سب رنگ ڈائجسٹ کا مقبول ترین سلسلہ
بازیگر
PDFBOOKSFREE.PK
آٹھواں حصہ

سیورین کی مضطرب نظریں مجھ پر ایک لمحے کے لیے منڈلائی تھیں۔ مجھے پرسکون دیکھ کے وہ بستر کے کنارے پڑمرا کے بیٹھ گئی۔ اُس کا ریشم ہاتھ جھَل نے سینے سے لگا لیا۔

"یہ تو بالکل اپنی بٹیا کی طرح لگتی ہے۔" اُس کی آواز سے یاسیت اور حسرت اُمڈ رہی تھی۔

سیورین کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ "کون بٹیا؟" اُس نے اٹکتی زبان سے پوچھا۔

"ہے ان کی ایک بیٹی" میں نے اُسے بتایا، "بہت لاڈلی۔"

"تیری کچھ نہیں ہے۔" جھَل چہچہا کے بولا۔

"میری! میری بھی بہت کچھ ہے، مگر تم سے زیادہ نہیں۔" میں نے تیکھی آواز میں کہا، "سوچا تھا، تاروے کے اُسی کو بلا لوں۔ وہ بھی تمھارا ایک علاج ہے، لیکن پھر تمھارا ہی خیال آ گیا۔ تم ناراض نہ ہو جاؤ کہ اُسے کیوں پریشان کیا۔"

"ٹھیک کیا تُو نے، وہ تو رستے میں آدھی ہو جاتی۔"

"اُس کی یاد آ رہی ہے تمھیں؟"

...ب نہیں آتی رہے۔"

"اب یہاں سے اُسی کے پاس چلیں گے" فیصلہ کُن لہجے میں کہا، "اور بہت دنوں تک تم وہیں فیض آباد میں اپنی بٹیا کے پاس، بل کہ میں تو کہتا کہیں آنے جانے کا سلسلہ ہی بند کر دینا چاہیے اب، نہیں آتا ہمیں۔ اِتنے زمانے سے خاک چھان رہے ہیں حاصل ہوا۔ اُلٹی ہر جگہ یہ دیواریں، خنجر چاقو، خون... جی میں آئی، اُسے بتاؤں کہ اُس کی بیماری ہی نے کچھ کم پریشان نہیں کیا تھا کہ اِس دوران مجھ پر جو گزرتی رہی ہے، وہ میں ہی جانتا ہوں۔ بروقت مجھے خیال آ گیا کہ یہ وقت تو اُس کی دل وہی و دل جُوئی کا ہے۔ مجھے تو سیورین اور ایمی کو بھی ہدایت کرنی ہے کہ وہ اُس کے سامنے کوئی ایسی ویسی بات نہ کریں۔ پہلے وہ پوری طرح تن درست ہو جائے۔ بعد کو تو اُسے سارا کچھ معلوم ہو ہی جائے گا۔ اکبر علی خاں جیسا نادر اور مہربان آدمی اور انتھونی جیسا جرأت مند اور ایثار پیشہ نوجوان... اُن کے گھر اُجڑ گئے۔ اُن کی طرف دھیان جاتا ہے تو دل ڈوبنے لگتا ہے۔ ہزار تاویلیں ڈھونڈتا ہوں کہ اس میں میری لغزش کیا ہے، لیکن کوئی ایک تاویل ضرور ہے جو کانٹے کی طرح میرے سینے میں چبھتی رہتی ہے اور شاید یہی ہے کہ اگر ہم یہاں، اِس منحوس شہر میں نہ آتے تو..."

جھَل نے یہاں سے فیض آباد واپس جانے اور مستقل وہیں رہنے کی بات سن لی تھی، وہ منمناتے ہوئے بولا، "دیکھیں گے رے۔"

"اب اور دیکھنا وکھنا کچھ نہیں... اور کیا، کتنا دیکھنا ہے، میں تمھیں یاد دلاؤں سارا۔"

اُس نے سر اُٹھا کے گھورتی آنکھوں سے مجھے دیکھا۔ "بہت گھوما ہوا لگتا ہے۔ تیرے بارے میں بھی ڈاکٹر صاحب سے بات کرنا پڑے گی۔" وہ تیکھی آواز میں بولا۔

"ہاں ہاں، ٹھیک ہے، کر لینا بات۔ بولنا کہ میرا دماغ چل گیا ہے۔" میں نے جھلّا کے کہا، اور مجھے خود کو باز رکھنا پڑا۔ یہ میں کس زبان اور لہجے میں کس شخص سے ایسی باتیں کر رہا ہوں جو بستر پہ دراز ہے اور خدا خدا کر کے کہیں آج اُس کے بے خبر وجود میں زندگی جاگتی نظر آتی ہے۔ وہ ٹھیک ہی کہہ رہا ہے،

خود میری دماغی حالت استوار نہیں ہے، میں بار بار کیوں بھٹک جاتا ہوں۔ اُس کی جمع خاطر کے لیے پھر مجھے دس قسم کی باتیں کرنی پڑیں۔ گو اپنے لفظوں کی بے اثری خود مجھی کو کھٹک رہی تھی۔ میں نے خود کو ترک کر دیا۔ ”ٹھیک ہے،“ جتنی نرمی سے ممکن تھا، میں نے کہا، ”بعد کو بات ہوگی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو قائل کریں گے اور کسی ایک نتیجے پر پہنچ جائیں گے۔“

سیورین اُس کے بستر کے کنارے بیٹھی ہماری نوک جھونک پٹ پٹاتی پلکوں سے سن رہی تھی، اور اب ایسی کٹی ہوئی نہیں تھی۔ اُس کا ہاتھ دیر سے بھٹل کی گرفت میں تھا اور وہ اُس کی پتلی جیسی پتلی پتلی نرم نازک اُنگلیاں چھیڑتا مسکاتا رہا تھا۔

”اتنا کام بیروئی کے ہاتھوں سے کیسے کر لیتی ہے۔“

سیورین کا سراپا نکھر آیا۔ رُخساروں پر چاندنی سی چٹک اُٹھی۔ اس عالم میں وہ اور دل کش اور معصوم نظر آ رہی تھی۔ بھٹل نے اُس کی گردن میں ہاتھ ڈال کے والہانہ اپنی طرف کھینچ لیا۔ سیورین ٹوٹے ہوئے پتے کے مانند اُس کے سینے پر جا گری، یا جا لگی، اور پھر جیسے [illegible] بھٹل اُس کی کمر تھپکنے لگا۔ ”یہ تو اس سے زیادہ چھوٹی ہوتی ہے۔ کیا بھولی لگتی ہے، کب سے دھوپ میں کھڑی ہے۔ [illegible] نہیں۔“ وہ مضطرب ہو گیا اور طرح طرح اُس کی دل داری کرنے لگا۔ ناچار اُس نے مجھے اشارہ کیا۔ ”سنبھالو اسے... یہ تو موم کی بنی ہے۔“

میں نے سیورین کا بازو تھام کے آہستہ سے بستر سے اُٹھا دیا۔ اُس کی آنکھیں [illegible] ہو رہی تھیں اور آنسو نکل رہے تھے۔ اپنا چہرہ کلائی سے چھپائی ہوئی میرے سہارے وہ صوفے پر آ کے بیٹھ گئی اور سر جھکائے سسکتی رہی۔ میں جلدی سے پانی لے آیا۔ میرے اصرار پر اُس نے گھونٹ بھر پانی پیا اور [illegible] کیا۔ [illegible] اُس کی اتنی شوقی [illegible] مجھے تو بڑی حیرت ہو رہی تھی [illegible] کوئی اندازہ نہیں ہو پاتا کہ سامنے جو آدمی بیٹھا ہے، بظاہر پُرسکون، اندر سے کیسا منتشر ہے۔ آدمی کے چہرے پر کیسی نادیدہ نقابیں چڑھی ہوتی ہیں۔

سب ہی آدمی مختلف عناصر کا مرکب ہے، مگر بعد کو، دنیا میں وارد ہو جانے کے بعد تو آدمی کی تشکیل اُس کے خِلقی اور طبعی عناصر سے زیادہ اُس کے گرد و پیش اور گزرنے والے لمحوں سے ہوتی ہے اور اختتام تک ہوتی رہتی ہے۔ بامراد لمحے، نامراد لمحے، وصال لمحے، ہجر لمحے، خزاں لمحے اور بہار لمحے۔ آدمی لمحوں کا قیدی اور لمحوں میں بٹا رہتا ہے۔ لمحے، جو جزو ہو جاتے ہیں، رگ و پے میں کھٹکتے، خون میں گردش کرتے رہتے ہیں۔ ہر گزرا ہوا لمحہ پیش آنے والے لمحے پر غالب آ جاتا ہے، مگر یہ مٹتا نہیں، دور ہو جاتا ہے، دور ہوتا رہتا ہے۔ اور بے شمار اوجھل، یا گم شدہ لمحے کسی موقع پر نمودار ہو کے آدمی کو زیر و زبر کر دیتے ہیں۔ زندگی بھر یہ سلسلہ جاری رہتا ہے، تاوقتیکہ آدمی کے خِلقی عناصر کی ناتوانی اور بے توازنی سے ایک روز سارا پیکر مسمار ہو جاتا ہے۔ پھر آدمی بھی گئی، لمحے بھی گئے، یادیں بھی گئیں۔

سیورین کے جسم و جاں میں بھی جانے کتنے محروم اور ویران لمحوں کی [illegible] پڑی ہوئی تھیں کہ بھٹل کے ایک ذرا سے سامنے، ایک ذرا سی ٹھنڈک سے بے اختیار ہو گئی۔ شاید کچھ یہی ہوا۔ اُس وقت [illegible] آ گئی۔ کبھی کسی سے سنا تھا، جان سوزی، جاں گدازی کی ایسی حالت میں مکانی تبدیلی کارگر ہوتی ہے۔ میں اُسے صوفے سے اُٹھا کے باہر لے آیا اور مریضوں کے لیے مخصوص ملحقہ کمرے تک لے گیا۔ وہ بہرحال ایک ہوش مند لڑکی تھی، بخلاف میری توقع، مجھ سے پہلے وہ ٹھٹھکتی ہوئی کمرے میں چلی گئی۔ اس کے انتظار میں، میں راہداری میں ٹہلتا رہا۔ چند لمحوں بعد وہ واپس آ گئی، بہت سنجیدہ اور شرمسار سی۔ میں نے اس سے کوئی گلہ کیا، نہ اپنا تک اُس کی شگفتہ خاطری اور دل افتادگی کا سبب جاننے کی کوشش کی اور مجھے اس کا موقع بھی نہیں ملا۔

ابھی ہم کمرے میں داخل نہیں ہوئے تھے کہ تیز قدموں سے چلتا ہوا ڈاکٹر رائے کا خاص خادم راستے میں مزاحم ہو گیا۔ ڈاکٹر نے مجھے طلب کیا تھا اور عجلت کی تاکید کی تھی۔ اپنے دفتر میں میری حاضری کی فرمائش تو وہ خود کر گیا تھا، اور میں جلد ہی اُن کے پاس جانے کا ارادہ بھی کیے ہوئے تھا، لیکن عجلت کی تاکید نے مجھے متوحش کیا۔ سیورین نے بھی یہ پیغام سن لیا تھا۔ وہ کچھ اور ہراساں ہو گئی۔ میں اُسے حوصلے کی تلقین کرنا چاہتا تھا، لیکن چند رسمی لفظوں کے بجائے خاموشی ہی مناسب معلوم ہوئی، اور باہر ہی سے میں قاصد کے ہمراہ چل پڑا۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ ڈاکٹر رائے رات والی بات کے سلسلے میں کوئی صراحت کرے گا یا پیر اعتدیہ جاننے کا خواہاں ہوگا۔ ایسے نازک معاملات کی تکرار اور تکلّف بلاغت کے منافی ہوتی ہے۔ ہر بُردبار شخص کی طرح ڈاکٹر رائے کو اپنا منصب و مرتبہ بہت عزیز ہونا چاہیے۔

درمیان میں کئی وارڈوں سے گزرنے کے بعد مرکزی عمارت آئی تھی۔ پولیس ابھی تک موجود تھی، سرکاری وردی کے ساتھ سادہ لباس میں بھی۔ ہمارے کمرے کے ارد گرد نفری کچھ زیادہ ہی تھی۔ مجھے سامنے سے گزرتا دیکھ کے گزشتہ کل کی طرح اُن کے جسم اکڑتے رہے۔ میری ضمانت اور ہمسر، ڈاکٹر کا خادم میرے پہلو بہ پہلو تھا۔ غالباً اسی لیے کسی نے مجھ سے کوئی تعرض نہیں کیا۔ راستے میں مَیں نے بھی اپنے تجسس و تردد پر بڑی حد تک قابو پا لیا تھا۔ اب جو کچھ بھی ہو، بھٹل تو زندگی کی طرف بڑھ رہا تھا۔

کچھ دیر کا راستہ طے کرنے کے بعد مرکزی عمارت آئی تھی۔ یہاں بھی اچھی خاصی چہل پہل تھی۔ پولیس کا ایک جتھا یہاں بھی دھرنا دیے ہوئے تھا۔ پولیس کو بعد از وقت احتیاط کا ہنر خوب آتا ہے۔ ڈاکٹر کے کمرے تک پہنچا کے خادم وہیں رُک گیا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ دستک دیے اور اجازت لیے بغیر میں نے اندر قدم رکھنے کی جسارت نہیں کی۔ ڈاکٹر کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ پہلی نظر میں کچھ منتشر سا نظر آیا۔ میں نے آداب کیا تو سر جھٹک کے جواب دیا اور اضطراری لہجے میں بولا، ”بیٹھو، بیٹھو! تم نے دیکھا، یہاں یہ لوگ پھر کیوں جمع ہو رہے ہیں؟“

”کون لوگ، کہاں؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”صدر دروازے کے باہر۔“ وہ جھنجلا کے بولا، ”میں نے معلوم کروایا تھا، یہ وہی لوگ ہیں، اڈّے کے آدمی، جو کل اُستاد میدا کے ساتھ آئے تھے اور باہر کھڑے رہے تھے۔“

میں نے معذرت خواہانہ لہجے میں وضاحت کی۔ ”مجھے نہیں معلوم، میں نے نہیں دیکھا۔ اتفاق سے یہاں آتے ہوئے میری نظر صدر دروازے پر نہیں گئی، مگر... آپ کیوں آئے ہیں وہ... کیا چاہتے ہیں؟“

”ابھی وہ کم تعداد میں ہیں، کل کی طرح نہیں، لیکن مجھے بتایا گیا ہے کہ رفتہ رفتہ وہ دروازے کے باہر اکٹھے ہو رہے ہیں، اور مسلسل بڑھ رہے ہیں۔ کوئی مقصد تو ہوگا، دوبارہ اُن کے یہاں آنے کا۔“

”یقیناً۔“ میں نے جھجکتے ہوئے تائید کی۔

”اور اب یہ کیا مقصد ہو سکتا ہے، تمھارے خیال میں؟“

میں کیا کہہ سکتا تھا۔ ڈاکٹر کے لہجے کی کساوٹ بتاتی تھی کہ اُسے مجھ پر کوئی شبہ ہے، میں کچھ جانتا ہوں اور بتانا نہیں چاہتا۔ ”ظاہر ہے مجھ سے ملنے کا۔“ میری بُجھی ہوئی آواز کی برگشتگی اُسے محسوس ہوئی ہوگی، اور یہ اچھی بات نہیں تھی۔

”یہ تو میں بھی جانتا ہوں۔“ وہ بپھر سا گیا۔ ”وہ مجھ سے ملنے نہیں آئے ہوں گے، مگر وہ تم سے کیوں ملنا چاہتے ہیں۔ کل میں نے خود سنا تھا، تم نے ہر بات صاف کر دی تھی۔ اب کیا ہے؟“

”بظاہر ایک ہی بات سمجھ میں آتی ہے۔“ میں نے دبے لہجے میں کہا۔ ”ہو سکتا ہے، میدا نے میری [illegible] پر نظرِ ثانی کی ہو اور اڈّے کی چوکی سے دست بردار [illegible] کر دیا ہو، اور اب صورتِ حال میں وہ مجھ سے مشورہ کرنے اُستاد کے آخری بات کرنے آئے ہوں۔ کوئی ایسی ہی بات ہو سکتی ہے۔ میدا کی غیرت کسی وقت گوارا کر سکتی ہے کہ وہ اپنے زور پر اڈّے کا داؤ نہیں دے رہا ہے۔ چوکی کا منصب مستقل ہے اور ایک قسم کی بخشش و عطا ہے یا پھر اُسے کوئی...“

”ہاں، ہاں، بولو، رُک کیوں گئے؟“ وہ بے کلی سے بولا۔

”یا پھر اُسے کوئی حادثہ پیش آ گیا ہے، اکبر علی خاں کے

مکان کے نزدیک جن تین آدمیوں کا خون ہوا تھا، اُن کے بھی تو کچھ نام لیوا، کچھ قریبی ساتھی اڈّے پر ہو سکتے ہیں۔ انھیں معلوم ہوگا کہ کس نے انھیں اُن کے عزیز سے جدا کیا ہے، دھنوا کے فدائیوں کی طرح۔"

"کیا یہ بھی ممکن ہے۔"

"سب کچھ ممکن ہے۔"

"یعنی وہ میدا کو ختم کر سکتے ہیں؟" اُس کی آنکھیں سکڑ گئیں۔

"اب ایک سلسلہ شروع ہو گیا ہے تو کچھ بھی ہو سکتا ہے۔"

میں نے مایوسی سے کہا، "لیکن ابھی کیا کیا جا سکتا ہے، اور کوئی بات بھی ہو سکتی ہے۔ آپ کی اجازت ہو تو میں صدر دروازے پر جا کے دیکھوں؟"

"نہیں۔" اُس نے فیصلہ سنانے میں ایک لمحے تامّل نہیں کیا۔ "تمھارا وہاں جانا ٹھیک نہیں۔"

"مگر جانا تو پڑے گا۔"

"ابھی دیکھتے ہیں۔" اُس نے ہاتھ اُٹھا کے کہا، "اسپتال کے کئی ملازم باہر ہیں۔ کچھ معلوم ہوا تو آ کے بتائیں گے۔ تم بیٹھتے کیوں نہیں۔" پھر اُسے کچھ خیال آیا، اپنی مخصوص کرسی کے بجائے وہ صوفے پر بیٹھ گیا۔ "کچھ پیو گے؟"

"نہیں شکریہ۔" میں بھی اُس سے کچھ فاصلے پر بیٹھ گیا۔ لمحوں تک وہ اپنے آپ میں گُم کچھ سوچتا رہا مجھے اپنی جانب سے کچھ کہنا نہیں تھا کہ میرے پاس لب کشائی کے لیے تھا ہی کیا۔

"ابھی کچھ دیر پہلے آئی جی کا فرستادہ ایک پولیس افسر یہاں آیا تھا۔" ڈاکٹر نے چونک کے کہا، "میں تمھیں بتانا ہی بھول گیا۔ جیسا کہ میں نے کل رات خیال ظاہر کیا تھا، اکبر علی خاں کے بڑے بھائی نے تم سے ملنے کا مطالبہ کیا ہے۔ مطالبہ میں یوں کہہ رہا ہوں کہ مجھے یہی بتایا گیا ہے۔ تمھیں معلوم ہے کہ وہ ریاست حیدر آباد میں نظام سرکار کا کوئی بڑا عہدے دار ہے۔ پولیس اُس کے اثر ورسوخ کے دباؤ میں ہے۔ مرکزی حکومت کی طرف سے پٹنا پولیس کو متنبہ کیا گیا ہے کہ اصل مجرم جلد از جلد عدالت کے حوالے کیے جائیں اور مرکزی حکومت کو مرحلہ وار کارروائی سے آگاہ کیا جاتا رہے۔ اکبر علی خاں کی تدفین کے فوراً بعد اُن کے گھر آئی جی سمیت پولیس کے تمام بڑے افسر جمع ہوئے تھے۔ رات گئے تک اُن کے درمیان بات چیت جاری رہی اور تمھارا ذکر بار بار ہوتا رہا۔

میں سنا کیا۔ ایک بھائی کے اِس طرح جدا ہو جانے سے کسی بھی بھائی پر کیا قیامت گزر سکتی ہے، اور اگر وہ صاحبِ اثر بھی ہو۔ ڈاکٹر رائے نے مجھے بتایا کہ اسپتال میں مجھ سے مل کے آئی جی پولیس بڑی حد تک مطمئن ہو گیا تھا۔ یہ کمالِ شرافت، کس درجے کی بزرگی اور شفقتِ خسروانہ تھی کہ ڈاکٹر رائے مجھے کچھ جتا نہیں رہا تھا، لیکن میں جانتا تھا، اپنے اطمینان کے باوجود آئی جی مجھے ساتھ لے جانے کے لیے کس قدر بے چین تھا۔ ڈاکٹر رائے درمیان میں نہ پڑتا تو آج میں پولیس کی تحویل میں ہوتا اور جانے کب تک رہتا۔ ڈاکٹر کے کہنے کے مطابق آئی جی نے اکبر علی خاں کے بھائی کو یقین دلانے کی کوشش کی ہے کہ اسپتال میں کئی دن سے پولیس نے جال بچھا رکھا ہے اور مجھ پر کڑی نظر رکھی جاتی رہی ہے۔ گو میرا تعلق بھی اڈّے سے ہے، لیکن اِس معاملے میں میرے کسی تعلق کے شواہد نہیں مل پا رہے۔ ظاہر ہے، آئی جی نے اکبر علی خاں سے میری شناسائی کی تمام رُوداد بھی اُس کے بھائی کو سنائی ہوگی۔ ڈاکٹر رائے کہہ رہا تھا کہ آئی جی نے اکبر علی خاں کے بھائی کو باور کرایا ہے کہ اپنے بھائی کی بیماری کی وجہ سے میں مسلسل اسپتال میں رہا ہوں، اور پولیس نے اچھی طرح تحقیق کر لی ہے کہ ایک اکبر علی خاں ہی تھے جن سے شہر میں میری رسم و راہ ہوئی تھی۔ میں نے فرار ہو جانے کی بھی جستجو نہیں کی ہے۔ شہر آ کے کسی ٹھکانے کے لیے جس ہوٹل میں، میں نے کمرا لیا تھا، وہاں میں ایک رات بھی نہ ٹھیر سکا۔ کمرے میں سامان رکھنے کے بعد ایک لمحہ ضائع نہیں کیا، بھائی کو لے کے سیدھے اسپتال کا رُخ کیا۔ پولیس نے ہوٹل کے کارندوں سے پوچھ گچھ کی ہے۔ میرا سامان وہیں پڑا ہے اور کچھ نقدی مینیجر کے پاس امانت رکھی ہوئی ہے۔ پولیس نے اُس تانگے والے کو تلاش کر کے اپنی تسلّی کر لی ہے جو مجھے اور نِثّل کو اسٹیشن سے ہوٹل اور ہوٹل سے اسپتال لے گیا تھا۔ اسپتال کے ڈاکٹروں نے تصدیق کی ہے کہ میرا بھائی سر کی شدید چوٹ کی وجہ سے ابتر حالت میں اسپتال آیا تھا اور اُس کا علاج خاص توجہ سے کیا جاتا رہا ہے۔ یہ بھی سراغ لگا لیا گیا ہے کہ اکبر پور اسٹیشن پر ریل کا انجن اچانک خراب ہو جانے سے بہت سے مسافر متاثر ہوئے تھے۔ اسی

گاڑی میں میرا بھائی موجود تھا۔

خدمت گار کے چائے لانے کی وجہ سے ڈاکٹر رُک گیا۔ اُس کے اشارے پر خدمت گار نے ہم دونوں کے لیے چائے بنائی اور بسکٹوں کی تشتریاں سامنے رکھ کے چلا گیا۔

"اور اُسے جلدی ہے... اکبر علی خاں کے بھائی کو۔" ڈاکٹر نے بھاری آواز میں کہا اور اُلجھ کے بولا، "کیا نام بتایا تھا پولیس افسر نے اُس کا؟"

میں نے زیرِ لبی سے کہا۔ "شاید سکندر علی خاں۔"

"ہاں، ہاں کچھ ایسا ہی۔" اُس نے تیزی سے سر ہلا کے تصدیق کی۔ "گو یہ اُس کا آبائی شہر ہے، مگر معلوم ہوا ہے، اُدھر حیدر آباد میں اُس کی منصبی ذمّے داریاں یہاں طویل قیام میں حارج ہیں۔ اُس کا ارادہ ہے کہ اپنی بیمار ماں، مرحوم بھائی کی بیوہ اور بچّوں کو ساتھ لے جائے۔ حیدر آباد سے بھیجے جانے والے اُس کے معتبر کارندے یہاں کی جائداد، زرعی زمینیں اور دیگر معاملات دیکھتے رہیں۔ پولیس کا قیاس ہے کہ اکبر علی خاں کی بیوہ پٹنا چھوڑنے پر شاید آمادہ نہ ہو سکے۔ یہاں کالج میں وہ پڑھاتی ہے، اپنی زمینوں پر بسنے والے کسانوں کی فلاح و بہبود میں دل چسپی لیتی ہے، گانو میں اُس نے ایک اسکول کھولا ہوا ہے، بچّے یہاں کی درس گاہوں میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں، اُن کے تعلیمی سال متاثر ہو سکتے ہیں۔ یہی ہو سکتا ہے کہ مستقل طور پر نہیں تو چند ہفتوں، مہینے دو مہینے کے لیے حیدر آباد چلی جائے۔ تمام آسائشوں سے آراستہ نظام اسٹیٹ ریلوے کا ایک سرکاری ڈبا پٹنا ریلوے اسٹیشن پر کھڑا ہوا ہے، لیکن روانگی سے پہلے سکندر علی خاں اپنے بھائی کے قاتلوں کو انجام تک پہنچانے کے لیے خاصا مضطرب نظر آتا ہے۔ اُسے بتایا گیا ہے، پولیس کی تفتیش کے مطابق وہی تین آدمی اُس کے بھائی کے قاتل تھے جن کی لاشیں اُس کے آبائی گھر کے قریب پھینک دی گئی تھیں۔ پولیس کو اب اُن تین آدمیوں کے قاتل، یا قاتلوں کی تلاش ہے، اور اُسے کچھ اندازہ ہے کہ وہ کون لوگ ہو سکتے ہیں، اور یوں محض شبہے کی بنیاد پر کسی کو گرفت میں لینے سے پہلے وہ یقینی ثبوت فراہم ہو جانے کی تگ و دو میں ہے۔"

ڈاکٹر رائے، ایک مصروف ترین ڈاکٹر کس انہماک، کتنی جزئیات اور کیسی یگانگت سے مجھے یہ ساری رُوداد سنا رہا تھا۔

مجھ میں تو ممنونیت کے دو لفظ کہنے کی سکت نہیں رہی تھی۔ میں سر نگوں بیٹھا رہا۔ چائے ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ دونوں کو خیال ہی نہیں رہا تھا۔ اُس کے ٹوکنے پر میں نے ایک گھونٹ میں پیالی ختم کر دی۔ اُس نے گھونٹ لیا تو چہرہ بگڑ گیا۔ ناگواری سے پیالی پرچ پر رکھ کے تازہ چائے کے لیے وہ خدمت گار کو طلب کیا چاہتا تھا کہ پھر جیسے بھول گیا، بے چینی سے کہنے لگا۔

"ہاں... اور سکندر علی خاں نے تمھارے بارے میں بہت سوال کیے، پولیس نے اُسے قائل کرنے کے بجائے محض آثار و شواہد پیش کرنے کی احتیاط کی۔ آئی جی نے اُس سے کہا، یقیناً گھر والوں نے بھی گھر میں جا تو تان کے گھس آنے والے نوجوان کے بارے میں اُسے کچھ بتایا ہوگا۔ جہاں تک آئی جی کی معلومات ہیں، اُس کے بھائی سے نوجوان کی چند روزہ شناسائی کی ابتدا نہایت ناشائستہ اور جارحانہ انداز میں ہوئی تھی، لیکن نوجوان کا ماجرا سن کے اکبر علی خاں نے اُس کی بے چارگی محسوس کی اور ساری اذیّت بھلا کے وہی کیا جو ایک کشادہ دل

...کا ذخیرہ ہوسکتا ہے۔ بعد کو نوجوان کے عزم و حوصلے، اُس کی سچ بیانی کے اکبر علی خاں ایسے شیدائی ہوئے کہ اجنبیت کی ساری دیواریں ایک ہی جست میں پھلانگ لیں۔ صبح و شام اسپتال جا کے دوست کی دل دہی، خاطر داری معمول بنائی۔ اُس رات، رات گئے نوجوان نے انھیں اسپتال کے صدر دروازے پر رخصت کیا تھا۔ اسپتال کا عملہ گواہ ہے کہ نوجوان واپس اپنے کمرے میں آ گیا تھا۔ اکبر علی خاں کے گھر والے کچھ ٹھیک بتا سکتے ہیں کہ اسپتال سے گھر واپس آ کے وہ نوجوان کا ذکر کس اشتیاق سے کیا کرتے تھے۔ سو نوجوان، یا اُس کے ایما پر اُس کے آدمیوں کے ذریعے انھیں ختم کر دینے کا کوئی جواز ہونا لازم ہے۔ ایسے سنگین جرم کے ارتکاب کے لیے کوئی بڑی علت پس منظر میں ہونی چاہیے، بہت سی آگ، یا دیوانگی۔ اس منطق کے باوجود پولیس اپنے اخذ کیے ہوئے نتائج پر مُصر نہیں، ایک ذرا سا اشارہ ملا تو خاطر جمع ہے، نوجوان اور پولیس کے درمیان کوئی حدِ فاصل نہیں ہے۔ نوجوان عملاً پولیس کے حصار میں ہے۔

ڈاکٹر راے کو از خود کچھ احساس ہوا اور اُس کے لہجے میں کسی قدر بے اعتنائی در آئی، پہلو بدلتے ہوئے بولا، "یہ سارا کچھ اتنی تفصیل سے میں تمھیں اس لیے بتا رہا ہوں کہ تم کشاکش سے باہر آ سکو۔"

"میرے لیے اس وقت سب سے بڑی کشاکش اور کش مکش میرا بھائی ہے۔" اپنی اس صاف گوئی پر مجھے خجالت بھی ہوئی۔ کہتے ہیں، آدمی کے جسم میں سب سے زیادہ بے قابو چیز دل ہے، لیکن یہ زبان بھی کچھ کم نہیں۔

"اور جو تمھارا بھائی نہیں ہے۔" وہ تیکھی آواز میں بولا۔

"میں نے آپ سے کہا تھا، میرے لیے وہ بھائیوں سے [ب]ڑھ کے ہے۔ اُس کے میرے بہت سے رشتے ہیں، بھائی کا تو [ا]یک ہی رشتہ ہوتا ہے۔"

اُس نے لمبی سانس لی اور سر ہلانے لگا، پھر کچھ توقف بعد [نر]م لہجے میں بولا۔ "میں سمجھتا ہوں، یہ اطمینان کی صورت ...۔ مجھے سکندر علی خاں کی طرف سے خدشہ تھا کہ وہ پولیس پر ...بے جا اثر نہ ڈالے اور پولیس بدحواسی میں اُلٹے سیدھے ...نہ کرنے لگے اور تم مزید مصائب میں نہ گھِر جاؤ، لیکن وہ ایک تعلیم یافتہ اور جہاں دیدہ آدمی ہے، قاعدے قانو... پوری طرح آگاہ۔ کوئی نواب جاگیردار نہیں، جو آدمی کم... جاگیردار زیادہ ہوتے ہیں۔ اُس نے پولیس کی دلیلیں تحمّ... سنیں اور اپنے زور و اثر کے غیر ضروری اظہار سے اجتنا... مگر وہ تمھیں دیکھنے، تم سے ملنے کے مطالبے، یا خواہ... شدت سے قائم ہے۔ پولیس نے اُس سے درخواست کی... کہ تمھارا اُس کے گھر جانا بوجوہ سرِدست مناسب نہیں... یہی سبب تھا کہ تمھیں اکبر علی خاں کی تدفین میں شرکت... روک دیا گیا تھا۔ سارے شہر میں اُس آدمی کا چرچا ہے... اُستاد میدا جیسے سرکش چاقو باز کے اڈے پر جا کے سینہ... ہو گیا تھا اور اُس کے بعد خونی واقعات کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا... اُس کے بعد پانچ آدمی مارے گئے۔ سکندر علی خاں ذرا زحمت کرے تو بے شک اسپتال میں تم سے ملاقات ہو سکتی ہے، لیکن سکندر علی خاں اس زحمت پر آمادہ نہیں ہوں۔"

"میرا خیال ہے، اب ایسی کوئی بات نہیں۔ میں خود اُس کے پاس چلا جاتا ہوں، اور مجھی کو جانا چاہیے۔ حالاں کہ اکبر علی خاں کے گھر والوں کا سامنا کرنے کے تصور سے دل..."

"جاتا ہوں۔ تم جا سکتے ہو۔" اُس کے ہونٹوں پر تلخی عود کر آئی۔ "تم کہیں بھی جا سکتے ہو۔"

"کبھی نہ کبھی تو مجھے باہر نکلنا ہی ہے۔"

"کبھی تو تم ایک چھوٹے بچے کی طرح معلوم ہوتے ہو اور ویسے یہ... یہ اچھی بات ہے، آدمی کو بچہ بھی ہونا چاہیے۔" وہ مسکرایا اور مفاہمت کے انداز میں بولا، "تم سمجھتے کیوں نہیں، گذشتہ رات ہی اکبر علی خاں کی تدفین ہوئی ہے، ایک مشتعل ہجوم اس موقع پر موجود تھا۔ شہر میں بڑی کشیدگی ہے، فرقے وارانہ رنگ بھی دیا جا رہا ہے۔ سارا شہر ہی ہراساں ہے۔ بازار بند پڑے ہیں، کاروبار چوپٹ ہے۔ طلبہ نے پروفیسر کے قاتلوں کی گرفتاری تک کلاسوں کا بائیکاٹ کیا ہوا ہے، طرح طرح کی افواہیں پھیلی ہوئی ہیں۔ جگہ جگہ پولیس گشت کر رہی ہے اور حالات معمول پر لانے کے جتن کر رہی ہے، ایسے میں..."

دروازے پر ہلکی دستک ہوئی۔ ڈاکٹر رک گیا۔ "آ جاؤ۔" وہ دھمکتی آواز میں بولا۔ اجازت ملنے پر انگریزی لباس میں، سانولی رنگت کا ایک باوضع ادھیڑ آدمی جھجکتے ہوئے اندر آیا۔ وہ

ڈاکٹر معلوم ہوتا تھا، یا اسپتال کا کوئی افسر۔ ''ہاں چھاگلا! کیا ہے؟'' ڈاکٹر رائے نے اُچکتی آواز میں پوچھا۔

چھاگلا نے مؤدبانہ جواب دیا۔ ''جناب! باہر خاصی بڑی تعداد میں وہ لوگ جمع ہو چکے ہیں اور منضبط ہیں۔ فی الحال کسی قسم کا ہنگامہ نہیں۔''

''کیا... کیا چاہتے ہیں؟''

''ابھی کچھ صاف نہیں، لگتا ہے، کسی کا انتظار ہے اُنھیں۔''

''کس کا... کس کا انتظار؟''

''کچھ دیر میں سب کچھ واضح ہو جائے گا جناب! پولیس بھی خاصی تعداد میں چار دیواری کے باہر موجود ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' ڈاکٹر جھنجلا کے بولا، ''ہم یہیں بیٹھے ہیں، اُن کا مقصد معلوم کرو... اور ہاں بہ راہِ مہربانی کچھ چائے کافی وغیرہ کا بندوبست کرواؤ۔''

چھاگلا سر جھکائے واپس چلا گیا۔

''کہیں ایسا تو نہیں۔'' میں نے سمٹی ہوئی آواز میں کہا، ''پولیس نے میداہی کو گرفتار کر لیا ہو۔''

ایک لحظے کے شش و پنج کے بعد وہ بھڑک اُٹھا۔ ''نہیں، پولیس افسر تھوڑی ہی دیر پہلے میرے پاس آیا تھا۔ ایسا کچھ ہوتا تو اُسے معلوم ہوتا، مگر تمھیں یہ خیال کیوں آیا؟''

''یوں ہی... یوں ہی ذہن میں آیا، کچھ سمجھنے کی جستجو میں، کہ ایک وجہ یہ بھی تو ہو سکتی ہے، میداہی کی گرفتاری کے بعد اڈّے کے آدمیوں کو نئی صورتِ حال میں میری ہی جانب رُخ کرنا چاہیے۔''

''ہاں، یہ تو ضوابط کی بات ہے۔'' اُس کا طنز ڈھکا چھپا نہیں تھا، اِس لیے ایسا کاری بھی نہیں تھا۔ ''مگر تم تو کہتے تھے کہ میداہی پر ہاتھ ڈالنا پولیس کے لیے اِتنا آسان نہیں ہوگا۔''

''ہونا تو یہی چاہیے، مگر چوک تو کسی سے بھی ہو سکتی ہے، اور گواہ تو کبھی کبھی اندھیرا بھی بن جاتا ہے، اور اپنا سایہ بھی۔ دباؤ کے ایسے وقت میں پولیس کو اپنی کارکردگی کی بڑی بے قراری ہوتی ہے۔ شک کرنا، آدمی پکڑنا، کسی معذرت کے بغیر اُنھیں چھوڑ دینا، پولیس کا ایک آزمودہ اور فرسودہ مشغلہ ہے۔''

''تمھارا مطلب ہے، وہ کسی کو بھی گرفت میں لے سکتے ہیں، خواہ متعلق اور مطلوب ہو نہ ہو؟''

''شک کا ایک جواز، اُن کے پاس ہتھیار کے مانند ہوتا ہے۔''

''اُدھر یورپ میں ایسا نہیں ہوتا۔''

''اکبر علی خاں صاحب وکیل تھے اور آپ کی طرح یورپ میں ایک عرصے رہے تھے۔ وہ بھی یہی کہتے تھے، ناحق کسی کو گرفتار کرنے پر پولیس کی بن آتی ہے۔ بہت دیکھ بھال کے بعد پولیس کسی کے گریبان کی طرف ہاتھ بڑھاتی ہے، مگر یہاں کا معاملہ دوسرا ہے اور شاید یوں کہ یہاں آدمی کی بڑی ارزانی ہے۔ وہ جو کہتے ہیں، ٹکے سیر مل جاتے ہیں۔ مغرب میں کسی کو اِس طرح پکڑ کے خانہ پُری نہیں کی جاتی۔ یہاں تو چوپایوں سے آدمی کا کوئی ایسا امتیاز نہیں۔ اُن کے بھی ریوڑ ہوتے ہیں، آدمی بھی یہاں ریوڑوں کی طرح ہنکائے جاتے ہیں، بعض جگہوں پر تو یہاں آدمی، آدمی سے زیادہ جانور ہے، جانوروں سے مشابہ جو اپنے حق سے آگاہ نہیں ہوتے۔''

''اِس کی بنیادی وجہ عمومی جہالت ہے۔'' اُس نے تاسّف سے کہا۔

''اور جہالت کی بنیادی وجہ عمومی غربت ہے۔''

''ہونہہ۔'' اس کے شانے ڈھلک گئے۔

''تم اِس وقت کسی کامریڈ کی طرح لگ رہے ہو۔''

''میں کیا... میں تو...'' میری زبان بل کھا گئی۔ میں نے ندامت سے کہا۔ ''شاید مجھ سے یا وہ گوئی سرزد ہو رہی ہے۔''

اُس نے میری عذر خواہی نظر انداز کر دی اور کہنے لگا، ''لندن میں میرے ایک دو دوست برِصغیر کے متعلق کچھ اِسی قسم کی باتیں کیا کرتے تھے، پُرجوش اور شعلہ خو درویش، لیکن میں سمجھتا ہوں، وہ بہت انتہا پسند تھے۔ اُن میں لچک کی بڑی کمی نظر آئی مجھے۔ کسی ملک، قوم اور قبیلے کے معروضی حالات، اُس کا پس منظر اور پیش منظر اور اُس کی نفسی کیفیات کے تجزیے کے بغیر وہ فیصلے صادر کرتے رہتے تھے۔ بہت عجیب لوگ تھے وہ...''

ڈاکٹر رائے کہیں کھو سا گیا۔ پھر جھرجھری لے کے بولا، ''خیر... ہم بہک رہے ہیں۔ مناسب ہوگا، سرِ دست یہ فکر انگیزی کسی اَور وقت کے لیے موقوف کی جائے۔ تم میداہی استاد کی بات کر رہے تھے۔''

میں نے اپنے بھٹک جانے پر معافی چاہی۔ ''میں کہہ رہا تھا'' میں نے نسبتاً دھیمی اور تھمی ہوئی آواز میں کہا، ''کچھ ایسا ہے، میں نے کہیں پڑھا تھا کہ پولیس کا جواز ہی جرم سے ہے۔ جرم نہ ہو تو پولیس کا یہ لاؤ لشکر کیوں۔ مجرموں کی افزائش سے پولیس کا

کاروبار فزوں ہوتا ہے، چشم پوشی سے مراد پشت پناہی ہے۔ سو کبھی پشت پناہی، کبھی سرکوبی، معاملہ حد سے گزر جائے تو آخر پولیس کو وہی کرنا پڑتا ہے جو اُسے ابتدا میں کرنا چاہیے۔ اڈّے اور پولیس کے درمیان ایک ربطِ خاطر تقریباً ہر جگہ موجود ہوتا ہے۔ ایک مرتبہ کسی کو پکڑ کے چھوڑ دیا جائے تو وہ شک سے بَری ہو جاتا ہے، اُس کا سینہ چوڑا ہو جاتا ہے۔ اُسے الزامات کے نشتروں اور رُسوائیوں سے نجات مل جاتی ہے۔ اِس باہمی ربط وارتباط کی وضع میں پولیس کی آبرو بچانے کے لیے کبھی اڈّے کے آدمی خود چارا بن جاتے ہیں، کبھی چارا بنا لیے جاتے ہیں۔ اِس طرح پولیس کی مستعدی، سرگرمی اور اہمیت کا اظہار ہوتا رہتا ہے، میدا کی گرفتاری بھی کچھ اِسی طرح کی ہو سکتی ہے۔ میدا کا اڈّا بُری طرح الزامات کی زد پر ہوگا، کیوں کہ چار مرنے والوں کا تعلق اُسی کے اڈّے سے تھا۔ اِدھر پولیس بھی اڈّے کے آدمیوں، خصوصاً اُستاد سے چشم پوشی پر ملامتوں کا ہدف بنی ہوگی۔"

"تو... تو پھر؟" ڈاکٹر نے سرگرانی سے پوچھا۔

"ابھی کیا کہا جا سکتا ہے، ایک دوسرے کی ضرورت اور معاونت کی بات ہے تو میدا چند دنوں میں باہر آ جائے گا اور واقعی کوئی سراغ مل جانے کے بعد اُسے گرفت میں لیا گیا ہے تو اپنے انجام کو پہنچے گا۔ ہر صورت میں پولیس بالا رہتی ہے۔ پولیس کو آنکھیں پھیر لینا بھی خوب آتا ہے۔"

ڈاکٹر کی آنکھیں چڑھ گئیں۔ "تم نے کیا سوچا ہے پھر؟"

"اگر وہ اِسی وجہ سے آئے ہیں تو مجھے کل کا آموختہ دُہرانا ہوگا۔ مجھے اُن میں سے کسی ایک کو منتخب کرنا چاہیے۔"

"اور اگر کوئی تیار نہیں ہوا؟"

"یہ ممکن نہیں ہے، اڈّے کی چوکی ہر کسی کا خواب ہوتی ہے۔"

"اِن حالات میں شاید کوئی تیار نہ ہو۔"

"دیکھتے ہیں" میں نے جزبز ہو کے کہا۔

"مگر ایک بات کا دھیان رکھنا۔ یہ اسپتال ہے۔ ایک بار کی بات ٹھیک تھی۔ وہ دوسری بار آ گئے ہیں۔ میں نہیں چاہوں گا۔ پھر وہ یہاں اِس طرح..."

"آپ کچھ نہ کہیے۔ مجھے اِس کا احساس ہے۔" میں نے لجاجت سے کہا، "میں اِس کا انتظام آج کر دوں گا۔"

"کیا کرو گے تم؟ مجھے کچھ بتاؤ۔"

"اُن سے دوبارہ یہاں آنے کو صاف منع کر دیا جائے گا۔ آپ اطمینان رکھیے ورنہ... ورنہ مجھے یہاں سے جانا پڑے گا۔"

اِدھر خدمت گار خورونوش کی چیزوں سے بھرا تشت لے کے آیا، اُدھر چھاگلا بدحواسی کے عالم میں کمرے میں داخل ہوا۔

"جناب! ابھی اُن سے میری بات ہوئی ہے۔ میں صدر دروازے سے آ رہا ہوں۔" چھاگلا کی آواز جھنگی ہوئی تھی۔

"کیا... کیا چاہتے ہیں؟" ڈاکٹر نے کشیدہ لہجے میں پوچھا۔

"اندر آنا چاہتے ہیں جناب!"

"اندر آنا چاہتے ہیں۔" ڈاکٹر نے برہمی سے دُہرایا۔ "تم نے بتایا نہیں کہ اسپتال میں ملاقاتیوں کی آمدورفت کا وقت مقرر ہے۔ یہ وقت ختم ہو گیا ہے... اور ہم اِتنے لوگوں کو ایک ساتھ اندر آنے کی اجازت نہیں دے سکتے۔ کبھی نہیں۔"

"بتایا، بتایا جناب!" چھاگلا نے جسم سیدھا کر لیا۔ "صدر دروازہ بند کر دیا گیا ہے۔ وہ سارے کے سارے نہیں، صرف چند آدمی اندر آنے کی درخواست کر رہے ہیں۔ اُن کی خاصی بڑی تعداد کی وجہ سے کچھ شور مچنا شروع ہوا تھا۔ ٹوکنے پر کہ اسپتال کا خیال رکھا جائے، اُنھوں نے احتیاط کی۔"

"کیا کہا تم نے؟" ڈاکٹر راسے نے چونک کے پوچھا۔

"صرف چند آدمی اندر آنا چاہتے ہیں، مگر کیوں؟"

"وہ اُستاد جُھلّل کا نام لے رہے ہیں۔ کہتے ہیں، صرف ایک دومنٹ کے لیے وہ اُستاد جُھلّل کو دیکھنا چاہتے ہیں۔"

ڈاکٹر اور میں نے منتشر نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔

میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ "کون ہیں وہ؟"

"اُستاد میدا اور اُس کے چند ساتھی۔"

"اُستاد میدا؟" ڈاکٹر کی نظریں سیدھی مجھ پر منڈلائیں اور اُس نے چھاگلا سے پوچھا۔ "تم پہچانتے ہو اُسے؟"

"جی، جی ہاں، کل بھی تو اُسے دیکھا تھا یہاں۔" چھاگلا نے گھبرائے انداز میں کہا۔ "وہی ہے جناب۔"

"کیا وہ واقعی اُستاد جُھلّل کا نام لے رہا تھا؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"جی ہاں۔" چھاگلا نے اکڑ کے کہا۔

"اُن سے کہو، اسپتال کے قاعدے کے مطابق اَب شام 4 بجے سے 6 بجے کے دوران ہی ملاقات ہو سکتی ہے۔"

ڈاکٹر راسے نے بپھری ہوئی آواز میں فیصلہ سنا دیا۔

"میں نے کہا تھا جناب! اُنھوں نے کہا، بس ڈاکٹر صاحب تک ہماری درخواست پہنچا دو۔ وہ مہربان آدمی ہیں۔ نہیں مانے تو ہم چار بجنے تک کا انتظار کر لیں گے۔"

"چار بجے تک وہ یہیں بیٹھے رہیں گے۔" ڈاکٹر برانگیختہ ہو گیا۔ "ٹھیک ہے، بیٹھیں، بیٹھیں۔ اُن سے صاف کہ دو کہ اُنھوں نے اسپتال کا سکون درہم برہم کرنے کی کوشش کی تو پولیس حرکت میں لائی جا سکتی ہے۔"

"بہتر جناب۔" چھاگلا نے مؤدبانہ سر خم کیا۔

وہ واپس جایا چاہتا تھا کہ میں نے اُس سے ٹھہر جانے کو کہا اور ڈاکٹر راسے سے گزارش کی۔ "مجھے اجازت دیجیے، میں اُن سے ملتا ہوں۔ یہ کوئی دوسری بات معلوم ہوتی ہے۔ وہ نہیں جو ہم قیاس کر رہے تھے۔ آپ نے غور کیا، میدا اُستاد وہاں موجود ہے اور وہ جُھلّل بھائی کا نام لے رہا ہے۔"

ڈاکٹر کو جواب دینے میں تامّل ہوا۔

"یہ بڑے ضدی اور ڈھیٹ قسم کے لوگ ہوتے ہیں، یہیں بیٹھے رہیں گے۔" میں نے تمام تر متانت سے کہا، حالاں کہ مجھے خود بڑی وحشت ہو رہی تھی۔

"دیکھتے ہیں پھر۔" ڈاکٹر پست آواز میں بولا۔

خدمت گار نے چائے پیالیوں میں اُونڈیل دی تھی۔ چھاگلا بھی منتظر کھڑا تھا۔ ڈاکٹر نے لباس کھینچ کر شکنیں درست کیں، بالوں پر ہاتھ پھیرا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

میں لپک کر اُس کے برابر ہوا اور دبی زبان میں مشورہ دیا کہ وہ میرے ساتھ نہ جائے۔

"مجھے معلوم ہے، تمھیں جانا چاہیے، لیکن میں اپنی آنکھوں سے کچھ دیکھنا چاہتا ہوں۔" اُس نے آزردہ مسکراہٹ سے کہا۔ وہ مجھے کہہ رہا تھا، اُس وقت وہ خود بچوں جیسی خواہش کر رہا ہے، بار بار اُسے اُن لوگوں کے سامنے نہیں ہونا چاہیے۔ تجسس و اضطراب اپنی جگہ، لیکن اُس کا ایک مرتبہ ہے۔ میں کچھ نہ کہہ سکا۔ یہ ادب کی حدود کا لحاظ کبھی بڑا جبر ہوتا ہے۔

"وہ میرے ساتھ رہنے سے سنبھلے رہیں گے۔" یہ کہتا ہوا سب سے پہلے وہی دروازے سے باہر نکلا، پھر میں اور چھاگلا۔ ہمیں دیکھ کے عمارت کے وسیع استقبالی ہال میں تعینات پژمردہ سپاہیوں

مینارِ پاکستان

برِصغیر میں عالم گیری مسجد (لاہور) کے میناروں کے بعد جو پہلا اہم مینار مکمل ہوا ہے، وہ مینارِ قراردادِ پاکستان ہے۔ یوں تو مسجد اور مینار آمنے سامنے ہیں، مگر اُن کے درمیان یہ ذرا سی مسافت، جس میں سکھوں کا گردوارہ اور فرنگیوں کا پڑاؤ شامل ہیں، تین صدیوں پر محیط ہے۔ میں مسجد کی سیڑھیوں پر بیٹھا اُن تین صدیوں کا ماتم کر رہا تھا۔ مسجد کے مینار نے جھک کر میرے کان میں راز کی بات کہہ دی۔ جب مسجدیں بے رونق اور مدرسے بے چراغ ہو جائیں، جہاد کی جگہ جمود اور حق کی جگہ حکایت کو مل جائے، ملک کے بجائے مفاد اور ملّت کے بجائے مصلحت عزیز ہو اور جب مسلمانوں کو موت سے خوف آنے اور زندگی سے محبت ہو جائے تو صدیاں یوں ہی گم ہو جایا کرتی ہیں۔

آوازِ دوست از مختار مسعود ❖ تعاون: ابوالفرح ہمایوں

میں جیسے جان آ گئی۔ چند قدم کی دُوری طے کر کے ہم عمارت سے نکل آئے۔ سامنے ایک بڑے بیضوی دائرے کی شکل میں سبزہ زار پھیلا ہوا تھا، اطراف میں پام کے بلند قامت درخت ایستادہ، سبزہ زار کے اُس طرف صدر دروازہ اور صدر دروازے کے دائیں بائیں لوہے کی سلاخوں کا جنگلا بنا ہوا تھا۔ سلاخوں سے جگہ جگہ مختلف رنگوں کے پھولوں کی بیلیں لپٹی ہوئی تھیں۔ سبزہ زار کے دائرے کے دونوں جانب گھومتی ہوئی لال بجری بچھی گھومتی روش پر چلنے کے بجائے ڈاکٹر راسے سبزہ زار کے بیچوں بیچ اینٹوں سے بنے پگ ڈنڈی جیسے راستے پر آ گیا۔ یہ راستہ سیدھا صدر دروازے پر ختم ہوتا تھا۔ اِس طرح فاصلہ مختصر ہو گیا۔

وہ بڑی تعداد میں باہر بکھرے ہوئے تھے۔ چھاگلا تیز قدموں سے آگے چلا گیا تھا۔ ہم سے پہلے دربان کے پاس جا کے اُس نے صدر دروازے کا بغلی دروازہ کھولنے کا اشارہ کیا۔ ہم پر نظر پڑتے ہی یکا یک شور اُٹھا، لیکن چھاگلا کی بروقت مداخلت سے بھِن بھِناہٹ میں تبدیل ہو گیا۔ دروازہ کھلنے پر ہمیں جگہ دینے کے لیے وہ پیچھے ہٹنے لگے اور چھاگلا کی تقلید میں اُور بہت سوں نے ہاتھ اُٹھا اُٹھا کے لوگوں کو خاموش رہنے کی تلقین شروع کر دی۔

اِتنے قریب جانے پر اُن کے چہرے نمایاں ہو گئے اور یہ

میرے ہوش و حواس کی کوئی آزمائش تھی۔ اُستاد میدا، برجو دادا اور اُن کے معتمد ساتھیوں کے درمیان جامو اور زورا بھی موجود تھے۔ پہلے جامو نے مجھے دیکھا، پھر زورا نے، اور وہ اُچھلنے لگا۔ جیسے ہی ہم دروازے سے باہر نکلے، وہ بیچ میں کھڑے لوگوں کو ہٹاتا دیوانہ وار پاس آ کے مجھ سے چمٹ گیا اور میرے سینے سے سر رگڑنے لگا۔ اِدھر جامو نے مجھے پہلو سے دبوچ لیا۔ چند لمحوں تک میں خود سے بیگانہ سا رہا۔ میری آنکھیں جلنے لگیں اور جی چاہا، اپنا سارا وجود اُن کے حوالے کر دوں، میں بے اختیار ہو جاؤں۔ اِسی دوران میری نظر ڈاکٹر رائے پر گئی، اور مجھے اپنے آپ کو پھر سمیٹنا اور باندھنا پڑا۔ میں نے جکڑی ہوئی آواز میں اُن سے کہا۔ ”ڈاکٹر صاحب... ڈاکٹر رائے... اسپتال کے سب سے بڑے ڈاکٹر۔“

اُن دونوں نے مجھے چھوڑ دیا اور سٹ پٹاتے ہوئے ڈاکٹر کو سلام کیا۔

”اُستاد کیسے ہیں۔“ جامو نے بے تابی سے پوچھا۔

”ٹھیک ہیں اَب۔“ یہ بتاتے ہوئے میری آواز حلق میں پھنس گئی۔ میرے تو دست و بازو، سارا جسم ہی دُکھنے، ڈھیر ہونے لگا تھا۔

اِتنے میں اُستاد میدا، برجو دادا میرے سامنے آ گئے۔ دونوں کے ہاتھ جڑے ہوئے تھے، اور شکل و صورت سے سرگردانی جھلک رہی تھی۔ میدا نے خیال رکھا۔ پہلے ڈاکٹر کے پانو چھوئے، پھر میرے پیر پکڑ لیے۔ ”ہمرے کو ماپھی دے دیو اُستاد!“

مجھے حیرت ہوئی، وہ بلک رہا تھا، میں نے اُس کے شانے پکڑ کے اُسے پیروں سے اُٹھایا، لیکن وہ اپنے بال نوچنے کھسوٹنے اور پیشانی کوٹنے لگا۔ میں نے اُسے روکا تو وہ بے طرح میرے سینے سے لگ گیا۔ ”ہمرے کو کچھ پتا ناہیں تھا لاڈلے بابو، کون سامنے ہے، اپنا متھا ہی پھر گیو تھا، کچھ پوچھا، نہ جانا، ایسے کون سینہ تان کے اپنے سامنے آ سکت ہے۔ اُستاد ٹھل کا لاڈلا ہی ہوئے گا، کوئی

ایسو۔ اندھا بن گیو تھا ہم... اور تم... تم بھی تو کچھ ناہیں بولے... اُستاد ٹھل اپنے شہر میں ہو اور ہمرے کو بالکل کھبر ناہیں... کیسو گھور پاپ ہو گیو ہمرے سے۔“ میدا کا حال دِگر تھا۔

جامو نے اُسے کھینچ کے میرے پاس سے ہٹایا۔ میدا، برجو، زورا اور جانے کون کون، وہ سبھی اپنی اپنی بولیاں بول رہے تھے، اور اُدھر ڈاکٹر رائے موجود تھا۔ میرا دماغ ہی معطل ہو گیا تھا، کس طرف دیکھوں، کس کی سنوں اور کسے کیا جواب دوں۔ ہجوم میں ہر شخص ہم سے قریب ہونے کی کوشش کر رہا تھا اور دھکم پیل سی ہونے لگی تھی۔ میں نے بے چارگی سے ڈاکٹر کی طرف دیکھا، وہ ذہین و فطین آدمی لمحوں میں ساری صورتِ حال سمجھ گیا۔ اُس نے پہلو میں کھڑے چھاگلا کو سرگوشی میں کوئی ہدایت کی۔ ایک ثانیے کی تاخیر کیے بغیر چھاگلا نے میدا کے بجائے عمر رسیدہ برجو کا بازو تھام کے اُسے ڈاکٹر رائے کا حکم منتقل کر دیا۔

جواب میں برجو منّت سماجت کرنے لگا۔ ”سارے اُستاد ٹھل کے درشن وسطے آیو ہیں مہاراج۔“

”وہ یہاں نہیں آ سکتا۔“ ڈاکٹر رائے نے درشتی سے کہا۔ ”نہ اُس کے کمرے میں اِتنے لوگوں کو جانے کی اجازت دی جا سکتی ہے۔“

ناچار برجو دادا نے دربان کی کرسی پر کھڑے ہو کے ہجوم کو واپس چلے جانے کی تاکید کی۔ ”بڑے ڈاکٹر ساب کا حکم ناہیں ہے بھیا، ابھی اُستاد ٹھل باہر نا آ سکت ہیں۔ ڈاکٹر ساب کچھ اور اِنتجار کرنے کو بولے ہیں۔“

ڈاکٹر رائے کے ایما سے چند آدمیوں کو اندر جانے کی اجازت دے دی گئی۔

خلافِ توقع ڈاکٹر پھر وہاں نہیں ٹھہرا۔ میرا شانہ تھپک کے وہ تنہا واپس ہو گیا۔ میں نے کچھ کہنا چاہا، لیکن مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ کیا کہنا چاہیے۔ چھاگلا نے پھرتی سے کام لیا۔ دربان اور اردگرد کھڑے سپاہیوں نے میرے اور چھاگلا کے علاوہ آٹھ آدمیوں کو اسپتال کی چار دیواری میں داخل کر دینے کے بعد دروازہ بند کر دیا، اندر ہمارے قدم رکھتے ہی ہجوم کی گونج تیز ہو گئی تھی، لیکن ہم اُن سے دُور ہوتے گئے، زورا اور میدا میرے دونوں بازو جکڑے جیسے مجھ میں پیوست ہوئے جاتے تھے۔ سبزہ زار کے بیچ میں تنگ راستے پر چلتے ہوئے ہم مرکزی عمارت

میں آ گئے۔ میدا کے ساتھ کیلے کے تازہ پتوں سے ڈھکی اور کلاوے سے بندھی ٹوکریاں سر پر اُٹھائے تین اور آدمی بھی تھے۔ ڈاکٹر رائے کے کمرے سے کچھ فاصلے پر ایک بڑے صاف ستھرے اور روشن کمرے میں چھاگلا ہمیں لے آیا۔ کمرے کے دو اطراف دیواروں کے ساتھ صوفے لگے ہوئے تھے اور ایک گوشے میں بڑی گول میز اور اُس کے گرد درجن بھر کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ ٹوکریاں میز پر رکھ کے تینوں آدمی باہر چلے گئے۔ کمرے میں میرے اور چھاگلا کے علاوہ صرف پانچ ہی افراد رہ گئے۔ زورا، جامو، میدا، برجو اور ایک پختہ کار آدمی، جو کل بھی میدا کے ساتھ اسپتال آیا تھا اور جس کا نام مجھے یاد نہیں رہا تھا۔ چھاگلا کی درخواست پر جھجکتے ہوئے وہ پانچوں صوفوں پر بیٹھ گئے۔ میدا اور جامو میرے دائیں بائیں بیٹھے۔ چھاگلا نے مجھ سے کسی خدمت کے لیے پوچھا۔ میں کیا کہتا، مجھے تو اُس کا شکریہ ادا کرنے کا بھی یارا نہیں تھا۔ میرے بجائے اُن سب نے انکار کر دیا، پھر چھاگلا بھی کمرے میں نہیں رُکا۔

کچھ دیر خاموشی رہی، جیسے اُن کے پاس کوئی موضوع ہی نہ رہا ہو، یا پھر احوال بے شمار اور کثرتِ ماجرا اور ناگفتنی کو گفتنی کرنے کی فکر میں بات شروع کرنی مشکل ہو جاتی ہے۔

”کیا ہوا تھا اُستاد کو؟“ جامو نے بوجھل آواز میں پہل کی۔

پھر تو اُن میں سے کسی کو قرار نہیں رہا۔ ایک چپ نہیں ہوتا تھا کہ دوسرا بول پڑتا۔ وہ سارے وضاحتیں، صراحتیں اور تاویلیں کرتے رہے۔ جو گزر چکا تھا، اُس کا ملال، اُس کا تیقن۔ اکبر علی خاں کے دونوں تار کلکتے پہنچ گئے تھے۔ اڈّے پر نہ جامو تھا، نہ زورا اور جمرو۔ وہ تینوں اڈّے کے چند اَور ساتھیوں کے ہم راہ اُستاد سامی بابو کی ناگہاں موت پر کھلنا گئے ہوئے تھے۔ سامی بابو کے آبا و اجداد آسام سے آ کے کھلنا شہر میں بس گئے تھے۔ آسام کی نسبت سے سب اُسے سامی کہتے ہیں، میں بھی اُسے خوب جانتا تھا، ہاتھ کا بڑا صاف، جی داری میں یکتا، ٹھل کا مقربِ خاص تھا۔ ایک زمانے سے کلکتے کے اڈّے سے وابستہ تھا۔ جامو کے کہنے کے مطابق ماں کی موت کی خبر ملنے پر عرصے بعد سامی بابو کھلنا گیا تھا کہ وہاں کسی سے لڑائی جھگڑے میں مارا گیا۔ جامو، جمرو، زورا وغیرہ کو تیسرے چوتھے روز کلکتے واپس آ جانا تھا۔ اڈّے پر سبھی آج کل میں اُن کی واپسی کے منتظر تھے، مگر اپنے اڈّے کے آدمی کے خون کا حساب صاف کیے بغیر، صرف آنسو بہا کر انھیں واپس نہیں آنا چاہیے تھا۔ کھلنا میں ابھی ایک دو روز اُنھیں اَور ٹھیرنا تھا۔ کلکتے کے اڈّے والوں نے ایک دن اَور اُن کی راہ دیکھی، پھر ہرکارہ بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ ہرکارے کے پہنچتے ہی جامو، جمرو، زورا وغیرہ نے سب کچھ اَدھورا چھوڑ کے فوراً کلکتے روانگی کا قصد کیا۔ شدید بارشوں نے راستے مسدود کر دیے تھے۔ بہر حال، کسی نہ کسی طرح وہ کلکتے پہنچے اور لباس کی تبدیلی کے لیے کچھ دیر اڈّے ٹھیر کے پہلی گاڑی سے پٹنے روانہ ہو گئے۔

بارشوں کی وجہ سے گاڑی کی رفتار سُست تھی۔ تین گھنٹے تاخیر سے پہنچی۔ رات 9 بجے پٹنا اسٹیشن اُتر کے اُنھوں نے سیدھے گرانڈ ہوٹل کا رُخ کیا۔ تار میں اُسی ہوٹل کا پتا مندرج تھا۔ اسٹیشن سے باہر آتے ہی اُن کا ماتھا ٹھنکا تھا، راہ گیروں کی تعداد کم، دکانیں بند، پولیس کا گشت اور سناٹا سا، تھوڑی بہت تانگے والے سے اُنھوں نے سُن گُن لی۔ ابھی وہ کچھ اَور جاننے بُوجھنے کی ٹوہ میں تھے کہ پولیس نے تانگا روک لیا، اُنھوں نے احتیاط کی کہ ہوٹل کے بجائے اپنی منزل میدا کا اڈّا بتائی۔ پولیس اُنھیں تھانے لے گئی۔ رات گئے مختلف افسران اُن سے سوالات کرتے، دھمکیاں دیتے اور پولیس والوں کی طرح پیش آتے رہے۔ اُن کی تلاشی لی گئی۔ دونوں کی جیبوں

سے جاقو برآمد ہوئے، لیکن یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی۔ وہ پہلے ہی بتا چکے تھے کہ اُن کا تعلق کلکتے کے اڈّے سے ہے۔ احتیاطاً اُنھوں نے میرا اور بھَل کا کوئی حوالہ نہیں دیا، کیوں کہ تار میں طلبی کی وجہ کا ذکر نہیں تھا، اور اب شہر کے حالات کے پس منظر میں وہ یہ نتیجہ اخذ کر سکتے تھے کہ اِس اچانک طلبی کی وجہ سنگین ہی ہو سکتی ہے۔ بڑی بحث و تکرار اور سفر کے دوران بعض شہادتوں کی تصدیق کے بعد پولیس کو یقین آ گیا کہ واقعی وہ کلکتے سے تازہ تازہ آئے ہیں اور گزشتہ دنوں شہر میں ہونے والے خوں ریز واقعات میں ملوث نہیں ہیں۔ پولیس نے میدا سے رابطہ کیا تو وہ خود تھانے پہنچ گیا اور اُس نے اپنی ضمانت پر دونوں کو پولیس سے نجات دلائی۔

جامو کے بہ قول، میدا اور اُس کے ساتھی اِس انکشاف پر ششدر رہ گئے کہ جامو اور زورا تو بھَل کے بلاوے پر یہاں آئے ہیں۔ گویا بھَل پہنچے ہیں، گرانڈ ہوٹل میں موجود ہے۔ جامو اور زورا کو ساتھ لے کر میدا اُسی وقت ہوٹل پہنچا۔ وہاں اُنھیں معلوم ہوا کہ بھَل تو کئی دن سے اسپتال میں ہے۔

رات بہت گزر چکی تھی۔ ہوٹل سے وہ اسپتال گئے، لیکن اُن کا اندر جانا ممکن نہ ہو سکا۔ اسپتال سکوت میں ڈوبا ہوا تھا، اور بڑی تعداد میں پولیس پہرا دے رہی تھی۔

زنجیر کی کڑیاں پھر ملتی ہی گئیں۔ میدا کہہ رہا تھا، اُس پر تو قیامت گزر گئی: جو نوجوان اُس کے اڈّے پر اِس دیدہ دلیری سے آیا تھا، کوئی اور نہیں، اُستاد بھَل کا 'لاڈلا' تھا۔ وہ نوجوان، جس کی وجہ سے بھَل عملاً اڈّے سے دست بردار ہو گیا ہے، اور شہروں شہروں اُسی کے ساتھ گھومتا رہتا ہے۔ بر جوودا نے بتایا کہ رات بھر میدا تڑپتا، بلکتا رہا، وہ کیسا بدبخت ہے، اُستاد بھَل بیماری کی حالت میں اُس کے شہر میں موجود ہو، اور اُسے خبر نہ ہو پائے۔ صبح ہوتے ہی اُس نے اپنے ذرائع سے بھَل کی خیر خبر حاصل کی اور یہ جان کے چین نصیب ہوا کہ بھَل رُو بہ صحت ہے اور آج صبح اُس نے کچھ دیر چہل قدمی بھی کی ہے۔

کسی ردّ و قدح کے بغیر میدا اعتراف کر رہا تھا کہ اُس نے اور بر جوودا نے مبارزت ملتوی کرنے کا فیصلہ خوب سوچ سمجھ کر کیا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ اپنے اڈّے پر بلائے ناگہانی کی طرح وارد ہونے والے نوجوان کے عزم و ہمت سے وہ سحر زدہ ہو چکا تھا۔ اُس وقت یہی ایک تدبیر قرینِ مصلحت تھی کہ کوئی خطرہ مول نہ لیا جائے اور کسی طور یہ وقت ٹال دیا جائے، اور مبارزت کے التوا کے بعد ملنے والی مہلت کے دوران نیم پاگل نوجوان کے کوائف کے بارے میں آگہی حاصل کی جائے۔ اب اُسے احساس ہو رہا ہے، وہ مبارزت پر آمادہ ہو جاتا تو نتیجے میں کیسی ذلّت کا سامنا کرنا پڑتا۔

یہ اتفاق ہے کہ اُسے مجھ سے ملنے کا موقع بھی نہ مل سکا تھا، لیکن وہ مجھ سے اچھی طرح واقف تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ میں بھَل کا مقرّب اور تربیت یافتہ ہوں۔ میری نگاہ کی تیزی، بازوؤں کے بَل اور چاقو پر دست رس کی بڑی دھوم ہے۔ میں نے بمبئی کے کئی پاڑوں کے داداؤں کو یکے بعد دیگرے بے دخل کر دیا تھا۔ حیدرآباد اور جانے کہاں کہاں اڈّوں پر قبضے کے واقعات اُس کے علم میں تھے، اور یہ بھی کہ سات سال جیل میں مَیں نے تعلیمی سلسلہ جاری رکھا تھا، اڈّے پر جب میں نے کسی موقع پر اکبر علی خاں کو مداخلت سے باز رہنے کے لیے ٹوکا تھا تو اُسے میری انگریزی دانی پر حیرت ہوئی تھی، لیکن اُس کی عقل خبط ہو چکی تھی، اُسے ذرا بھی شک نہیں گزرا کہ میں بھَل کا لاڈلا، لاڈلا اُستاد ہو سکتا ہوں۔ ایک ذرا چھو جانے کی حد تک یہ گمان اُس کے دماغ میں دَر آتا تو ساری صورتِ حال بدلی ہوئی ہوتی۔ میدا اور اُس کے ساتھی گزشتہ رات ماتم کرتے رہے کہ پھر پے در پے یہ سانحے رُونما ہوتے۔

اڈّے کے وہ چند آدمی بُری طرح مشتعل تھے کہ ایک اجنبی کی وجہ سے اُن کا عزیز ترین ساتھی دھنوا جدا ہو گیا اور میدا تماشائی بنا رہا۔ اُنھیں قلق تھا کہ چنگل میں آئے اُس اجنبی کو میدا نے اتنی آسانی سے کیوں جانے دیا... وہ پاگل بھی میری حقیقت سے آگاہ ہو جاتے تو اُن کا جنون کبھی اِس انتہا کو نہ پہنچتا۔ میں بھَل کے نام سے وابستہ تھا، اور بھَل اُن کے لیے جتنا واجبِ احترام تھا، اُتنا ہی ہیبت کی علامت بھی۔

میدا کے اعتراف میں کوئی کھوٹ نظر نہیں آتی تھی، کیوں کہ اُس کا تعلق توتنگی سے شاید کبھی نہیں رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ اُسے مجھ سے کوئی دل چسپی تھی نہ میرے بیمار بھائی سے۔ میرے لیے تو عداوت اُس کے دل میں گھر کر چکی تھی۔ پہلے دن، شام کو جو دو پولیس والے سادہ لباس میں مجھ سے ملنے اسپتال آئے تھے، اُن کا تعلق واقعی پولیس سے تھا، لیکن اصل میں وہ

اُس کے فرستادہ تھے۔ اُنھیں بھیج کر وہ میرا عزم جاننا اور میری میزان کرنا چاہتا تھا، اور یہ سن کے اُس کا اضطراب دو چند ہوا کہ میں اپنے ارادے میں اٹل ہوں اور بھائی کی طبیعت ٹھیک ہوتے ہی اپنا چاقو واپس لینے، یعنی میدا سے پنجہ آزمائی کے لیے اڈّے ضرور جاؤں گا، چناں چہ رات کو جب مجھے ختم کرنے کے لیے میدا کے سرد رویّے سے نالاں دھنوا کے جاں نثار ساتھیوں نے اسپتال میں داخل ہونے کی جرأت کی تھی تو میدا کو اُن کے اِس سفاکانہ اقدام پر کسی قدر تسلی ہوئی کہ اُس کے ایما سے نہ سہی، مگر چند لوگ میرے خاتمے کے تو درپے ہیں، اور میدا کا کہنا تھا کہ اُس سے یہی چوک ہو گئی۔ اُس کی خاموشی اور چشم پوشی نے دھنوا کے دوستوں کا حوصلہ مہمیز کیا۔ اُسے کوئی اندازہ نہیں تھا کہ مجھ سے نفرت اور اپنے قہر و غضب میں وہ جنگلی حد سے گزر جائیں گے۔ اُن کے ہاتھ میں نہ آ پایا تھا تو کسی طور پر مجھے زک پہنچانے کے لیے وہ میرے مربی، ایک بے گناہ، غیر متعلق شخص کو نشانہ بنا دیں گے۔

اُس رات اسپتال میں ایک نوجوان انتھونی اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا، لیکن میدا کی نظر میں یہ اِتنا بڑا سانحہ نہیں تھا۔ انتھونی نے خود اپنی موت کو دعوت دی تھی۔ وہ اُن بھاگتے ہوئے لوگوں کے آڑے نہ آ جاتا تو اِس انجام سے دوچار نہ ہوتا۔ بھاگتے ہوئے چور کی راہ میں کوئی رکاوٹ اُسے حیوان بنا دیتی ہے، مگر اکبر علی خاں کس کے آڑے آئے تھے۔ میدا کہہ رہا تھا کہ اُسے اکبر علی خاں کی موت کا بڑا صدمہ ہے، اُنھوں نے کسی کا کیا بگاڑا تھا۔ وہ شہر کے ایک معزز، بڑے نام ور، بہت مہربان آدمی تھے۔ ایسے لوگ تو کم کم پیدا ہوتے ہیں۔ یہ کیا ہو گیا۔ میدا کے بہ قول، اُس کا دماغ ہی پھر پلٹ گیا۔ اُسے اڈّا، اڈّے کی چوکی حقیر لگنے لگی۔ اُسے تو اپنے آپ سے چڑ ہونے لگی تھی۔ اُس نے طے کر لیا تھا کہ اب جو کچھ بھی ہو، وہ اُن تین وحشیوں کو زندہ نہیں رہنے دے گا۔ اِس طرح اکبر علی خاں کی موت کی تلافی تو نہ ہوگی، مگر میدا کو اپنے آپ کو بھی تو کوئی جواب دینا تھا۔ اُسے میری آگ کا بھی احساس تھا کہ بجا طور پر میرا ردِّ عمل اب کتنا شدید ہو سکتا ہے۔ اِس لیے اُس نے کل شام اسپتال آ کر میرا چاقو واپس کر کے اڈّے سے دست برداری کا اعلان کر دیا، اور یہ کوئی اپنے دفاع، اپنی جان بچانے کا کوئی حیلہ و حربہ نہیں تھا۔ وہ اپنے آپ کو ترک کر چکا تھا۔

میدا سے بھَل کا واسطہ کوئی نیا نہیں تھا۔ ایک زمانے میں بھَل کی قدم بوسی کے لیے مہینے ڈیڑھ مہینے بعد کلکتے جانا اُس کا معمول تھا۔ وہ کہہ رہا تھا، بھَل بھی کبھی کبھی پٹنے بہت آیا جایا کرتا تھا۔ بھَل سے میدا نے بہت ہنر سیکھا تھا۔ پٹنے کے اڈّے کی چوکی کا منصب بھی اُسے بھَل کے سائے: بھَل کی تربیت کے طفیل مل پایا تھا۔ اُس کے چوکی سنبھالنے کی رسم ادائی کی تقریب بھَل کی سرپرستی میں ہوئی تھی۔ اب بہت عرصے سے اُس کی ملاقات نہیں ہو پائی تھی، لیکن بھَل سے تو اُس کا رشتہ قلبی اور دائمی ہے۔ اِس دوران بھی وہ کئی بار کلکتے گیا اور اپنے ولی نعمت کے دیدار سے محروم لوٹ آیا۔ بھَل تو کلکتا شہر جیسے بھول ہی گیا ہے۔ بھَل کا نام لیتے ہوئے میدا کا لہجہ محبت و عقیدت سے معمور تھا۔

میں نے کچھ نہیں کہا، کہنے کو اب رہ بھی کیا گیا تھا۔ میری خاموشی پر شاید اُسے گمان ہوا کہ جس صمیم قلب سے اُس نے اپنا احوال بیان کیا ہے، میں نے اُس دردمندی سے نہیں سنا ہے۔ مجھے اُس سے کیا کہنا چاہیے تھا، کہ میرا سینہ بہت بھرا ہوا ہے۔ ہزار نظریں چراؤں، اکبر علی خاں کا چہرہ بار بار سامنے آ جاتا ہے، اور ایک ہُوک سی اُٹھتی ہے، اور کچھ بس میں دکھائی نہیں دیتا تو

انصاف

عدالتوں میں انصاف رائج کرنے کی ایک انوکھی ترکیب کمبوجیہ نامی بادشاہ نے نکالی تھی۔ اُس کے عہد سے پہلے کسی کو یہ ترکیب سوجھی نہ اُس کے بعد کسی کو اِس پر عمل کرنے کی توفیق ہوئی۔ بادشاہِ کمبوجیہ کے حکم کے مطابق بے انصاف اور بے ایمان جج کی کھال بہ طورِ سزا کھینچ لی جاتی۔ چوں کہ یہ کھال یتیم خانے کے کسی مصرف کی نہ ہوتی، اِس لیے اُس سے سرکاری فرنیچر کی پوشش کا کام لیا جاتا۔ جج صاحب کی کھال اُن کی کرسیِ عدالت پر مڑھوا دی جاتی۔ پھر آں جہانی کی جگہ اُس کے بیٹے کا تقرر کیا جاتا تا کہ وہ اُس کرسی پر بیٹھ کر آغوشِ پدر کی گرمی اور انجامِ پدر کی تپش محسوس کرے اور مقدمات کا فیصلہ کرتے وقت انصاف اور صرف انصاف سے کام لے۔

لوحِ ایام از مختار مسعود ❖ تعاون: اشتیاق خان

اپنا وجود ہی زہر لگتا ہے، میدا سے اب کوئی پرخاش رکھنے سے حاصل بھی کیا تھا۔ لوٹ پھیر کے پس ماندگانِ خستگاں کو اِسی ایک سنگ دلانہ قول اور بے رحمانہ ارشاد پر تکیہ کرنا پڑتا ہے کہ جس کی موت جس طرح لکھی ہے، اُسی طرح آئے گی۔

میدا یک لخت اپنی جگہ سے اُٹھ کے میرے سامنے آ کے فرش پر بیٹھ گیا اور اُس نے پہلے کی طرح پھر میرے پیر پکڑ لیے اور گھٹنوں پر سر رکھ کے مچلنے بکھرنے لگا۔ وہ رو رہا تھا۔ اُس کے پاس آنسو تھے، مگر جس کے پاس آنسو بھی نہ رہے ہوں؟ جاموں نے پھر اُسے میرے پاس سے ہٹایا۔

چھاگلا نے یقیناً ڈاکٹر رائے کی ہدایت پر چائے اور دیگر لوازم فراہم کیے تھے۔ خدمت گار مہمانوں کی طرح اُن سب کی خدمت بجالایا تھا۔ وہ بٹھل کو دیکھنے کے لیے بے قرار تھے، اور ڈاکٹر رائے کے عندیے کے بغیر یہ ممکن نہ تھا۔ میں نے خدمت گار سے چھاگلا کو بلانے کے لیے کہا۔ وہ کہیں قریب ہی تھا، جلد ہی پُرتپاک انداز میں حاضر ہو گیا۔ میرے استفسار پر اُس نے بتایا کہ ڈاکٹر رائے مریضوں کے معائنے کے لیے معمول کی گشت پر ہے اور واپس آیا ہی چاہتا ہوگا۔ ہم انتظار کرتے رہے اور اِس درمیان جاموں، برجو دادا، اُس کا ساتھی میدا کی کیفیت کی توثیق و تصدیق کرنے، اور ایک طرح اُس کی وکالت کرنے لگے۔ میدا کو پھر بے کلی سی ہوئی، بھڑکتے لہجے میں خود پر لعن طعن کرنے لگا کہ کل شام وہ سر نگوں جب میرے پاس اپنا چاقو لوٹانے اور اڈّے کی چوکی، اڈّے کے ماحول اور اِس شہر ہی سے ہمیشہ کے لیے نکل جانے کا ارادہ کر کے اسپتال آیا تھا، اور اُس نے اپنے آپ کو میری صواب دید پر چھوڑ دیا تھا کہ جو چاہوں، اُس کے لیے سزا تجویز کر دوں، اُس وقت بھی اُس کی آنکھ نہیں کھلی، اُسے مطلق خیال نہیں آیا کہ یہ فیاضی اور دریادلی تو بٹھل کی کسی نظیر، کسی پرچھائیں ہی کی ہو سکتی ہے جو میں نے اُس سے روا رکھی تھی۔ یہ تو صاف صاف اُس کے آقا بٹھل کے تیور ہیں، یہ تو اُس کا پرتو ہے۔

زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ چھاگلا نے آ کے بتایا، ڈاکٹر رائے واپس آ گیا ہے، اور اپنے کمرے میں میرا منتظر ہے۔ اُن سب کو وہیں چھوڑ کے میں فوراً چھاگلا کے ساتھ کمرے سے باہر آ گیا۔ ڈاکٹر کی نظریں دروازے پر لگی ہوئی تھیں۔ اُس کی اجازت سے میں اُس کے سامنے بیٹھ گیا۔

"ہاں لاڈلے صاحب... راجا... اور بابر اُستاد! کیا حال ہے؟" وہ اینٹھی ہوئی آواز میں بولا۔

"اور بھی ایک دو نام ہیں... ظہیر بھی ایک نام ہے میرا، گھر میں امّی کبھی 'ہیری' اور 'ہیرو' بھی کہہ دیتی تھیں۔" میں نے سرد لہجے میں کہا۔

"ہاں، ہاں، تین ہو سکتے ہیں تو چار پانچ بھی۔"

"کیا ایک شخص کا ایک ہی نام لازم ہے؟"

"نہیں، نہیں، بالکل نہیں۔" وہ تیزی سے بولا، "اُس کی مرضی ہے، نام بدلتا رہے، سو نام رکھ لے، جہاں جائے، نیا نام، اور کوئی نام ہی کیوں رکھے، بے نام ہی رہے۔"

"ناموں میں کیا رکھا ہے جناب!"

اچھا ہوا جو اُس نے موضوع بدل دیا، مُنہ پھُلا کے بولا، "تم بتاؤ، کیوں ملنا چاہتے تھے؟"

"کیا آپ کچھ سننا چاہیں گے؟"

"سنانے کے لیے کیا کچھ نیا ہے؟"

"اتنا نیا تو نہیں، لیکن چوں کہ آپ شامل رہے ہیں... تو شاید دل چسپی کا باعث ہو۔"

"شکر ہے، تشویش کا نہیں کہا تم نے۔"

"مگر مایوسی اور اُداسی سے عاری نہیں۔"

اُس نے سر کو خفیف جنبش دی۔ مجھے معلوم تھا، عمر ڈھل چکی ہے، لیکن وہ پس پا نہیں ہوا ہے۔ اُسے سب کچھ جاننے کی بڑی جُستجو ہوگی۔ وہ صدر دروازے سے واپس چلا آیا تھا، پھر جس کمرے میں چھاگلا نے ہمیں بٹھایا تھا، وہاں بھی موجود نہیں رہا۔ دونوں جگہوں پر اُسے ہونا بھی نہیں چاہیے تھا۔ یہ مرتبہ و مقام بھی دیواروں کی طرح ہوتے ہیں، آدمی کو جکڑے رکھتے ہیں، ڈاکٹر نے خاموشی اختیار کر لی تھی اور بے وجہ نہیں۔ اُسے تردّد ہوگا کہ میں اِدھر اُدھر کی کسی بات میں اُلجھ نہ جاؤں۔ میں نے بھی مدّعا بیان کرنے میں دیر نہیں کی اور مختصراً میدا کے اعترافات کے بارے میں بتایا۔ میں نے کہا، "میدا مسلسل خود کو ملامت کر رہا تھا کہ اتنی جرأتیں دیکھتے ہوئے اُسے کسی لمحے بٹھل بھائی اور میرا خیال آنا چاہیے تھا۔ کاش کہ ایسا ہوتا، کچھ میری بھی کوتاہی تھی۔ اُس کے اڈّے پر جا کے اُسے زچ کرنے کے لیے میں نے دانستہ بڑی بڑی باتیں کی تھیں۔ اِنھی دعووں سے وہ متزلزل ہو گیا تھا۔ کہیں اگر بٹھل بھائی سے اپنی وابستگی، اُن کا نام میری زبان سے ادا ہو جاتا، کوئی ایک اشارہ بھی، لیکن جانے کیوں میرے سان و گمان میں نہیں تھا کہ بٹھل سے میدا کا اتنا گہرا ربط ضبط ہو سکتا ہے۔ وہ اِسی کا ماتم کر رہا تھا کہ بٹھل کا تو نام سن کے وہ تینوں پاگل بھی ٹھنڈے پڑ جاتے۔ اُنھیں اچھی طرح علم تھا کہ بٹھل بھائی کون ہیں۔"

"کیا بہت بڑا اُستاد ہے تمھارا بھائی؟ وہ کیا کہتے ہیں، مُنہ بولا بھائی۔"

"معاف کیجیے، مُنہ بولا کہہ کے آپ میرے اُس کے تعلق کا درجہ گھٹا رہے ہیں۔ میں نے آپ سے پہلے بھی کہا تھا کہ میرے اُس کے..."

"یاد آیا۔ تم نے یہی کچھ کہا تھا۔" اُس نے میری آواز کی تپش پر توجہ نہیں دی اور بڑبڑاتے ہوئے بولا، "ٹھیک ہے۔"

"اور وہ صرف کسی اڈّے، یا اڈّوں کے اُستاد نہیں، ایک بہت مختلف آدمی ہیں۔ میں آپ سے کیا کہوں، اُن جیسا مشکل سے کوئی ہوتا ہے۔"

"ہُوں، اُوں... واقعی!" وہ دیدے گھماتے ہوئے بولا۔

اُس کا مضحک انداز میں نے بہ جبر نظر انداز کیا۔ اُسے کچھ میری بے لطفی و دل گیری کا احساس ہوا اور اُس نے لہجے میں نرمی پیدا کی۔ "بہ ہر حال کم ہوتا ہے ایسا۔ یہ یگانگت قابلِ رشک ہے۔ مجھے بتاؤ، اب میدا کیا چاہتا ہے؟ تمھارے بھائی سے ملنا؟"

"جی ہاں۔"

"ٹھیک ہے، مگر بہتر ہوگا، وہ زیادہ دیر وہاں نہ ٹھیرے اور گزرے ہوئے واقعات کی کوئی بات نہ کرے۔"

"ظاہر ہے، وہ ایسا نہیں کرے گا، اور اُسے تنبیہ بھی کر دی جائے گی۔ اڈّے کی چوکی پر بیٹھا آدمی عام آدمی نہیں ہوتا۔"

"بہت خاص ہوتا ہے کیا؟"

"خاص نہیں ہوتا تو اڈّے کی چوکی پر تا دیر تک بھی نہیں سکتا۔"

"اُس سے کہہ دینا، کوئی شور شرابا نہیں۔"

"وہ بھی سمجھتا ہے، یہ کون سی جگہ ہے۔" میں اُٹھ گیا اور دروازے سے نکلتے نکلتے بے ارادہ میرے قدم رُک گئے، کچھ تامّل کے بعد میں نے پلٹ کے ہچکچاتے ہوئے کہا، "آپ کے لہجے سے کچھ بیزاری اور ناپسندیدگی محسوس ہو رہی ہے، مگر میں کیا کروں، یہی کچھ ہے۔ مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے آپ نے میرے بارے میں نظرِ ثانی کی ہو۔"

ایک پَل کے سکوت کے بعد وہ کرسی پر اُچھل سا گیا۔ "نہیں نہیں، مجھے تو تم اور دل چسپ اور عجیب لگ رہے ہو۔" وہ زور دے کے بولا۔

میری آنکھوں کو کیا ہو گیا تھا۔ ذرا ذرا سی بات پر جلنے لگی تھیں۔ دوسرے لمحے میں کمرے سے چلا آیا۔

اُن کی درخواست پر چھاگلا نے اسپتال کے تین ملازموں کا انتظام کر دیا۔ تینوں نے ٹوکریاں سروں پر اُٹھا لیں۔ زورا، جاموں، میدا، برجو دادا اور اُن کا ساتھی راہ داریوں، وارڈوں اور جگہ جگہ تعینات سپاہیوں کے سامنے سے گزرتے ہوئے بٹھل کے کمرے تک آ گئے۔ سارے راستے زورا نے میرا پنچہ پکڑ رکھا تھا اور قدم سے قدم ملا کے چلتا رہا تھا، جیسے میرا جزو بن جانا، مجھ میں سما جانا چاہتا ہو۔ اُس کے جسم کی لپک، ہاتھ کی گرمی مجھ سے ہم کلام رہی، اپنی وارفتگی اور شدّتوں کا اظہار کرتی رہی۔ اُنھیں کمرے کے باہر روک کے میں نے جھانک کے اندر دیکھا۔ بٹھل بستر پر بیٹھا ہوا تھا، سینے کے آگے چھوٹی میز لگی ہوئی تھی اور وہ اپنے ہاتھ سے کھانا کھا رہا تھا۔ سیورین بستر کے کنارے بیٹھی اُس کی نگرانی کر رہی تھی۔ میں نے اُن سے کچھ توقف کے

لیے کہا اور توقف کی وجہ بھی بتائی۔ وہ کمرے کے دروازے کے ساتھ دم سادھے کھڑے رہے۔ ہیجان اُن کے چہروں سے عیاں تھا۔ اُنھیں باہر ہی ٹھیرا کے کچھ دیر بعد میں نے آہستگی سے کمرے میں قدم رکھا۔ بھُٹل اور سیورین چونک سے پڑے۔

"کدھری تھا رے؟" بھُٹل نے شکایتی لہجے میں پوچھا۔

"یہیں تھا، ڈاکٹر صاحب کے پاس۔" میں نے سادگی سے بتانے کی کوشش کی۔ سیورین نے کچھ نہیں کہا، لیکن اس کی نظریں میرے چہرے پر تنکوں کی طرح چبھتی رہیں۔ اسپتال کے ملازموں کے ذریعے اُسے لمحے لمحے کی خبر ملتی رہی ہوگی۔ ایک بڑا ہجوم اسپتال کے باہر دوسری بار جمع ہوا تھا۔ یہ ایک خلافِ معمول واقعہ تھا۔ اسپتال کے ہر فرد کو مضطرب ہونا چاہیے تھا کہ وہ شہر کے اڈّے کے آدمی تھے، بھتّہ، چھٹ، چاقو باز...

بھُٹل نے کھانا ختم کر لیا اور گلاس بھر پانی پی لیا تو میں نے پوچھا، "طبیعت بہتر ہے نا؟"

اُس نے مایوسی سے کہا، "بستر پہ ہوں۔"

"کچھ وقت کی بات ہے۔" میں نے بے پروائی ظاہر کی۔

"کچھ بات ہوئی ڈاکٹر سے؟"

"کیسی بات؟... مطمئن ہیں وہ۔"

"دِن کا پوچھتا ہوں۔"

ابھی صبح تو اسی بات پر اس سے چیں چیں ہوئی تھی۔ وہ پھر وہی رٹ لگا رہا تھا۔ "میں نے نہیں معلوم کیا۔" میں نے صاف کہا، "وہ کیوں روکیں گے زیادہ، جب سمجھیں گے، خود ہی بتا دیں گے۔"

اُس کی پیشانی پر انتشار کے آثار نمودار ہوئے، لیکن وہ چپ رہا۔

"کوئی تم سے ملنے آیا ہے۔" موقع دیکھ کے میں نے دھیرے سے کہا۔ قریب موجود سیورین، بھُٹل سے زیادہ متعجب ہوئی، چونکتی سی ہوگئی۔

"کون...؟ کون ہے رے؟" بھُٹل کا دماغ خوب کام کر رہا تھا۔ میرے لیے یہ طمانیت کی علامت تھی۔ ناک چڑھا کے کہنے لگا، "آ گئے حرام کے..."

"ہاں، لیکن کوئی اور بھی ہے۔"

"پلیا تو نہیں ہے؟" وہ بُری طرح تلملا گیا۔

میں نے سیورین کو اشارہ کیا کہ وہ باہر کھڑے لوگوں
اندر لے آئے۔

وہ منظر دیدنی تھا، کاش ڈاکٹر راے بھی موجود ہوتا اور
آدمی سے آدمی کا رشتہ کیسا ہوتا، کیسا ہو سکتا ہے۔ اُنھوں
بھُٹل کا پلنگ گھیر لیا۔ کوئی اُس کے ہاتھ چومتا، کوئی پیر پکڑتا
پیروں پر سر رکھتا۔ اُنھوں نے بھُٹل کا بستر پھولوں سے بھر دیا
میدا کا تو بُرا حال تھا، جنون سا طاری تھا اُس پر۔ "کا ہے اُستاد
ایسا کا کسور ہو گیو ہمرے سے۔ اتّے دن سے اِدھری ہو، ہم کو ہی پتا نا ہیں۔ تم کو تو سیدھے ہمرے پاس، اپنے داس کے پاس آنا چاہیے تھا۔" اُن میں صرف جامو ہی کسی حد تک تھما ہوا تھا۔ بھُٹل کو سلام کر کے اور اُس کے سینے سے لگ کے میرے پاس آ کھڑا ہوا۔ کمرے میں ہر طرف پھولوں کی پتیاں بکھر گئی تھیں۔ بھُٹل ہر ایک سے حال پوچھتا رہا۔ گلے شکوے، تشفیاں، تسلیاں، دُعائیں، تمنائیں، ہر کوئی حکم سننے کا آرزومند۔ اُن کا بس نہیں چل رہا تھا کہ بھُٹل کو اُٹھا کے کھڑا کر دیں، اُس کی ساری تکلیف اپنے اندر جذب کر لیں۔ دیر ہوگئی تو میں نے جامو کو ٹوکا کہ اتنا ہی کافی ہے۔ مجھے خدشہ تھا، اپنے تجسس میں ڈاکٹر راے آ گیا تو کمرے کا حال دیکھ کے بہت ناراض ہوگا۔

جامو نے سب کو وہاں سے ہٹا دیا۔ سیورین بھی پھیلی پھیلی آنکھوں سے اُن کی بے قراریاں دیکھتی رہی تھی۔ میں نے فرش پر پڑی ہوئی پتیاں سمیٹنے کی کوشش کی تو بھی میرا ہاتھ بٹانے لگے۔ شاخ سے جدا ہو کے پھول کیسا بکھر جاتا ہے، بے وجود ہی ہو جاتا ہے، کیوں کہ وجود تو انضباط سے عبارت ہے۔ ہم نے بہ عجلت بھُٹل کے بستر سے پتیاں چن لی تھیں۔ اُدھر سیورین کمرا صاف کرنے والی ملازمہ لے آئی۔ منٹوں میں اُس نے فرش پہلے جیسا کر دیا۔ اور وہی ہوا، جس کا مجھے دھڑکا لگا ہوا تھا۔ ملازمہ کمرا صاف کر کے گئی تھی کہ کسی نے آ کے ڈاکٹر راے کے آنے کی اطلاع دی۔ میں نے اُن سے منت کی کہ اب وہ سارے کمرے سے چلے جائیں۔ کوئی بھی جانا نہیں چاہتا تھا۔ بھُٹل کی مرضی بھی نہیں تھی۔ اس میں کچھ وقت صرف ہو گیا، اور ڈاکٹر راے دو مددگار ڈاکٹروں، ایک معمر نرس کے ساتھ کمرے میں داخل ہو گیا۔ سب نے سٹ پٹاتے ہوئے اُسے سلام کیا، اور ڈاکٹر کو کچھ کہنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ بھُٹل کے پیر چھو کے وہ بھی

کمرے سے چلے گئے۔ میں بھی اُن کے پیچھے باہر آ گیا۔
ڈاکٹر زیادہ وقت اندر نہیں ٹھیرا۔ وہ سارے کمرے کے باہر سبزہ زار کے فرش پر بیٹھ گئے تھے۔ ڈاکٹر کو دیکھتے ہی اُٹھ کھڑے ہوئے، ہاتھ باندھے اور سر جھکائے ہوئے۔ ڈاکٹر اُن کے پاس ہی آ گیا اور لمحوں تک کچھ سوچتا اور جلتی بجھتی نظروں سے اُنھیں دیکھتا رہا۔ اُس کا چہرہ کبھی تمتما اُٹھتا، کبھی ماند پڑ جاتا۔ وہ مجھ سے مسلسل انگریزی میں بات کرتا تھا، لیکن اُس وقت خاصی بے اعتنائی سے ہندستانی میں مخاطب ہوا۔ ''آج اتنا ہی... سمجھے... ابھی اِسے آرام چاہیے۔''
اِس مختصر کلام کے بعد اُسے چلے جانا چاہیے تھا کہ اُس کے ساتھی ڈاکٹر منتظر کھڑے تھے۔ وہ موجود رہا۔ میں نے مناسب جانا کہ زورا اور جامو کی طرف انگلی اُٹھائی۔ ''یہ دونوں کلکتے سے آئے ہیں۔''

وہ ایک بیدار مغز، دقیقہ رس شخص تھا، میرا مدعا بھانپ گیا۔ ''دِن میں تمھارے ساتھ صرف ایک ہی آدمی یہاں ٹھیر سکتا ہے، رات کو صرف تمھی۔'' اُس نے جیسے کوئی حکم صادر کیا، اور فوراً ہی وضاحت کی۔

''ملاقات کے اوقات میں کوئی پابندی نہیں، لیکن زیادہ لوگ بالکل نہیں۔'' یہ کہتے ہی وہ چل پڑا تھا کہ پھر رُک گیا اور میرے عین مقابل ہو کے سرد لہجے میں بولا، ''اُستاد میدا سے کہو، اُسے وکیل صاحب کے خون کا بڑا ملال ہے، اور اُس نے اُن کے قاتلوں کو ختم کر کے قرض چکا دیا، اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لیا ہے، مگر ابھی وہ خود تو موجود ہے۔''
''جی، جی ہاں۔'' میں نے بوکھلا کے کہا اور میری نگاہیں میدا کی طرف اُٹھ گئیں۔ میدا کا جسم اکڑ گیا۔
''وہ بھی کچھ کم ذمے دار نہیں۔'' ڈاکٹر کی گھٹی ہوئی آواز میں بڑی ترشی اور تلخی تھی۔ میں کیا جواب دیتا، گنگ کھڑا رہا۔
پھر وہ بھی وہاں نہیں ٹھیرا۔
ڈاکٹر کے جاتے ہی میدا نے پاس آ کے میرا بازو پکڑ لیا اور بے تابی سے پوچھنے لگا، ''ڈاکٹر صاحب ہمرے بارے میں کا گٹ پٹ کیو تھے، بھیا؟''
''نہیں نہیں، کچھ نہیں۔'' میں نے گڑبڑا کے کہا۔
''ہمرا نام تو لیو تھے بھیا؟''
''بولتے تھے، اُستاد میدا سے کہو، وہ اسپتال کے باہر اتنے لوگ لے کے نہ آیا کرے، اپنے آدمیوں کو باندھ کے رکھے۔'' اُس وقت یہی ایک حیلہ میری سمجھ میں آیا۔ میدا تذبذب سے سر ہلانے لگا۔ میرے جواب سے صاف لگتا تھا، اُس کی تشفی نہیں ہوئی تھی۔

زورا کی خواہش تھی کہ اسپتال میں وہی میرے ساتھ رہے۔ جامو نے اُس کا لحاظ کیا۔ میدا، برجو دادا، اُن کا تیسرا ساتھی اور جامو واپس چلے گئے۔ کمرے میں ایک نظر جھانک کے ہم دونوں دروازے کے قریب کرسیاں ڈلوا کے بیٹھ گئے۔
زورا کے پاس حالِ دل بیان کرنے کے لیے ایک انبار تھا۔ سلما کو فیض آباد چھوڑ کے اور کچھ عرصے وہاں قیام کر کے وہ اور جمرو کلکتے چلے گئے تھے۔ کہتا تھا، فیض آباد سے نکلنے کو جی ہی نہیں کرتا تھا، مگر جمرو کی وجہ سے اُسے جانا پڑا۔ اُس نے طے کر لیا تھا، بھِتّل سے منت کر کے وہ مستقل طور پر فیض آباد رہنے کی اجازت لے لے گا اور زندگی حویلی کی نذر کر دے گا۔ کلکتے میں سبھی نے اُس کا خیال رکھا تھا، مگر اُس کا دل فیض آباد میں اٹکا ہوا تھا، جہاں زرّیں تھی جس کے پاس بہت چھا تو سے۔ کہہ رہا تھا کہ بیش تر وہ فیض آباد کے اڈّے ہی پر رہا تھا، لیکن روز شام کو حویلی جاتا تھا۔ زرّیں اُسے روک لیتی اور رات کا کھانا کھلائے بغیر جانے نہیں دیتی۔ دوپہر کو بھی وہ اُس کے اور جمرو وغیرہ کے لیے اتنا کھانا اڈّے بھیج دیتی کہ کئی لوگ سیر ہو کر کھاتے۔ زرّیں کے پاس جا کے اُسے لگتا تھا جیسے اُس کی کھوئی ہوئی ماں اور بہن مل گئی ہیں۔
پہلی بار زورا نے مجھے اپنے بارے میں بتایا کہ کبھی بڑودا شہر میں اُس کا گھر تھا۔ اُس کی ایک بہن نرمل اُس سے کوئی آٹھ نو برس بڑی تھی۔ پندرہ سال کی ہوئی تو ایک دن اُس کا شرابی جواری باپ بیٹی کو گھر سے لے گیا۔ واپس آیا تو بیٹی ساتھ نہیں تھی۔ ماں نے بہت دُہائیاں دیں، باپ نے کچھ اتا پتا نہیں دیا۔ بیٹی کی تلاش میں ایک روز ماں گھر سے نکل گئی اور کبھی واپس نہیں آئی۔ اُس وقت زورا کی عمر سات آٹھ برس تھی۔ باپ دن بھر شراب میں ڈوبا رہتا۔ پھر زورا بھی گھر سے نکل کھڑا ہوا اور بے ٹکٹ سفر کرنے پر پکڑا گیا۔ حوالات میں سپاہیوں نے اُس سے بڑی زیادتیاں کیں۔ نئے بھرتی ہونے والے کسی نوجوان افسر کو اُس پر ترس آیا

اور کہیں زورا کی جان چھوٹ پائی۔ پھر وہ واپس گھر نہیں گیا، دوبارہ بے ٹکٹ گاڑی میں سوار ہوا، اِس بار بچ رہا اور بمبئی پہنچ گیا۔ بمبئی میں ٹھوکریں کھاتا، اذیتیں سہتا رہا۔ بمبئی شہر کسی پناہ گاہ اور کمین گاہ کی طرح ہے۔ ہر ایک کو اپنے دامن میں سمو لیتا ہے۔ زورا نے ماں بہن کی تلاش جاری رکھی اور مختلف شہروں کے بازار، گلی کوچے چھان مارے، نہ اُس کی ماں مل پائی نہ بہن۔ باپ کا معلوم نہیں کیا ہوا۔ اُس نے پلٹ کے باپ کی خبر نہیں لی۔ بمبئی میں اُس نے طرح طرح کے کام کیے، مزدوری کی، چھوٹی موٹی چوریاں، جیب تراشی اور چاقو بازی کرنے لگا۔ آخر باڑے کا دادا بن گیا۔ کہہ رہا تھا، اُس کی ماں یا بہن ہوتی تو زرّیں ہی کی طرح پیش آتی۔ زرّیں تو بہت سی ماؤں کی ایک ماں اور بہت سی بہنوں کی ایک بہن ہے۔
زورا کی آنکھیں بھر آئیں۔ میں نے اُس کے گلے میں بانہیں ڈال کے بے کار کی تسلی دینی چاہی۔ ہر آدمی ہی شاید بہت بھروپ بھرے ہوئے ہوتا ہے۔ دیکھو تو زورا کی طرح ہٹا کٹا، چلتا پرزہ، کچھ معلوم نہیں ہو پاتا، اندر سے کیسا ٹوٹا پھوٹا، کتنا چھلنی ہے۔
دھوپ زرد پڑ چکی تھی۔ زورا کی باتوں میں کچھ احساس ہی نہیں ہوا، نہ سیورین کے باہر آنے جانے کا۔ بعد کو اُس نے بتایا کہ وہ کئی بار باہر آئی تھی اور اُس نے ہمیں چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا کہ جانے کب کے بچھڑے ہوئے ہیں۔ پھر اُس کے اندر بلانے پر ہمیں اُٹھنا پڑا اور یہ دیکھ کے حیرت ہوئی کہ صوفے کے آگے رکھی ہوئی لمبی میز پہ کھانا سجا ہوا ہے۔ سیورین میں بھی زرّیں کی بڑی خو بو تھی۔ اُسے خیال تھا کہ ہم نے دوپہر کا کھانا کہاں کھایا ہوگا۔ پوچھے بغیر اُس نے یہ اہتمام کیا تھا۔ ہم نے اُسے بھی ساتھ بٹھا لیا۔ زورا کی وجہ سے وہ جھجک رہی تھی، میرے اصرار پر ساتھ بیٹھ گئی۔ ایسا پُرتکلف کھانا نہیں تھا، اسپتال کا سیدھا سادا، ہلکا پھلکا سا، دو تین شریک ہوں تو آدمی کچھ کھا پی ہی لیتا ہے۔ ہم نے ہر ممکن احتیاط کی کہ ذرا سا شور نہ ہو اور بھِتّل کے آرام میں خلل نہ پڑے۔ دوپہر کے کھانے اور خوراک لینے کے بعد وہ نیند میں ڈوب چکا تھا۔
ڈاکٹر رائے نے مجھ پر پابندی عائد کر دی تھی۔ زورا موجود تھا، لیکن شہر کے دگرگوں حالات میں اُس اجنبی کا تنہا باہر نکلنا اچھا نہیں تھا۔ میرے کپڑے میلے اور شکستہ ہو گئے تھے، مجھے بڑی اُلجھن ہو رہی تھی۔
پھر ایک تدبیر دماغ میں آ گئی۔ زورا کو وہاں چھوڑ کے میں مرکزی عمارت تک چلا گیا اور چھاگلا کو اپنی مشکل بتائی۔ وہ ایک چست و چابک دست آدمی تھا۔ کچھ وہ ڈاکٹر رائے سے میرے خصوصی مراسم کا گواہ بھی تھا۔ میری خوش نودی بالواسطہ ڈاکٹر کی خوش نودی تھی۔ اُس نے میری گذارش توجہ سے سنی اور ہوٹل کے مینیجر کے نام مجھ سے ایک رقعہ لکھوایا۔ رقعے میں درخواست کی گئی تھی کہ بھائی کی بیماری کی وجہ سے میرا ہوٹل آنا ممکن نہیں ہو رہا۔ مینیجر میرے لیے محفوظ کمرے میں رکھا کپڑوں کا بکسا حاملِ رقعہ کے سپرد کر دے تو بڑی عنایت ہو۔ ہوٹل میں بہ طورِ امانت خاصی بڑی رقم میں نے محفوظ کرائی تھی، سو ہوٹل کے مینیجر کو کوئی اعتراض یا شبہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔ میں نے لکھا تھا کہ مینیجر چاہے تو تصدیق کے لیے ہوٹل کے کسی کارندے کو میرے فرستادے کے ساتھ بھیج دے کہ رقعہ میرا ہی نوشتہ ہے اور بکسا میرے ہی حوالے کیا گیا ہے۔ چھاگلا نے اپنا کوئی ماتحت ہوٹل بھیج دیا اور وہ ہوٹل کے کارندے کے ساتھ ہی واپس آیا۔ کارندے نے مجھ سے بکسے کی رسید لینا بھی لازم جانی۔
کئی دن بعد لباس تبدیل کرنے کی صورت پیدا ہوئی۔ نہا دھو کے اور لباس بدل کے آدمی کیسا نیا نیا ہو جاتا ہے۔ کچھ دیر بعد جیسے ہی شام چار بجے مریضوں سے ملاقات کا وقت شروع ہوا، جامو اور میدا آ گئے۔ اَب کی اُن کے ساتھ کوئی اور نہیں تھا۔ بھِتّل غفلت میں تھا۔ وہ باہر بیٹھے انتظار کرتے رہے۔ ملاقات کا وقت ختم ہوا چاہتا تھا کہ سیورین نے اُنھیں اندر بلا لیا۔

انداز طعام

ایک اعرابی (دیہاتی) کسی خلیفہ کے دسترخوان پر آیا۔ اُس کے سامنے بکری کا بُھنا ہوا گوشت رکھا گیا۔ اعرابی نے کھانے میں بڑی تیزی دکھائی۔ خلیفہ نے اعرابی سے کہا، ''میں دیکھ رہا ہوں، تم ایسے غصّے سے کھا رہے ہو جیسے بکرے کی ماں نے تمھیں سینگ مارا ہو۔''
اعرابی بولا، ''میں آپ کو دیکھ رہا ہوں، آپ ایسے پیار سے کھا رہے ہیں جیسے اِس کی ماں نے آپ کو دودھ پلایا ہو۔''

[illegible]

بتھل جاگ چکا تھا۔ سیورین نے اُسے جگا دیا تھا۔ جامو اور حمیدا اُس کے گرد بیٹھے محبتیں نچھاور کرتے رہے۔ ٹھیک پانچ بجے ملاقات کا وقت ختم ہو جانے کا اطلاعی گھنٹا بج جانے پر سیورین نے اُنھیں اُٹھا دیا۔ چند منٹ ہی اُنھیں بتھل کے پاس بیٹھنے اور اپنے گرامی قدر کی دل جوئیاں کرنے کا موقع مل سکا۔ زورا کو بھی وہ ساتھ لے گئے۔ ڈاکٹر رائے کے حکم کے مطابق زورا رات تک میرے ساتھ رہ سکتا تھا، لیکن شہر کی سڑکوں پر پولیس دندنا رہی تھی۔ رات کو زورا کا اکیلے اڈّے تک جانا کسی پیچیدگی کا سبب بن سکتا تھا۔

بتھل کو پھر نیند نہیں آئی اور اُس کی فرمائش سیورین سے رد نہیں کی گئی۔ بستر سے اُٹھ کے بتھل نے چند پھیرے کمرے کے اندر لگائے، پھر باہر نکل گیا۔ ابتدا میں وہ دائیں بائیں ہم دونوں کے کندھوں پر ہاتھ جمائے چلتا رہا اور چند قدم بعد ہمارے سہارے سے دست کش ہو گیا۔ میں اور سیورین ساتھ ساتھ رہے۔ خود اُسے احتیاط کا احساس تھا کہ سیورین کو عاجزی نہیں کرنی پڑی۔ صبح کی طرح وہ دروازے کے پاس رکھی کرسی پر بیٹھ گیا۔ دن اپنا سفر تمام کر رہا تھا۔ دھوپ سورج کے پاس لوٹ رہی تھی۔ اب سائے ہی رہ گئے تھے۔ سورج کے سائے بھی کیسے روشن ہوتے ہیں۔ مغرب تک بتھل باہر بیٹھا آتی جاتی شام کا نظارہ کرتا رہا، اور خود ہی اُٹھ گیا۔ آدمی بھی کیا تماشا ہے۔ آرام کا مشتاق ہوتا ہے اور آرام سے تنگ بھی آ جاتا ہے۔

اندھیرا ابھی دُور تھا کہ ایمی آ گئی۔ میں دیکھ رہا تھا کہ سیورین کچھ بدلی بدلی سی ہے، کھوئی کھوئی نظر آ رہی ہے۔ دن میں بار ہا اُس کا سامنا ہوا، لیکن آج اطمینان سے بیٹھنے کا کوئی وقت ہی نہیں ملا۔ ایمی کے آ جانے پر اُس نے لباس تبدیل کر لیا تھا، لیکن وہیں موجود رہی اور اُس سے کوئی بات نہ ہو پائی۔ اِس خیال سے کہ اُس کی ژولیدہ ذہنی کا سبب کچھ تو معلوم ہو، وہ جانے لگی تو میں اُس کے پیچھے پیچھے باہر آ گیا اور اُسے روک کے پوچھا کہ اُس کی طبیعت تو ٹھیک ہے۔ وہ کچھ بدحواس ہو گئی، تھکی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھا کی اور گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی، ”کیوں، مجھے کیا ہوا؟“

”چہرے پر وہ روشنی نہیں ہے۔“

”کیسی روشنی؟“ وہ پٹ پٹاتی آواز میں بولی۔

”جو تم سے مخصوص ہے، روشنی، تازگی، شگفتگی۔“

اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی، اور وہ مسکراہٹ، مصنوعی مسکراہٹ بڑی زہر لگتی ہے۔

”تھکی تھکی سی لگتی ہو۔“ میں نے نرمی سے پوچھا۔

”شاید۔“ وہ ڈوبی ڈوبی آواز میں بولی۔

”یا کوئی اور بات ہے؟“

”کوئی بات نہیں، کیا بات ہوتی۔“

”بہ ہر حال... اب گھر جا کے ساری رات آرام کرنا، اور سنو! صبح ناشتے وغیرہ کی زحمت نہ کرنا۔“

”کیوں، پسند نہیں آتا کیا؟“ اُس کا لہجہ سراسیمہ تھا۔

”نہیں، یہ بات نہیں، مگر تم اہتمام زیادہ ہی کرتی ہو۔“

”کچھ بھی تو نہیں، مجھے تو اچھا لگتا ہے۔“

”تو ٹھیک ہے۔“ مجھے بہ ہر طور اُس کی خاطر عزیز تھی۔ وہ ہر اعتبار سے ایک نفیس لڑکی تھی، شائستہ، نازک طبع، سادہ و معصوم، اور دل کش بھی بے پناہ۔ دوشیزگی کی عمر میں جو کچا پن ہوتا ہے، اور حیرانی سی، اور شرمندگی سی اُس کے سراپا کا خاصہ تھی۔ اِتنے دنوں کے ساتھ میں آدمی ایسا ڈھکا چھپا نہیں رہتا، پھر اُس نے بتھل کا بہت خیال رکھا۔ دن بھر کام کرنے کے بعد وہ ضرور تھک جاتی ہوگی، کام بھی کیسا، بتھل جیسے مریض کی نگرانی، ہمہ وقت نگاہ رکھنے کا۔ فرض شناسی، دیانت ہے، اور یہ دیانت کاری بہت تھکاتی ہے۔ گھر پہنچنے کے بعد وہ ناشتے کے لیے فکر مند ہو جاتی ہوگی۔ یہ سوچ کے میں نے حجت سے اجتناب کیا کہ بہت سی فکروں سے دل کی طمانیت کا پہلو بھی نکلتا ہے۔

جاتے وقت اُس کی مسکراہٹ بے ساختہ تھی۔ میں اُسے راہ داری کے سرے ہی پر رخصت کر سکتا تھا۔ آگے اُس کی ہم رہی بہ وجوہ مناسب نہیں تھی۔ وہ ہاتھ ہلاتی ہوئی دائیں جانب مڑ گئی اور نظروں سے دُور ہو گئی۔ کسی کے اوجھل ہو جانے پر اُس کی کمی کے احساس سے مراد ہے کہ وہ شخص نقش گری و اثر پذیری کی نادر صفات سے آراستہ ہے۔ ورنہ کتنے بے شمار روز اوجھل ہوتے اور سامنے آتے رہتے ہیں، جیسے کوئی وجود ہی نہ ہو اُن کا۔

اُس رات ڈاکٹر رائے کے ناغے پر مجھے تعجب ہوا۔ اُس کے بجائے اُس کے مددگار دو اور ڈاکٹر رات کے دورے پر آئے۔ میں نے اُن سے ڈاکٹر کے نہ آنے کی وجہ جاننی چاہی تھی، اُنھوں نے خاطر خواہ جواب نہیں دیا۔ میں نے ایمی سے پوچھا تو اُس نے بھی خاص توجہ نہیں دی، بے نیازی سے بولی کہ کہیں اور مصروف ہو سکتے ہیں، وہ اپنا کام سمجھتے ہیں کہ کب کہاں اُن کی کس قدر ضرورت ہے۔

مجھے اطمینان نہیں ہوا۔ جیسا کہ دوپہر میں نے ڈاکٹر رائے سے شبہ ظاہر کیا تھا کہ کہیں اُس نے میرے بارے میں نظر ثانی تو نہیں کی ہے، گو اُس نے تردید میں ذرا سا تجمّل نہیں کیا تھا، مگر اُس وقت اُس کے نہ آنے سے پھر وہی وہم کھٹکنے لگا تھا۔ میں نے اُس سے یہ بھی تو کہا تھا کہ جو بھی ہے، یہی کچھ ہے میرے پاس۔ میں نے اُس سے کیا چھپایا ہے۔ کوئی سے کلی سی رہی اور اُس کی تشریح و تصریح سے میں قاصر رہا۔

ایمی کے التفات کی فراوانی وہی تھی۔ بتھل کے معمولات کی ادائی کے بعد مجھ سے پوچھے بغیر اُس نے کھانا منگوا لیا اور میرے ساتھ ہی بیٹھی رہی۔ میں نے دوبارہ ڈاکٹر کے بارے میں اپنی تشویش ظاہر کی تو اُس نے مجھے تاڑ دیا۔ وہ ایسی ہی تھی۔ اپنی عمر رسیدگی کا خوب فائدہ اُٹھاتی تھی۔ ڈانٹ ڈپٹ کرتی تھی تو اُس کے ہاں رحم بھی بہت تھا، اُس کی تلخی میں بڑی شیرینی تھی۔ کہنے لگی کہ کسی بات پر واقعی ڈاکٹر تم سے کشیدہ ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ تمھارے بھائی کی طرف سے غافل ہو جائے گا، یا اُس کے کارِ مسیحائی میں بَل آ سکتا ہے۔ میں نے ایمی سے نہیں کہا کہ اِس حقیقت کا مجھے علم ہے، لیکن یہ تو میرا اپنا معاملہ ہے۔ مجھے تو ہلکا سا بھی ایک امکان ویران کیے ہوئے ہے کہ میں نے کب اور کہاں تجاوز کیا ہے، مجھ سے کون سی لغزش سرزد ہو گئی ہے۔ ایمی کی ہدایت پر میں بستر پر آ کے دراز ہو گیا۔ میری آنکھیں کھلی دیکھ کے وہ کَل کا وظیفہ دُہرانے لگی۔ میں نے اُسے بہت منع کیا، نہیں مانی۔ میرے سرہانے بیٹھ کے سر دبانے لگی۔ اُس کی انگلیوں سے شفقت ٹپک رہی تھی۔ پھر میں نے بھی وہی کیا، آنکھیں بند کر لیں۔ تب کہیں وہ بستر سے اُٹھی، پھر جانے کس وقت میرے منتشر حواس پر رات غالب آ گئی۔

اور صبح جلد ہی آنکھ کھل گئی۔ ایمی نے چائے پلائے بغیر مجھے باہر نکلنے نہیں دیا۔ دیر تک میں ننگے پاؤں سبزہ زار پر ٹہلتا رہا۔ سبزے میں شبنم گھلی ہوئی تھی اور اُس کا گداز دوچند ہو گیا تھا۔ سورج رفتہ رفتہ زمین پر اُترتا رہا۔ سورج کو زمین کی توفیق کا اندازہ ہے، سو وہ ایک حد پر آ کے رُک جاتا ہے۔ کسی دن اُس نے اپنا معمول بدل دیا تو زمین کا کیا بنے گا، نام و نشاں ہی شاید باقی نہ رہے، اور کسی دن سورج نے زمین سے مُنھ پھیر لیا تو بھی زمین پر اندھیرے کے سوا کیا رہے گا۔ یوں زمین کا اپنا کیا ہے، اُس کی زندگی تو سورج کی مرہونِ منت ہے۔ میٹھے پانی اور نرم و لطیف ہوا کی کتنی ہی افراط ہو، سورج کی اعانت کے بغیر سب اکارت ہے۔ جب بھی تنہا چہل قدمی کرو، خوابیدگی کے مانند آدمی کو خیال و خواب پر قابو نہیں رہتا، خیال و خواب اُمڈے چلے آتے ہیں۔

صبح کے کاموں پر اسپتال کے کارندوں کی آمد و رفت جاری رہی، اور دن کھلتا گیا۔ پھر بائیں جانب، راہ داری سے سیورین طلوع ہوتی دکھائی دی۔ شہابی رنگت کی ساڑھی میں لپٹی ہوئی، کھلی کھلی، نئی نئی سی۔ اُس کے نمودار ہو جانے کی فرحت، رات اُس کے رخصت ہو جانے کی خلش سے کہیں بیش تھی۔ سیورین آج اِس لیے جلدی آ گئی تھی کہ ڈاکٹروں کی آمد سے پہلے ہم فراغت سے ناشتا کر سکیں۔ میں نے اُسے مشورہ دیا کہ کسی وقت ڈاکٹر کے وارد ہو جانے کا دھڑکا تو برقرار رہے گا، اور ایک ہڑ دھبڑ رہے گی، ڈاکٹر کو کمرے میں بسی ناشتے کی مہک پر مُنھ بنانے کا موقع بھی نہیں ملے گا۔ سیورین کو اُتنی ہی بے چینی ہوگی جتنی کسی تخلیق کار کو اپنی تازہ تخلیق کے اظہار کی، مگر وہ راضی ہو گئی۔ میں اصل بات اُسے کیا بتاتا کہ مجھے تو ڈاکٹر رائے کی آمد کا انتظار ہے، دیکھتے ہیں، وہ اِس وقت بھی آتا ہے کہ نہیں۔ اِس کش مکش میں بے لطفی کیا، ڈھنگ سے سیورین کے لطف و کرم سے انصاف نہ کیا جائے گا۔

نو بجے، پھر ساڑھے نو۔ بتھل بستر پر بیٹھا ہوا تھا اور میری نگاہیں دروازے پر جمی ہوئی تھیں۔ دس بجنے میں ابھی دیر تھی کہ باہر سے مانوس چاپوں کی گونج سنائی دی۔ میں نے شکر کی سانس لی۔ وہ ڈاکٹر رائے ہی تھا جو اپنے ساتھی ڈاکٹروں اور نرسوں کے ایک دستے کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا، اور ہم تینوں کے سلام کا سرسری جواب دیتا سیدھا بتھل کے پاس چلا گیا۔ نیم دراز

بجھل کی بحالی پر اُس نے سرخوشی سے داد دی اور بجھل سے طرح طرح کے سوالات کرتا رہا۔ اُس کے ساتھی نوجوان اور اُدھیڑ ڈاکٹر بھی۔ پھر ڈاکٹر رائے بیش تر اُنھی سے مخاطب رہا۔ وہ طبّی اصطلاحی زبان میں بجھل کے مرض کی نوعیت اور علاج کی نزاکت کے رموز و نکات اُنھیں تعلیم کرتا رہا تھا۔ اِس دوران سیورین نے میرے قریب آ کے سرگوشی کی کہ باہر ملاقاتی موجود ہیں اور اُنھیں روک دیا گیا ہے۔ میری نظر گھڑی پر گئی۔ دس سے چند منٹ اوپر ہو رہے تھے۔ باہر جا کے میں اُن سے ملنے کا ارادہ کرتا ہی رہ گیا۔

ڈاکٹر نے بجھل کو بستر سے اُٹھا دیا تھا۔ بجھل اِس فیاضی کا منتظر تھا۔ تقریباً اُچھل کے ایک دم فرش پہ آ گیا۔ ”میں اب ٹھیک ہوں ڈاکٹر ساب۔“ اُس نے بلند آواز میں کہا۔

ڈاکٹر رائے نے مسکرا کے سر ہلایا اور ہندستانی میں بولا، ”وہ تو میں بھی دیکھتا ہوں، لیکن ابھی اتمام کے اُستاد! زیادہ نہیں، سمجھے!“

اُستاد کے لقب سے بجھل کے چہرے پر حیرانی ہویدا ہوئی۔ دوسرے لمحے ڈاکٹر کو بھی شاید اپنی بے محل بے ساختگی کا احساس ہوا اور وہ خفیف سا نظر آیا، یا شاید مجھے محسوس ہوا، کیوں کہ اُس نے کوئی وضاحت ضروری نہیں سمجھی اور بجھل کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے دروازے کی طرف لوٹ پڑا۔ اُس سے بات کرنے کا مجھے موقع ہی نہیں مل سکا۔ پھر اُس نے بھی کمرے میں میری موجودی کا خیال نہیں کیا۔ دانستہ، یا نادانستہ میں بھی پھر اُس کے تعاقب میں کمرے سے نکل گیا۔ باہر کھڑے جامو، زورا، میدا اور برجو ڈاکٹر کی تعظیم میں ایک طرف سمٹ گئے تھے۔ اُنھیں دیکھ کے ڈاکٹر ٹھٹکا تھا، مگر فوراً ہی آگے چلا گیا۔ اُس نے اُن کے سلام کا جواب بھی نہیں دیا۔ جیسے اُس نے اُنھیں دیکھا ہی نہ ہو۔ میں نے تیز قدموں سے اُسے جا لیا اور اُسے رُکنا پڑا۔

”ہاں۔“ کسی بات کے اچانک یاد آ جانے پر جو عالم ہوتا ہے، اُس نے چونک کر پوچھا۔ ”کیسے ہو؟“

”آپ کیسے ہیں؟“ میں نے کٹی کٹی آواز میں کہا۔

”مجھے ایک مریض کو دیکھنے کی عجلت ہے۔“ اُس کے ماتھے پر شکنیں اُبھر آئیں۔ اُس کے لہجے سے بھی فکر مندی عیاں تھی۔

میں خاموش رہا۔

”تم آؤ گے اُس طرف؟“ اُس نے رسمی انداز میں پوچھا۔

”کہاں؟“

”میری طرف، اُدھر دفتر میں۔“

”کب آنا ہے؟“

”جب، جب تم چاہو۔“

”ابھی آ جاتا ہوں، یا آپ کے ساتھ ہی چلتا ہوں۔“

”ابھی نہیں... تھوڑی دیر بعد... میں نے بتایا نا۔ ایک مریض کو دیکھنا ہے، اُس کی حالت نازک ہے۔“ اُس کی آواز میں تشویش تھی، لمحے بھر کے توقف کے بعد کہنے لگا، ”ارادہ تھا، فارغ ہوتے ہی تمھیں بلاؤں گا۔“

مجھے ہمت ہوئی اور میں نے بیچی، بل کہ خفگی آواز میں کہا، ”رات بھی آپ کا انتظار...“

وہ کچھ کہتے کہتے رُک گیا اور بولا، ”وہیں بات ہو گی۔“

وہ چلا گیا۔ میں اُس کے چہرے اور لہجہ و آواز سے کچھ اخذ کرنے کی اُدھیڑ بُن میں وہیں کھڑا رہا۔

بجھل اُن چاروں کے درمیان باہر ہی موجود تھا۔ دھوپ سے ابھی سبزہ زار کا بڑا حصّہ محفوظ تھا۔ سیورین نے وہیں کرسیاں لگوا دی تھیں۔ میں اُن کے پاس پہنچا تو سارے میری جانب متوجہ ہو گئے۔ میرا دماغ بھٹکا ہوا تھا۔ اُن کے سوالوں کے جواب میں ہوں، ہاں ہی کرتا رہا۔ پھر ایمی نے باہر آ کے کوئی لحاظ کیے بغیر اعلان کیا کہ ناشتا لگا دیا گیا ہے۔ میں نے ازراہِ وضع اُن سے بھی پوچھا۔ سب نے انکار کر دیا تو میں نے زور بھی نہیں دیا۔ سیورین میرے انتظار میں کمرے میں ٹہل رہی تھی، آج بھی وہ باز نہیں آئی۔ وہی اہتمام تھا۔ ایمی کو بھی اُس نے روکا ہوا تھا۔ اُدھر جلد سے جلد ڈاکٹر رائے کی طرف جانے کی فکر، اِدھر سیورین کی دل شکستگی کا خدشہ۔ وہ دونوں، توشے میرے آگے رکھتی رہیں اور میں نے اُنھیں مایوس نہیں کیا۔ داد و تحسین مروتاً ہو تو بہت گراں ہوتا ہے۔ سیورین نے لطیف اور خوش ذائقہ چیزیں بنائی تھیں۔ نفاست طبعی اور جسم و جاں میں رچی ہوئی ہو تو آدمی کے ہر طور، ہر کام، ہر بات میں نظر آتی ہے۔ میری مدح سرائی سے سیورین گلنار ہوتی رہی۔ خوشی میں دل کش آدمی کی دل کشی و دل آویزی سوا ہو جاتی ہے۔

کچھ وقت ناشتے میں گزر گیا۔ گیارہ بجے عیادت کاروں کا وقت تمام ہو جاتا تھا۔ بہ ہر حال کچھ وقت جامو، میدا وغیرہ کے پاس بیٹھنا لازم تھا۔ میرا مچل رہا تھا کہ اسپتال سے فارغ ہو جانے کے بعد

بجھل چند دن اڈّے پر قیام کرے۔ ”ہاں رے، دیکھیں گے۔ ابھی اِدھر سے بیڑی تو کھلے۔“ بجھل اُکتائی آواز میں بولا۔

”نا، میں استاد۔“ میدا بچوں کی طرح ضد کرنے لگا۔ ”اُو تو جانو، اب کھلے ہی کھلے، پر ہمرے سے ابھی سے پکّا کرو۔“

”بولا نا، آ گئیں گے رے اُدھری۔“ بجھل نے معاملہ ختم اختیار کی۔ ”اپنا ٹھکانا ہے وہ بھی۔“

”ای ہوئی نا بات اُستاد!“ میدا ہاتھ نچا کے بولا۔

گیارہ بجے سے پانچ منٹ پہلے گجر بج اُٹھا۔ آخری گجر پر اُنھیں اُٹھ ہی جانا تھا۔ میں اُن کے چلے جانے ہی کا منتظر تھا۔ بجھل ابھی باہر بیٹھے رہنا چاہتا تھا۔ زورا اُس کی خدمت میں حاضر ہی تھا۔ ڈاکٹر رائے کی طلبی پر اُس کے پاس جانے کا عذر کر کے میں نے مرکزی عمارت کا رُخ کیا۔ مجھے چھاگلا کے پاس بیٹھنا پڑا، لیکن کچھ ہی دیر بعد مجھے ڈاکٹر کے کمرے میں طلب کر لیا گیا۔ اُس کے چہرے سے ملال مترشح تھا۔

”سب ٹھیک تو ہے ڈاکٹر صاحب؟“ میں نے تشویش سے پوچھا۔

”وہ بے چارہ بے کار کی جنگ کر رہا تھا، آخر ہار گیا۔“ ڈاکٹر اُداسی سے بولا۔

”ہار تو آدمی کا مقدر ہے، آخر ہار ہی جاتا ہے۔“

”مگر اُسے اور وقت مل سکتا تھا، اگر وقت پہ یہاں آ جاتا۔“

میں نے رسمی افسوس کا اظہار کیا۔

”خیر تم بتاؤ، یہاں تو روز ہی یہ تماشا ہوتا ہے۔“

”آپ رات نہیں آئے۔“ میں نے دبی زبان سے کہا۔

”یہ اسپتال ایک بڑا ادارہ ہے۔ یہاں بہت لائق اور تجربے کار ڈاکٹر ہیں۔“ اُس کا لہجہ جھنجلایا ہوا تھا۔ ”میں نہ ہوں گا، تب بھی یہ چلتا رہے گا۔“

”مگر کوئی بات تو ہے جو لوگ آپ کے پاس کھنچے چلے آتے ہیں۔ لوگ آپ سے اِتنی اُمیدیں کیوں رکھتے ہیں؟ اس لیے کہ یہ اُمیدیں آپ ہی کی دی ہوئی ہیں۔“ میں طے کر کے آیا تھا، اِس بار کھل کے بات کروں گا۔ میں نے کہا، ”میری خوش گمانی ہے، آپ نے مجھے بڑی عزت دی ہے۔ دوسروں سے کچھ زیادہ ہی۔ سو آپ سے کچھ ہوا کی توقع بے جا نہیں ہے۔“

اُس نے سکون سے میری بات سنی، چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی، اور نرم روی سے بولا، ”رات کو ذرا مصروفیت رہی۔ آئی جی ملنا چاہتا تھا۔ میں نے سوچا، یہاں کیا بات ہو پائے گی، گھر پر بلا لیا۔ رات کا کھانا پھر ہم لوگوں نے ساتھ ہی کھایا۔“

میں نے تجسّس ظاہر نہیں کیا۔ حالاں کہ یہ سن کے میری رگیں کھنچنے لگی تھیں۔ اُس نے خود ہی بتایا، بل کہ تکرار کی کہ آئی جی اپنے افسرانِ بالا کے رویّوں سے بہت آزردہ ہے۔ اِدھر اکبر علی خاں کے بھائی سکندر علی خاں کی شہر میں موجودی سر پر لٹکی ہوئی تلوار کے مانند ہے۔ مرکزی اور صوبائی حکومت کے حکّام اپنے عالی شان ایوانوں میں بیٹھے حکم پر حکم صادر کر رہے ہیں۔ اُن کی تسلّی کے لیے پولیس کی روایتی کارروائیاں جاری ہیں۔ پولیس نے کئی ایسے جرائم پیشہ پکڑ لیے ہیں، بہ ظاہر اِن واقعات سے جن کا کوئی تعلّق نظر نہیں آتا۔ شہر کے اڈّے کے بھی بہت سے لوگ گرفتار کر لیے گئے ہیں، لیکن کہیں سے سراغ نہیں مل رہا۔ کسی جانب کوئی شبہ گزرتا ہے تو ثبوت ناپید ہے۔ ڈاکٹر رائے کہہ رہا تھا کہ آئی جی سے اُس کی ایسی کوئی شناسائی نہیں تھی۔ دوستیاں کرنے کا اُسے وقت ہی کہاں ملتا ہے۔ پہلی مرتبہ جب آئی جی مجھ سے بازپرس کرنے اور ساتھ لے جانے کے ارادے سے اسپتال آیا تھا تو ڈاکٹر سے خاصا متاثر ہو کے گیا تھا۔ ڈاکٹر نے انکسار کیا، اپنی زبان سے کچھ نہیں کہا، لیکن میں تو گواہ تھا۔ اُس کی صاف بیانی، زیرکی، استدلال اور منطقی توجیہات سے کوئی بھی اُس کا اسیر ہو جاتا۔ چناں چہ اِس پیچیدہ اور سنگین صورتِ حال میں آئی جی کو ڈاکٹر رائے کا خیال آنا چاہیے تھا۔ جزرسی اور نکتہ طرازی اپنی جگہ، ڈاکٹر کی طبعی سنجیدگی، متانت، انسانوں سے ہم دردی، چیزوں کی درستی اور تعمیر و اصلاح کی خوبیاں مستزاد ہیں۔ اُس کے لیے زبان پہ

آ سکے اپنے اِن احساسات کا اظہار کہیں بے موقع نہ ہو، کسی جتنی تاثر کے اندیشے میں، میں نے زبان بند ہی رکھی۔

کہنے لگا، ”میں نے آئی جی سے کہا، میں تو ایک ڈاکٹر ہوں، لیکن ایک بات بڑی صاف ہے۔ خوں ریز وارداتیں ہو چکی ہیں تو ثبوت بھی کہیں موجود ہونا چاہیے۔ ثبوت تہ خانوں میں چھپا ہوا ہے، یا چھپا دیا گیا ہے۔ پولیس کو حوصلہ رکھنا چاہیے کہ ثبوت اتنی آسانی سے مرتا نہیں۔ اور مرتا نہیں تو دست رس سے کچھ فاصلے ہی پر ہے، کہیں آس پاس، دور و نزدیک۔ پولیس کو واضح طور پر شبہے کے اہداف متعین کرنے چاہییں، اور ایک ایک کر کے اُن پر تجربہ ہے۔ مفروضے قائم کیے بغیر نتائج کیسے اخذ کیے جا سکتے ہیں، اور مفروضے قائم کرنے کے بعد ہر قسم کی جراتوں کے لیے آمادگی... کسی رُو رعایت کے بغیر... پولیس کے فرسودہ انداز سے الگ۔“

میرے جسم میں سردی کی ایک لہر آ کے گزر گئی۔

”میں نے کچھ غلط تو نہیں کہا؟“ مجھے خاموش دیکھ کے ڈاکٹر نے ڈنک مارتی آواز میں سوال کیا۔

میں نے ست پٹاتے ہوئے ہم نوائی کی، ”اور کیا کہہ سکتے تھے آپ۔“

”تمھارے دماغ میں کوئی بات ہو تو بتاؤ۔“

”آپ اور میں بہت کچھ جانتے ہیں، یقیناً پولیس بھی کسی حد تک جانتی ہو گی، لیکن مکمل شواہد کے بغیر کوئی اقدام دیواروں سے سر پھوڑنے کے مترادف ہو گا۔“

”اور یہ کیسا المیہ ہے۔“ وہ سلگتی آواز میں بولا، ”ہم بہت کچھ جانتے ہوئے بھی کچھ نہیں جانتے۔“

”اُوپر رکھی چیز کا حصول دست رس ہی سے ممکن ہے، قامت کی بلندی کے لیے کوئی چیز چاہیے جو اردگرد موجود نہیں ہے۔ یہی صورت کچھ پولیس کے بھی پیش نظر ہو گی۔“

اُس نے آہ بھری۔ ”رات میں نے سوچا تھا، تمھیں بھی بلا لوں، بیٹا کی بھی یہی خواہش تھی، لیکن شبہہ تھا، تمھاری موجودی آئی جی کو بارِ خاطر نہ ہو۔“

اُس کے لہجے کی یگانگت اور قربت سے مجھے اپنا غبار چھٹتا محسوس ہوا، کوئی بوجھ سر سے اُتر گیا ہو جیسے۔ ”بیٹا کیسی ہیں؟“ میں نے اشتیاق سے پوچھا۔

”ٹھیک ہے، اپنے حال میں گم، آئی جی کے جانے کے بعد تمھارا بہت ذکر رہا۔ اِدھر اُدھر رکھی تصویریں جمع کر رہی ہے تمھیں دکھانے کے لیے۔“

”مجھے بھی انھیں دیکھنے کا تجسس ہے، حالاں کہ یقین ہے بڑی نادر چیزیں ہی ہوں گی۔ قلم، مُوقلم پر اُن کی گرفت کیا خوب ہے۔ روانی، بے ساختگی، پھر خیال اور فکر، اور اُن کی نظر، چیزوں کو اپنے زاویے سے دیکھنے اور محسوس کرنے والی نظر۔ اُن کی چند تصویریں ہی دیکھ پایا تھا، لیکن اندازہ ہو گیا تھا کہ اُن کا مشاہدہ کتنا تیز ہے، مشاہدے کے ساتھ مطالعہ ہو تو دو آتشہ ہے۔ اُن کے ہاں کیسی مشاقی ہے، رنگ برتنے کا ایک سلیقہ اور... اور...“

اُس نے ہاتھ اُٹھا کے مجھے روک دیا، ”یہ سارا کچھ اُسی کے سامنے کہنا۔ آج تمھیں بلانے کو کہہ رہی تھی، لیکن دیکھو، آج نہیں تو کل... وقت تمھارے پاس بھی اب کم ہے۔ تمھارے بھائی کو جلد چھٹی مل جائے گی، اور ظاہر ہے، تم فوراً اسے گھر لے جانا چاہو گے۔“

اُس کی زبان سے یہ مژدہ سننے کا میں کب سے آرزومند تھا، یہ بتاتے ہوئے ڈاکٹر کی آواز سُست ہو گئی تھی، گرہیں سی پڑ گئی ہوں۔ میں نے اپنی مسرت بہ مشکل خود تک محدود رکھنے کی کوشش کی اور سر جھکا لیا۔

دیر تک اُس پر سکوت طاری رہا۔ جانے کن خیالوں میں کھویا ہوا تھا، پھر افسردگی سے کہنے لگا، ”آج شام اکبر علی خاں کے گھر انتقال کے بعد ہونے والا روایتی اجتماع ہے، تیجا وغیرہ... کیا کہتے ہیں اُسے؟“

”مجھے جانے کی اجازت مل سکتی ہے؟“ میں نے زیرِ لبی سے پوچھا۔

”ہا!“ وہ بگڑ کے بولا، ”تم پاگل ہو گیا؟“

”مجھے بہت بار محسوس ہوتا ہے۔“

”میں نے تمھیں بتایا تھا، آئی جی نے تمھارے بارے میں سکندر علی خاں کو خاصا مطمئن کر دیا ہے۔“

”سکندر علی خاں کا نہیں، یہ میرا اپنا معاملہ ہے۔“

”تم وہاں جا کے کیا کرو گے؟ انھیں اور رُلاؤ گے، اُن کے زخم کریدو گے؟ کیا فضول بات کرتے ہو۔“ وہ ناراضی سے بولا۔

وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا، وہاں جا کے میں اِس کے سوا کیا کر سکتا تھا۔

”معلوم ہوا ہے، اکبر علی خاں کی بیوی ٹھیک نہیں ہے۔ بار بار اُس پر غشی کے دورے پڑ رہے ہیں۔“

”یہ تو ہو گا ہی۔ اکبر علی خاں نے بتایا تھا، دونوں بڑی آزمائشوں کے بعد ایک ہو سکے تھے۔ بیگم کا ذکر وہ بڑی چاہت سے کیا کرتے تھے، دونوں ہم مزاج تھے۔ ایک ہی جھلک دیکھی تھی میں نے اُن کے گھر کی، دونوں جیسے ایک دوسرے کے لیے...“ میری آواز بھرا گئی اور آگے کچھ نہ کہا گیا۔

ڈاکٹر کرسی سے اُٹھ کے میرے پاس آ گیا اور میری کمر تھپکنے لگا۔ ”یہی ہوتا ہے۔ آدمی، آدمی سے ملتا ہے، آدمی، آدمی سے بچھڑ جاتا ہے۔ کسی ایک کو تو پہلے جدا ہونا پڑتا ہے، اُسے خبر نہیں ہوتی، دوسرا کتنا ویران ہو جائے گا۔ یہاں تو بات ہی دوسری ہے۔ ایک کو دوسرے سے چھین لیا گیا ہے، کسی خطا اور گناہ کے بغیر چھین لیا گیا ہے۔ سکندر علی خاں نے درست فیصلہ کیا ہے، بھائی کے بیوی بچوں کو ساتھ لے جائے، یہ گھر اور در و دیوار تو انھیں بہت ستائیں گے۔“

ڈاکٹر نے چائے منگوالی تھی اور ابھی کہیں جانے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا کہ چھاگلا گھبرایا گھبرایا کمرے میں داخل ہوا اور سرگوشیانہ انداز میں ڈاکٹر کو کچھ بتایا۔ پوری بات تو میری سمجھ میں نہ آ سکی، لیکن کسی مریض کا ذکر تھا۔ ڈاکٹر چائے ادھوری چھوڑ کے مجھ سے معذرت کرتا ہوا اُسی وقت کمرے سے چلا گیا۔ مریض ڈاکٹر کے رحم و کرم پر ہوتے ہیں تو ڈاکٹر بھی کچھ کم اُن کے تابع نہیں ہوتا۔

اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے موسم جیسے بدلتے رہے، کبھی گرمی، کبھی سردی کا احساس۔ سارے راستے ڈاکٹر مجھ پر مسلّط رہا۔ اُس نے بچھل کے بارے میں تو یہ سنائی تھی تو گزشتہ رات آئی جی سے ملاقات کا احوال بھی بتایا تھا۔ اُس نے واضح طور پر کچھ نہیں کہا تھا۔ میں جانتا تھا، بہت کچھ وہ مجھے نہیں بتا سکا ہے۔ شاید میں اُسے سننا بھی نہیں چاہتا تھا، اُس کا چہرہ تو میرے سامنے ہی تھا۔ اکبر علی خاں کا نام آنے پر اُس نرم خو، اُس دَور کے آدمی کی آنکھوں میں وحشت اُتر آئی تھی۔ اُس کا چہرہ ہی کچھ اور ہو جاتا تھا۔ کچھ وقت ہی جاتا ہے، میرا دل دھڑک رہا تھا، جانے کیا دیکھنے اور سننے کو ملے۔

ٹھیک پانچ بجے جامو اسپتال آ گیا۔ یہی بات مجھے

کھٹک رہی تھی۔ وہ تنہا ہی تھا۔ میدا، برجو دادا میں سے کوئی اُس کے ساتھ نہیں تھا۔ بچھل کو تعجب ہوا۔ ”کدھر گیا رے وہ بہاری بھنگرا۔“ اُس نے ناگواری سے پوچھا۔

”نہیں آیا اُستاد۔“ جامو نے ہلکی آواز میں کہا، ”اور دیکھو، ابھی کب آئے۔“

”کیا ہوا احرام کے بچے کو؟“

جامو نے بچی زبان میں بتایا کہ اڈے پر کسی نومشقے سے چاقو بازی کے دوران معمولی زخمی ہو گیا ہے۔

”وہ بدھوا بھی ساتھ اُلٹا ہو گیا کیا؟“

”دادا کو میدا کے واسطے پھر ٹھیرنا ہی تھا۔“ جامو جھنجلایا ہوا لگتا تھا۔ ”میں تو اِدھر ہوں اُستاد۔“

”بدوا نے کچھ نہیں بولا تجھ کو؟“

”بولتا تھا، اُستاد کے آگے ہاتھ جوڑ دینا۔“

بچھل نے سر جھٹک کے بے دلی کا اظہار کیا۔

جامو کو فوراً ہی خیال آیا کہ بچھل کا مطلب کچھ اور ہے،

اور میدا اُس سے کوئی وعدہ کر کے گیا ہے، اُس نے خفا ہو کے کہا، ”ڈاکٹر سے پوچھ لیا ہے؟“

”ڈاکٹر اور جیلر ایک ہی گھاٹ کے ہوتے ہیں۔“

”ابھی تھوڑا اپنے کو روکو اُستاد، نکل کے بیڑیاں ہی بیڑیاں پینا، اور کھانا بھی، کون پکڑے گا تمھارا ہاتھ۔“

”تُو اپنے کو ٹھیک نہیں لگتا رے آج۔“ بجھل نے اُس کے چہرے پر نگاہیں جُھماتے ہوئے کہا۔

”مجھ کو کیا ہوتا۔“ جامو بھن بھنا کے بولا، ”تمھارے سامنے بیٹھا ہوں، ٹیڑھا میڑھا دکھائی پڑتا ہوں تم کو...“

بجھل نے زورا کو مخاطب کیا، ”ببیا! اُستاد کو پانی دِکھا ذرا۔“ اچھا ہوا، جامو کو خود دھیان آ گیا کہ وہ کس کے سامنے بیٹھا ہے۔ ”کیا ہے اُستاد!“ وہ چڑتے ہوئے بولا، ”کیسی بات کر رہے ہو۔“

”لگتا ہے، اِس کھونٹے کا گھاس پانی راس نہیں آیا تجھ کو۔“ بجھل نے اپنی آواز دھیمی رکھی۔ ”بول رے، کیا بات ہے؟“

”کچھ نہیں اُستاد، کیا ہوتا۔“ جامو شکستہ لہجے میں بولا۔

”تُو پکّی تول کا ہے۔ پورا سیدھا بول رے۔“

”کیا بولوں، پتا نہیں، تم کیا سمجھ رہے ہو۔“

”تُو اَب اُدھری لَوٹ جا، بنگلا پاڑے میں۔“

”اِدھر میں تم کو بُرا لگ رہا ہوں۔ تم کو ساتھ لے کے جاؤں گا۔ اپنے کو کیوں بلایا ہے پھریاں۔ اَب بولو گے تم نے کب بلایا ہے۔“

”ہاں۔“ بات بدلنے کے لیے میں نے مداخلت کی۔ ”بلایا تو میں نے ہے جامو بھائی کو۔“ میں نے بجھل سے کہا، ”اُس وقت تمھاری حالت ہی ایسی تھی۔ اَب تو شکر ہے، سب ٹھیک ہے۔ جامو بھائی آ گئے، بڑی بات ہے اور وہ چاہیں تو جا بھی سکتے ہیں اَب۔“

”اُستاد بولیں گے تو چلا جاؤں گا ابھی۔“ جامو تیوری چڑھا کے بولا، ”بولو اُستاد!“

”تجھ کو گھما کے لگاؤں کیا۔“

”لگاؤ، ایمان سے، دن بھی بہت ہو گئے۔“

”جا رے۔“ بجھل نے مُنہ پھیر لیا۔ ”اپنے سے مستی کرتا ہے۔“ جامو کچھ بولنا چاہتا تھا کہ میں نے اُسے چپ ہو جانے کا اشارہ کیا۔ بجھل نے بھی دیکھ لیا تھا۔ شاید اُس نے بھی باور کیا

کہ کسی وجہ سے جامو اصل بات بتانے سے اجتناب کر رہا ہو گا۔ وہ بھی کچھ سرد پڑ گیا۔ میں نے سیورین سے کہہ کے چائے وغیرہ کا بندوبست کروایا، اور اِس دوران کوشش کی کہ کلکتے، فیض آباد کا ذکر ہوتا رہے۔

پانچ بجے جامو اور زورا بجھل کے پانو چھو کے اُٹھ گئے۔ ہم باہر آ گئے اور کمرے سے چند قدم دُور جا کے میں نے جامو سے پوچھا، ”میدا کب پکڑا گیا جامو بھائی؟“ وہ چلتے چلتے رُک گیا اور میری صورت دیکھنے لگا۔ ”تجھ کو پتا ہے؟“

”نہیں۔“ میں نے آہستگی سے کہا۔ ”بس اندازہ۔“

”نکّا سچ بول، ابھی تھوڑی دیر پہلے تو وہ لے گئے ہیں، اُس کو اڈّے سے۔“

”بجھل بھائی کے سامنے تمھارے اُلجھنے اور میدا، برجو وغیرہ کے ساتھ نہ آنے سے بھی کچھ سمجھ میں آتا ہے۔“

جامو نے پھر سارا واقعہ بتایا کہ تین سوا تین بجے پولیس کی بھاری نفری نے آناً فاناً اڈّے کا علاقہ گھیرے میں لے لیا۔ وہ دندناتے، بندوقیں تانے اندر گھستے ہی چلے آئے۔ اُن کے تیور بہت جارحانہ تھے۔ اُنھوں نے جامو اور زورا کو بھی پکڑ لیا تھا، لیکن بعد کو کسی پولیس افسر کی دخل اندازی پر چھوڑ دیا گیا۔ یہ پولیس افسر یقیناً جامو اور زورا سے پہلے نمٹ چکا تھا۔ جب اُنھیں پٹنا شہر میں داخل ہوتے ہی گرفت میں لے لیا گیا تھا، اور رات بھر اُن سے بازپُرس، بل کہ زیادتی کی جاتی رہی تھی۔ پولیس نے اڈّے پر پکڑ دھکڑ کی کارروائی اِتنی تیزی سے کی کہ کسی کو کچھ سوچنے، سنبھلنے کا موقع ہی نہ مل سکا۔ میدا سے بھی جامو اور زورا کی کوئی بات نہ ہو سکی۔ اتفاق سے اڈّے پر اُس وقت سارے لوگ نہیں تھے، لیکن جتنے بھی تھے، سبھی کو جانوروں کی طرح گاڑیوں میں دھکیل دیا گیا، گردن پکڑ پکڑ کے، بندوق کی بٹوں کی ضربوں سے۔ جامو کہہ رہا تھا کہ اُس نے اڈّے کے آدمیوں سے ایسا معاندانہ سلوک کبھی نہیں دیکھا۔ باہر کے پولیس والے بھی پٹنا پولیس کے ساتھ ہوں گے۔ شہری پولیس سے اڈّے کے آدمیوں کی تھوڑی بہت صاحب سلامت ہوتی ہی ہے۔ کچھ تو یہ مروّت کام آئی۔ باہر کی پولیس کے دباؤ میں شہری پولیس بھی چوکنّی رہی۔ پھر جامو اور زورا ہی اڈّے پر باقی رہ گئے۔ بعد کو چھاپے کے وقت اڈّے سے باہر رہ جانے والے لوگ اچھی خاصی

تعداد میں اڈّے پر آ گئے، اور اُن میں سے کچھ تو فرار ہو گئے، کچھ نے ہر حالت میں اڈّے پر موجود رہنے کو ترجیح دی۔

”اَب تم نے کیا سوچا ہے جامو بھائی؟“ ساری رُوداد سن کے میں نے جامو سے پوچھا۔

”اپنے کو کیا سوچنا لاڈلے۔“ جامو بیزاری سے بولا۔

میں نے اُسے مشورہ دیا کہ بہتر ہے، وہ دونوں میدا کے اڈّے واپس نہ جائیں اور کلکتے جانے والی پہلی گاڑی میں سوار ہو جائیں، یا پھر جس ہوٹل میں میرا کمرا ہے، وہیں رہیں۔ آگے جا کے اُن کے لیے مشکلیں ہو سکتی ہیں۔

دونوں نے انکار کر دیا۔ کہنے لگے کہ ایسے وقت اڈّے واپس نہ جانے سے وہاں بچ جانے والوں کی نظروں میں اُن کی کیا وقعت رہ جائے گی۔ کلکتے کے اڈّے کا ایک بھرم ہے دُور دُور تک، اور وہ تو بجھل کے لیے آئے ہیں۔ اب اُسے ساتھ لے کے ہی جائیں گے۔ اُنھوں نے اِس شہر میں کون سا جرم کیا ہے جو پولیس اُن کے پیچھے پڑی رہے گی۔ اُن کا یہاں سے اِس طرح روانہ ہو جانا فرار کے زمرے میں آ سکتا ہے، اور پولیس کو اَور شک میں مبتلا کر سکتا ہے، اور میدا بھی کیا سوچے گا۔ جامو کو توقع تھی کہ میدا جلد واپس آ جائے گا۔ پولیس یہ کارروائیاں کرتی رہتی ہے۔ عرصے سے میدا یہاں راج کر رہا ہے۔ اُس کے ہاتھ بھی لمبے ہونے چاہییں، اُس کی جڑیں ایسی کم زور نہیں ہوں گی۔

”میدا اَب شاید جلد نہ لَوٹ پائے جامو بھائی۔“ میں یہ کہنا نہیں چاہتا تھا، زبان سے نکل گیا۔

”کیوں؟“ جامو حیرانی سے بولا۔ ”ایسا کیوں بولتا ہے۔“

”کسی بنیاد ہی پر اُس پر ہاتھ ڈالا گیا ہو گا۔ پولیس اُسے پہلے کیوں نہیں لے گئی۔ اَب کیوں؟ میدا سے ضرور کوئی چُوک ہوئی ہو گی۔“ میں نے محتاط لہجے میں کہا۔

”کیسی چُوک؟ کیا مطلب ہے تیرا؟“

جامو کو شاید تفصیل سے واقعات معلوم نہیں تھے۔ معلوم بھی ہوئے ہوں گے تو اُس طرح، میدا نے جس طور سے تلقین کیے ہوں گے۔ جامو کے پٹنا آنے کے بعد میری اُس سے کوئی بات ہی کہاں ہو پائی تھی۔ میں نے ترتیب سے مختصراً اُسے ساری رُوداد سنانی چاہی۔ دھنوا سے نبرد آزمائی، میرے خاتمے کے لیے اسپتال میں گھس آنے والے حملہ آور اور نوجوان انتھونی کی موت،

پھر اکبر علی خاں کے خون تک۔ میں نے اُسے بتایا کہ مبیّنہ طور پر وہ تین آدمی تھے، اور ایک دن بعد ہی اُن تینوں کا کام تمام کر کے اُن کی لاشیں اُسی جگہ پھنکوا دی گئیں جہاں اکبر علی خاں کا خون کیا گیا تھا، اور یوں یہ باور کرانے کی کوشش کی گئی کہ اکبر علی خاں کے خونِ ناحق کی تلافی کر دی گئی ہے، اور یہ تین آدمی میدا کے ہاتھوں، یا اُس کے اشارے پر اپنے انجام سے دوچار ہوئے۔

”میدا کے ہاتھوں۔“ جامو پھیلی آنکھوں سے بولا۔

”پر اُس نے بہت بات کی، اپنے کو ایسا کچھ نہیں بولا۔“

”یہ بات کھل کے کہنے کی تھوڑی ہوتی ہے جامو بھائی! آدمی اپنے آپ سے نہیں بولتا۔ میدا کے بقول، اُسے بے خطا، بے گناہ اکبر علی خاں کے اِس طرح ختم ہو جانے کا بہت دُکھ تھا، اور وہ اکبر علی خاں کو واپس تو نہیں لا سکتا تھا۔ یہی کچھ اُس کے بس میں تھا۔ لگتا ہے، میدا سے کہیں چُوک ہو گئی۔ ظاہر ہے، انتھونی، پھر اکبر علی خاں، پھر اُن تین آدمیوں کے قتل کے بعد پولیس تماشائی تو نہیں بنی رہتی۔“

”میدا نے اِس بارے میں تجھ کو خود بولا؟ میرا مطلب ہے، اُن تین آدمیوں کا صفایا کرنے کا۔“ اُس نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں، اُس نے میرے سامنے اقرار کیا ہے۔“

جامو کے چہرے کا گوشت اُبھرا آیا، کہنے لگا۔ "پر اُس نے ٹھیک ہی کیا لاڈلے!"

"مگر پولیس کی نظر میں تو خون، خون ہے۔ میدا اکبر علی خاں کے قاتلوں کو پولیس کے آگے ڈال دیتا تو اور بات ہوتی۔ وہ تو عدالت بن بیٹھا۔"

"ایسا تو ہوتا ہے، پولیس، عدالت کی گھما پھیری کا تجھ کو پتا ہے۔ برس لگ جاتے ہیں، اُدھر میدا کو تیرا بھی دھیان ہوگا، تو ذرا اسپتال سے چھوٹنے گا تو آندھی بن کے اُس پر ٹوٹے گا۔"

"تو اُس کے خیال میں اُس نے حساب صاف کر دیا؟ جامو بھائی! میں تمھیں کیا بتاؤں، اکبر علی خاں صاحب کیسے آدمی تھے۔ وہ تین آدمی نہیں، وہ تو بہت سوں سے اُوپر تھے۔ وہ تو بڑے فرشتہ آدمی تھے۔ میں اُنھیں کبھی نہیں بھول سکتا۔ میری جگہ کوئی بھی ہوتا تو یہی کہتا۔ تم نے اُنھیں دیکھا جو نہیں۔"

"سمجھتا ہوں لاڈلے۔" جامو نے مجھے گلے سے لپٹا لیا۔

"ایک بات بولے راجا بھائی!" زور از ہریلی آواز میں بولا، "اپن ایدر میدا اوادا کا مہمان ہے۔ اپن نے تمھارا پورا بات سن لیا ہے۔ ٹھیک ہے، جو تم بولتا ہے، پر اپن کو یہ میدا دادا سالا، ماں قسم اڈّے کا دادا دکھائی نہیں پڑتا۔"

"تیرا کون سا گاٹو مار لیا ہے اُس نے۔" جامو نے اُسے ڈپٹ دیا۔

"سُن جامو بھائی، تم کچھ بولو، اپن بھی تم لوگ بیچ اُٹھتا بیٹھتا ہے شروع سے۔ یہ آدمی ٹھیک نہیں ہے ایک دم۔"

شام کو اسپتال آنے والے ملاقاتیوں کا وقت کب کا ختم ہو چکا تھا، اس لیے ہم صدر دروازے سے باہر آ گئے اور تادیر چاردیواری کے جنگلے کے پاس کھڑے رہے۔ دربان اور تعینات سپاہی مجھے پہچان گئے تھے۔ اُنھوں نے ہمارے بیٹھ جانے کے لیے اپنی کرسیاں اور بینچیں خالی کر دیں۔ ہم نے منع کیا، لیکن وہ نہیں مانے، اور ہمیں بیٹھنا پڑا۔ جامو گم سم سا ہو گیا تھا، پھر یکایک اُس کے جسم میں ہمک اُٹھی، مچل کے بولا۔ "میدا سے کوئی غلطی نہیں ہوئی چھے لاڈلے۔ کام بھی اُس نے خود نہیں کیا ہوگا۔ وہ کوئی نیا آدمی نہیں ہے جو اوچھا ہاتھ ڈالے گا۔ اپنے کو لگتا ہے، پولیس دکھاوے کے لیے اُس کو لے گئی ہے۔"

"کام اُس نے کیا، یا اُس کے اشارے پر کسی اور نے، غلطی تو کسی سے بھی ہو سکتی ہے۔ نہیں بھی ہوئی تو اندر باہر کا کوئی آدمی انگلی بھی تو اُٹھا سکتا ہے، میدا کا کانٹا دل میں لیے، یا اُس سے ناراض آدمی۔ پولیس کو شک تو میدا پر پہلے بھی ہوگا، اور شک اور گہرا ہو جائے تو پولیس بال کی کھال نکال لیتی ہے۔ سنتے ہیں، پولیس بڑی لکھنی ہو رہی ہے۔ کچھ اُس کی ساکھ کی بھی تو بات ہے۔"

"تو کیسی باتیں کر رہا ہے لاڈلے؟" جامو کرکری آواز میں بولا۔

مجھے احساس ہوا کہ اتنا کچھ نہیں کہنا چاہیے تھا۔

"تو تیرا خیال ہے، میدا جلدی نہیں آ پائے گا۔"

میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا، "ایک اندازہ ہے جامو بھائی۔"

"تو کچی بات نہیں بولتا۔" جامو یقینی لہجے میں بولا، "میں تو دوسری بات سوچتا ہوں، پھر اڈّے کا کیا بنے گا۔ واں تو اوپر کا کوئی آدمی نہیں بچا۔"

"کسی کو بھی چوکی پر بٹھا دو۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔

"اڈّا تو اپنا ہے۔"

"اپنا کیا، کون سا وہاں بیٹھنا ہے، مجھے، یا تمھیں۔"

"پھر بھی ایسے چھوڑا تو نہیں جا سکتا، بہت بڑا اور پرانا اڈّا ہے، شہر میں ایک ہی۔"

"وہاں جو رہ گئے ہیں، آپ طے کر لیں گے۔"

"واں تو اپنے کو کوئی بھی پورا دکھائی نہیں پڑتا۔"

"اُنھی میں سے کسی کو آگے بڑھا دو جامو بھائی! جان چھڑاؤ، ہمیں تو چلے جانا ہے۔ کتنا ہی بڑا اور پرانا ہو، ایسے اڈّے کی کیا فکر کرنی، جس سے کوئی واسطہ ہی نہیں رکھنا۔ ہمارے، یہاں آنے کا مقصد تو بتھل بھائی کی صحت یابی ہے۔ ابھی تم نے خود ہی کہا تھا، آپ ہی وہاں لوگ چھینا جھپٹی، مارا کوٹی کر کے طے کر لیں گے۔ ہم سامنے نہ ہوتے تو بھی ایسی صورت میں اُنھیں اپنے لیے کوئی راستہ نکالنا ہی پڑتا۔"

جامو کوئی جواب نہ دے سکا۔ اُجالا ڈوبتا جا رہا تھا۔ اُنھیں جانا تھا، اور وہ دونوں مجھ سے گلے مل کے چلے گئے۔

بتھل سبزہ زار میں بیٹھا ہوا تھا اور سیورین سے باتوں میں مصروف تھا۔ نرسیں عام طور سے مریضوں کے ساتھ کسی بے تکلفی سے اجتناب کرتی تھیں، مگر سیورین بتھل کا حکم ٹال بھی نہیں سکتی تھی۔ دوسرے یہ اسپتال کے خاص الخاص مریضوں کا حصہ تھا۔ یہاں اسپتال کے عام قواعد کا اطلاق نہیں ہو پاتا ہوگا۔ بتھل کے سامنے میز رکھی تھی، میز پر شربت بھرا جگ، گلاس، پھلوں کی تشتری وغیرہ۔ وہ خاصا تن آسان لگ رہا تھا، حویلی کے باغیچے، یا اڈّے کی چوکی پر گاؤ تکیے سے کمر ٹکائے بیٹھا ہو جیسے، بس حقہ ہی وہاں نہیں تھا۔ مجھے دیکھتے ہی سیورین اُٹھ گئی۔

"کیوں ری، کدھری کو چلی؟" بتھل نے اُسے ٹوکا۔

سیورین نے سعادت مندانہ انداز میں اندر کے کام نمٹانے کا عذر کیا اور چمکتی آنکھوں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی، "یہ بھی تو آ گئے ہیں۔"

اُن کے درمیان یہ موانست میرے لیے تعجب انگیز تھی۔ اِس کا مطلب تھا کہ میری عدم موجودگی میں وہ ایک دوسرے کو بہت جان چکے ہیں۔

میں بھی وہیں بیٹھ گیا۔ مجھے خدشہ تھا کہ بتھل مجھ سے میدا کے بارے میں نہ پوچھ گچھ کرے کہ جامو اُس سے کیا چھپا رہا تھا، اور مجھے آنا کانی کرنی پڑے۔ اِس ایک بچ پر کہ میدا پولیس کے قبضے میں ہے، اُسے قرار نہیں آتا، مگر وہ کسی اور دھن میں تھا، یا اُسے میدا کے زخمی ہو جانے کی بات پر یقین آ گیا تھا۔

دھوپ ٹم ٹمانے لگی تھی۔ تھوڑی دیر میں سیورین نے واپس آ کے کسی پیش و پس کے بغیر بتھل کے بازو کو ٹھوکا دیا۔ بتھل نے ذرا چون و چرا نہیں کی اور اُٹھ گیا۔ اُجالے کی اب رمق ہی باقی رہ گئی تھی کہ ایکی آ گئی۔ سیورین کو اب گھر جانا تھا، لباس تبدیل کر کے وہ کمرے میں چلی آئی اور بتھل کے بستر کے کنارے بیٹھ گئی۔ "تجھ کو یہی روپ سجتا ہے، اِسی کو پہنا کر۔" بتھل نے کہا۔

سیورین کا سراپا دُہرا ہو گیا۔ ساڑھی میں وہ بالکل بدل جاتی تھی۔ لہر کی طرح اُس کے سیدھے ترچھے بدن پر ساڑھی خوب کھلتی تھی۔ بتھل نے اُس کے سر پہ ہاتھ رکھ کے پیشانی کو بوسہ دیا تو اُس کے ہونٹ بھنچ گئے۔ اِس سے پہلے کہ وہ چھلک پڑتی، فوراً ہی باہر نکل گئی۔ اِن لڑکیوں کے پاس آنسوؤں کا ایک دریا چھپا ہوتا ہے۔ مجھے خیال تھا، آج بس ناشتے ہی پر اُس سے کوئی بات ہو پائی تھی، سو میں بھی باہر نکل آیا۔ وہ میری منتظر ہی تھی۔ "جا رہی ہو۔" میں نے بوجھل آواز میں کہا، "آج وقت ہی نہیں مل پایا۔"

"میں دیکھ رہی تھی۔" اُس کے لہجے میں اُداسی تھی۔

"وہ اُدھر ڈاکٹر صاحب نے بلا لیا۔ اڈّے کے آدمی، زورا

اور جامو وغیرہ آ گئے۔ اور بتھل بھائی... وہ بھی اَب موجود ہیں نا... بیدار آدمی موجود ہی ہوتا ہے، اور اَب تمھارے جانے کا وقت ہو گیا۔"

"کہو تو میں واپس آ جاؤں۔" وہ چپکے سے بولی، یہ بات وہ پہلے بھی کئی بار کر چکی تھی۔

"نہیں نہیں۔ تم اَب گھر جا کے آرام کرو۔" گھر جا کے تمھیں کل کے ناشتے کی بھی تو تیاری کرنی ہے۔"

وہ کھِل کھِلا پڑی، موتی سے بکھر گئے۔

"بس صبح بہ ترین ناشتا لے کے آنا۔ تم مانو گی تو نہیں نا۔" میں نے مسکرا کے کہا۔ "اور ہاں، ایک آدمی بڑھ گیا ہے۔ بتھل بھائی کا بھی دھیان رکھنا ہے۔ اسپتال کا کھانا کھاتے کھاتے وہ عاجز آ چکے ہوں گے۔ ویسے بھی تمھاری اُن سے اچھی دوستی ہو گئی ہے۔"

"وہ بہت اچھے ہیں۔" سیورین وارفتگی سے بولی، "میرے بابا تو بچپن ہی میں دُور ہو گئے تھے، بعد کو ماں بھی نہیں رہی۔ بابا سے باتیں کر کے ایسا لگا جیسے مجھے میرے بابا مل گئے ہیں۔ ہم دونوں میں بہت باتیں ہوئیں۔ وہ میرے بارے میں پوچھتے رہے، پھر اپنے گھر کی جنت کا حال بتاتے رہے۔ اپنی بٹی زری کا... اور کہنے لگے کہ کبھی وہاں آنا اور دیکھنا کہ وہاں کیسے لوگ بستے ہیں، اور بولے، سب تیرے جیسے ہیں۔ اُنھوں نے

بڑا مان دیا ہے مجھے۔" وہ پٹر پٹر بولتی رہی۔

کل کی طرح راہ داری کے موڑ پر میں نے اُسے رخصت کیا، اور کوشش کی کہ وہ کوئی بار لیے گھر نہ جائے۔

مجھے شبہ تھا، آج رات ڈاکٹر رائے کے گھر طلبی نہ ہوجائے۔ دوپہر اُس نے ایسا کچھ امکان ظاہر کیا تھا مگر 9 بج گئے۔ نہ ڈاکٹر آیا، نہ معمول کے مطابق رات کے دورے پر اُس کے بجائے کوئی دوسرا ڈاکٹر، نہ کوئی قاصد۔ اِس وقت تک کسی کو آ جانا چاہیے تھا۔ ایمی بھی پیچ و تاب کھا رہی تھی۔ ڈاکٹر کے دورے کے بعد وہ جیسے کسی اہم کام سے نچنت ہوجاتی تھی۔ بہ ہر حال، میں اپنی جانب سے تیار بیٹھا تھا۔ ضرور اسپتال میں کوئی مریض نازک حالت میں آیا ہوگا۔ وقتی تسلّی کے لیے آدمی طرح طرح کے عذر، قیاس کر لیتا اور امکانات تراش لیتا ہے۔ دیر ہوجائے تو یہی قیاس وسوسوں، واہموں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں، اور اُن کی کثرت پریشان بھی بہت کرتی ہے۔ خلاق آدمی تو یوں بھی اَن ہونیاں تخلیق کرتا رہتا ہے۔

کوئی ساڑھے نو بجے اسپتال کے ایک ملازم نے آ کے ڈاکٹر رائے کی آمد کی اطلاع دی۔ میں راہ داری میں جا کے کھڑا ہوگیا، اور چند ہی منٹ بعد ڈاکٹر رائے، ایک اور ڈاکٹر اور نرس کے ساتھ لپکتے جھپکتے قدموں سے کمرے کی طرف آتا دکھائی دیا۔ مجھے دیکھ کے اُس نے ہاتھ پھیلا دیا، اور میرے شانے پر ہاتھ رکھ کے بُدبُداتے ہوئے بولا، "تم انتظار کر رہے ہوگے۔"

"جی ہاں۔" میں نے بےتابی سے کہا۔

"پہلے بھائی کو ایک نظر دیکھ لوں، پھر تم سے بات ہوتی ہے۔"

"خیریت تو ہے ڈاکٹر صاحب؟"

"کچھ تو معلوم ہوگیا ہوگا تمھیں۔"

"ہاں، میدا کے بارے میں معلوم ہوا تھا۔ آج شام جب کلکتے سے آنے والے وہ دونوں، جاموا اور زورا، میدا کے بغیر بتھل بھائی کو دیکھنے آئے تھے۔" میں نے اضطراری سادگی سے کہا۔

اِس اثنا میں ہم کمرے تک پہنچ گئے تھے۔ ڈاکٹر بتھل کے پاس چلا گیا۔ اُس کا روزنامچہ دیکھا۔ بتھل غنودگی میں تھا، آہٹوں سے جاگ گیا اور اُٹھ کے بیٹھ گیا۔ ڈاکٹر نے جگہ جگہ سے اُس کا سر دبا کے دیکھا اور اطمینان کا اظہار کرتا رہا۔ ایمی کو اُس نے دواؤں اور غذاؤں کی تبدیلی کے بارے میں ہدایت کی، ایمی تیزی سے کاغذ پر مندرج کرتی رہی۔ ڈاکٹر نے صبح و شام اسپتال کی حدود میں چلنے پھرنے کی بھی بتھل کو اجازت دے دی۔ وہ سات آٹھ منٹ سے زیادہ نہیں ٹھیرا۔ میں اُس کے ساتھ ہی کمرے سے باہر آ گیا۔ سبزہ زار میں کرسیاں ابھی تک پڑی ہوئی تھیں۔ وہ اُن کی طرف بڑھا تھا کہ ٹھیر گیا اور اُس نے اپنے ساتھی ڈاکٹر اور نرس کو واپس جانے کا اشارہ کیا اور سبزہ زار میں آ گیا۔ کرسیاں نم ہوچکی تھیں مگر ایسی زیادہ نہیں کہ بیٹھا نہ جا سکے۔ کرسی سنبھالتے ہی ڈاکٹر رائے سر جھکا کے بولا،

"ایک افسوس ناک خبر ہے۔"

"کیا ڈاکٹر صاحب؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"دوپہر میں نے تمھیں بتایا تھا، آج شام اکبر علی خاں کے ہاں روایتی قسم کا اجتماع ہے۔ سنا ہے، ایک خلقت جمع تھی، مرد، عورتیں..."

اور ڈاکٹر نے وہی بتایا جس کی تمہید سے میرے دل میں ہُوک اُٹھی تھی اور میری سانسیں سینے میں رُک گئی تھیں۔

"اکبر علی خاں کی بیوی بھی اُسی کے پاس چلی گئی۔" ڈاکٹر نے کرب سے کہا۔

میں اُسے دیکھتا رہ گیا۔

"ابھی ساڑھے آٹھ بجے ایک پولیس افسر میرے پاس آیا تھا۔ اُس نے بتایا کہ گھر میں عورتوں کا اژدحام تھا۔ قرآن خوانی کے بعد وہ بین کر رہی تھیں کہ پہلے سے نیم جاں اکبر علی خاں کی بیوہ اِس آہ و بکا کی تاب نہ لا سکی۔ وہ چلی گئی۔"

میرے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ ڈاکٹر نے اپنے ہاتھوں میں میرے ہاتھ جکڑ لیے۔ "تم ٹھیک کہتے تھے، وہ دونوں ایک دوسرے کے بغیر ادھورے تھے... تمھیں یہ اطلاع دیتے ہوئے مجھے بہت دکھ ہے۔" میں گنگ بیٹھا رہا۔

"ایک آدمی چلا گیا تھا، دوسرا اُس سے اِس قدر وابستہ تھا کہ زندہ رہنا اُس کے اختیار میں نہیں رہا۔ کوئی کیا کر سکتا ہے۔ اُسے اپنے بچوں سے زیادہ شوہر عزیز تھا۔" ڈاکٹر نے ڈوبتی آواز میں کہا۔ "سوچتا رہا، کس طرح یہ دل دوز خبر تم تک پہنچاؤں۔ اِسی کشمکش و پیچ میں دیر ہوگئی۔ تم میرا انتظار کر رہے ہوگے۔ بینا سے میں نے کہا تھا کہ آج شام تم گھر آ سکتے ہو، لیکن وہ پولیس افسر آ گیا اور اُس کی زبانی یہ سن کے مجھ پہ سکتے کا عالم رہا۔ میں تو اِن سانحوں کا عادی ہوں۔ روز یہاں تماشا ہوتا رہتا ہے۔ لوگ دم توڑ دیتے ہیں اور آہ و زاری کرتے ہوئے اُن کے عزیز اُن کی میتیں لے جاتے ہیں، لیکن اِس حادثے نے مجھے نڈھال کر دیا۔ ایک ذرا سی بات پر کتنے سانحے ممکن ہو سکتے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تم سے کیا کہوں، سوائے اِس کے کہ تم ایک حوصلہ مند آدمی ہو، اپنے آپ کو سنبھالے رکھو، اور ایک بات اچھی طرح سمجھ لو۔ اِس میں تمھاری کوئی غلطی، کوئی قصور نہیں، یہ تو عزیزِ من، تانے بانے کی بات ہے۔"

مجھ سے کچھ بھی نہ کہا جا سکا۔

"میں زیادہ دیر نہیں بیٹھوں گا۔ گھر میں بینا راہ تک رہی ہوگی۔ تم سے ایک اور بات کہنی ہے۔ یہ وقت تو نہیں ہے، لیکن متعلق ہی بات ہے۔ اچھا ہے، تم باخبر رہو۔"

"جی، ڈاکٹر صاحب۔" میں نے مری ہوئی آواز میں کہا۔

"میدا اُستاد کو گرفتار کر کے شہر کی پولیس کے بجائے بیرونی پولیس کے حوالے کر دیا گیا ہے۔ بیرونی پولیس اپنے انداز سے اُس سے اور اُس کے گرگوں سے نمٹ رہی ہے۔ تمھیں یہ جان کر حیرت ہوگی، حیرت بھی اور عبرت بھی کہ میدا نے کسی بھی جرم کے ارتکاب سے صاف انکار کر دیا ہے۔ یہی شخص کل ہمارے سامنے اعتراف کر رہا تھا۔ تم شاید مجھ سے متفق نہ ہو، مگر مجھے شبہ ہے، یہی آدمی سارے المیوں کی بنیاد ہے۔ مجھے تو وہ کاذب اور پرلے درجے کا کمینہ آدمی معلوم ہوتا ہے۔ یقیناً اُسی نے تمھیں ختم کرنے کے لیے اسپتال میں مسلح آدمی بھیجے تھے جن کی زد پر انتھونی غریب آ گیا۔ اپنے اِس اقدام میں ناکامی کے بعد تمھیں منتشر و متزلزل کرنے کے لیے اُس نے اکبر علی خاں کو مار دیا۔ یوں اُس کا ایک مقصد بھی حاصل ہوتا تھا۔ اکبر علی خاں اور تمھاری قرابت کی وجہ سے لازماً پولیس سب سے پہلے تمھاری جانب ہی رُخ کرے گی اور حوالات، یا جیل میں آسانی سے تم اُس کا نشانہ بن سکتے ہو، یا پھر ایک لمبی مدت تک پولیس، عدالت کے شکنجے میں جکڑے رہو گے۔ وہ تمھارے خلاف اپنے نمک خوار پولیس والوں کی ڈوریاں ہلاتا رہے گا۔ اُسے توقع نہیں ہوگی کہ پولیس تم پر ہاتھ ڈالنے کے بجائے تمھیں آزاد کیے رکھے گی۔ دوسری بار ناکامی کے بعد پھر یہی ایک صورت، چار و ناچار رہ جاتی تھی کہ وہ دوسرے طور سے تم پر اثر انداز ہو۔ اُس نے اپنے تین آدمیوں کی قربانی دے کے اُن کی لاشیں اکبر علی خاں کے خون کی جگہ پھنکوا دیں اور تمھیں یہ تاثر دینے کی کوشش کہ میدا اُستاد چٹے کے اڈّے کا ایک با اصول، سچا اور کھرا آدمی ہے۔ وہ اپنے علاقے میں ایسی دھاندلی اور ظلم و ستم برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اکبر علی خاں کے واقعے پر اُس کا سر جھک گیا ہے اور ندامت کا یہ عالم ہے کہ تمھارے قدموں پر اپنا چاقو ڈالنے اور اڈّے سے دست برداری کا اعلان کرنے آ گیا ہے۔ اُسے اندازہ تھا، اِس عجز و انکسار، شکستگی اور پشیمانی کے اِس اظہار پر اڈّا تم اُسی کے حوالے کر دو گے، نہ بھی کرو تو اُسے تمھارے ممکنہ قہر و غضب سے تو امان مل جائے گی، اور تم نے وہی کیا جو ایک عالی حوصلہ اور کشادہ دل شخص کو کرنا چاہیے تھا۔

"وہ شروع سے تمھارے تعاقب میں تھا اور اچھی طرح جان چکا تھا کہ تم اُس کے اڈّے پر اپنا چاقو واپس لینے ضرور آؤ گے اور اِس شہر میں اُسے رُسوائی کا سامنا کرنا پڑے گا، جہاں ایک عرصے سے بلاشرکتِ غیرے وہ حکم رانی کر رہا ہے۔ وہ تو کلکتے سے تمھارے دو ساتھیوں کی آمد کے بعد اُس کی آنکھیں کھلیں کہ تم تو اُستاد بتھل کے آدمی ہو، وہ کس شخص کی جان کے درپے تھا۔ یہ تو بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالنے کے مترادف ہے۔ اُستاد بتھل کے عتاب کے خیال ہی سے اُسے ہَول آنا چاہیے۔ اُسے تو پھر یہ خوف بھی دامن گیر ہوا ہوگا کہ صحت یابی کے بعد اُستاد بتھل اپنے طور سے حقائق کی تفتیش کر سکتا ہے، اور اُس سے کچھ چھپانا آسان نہ ہوگا۔ اکبر علی خاں کے خون کی حقیقت آشنائی

کے بعد اُس کا غصہ و غم کیسا قیامت خیز ہو سکتا ہے۔ سو اَب اُستاد جُھل کے سامنے میدا بندگی ہی پیش کر سکتا تھا، اور وہ یہی کر رہا تھا۔ بہ ہر حال، مآلِ کار وہ گرفت میں آ چکا ہے۔ یہ سارے جرائم اُس نے اپنے معتبر ساتھیوں کی مدد کے بہ غیر نہیں کیے ہوں گے۔ دیکھتے ہیں، کب تک وہ رفاقت کا حق نبھا پاتے ہیں۔ اپنے سرغنہ کی پردہ پوشی کی کتنی استقامت ہے اُن میں۔ پولیس کو اصل صورتِ حال تک پہنچنے میں دیر لگ سکتی ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہوا ہے، پولیس بھی عزم کیے ہوئے ہے۔ مجرموں کو اپنے انجام تک پہنچنا ہی چاہیے۔"

ڈاکٹر کی آواز جل سی رہی تھی۔ میں نے کوئی دخل نہیں دیا۔ ایک لمحاتی تامّل کے بعد اُس نے پوچھا، "تم کوئی تردید... کچھ کہنا چاہتے ہو؟"

میں تو ششدر رہ گیا تھا۔ کچھ کہنے کا یارا ہی نہ تھا مجھے۔

"ہو سکتا ہے، میرا تجزیہ ایک فسانہ لگتا ہو، لیکن یہی کچھ نظر آتا ہے، اور میں سمجھتا ہوں، اِتنا بے جواز بھی نہیں ہے۔"

"جی، جی ڈاکٹر صاحب۔" میری آواز بیٹھ گئی۔

"سوچنا تم... میں اَب چلتا ہوں، میری کمر پر دھپ مارتے ہوئے وہ اُٹھ گیا۔ "یہ دنیا بہت عجیب ہے، جتنی دل کش اور روشن ہے، اُتنی ہی مکروہ اور اندھیری... کل ملیں گے، اور ہاں، سنو! کل صبح میرے سامنے وہی چہرہ ہو، جو تمھارا ہے۔"

میں سبزہ زار ہی میں بیٹھا رہا۔ مجھ سے اُٹھا ہی نہیں جا رہا تھا۔ جسم میں جیسے جان ہی نہیں رہی تھی۔ پھر ایمی آ گئی اور کھانے کے لیے پوچھنے لگی۔ منع کرنے پر ضد کرنے لگی۔ جی میں آیا، اُسے جھڑک دوں، لیکن یہ بھی نہ ہو سکا۔ میرا ہاتھ پکڑ کے وہ مجھے کمرے میں لے گئی اور صوفے پر میرے پاس ہی بیٹھ گئی۔ "کیا بات ہے میرے بچے!" اُس نے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دل گیر لہجے میں پوچھا۔ مجھ سے ضبط

نہ ہو سکا اور میری سسکیاں نکل گئیں۔ اُسے پرسکون ہو جانا چاہیے تھا۔ اُس نے بے قراری سے میرا سر آغوش میں لے لیا۔ "نہیں، نہیں۔ یہ کیا۔" وہ مجھے پچکارنے لگی۔ مجھے تو خیال ہی نہیں رہا کہ جُھل بھی جاگ سکتا ہے۔ میرے تو پچھلی کئی میں نہیں رہا تھا، اُمڈ اُمڈ کے آنسو آ رہے تھے۔ اُس نے مجھے بازوؤں میں بھینچ لیا۔ "میری جان! مجھے بتاؤ، ڈاکٹر کیا کہہ گئے ہیں۔"

میں نے بہ مشکل اُسے اکبر علی خاں کی بیوی کے متعلق بتایا۔ وہ ہکا بکا رہ گئی۔ "یہ کیا ہوا... نہیں نہیں۔" بہت وہ مجھے دلاسے دے رہی تھی، خود ہی پر قابو نہیں رہا۔

"یہ کیسے ہوا بچے؟" وہ پھٹی ہوئی آواز میں بولی۔

"بس... اُن کے بغیر وہ نہیں رہ سکتی تھیں... سارا گھر ہی برباد ہو گیا... اور کس وجہ سے، کس کی وجہ سے۔" میں نے بلکتے ہوئے کہا۔

"نا نا، تمھاری وجہ سے کیوں، ایسا مت سوچو۔" وہ بکھری ہوئی سانسوں سے بولی، "تم ایسا چاہتے تھے کیا..." وہ مجھے سمجھاتی اور روتی رہی۔ کہنے لگی، "آدمی کسی کی موت سے زیادہ اپنی بے بسی اور مجبوری پر روتا ہے کہ نہ کسی کو جانے سے روک سکتا ہے، نہ کسی جانے والے کو واپس لا سکتا ہے۔" اپنی ہی تلقین و تاکید سے وہ زچ ہو گئی، بولی "رو لو میرے بچے! جتنا رو سکتے ہو۔ ہمارے پاس آنسوؤں کے سوا کیا ہے۔ یہ آنسو بڑا سہارا ہیں۔ یہ نہ ہوں تو آدمی کیا کرے، اُس کا دماغ پھٹ جائے، وہ تو پاگل ہو جائے۔"

بار بار وہ گھر میری آنکھوں کے سامنے آ جاتا تھا، جہاں میں چاقو نکالے داخل ہوا تھا، اور سارے گھر والوں کو ہیبت زدہ کر دیا تھا۔ اکبر علی خاں، اُن کی بیگم نزہت، اُن کے بچے۔ کیسا بھرا پُرا گھر تھا۔ اکبر علی خاں کس والہانہ انداز میں مجھ سے اپنی بیگم کا تذکرہ کیا کرتے تھے۔ اُن کی باتیں کانٹوں کی طرح میرے سینے میں چبھ رہی تھیں۔

ایمی بھی میرے ساتھ جاگتی رہی۔ رات گئے اُس نے جھجکتے ہوئے مجھ سے کھانے کے لیے پوچھا تو اُس کے بھوکے رہ جانے کی وجہ سے میں بھی رسمًا اُس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ نہ وہ کچھ کھا پی سکی، نہ مجھ سے کچھ زہر مار کیا جا سکا۔ میں نے اُسے میدا کے بارے میں نہیں بتایا تھا کہ ڈاکٹر رائے کیا ستم تراشی کر کے گیا ہے۔ ڈاکٹر کا اندازہ درست ہے تو اکبر علی خاں کی بیگم کا قاتل بھی تو وہی میدا ہے۔ ایسے شخص کے لیے سزائے موت تو بڑی حقیر سزا ہے۔

سیورین آج اور سویرے ہی آ گئی تھی، لہلہاتی اور چہچہاتی ہوئی۔ ایمی نے اُس کے داخل ہوتے ہی اُس کی شگفتگی چھین لی۔ ایمی تو بڑی سرد و گرم چشیدہ تھی۔ سیورین کو زندگی کے اتنے جھمیلوں، اتنے اعجوبوں سے کتنا واسطہ پڑا ہوگا۔ وہ تو کمھلا گئی۔ جہاں دیدہ بزرگوں کی فعالیت اور ہوش مندی کے اطوار کبھی کبھی بے محل، سنگ دلانہ لگتے ہیں۔ ایمی نے کسی سے پوچھے بغیر ناشتا میز پر لگا دیا، جو ناشتا کم، کھانے کی باقاعدہ دعوت کا اہتمام زیادہ ہوتا تھا۔ جُھل پوری طرح بیدار تھا۔ ایمی نے ازراہِ وضع اُس سے ساتھ دینے کی درخواست کی۔ سیورین نے آج بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی، لیکن ہم تینوں بس ٹُو تکتے رہے۔ جُھل کو دنوں بعد یہ موقع ملا تھا۔ سیورین کے ہاں روغن اور سالوں کی آمیزش برائے نام ہی ہوتی تھی۔ جُھل نے لطف لیتے ہوئے کھایا، اور پھیکی پھیکی مسکراہٹ سے سیورین اُس کی داد و ستائش کا شکریہ ادا کرتی رہی۔ ساری خوش رنگی و خوش ذائقگی، خوش آوازی و خوش شامگی، خوش دلی کی پابند ہوتی ہے۔ جُھل کی ناآگہی اُس کے لیے بڑی آسودگی تھی۔

ایمی نے برتن بھی جلد سمیٹ دیے، اور ڈاکٹر رائے کے آنے سے پہلے میز صاف کر دی۔ دس بج رہے تھے، اور چند ہی منٹ اُوپر ہوئے تھے کہ جامو اور زورا نے جھجکتے ہوئے کمرے میں قدم رکھا۔ وہ نو بجے سے اسپتال کے باہر ملاقاتیوں کا وقت شروع ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔ میری طرح اُن دونوں کو بھی حیرت ہوئی ہوگی کہ جُھل نے اُن سے میدا کے بارے میں کچھ نہیں پوچھا۔ انھوں نے بھی اپنی جانب سے کچھ بتانے سے گریز کیا۔ کسی وقت بھی ڈاکٹر کے آ جانے کے خیال سے جُھل کمرے ہی میں موجود اور ناشتے کے بعد صوفے پر بیٹھا رہا۔ اُس کی معتدل حالت، خوش باشی ہی کا اثر ہوگا کہ جامو اور زورا کے چہروں پر چھایا تکدر بڑی حد تک چھٹ گیا تھا۔

وہ دونوں جُھل میں مصروف تھے کہ اُنھیں وہیں چھوڑ کے میں باہر نکل آیا۔ مراد یہی تھی کہ اُن میں سے کوئی جلد، یا بدیر باہر آ جائے گا، اور اُسے مجھ سے بات کرنے کا موقع مل جائے گا۔ جتنا میں مضطرب تھا، اُتنے ہی وہ دونوں بھی ہونے چاہیے تھے۔ یہی ہوا، چند منٹ بعد جامو باہر آ گیا۔ اُسے اکبر علی خاں کی بیگم کے سانحے کا علم نہیں تھا۔ وہ تو اڈّے کی ویرانی کا حال بتا رہا تھا۔

حُسنِ کلام

معن بن زائدہ منصور کے دربار میں آئے۔ آتے ہوئے وہ درمیانے قدموں سے ذرا تیز چلتے ہوئے آئے تھے، منصور نے اُن سے کہا، "اے معن! آپ کی عمر دراز ہو گئی ہے۔"

معن نے جواب دیا، "آپ کی اطاعت و فرماں برداری میں اے امیرالمومنین!"

منصور نے کہا، "اِس کے باوجود آپ کا جسم مضبوط اور طاقت ور ہے۔"

معن نے کہا، "آپ کے دشمنوں کے لیے اے امیرالمومنین!"

منصور بولے، "آپ میں ایک خوبی ہے۔"

معن نے کہا، "وہ آپ کو نصیب ہو اے امیرالمومنین!"

المستطرف از الفتوحی ✩ تعاون: رفیق احمد نقش

کل شام اُن کے اڈّے پر واپس پہنچنے کے بعد پولیس دوبارہ عمارت میں گھس آئی، اور بچے کھچے لوگوں کو پکڑ کے لے گئی۔ کل شام ہی سے پولیس نے اڈّے کا علاقہ حصار میں لے رکھا تھا۔ اڈّے کی اِتنی بڑی عمارت میں صرف جامو اور زورا ہی رہ گئے۔ اڈّے سے متعلق کسی بھولے بھٹکے نے آنا چاہا ہوگا تو پولیس کی فصیل عبور کر کے اڈّے تک اُس کا پہنچنا ممکن ہی نہیں رہا تھا۔ نظر پڑتے ہی پولیس نے اُسے دھر لیا ہوگا، یا پولیس کو دیکھ کے وہ بھاگ نکلا ہوگا۔ جامو اور زورا نے رات بڑے کرب میں گزاری، صبح سویرے ہی اڈّے سے نکل پڑے۔ تھوڑی دُور جا کے ہی اُنھیں اندازہ ہو گیا کہ گلیوں اور سڑکوں پر گشت خطرناک ہے۔ اسٹیشن کے قریب ایک ہوٹل میں کہیں اُنھیں عافیت ملی۔ اُنھوں نے وہیں ناشتا کیا اور خاصا وقت گزار دیا۔ لیکن اُن کی منزل اسپتال تھی، اور جگہ جگہ پولیس موجود تھی۔ کئی مقامات پر اُنھیں روک لیا گیا اور پوچھ گچھ کے بعد چھوڑ دیا گیا۔ کسی جگہ سپاہیوں کو اُن کے بیان پر یقین نہیں آیا۔ وہ اُنھیں ساتھ لے جانے لگے تھے کہ پہلے کی طرح، گشت کرتے ہوئے پولیس کے دستے میں کسی نے پہچان لیا اور نجات دلوا دی۔ اسپتال ابھی دُور تھا۔ وہ تانگے میں بیٹھ گئے۔ باقی راستے میں بھی یہی رکاوٹیں پیش آ سکتی تھیں۔ آگے پولیس کا ایک جھنڈ نظر آنے پر وہ تانگے سے اُتر گئے، اور خود پولیس کے سامنے جا پہنچے۔ اُنھوں نے

اپنی مشکل بیان کی۔ یوں ایک مددگار سپاہی کے ہم راہ کہیں
وہ اسپتال پہنچ پائے۔

جامو اپنی بیزاری اور وحشت کا ذکر کر رہا تھا کہ راہ داری کے موڑ
پر ڈاکٹر رائے آتا دکھائی دیا۔ آج اُس کے ساتھ کوئی ڈاکٹر نہیں تھا،
نہ ہی کوئی نرس تھی۔ پیچھے البتہ کچھ دُوری پر ایک خدمت گار ساتھ
چل رہا تھا۔ اُسے دیکھتے ہی میں اُس کی جانب لپک پڑا، میری
تقلید میں جامو بھی۔ درمیان میں آمنا سامنا ہو جانے پر ڈاکٹر رُک
گیا۔ ہم بھی ٹھیر گئے۔ ڈاکٹر کا چہرہ گہری سنجیدگی کی غمازی
کر رہا تھا۔ ہمارے سلام پر وہ لمحوں تک خاموش رہا، پھر میرے
بجائے اُس نے انگلی اُٹھا کے ہندستانی میں جامو کو مخاطب کیا۔
"تم بھی کلکتے سے آئے ہو؟" اُس کی آواز دھمک رہی تھی۔

جامو نے اضطراری انداز میں سر ہلا دیا۔

"دوسرا کدھر ہے؟"

جامو کی گردن کمرے کی طرف مڑ گئی۔

"کیا نام ہے تمھارا؟" ڈاکٹر نے پوچھا۔

جامو کے بجائے میں نے جواب دیا، "یہ جامو ہیں، دوسرا
اندر کمرے میں زورا ہے۔"

"کدھر ٹھیرے ہو تم لوگ؟"

جامو نے میری طرف دیکھا اور ہکلاتے ہوئے بولا، "وہ
اُدھر میدا اُستاد کے ٹھکانے پر۔"

"وہ جگہ چھوڑ دو۔" ڈاکٹر نے تحکمیہ لہجے میں کہا، "یا تو کلکتے
لوٹ جاؤ، یا اپنا کوئی اور ٹھکانا کر لو۔ جس کے لیے تم اِدھر آئے
ہو، وہ اب ٹھیک ہے۔ تین چار دن میں تم تک پہنچ جائے گا۔"

جامو نے کچھ کہنا چاہا اور خاموش رہا۔

ڈاکٹر نے اُس سے زیادہ بات نہیں کی، اور
فاصلہ طے کر کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ بٹھل کو
دیکھ کے اُس کے جسم میں لہری اُٹھی، آنکھوں کی چمک
بے اختیار اُس نے انگریزی میں کہا، "یہ تم ہو اُستاد!"
بٹھل فوراً کھڑا ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر کی آواز کی لپک سے
اُس کا مفہوم سمجھ گیا۔ "سارا آپ کا ہے ڈاکٹر ساب۔" اُس نے
ممنونیت سے کہا۔

ڈاکٹر نے اُسے بٹھا دیا اور خود اُس کے برابر بیٹھ گیا۔
ایکی نے صبح و شام بٹھل کے طبی احوال پر مشتمل کاغذات
ڈاکٹر کے سامنے کر دیے۔ وہ بہ غور اُن کا جائزہ لیتا رہا اور بٹھل
سے کہا، "دو، یا تین دن بعد جا سکتے ہو۔"

"اب بھی جا سکتا ہوں۔" بٹھل آہستگی سے بڑبڑاتے
ہوئے بولا، اور اپنی بے چینی چھپانے میں ناکام رہا۔

"جا سکتے ہو اُستاد، پر ہم جانے دیں تب..." یہ کہتے ہوئے
ڈاکٹر صوفے سے اُٹھ گیا۔ قریب ہی جامو ہاتھ باندھے ہوئے
کھڑا تھا۔ ڈاکٹر نے اُس کے پاس رُک کے کہا، "تم اپنے
ساتھی کے ساتھ شام تک اِدھر ٹھیر سکتے ہو۔"

جامو کا چہرہ کھِل اُٹھا۔ اُس نے ڈاکٹر کے پیر چھونے
چاہے تو وہ پیچھے ہٹ گیا اور دروازے کی طرف جاتے جاتے
اُس نے ہاتھ اُٹھا کے مجھے اشارہ کیا، "میرے ساتھ آؤ۔"
پھر چند قدم آگے جا کے کہنے لگا، "میدا صبح حوالات میں
مردہ پایا گیا۔ پولیس نے ابھی تک چھپایا ہوا ہے۔"

بازی گر، سب رنگ کا سب سے مقبول سلسلہ
اُمنگوں، حوصلوں، آنسوؤں اور آہوں کی داستان
ایک سر گرفتہ و جاں سوختہ نوجوان کا سفر نامۂ زندگی
پانچویں درویش کا بیان
باقی واقعات آئندہ شمارے میں

میرا جسم ڈگمگا گیا اور مجھ سے ڈاکٹر راے کا ساتھ نہ دیا جا سکا۔

وہ بھی ٹھیر گیا اور میری صورت دیکھنے لگا۔ میرا مُنہ کھلا ہُوا تھا، آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ میرا بازو تھام کے اُس نے گہری سانس بھری۔ "مجھے ابھی کچھ دیر پہلے معلوم ہُوا ہے۔" وہ آہستگی سے بولا، "چلو، اُدھر چل کے بات کرتے ہیں۔ اپنے آپ کو قابو میں رکھو۔"

مجھے نہیں معلوم، اُس کے ساتھ چلتا ہُوا میں کس طرح اُس کے دفتر تک پہنچ سکا۔ دفتر آ کے اُس نے مجھے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں نے بے حواسی سے تعمیل کی۔

وہ میرے برابر بیٹھ گیا اور ملازم طلب کر کے مشروبات وغیرہ لانے کا حکم دیا۔ ملازم کے چلے جانے کے بعد وہ بوجھل آواز میں بولا، "مجھے بھی یقین آنے میں دیر لگی۔ اُسے اِتنا غیرت مند نہیں ہونا چاہیے تھا، مگر شاید یہ غیرت کی بات نہیں۔"

میں بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔

"ارے تم... تمھیں کیا ہُوا؟" میری خاموشی پر اُس نے مجھے ٹھوکا دیا۔

"کچھ نہیں۔" میں نے ہڑبڑا کے کہا، "یہ کیا... کیسے ڈاکٹر صاحب؟ آپ کیا..."

"ہاں، یہی کچھ معلوم ہُوا ہے۔ اُس نے اپنے آپ کو ختم کر لیا ہے۔" وہ سرد لہجے میں بولا۔

"اُس نے خود کو ختم کر لیا؟" میں نے بے ربطی سے کہا۔

"تمھیں دُکھ ہو رہا ہے؟"

اُس کی آواز سینے میں ترازو ہوئی تھی، لیکن اُس نے مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔

"مجھے بھی اِسی کا دکھ ہے۔" وہ تلخی سے بولا، "سزا بھی اُس درندے نے خود منتخب کی۔"

میں نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی اور بہ مشکل زبان کھولی،

"آپ کو کیا معلوم ہُوا ہے؟"

"کچھ زیادہ نہیں۔" وہ بگڑ کے بولا، "صبح سویرے اُس کا بے حرکت جسم دیکھ کے اُس کی کوٹھری پر تعینات پہرے دار نے جانا کہ وہ سو رہا ہے، لیکن پھر پہرے دار کو شبہہ ہُوا۔ اُس نے آوازیں دیں اور دوسرے سپاہی بلا لیے اور لمحوں میں اُن پر حقیقت کھل گئی۔ اُس نے شیشہ چبا لیا تھا، یا اُس کے پاس زہر تھا۔ گلے میں پڑی مالا کے ٹوٹے چھوٹے دانے فرش پر بکھرے ہوئے تھے۔ خون کی لکیر ہونٹوں پر جمی ہوئی تھی۔ یہ تو زہر خوری کی علامت لگتی ہے۔ اصل بات تو، بہ ہر حال، تفتیش کے بعد معلوم ہو ہی جائے گی۔ کیا اڈّے کے لوگ زہر بھی اپنے پاس چھپا کے رکھتے ہیں؟" اُس نے چبھتی ہوئی آواز میں پوچھا، "میرا مطلب ہے، حفظِ ماتقدم کے طور پر۔"

"مجھے نہیں معلوم، میرا خیال ہے نہیں۔ میں نے کبھی نہیں سنا۔ اڈّے کے لوگ اِتنے بودے نہیں ہوتے۔"

"وہ اڈّے سے اُوپر کا آدمی تھا۔"

"اڈّے کے لوگ تو آخر تک اپنی جنگ لڑتے ہیں۔"

"یا یوں کہو کہ حجت کرتے ہیں، مگر کسی بنیاد ہی پر... جب کہنے کے لیے کچھ رہ ہی نہ گیا ہو..."

ڈاکٹر تُرش آواز میں بولا، "میں نے تمھیں بتایا تھا۔ یہ شہر کی پولیس نہیں تھی۔ تمھارے بہ قول، شہر کی پولیس سے اڈّے کے لوگوں کی ایک رسم و راہ ہوتی ہے۔ یہ دوسرے شہر کے سپاہیوں اور افسروں پر مشتمل پولیس تھی، بالکل اجنبی۔ اُس نے میدا کے بجائے اُس کے قریب ترین ساتھیوں سے باز پُرس کا آغاز کیا۔ اُنھیں ایک دوسرے سے الگ رکھا گیا تھا۔ تمھیں حیرت ہوگی، مجھے بتایا گیا ہے کہ میدا کا خاص مربی، مشیرِ اوّل اور دستِ راست برجو دادا ہی سب سے ناتواں ثابت ہُوا، ذرا سی اذیت نہ سہ سکا۔ سنا ہے، پولیس کو زیادہ محنت نہیں کرنی پڑی۔ کچھ پولیس کے حصار، اُس کے تیور دیکھ کے برجو دادا کا حوصلہ پست ہُوا۔ اُدھر پولیس نے وعدہ معاف گواہ کی صورت میں زندگی کی اُمید جگائی تو اُس عمر رسیدہ سے کچھ نہاں نہ رکھا گیا۔ میدا کے دوسرے مقرّبین کے آگے جب برجو دادا کے اعترافات کا گوشوارہ پیش کیا گیا تو تھوڑے بہت ہاتھ پانو مار کے اُنھوں نے بھی سپر

ڈال دی۔ پولیس نے پہلے میدا کے وفاداروں، جاں نثاروں سے حاصل کی ہوئی شہادتوں کی راتوں رات تصدیق کی، پھر اُس کی کوٹھری کا رُخ کیا اور ساری رُوداد سامنے رکھ دی۔ بڑے پولیس افسر وہاں موجود تھے۔ احتیاطاً کوئی عدالتی کارندہ بھی طلب کر لیا گیا تھا۔ میدا پر سکتہ سا طاری ہو گیا۔ اُس نے کوئی بحث نہیں کی۔ دست خط کرنے اُسے آتے تھے، انگوٹھا بھی اقرار نامے پر ثبت کرا لیا گیا۔ یاد ہے، میں نے کیا کہا تھا؟"

"جی... جی ہاں۔" میں نے بوکھلا کے کہا۔

کل ہی ڈاکٹر راے نے اُستاد میدا کے بارے میں راے زنی کی تھی۔ اُس نے کہا تھا کہ کوئی اور نہیں، شہر کے اڈّے کی چوکی کا نگراں، وہی ایک آدمی سارے المیوں کی بنیاد لگتا ہے۔ مجھے ختم کرنے کے لیے اُسی نے اسپتال میں مسلح آدمی بھیجے تھے جن کی زد پر اسپتال کا نوجوان ملازم انتھونی آ گیا۔ میدا کو باور ہو گیا تھا کہ بھائی کی صحت یابی کے بعد میں اپنا حق تو واپس لینے اڈّے ضرور آؤں گا، اور اُس کی ہزیمت کا نتیجہ رسوائی کے علاوہ اڈّے پر برسوں کی عمل داری کا خاتمہ بھی ہے۔ اپنے پہلے اقدام کی ناکامی پر مجھے منتشر کرنے کے لیے اُس نے اکبر علی خاں کو ختم کر دیا کہ اکبر علی خاں اور میری قرابت کی وجہ سے سب سے پہلے پولیس میری ہی جانب قدم بڑھائے گی۔ کسی طور پر پولیس کے نرغے میں آ جاتا ہوں تو کسی بھی وقت آسانی سے اُس کا نشانہ بن سکتا ہوں، یا پھر ایک لمبی مدت تک پولیس اور عدالت کے شکنجے میں تو جکڑا رہوں گا، اور وہ میرے خلاف اپنے نمک خوار پولیس والوں کی ڈوریاں ہلاتا رہے گا۔ میدا کو توقع نہیں تھی کہ پولیس مجھے آزاد کیے رکھے گی۔ دوسری بار ناکامی کے بعد پھر یہی ایک صورت رہ جاتی تھی کہ وہ کسی اور طرح مجھ پر اثر انداز ہونے کی کوشش کرے۔ اُس نے اپنے تین آدمیوں کی قربانی دے کے اُن کی لاشیں اُسی جگہ پھنکوا دیں جہاں اکبر علی خاں کا خون ہُوا تھا اور یوں یہ تاثر دینا چاہا کہ میدا اُستاد پٹنا شہر کے اڈّے کا ایک سچا اور کھرا آدمی ہے۔ اپنے علاقے میں وہ ایسی ہٹ دھرمی، دھاندلی برداشت نہیں کر سکتا۔ اکبر علی خاں کے سانحے پر اُس کا سر جھک گیا ہے، اور ندامت کا یہ عالم ہے کہ اب وہ میرا حق تو واپس کرنے اور

اڈّے سے دست برداری کا اعلان کرنے آ گیا ہے۔ اُسے احساس ہے، یہ کوئی تلافی تو نہیں، لیکن وہ یہی کرسکتا تھا کہ اکبرعلی خاں کے قاتلوں کو جتنی جلد ممکن ہو، انجام سے دوچار کردے۔ میدا کو اندازہ ہو گیا کہ اڈّے کی چوکی مجھے مطلوب نہیں ہے۔ اُس کی پسپائی اور پشیمانی کے اِس بے پناہ اظہار پر مجھے پگھلنا چاہیے اور اعلا ظرفی یہی ہے کہ پھر اڈّا بھی اُسی کے حوالے کردیا جائے۔ میں نے یہی کیا، میں ایسا نہ کرتا تو بھی اسپتال سے فارغ ہوجانے کے بعد میرے ممکنہ قہروغضب سے میدا کسی امان کی توقع تو کرسکتا تھا۔

ڈاکٹر رائے کی ایک ایک بات مجھے یاد تھی۔ اُس کی دیدہ وری میں کیا کلام تھا۔ گو اُس نے اپنا تجزیہ فسانہ طرازی پر محمول کیا تھا، لیکن جہاں دیدگاں کا یہی شیوہ ہوتا ہے کہ اپنے قیاس اور مفروضوں میں وہ شک کی ایک گنجائش ضرور رکھتے ہیں، اپنے تجزیوں پر اصرار نہیں کرتے اور حتمی، یا آمرانہ انداز سے اجتناب کرتے ہیں۔ کچھ بھی بے تسلسل، بے ربط اور بے جواز نہیں لگتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اُس کی زبانی یہ فسانوی خاکہ سن کے میری رگیں کھنچنے اکڑنے لگی تھیں۔ اُسی وقت سے مجھے دھڑکا لگا ہوا تھا کہ آنے والے روز و شب میں تصور سے بعید کچھ بھی سننے اور دیکھنے سے واسطہ پڑسکتا ہے۔

”میدا نے اعتراف کرلیا ہے کہ اُسی نے اکبرعلی خاں کو...؟“ میں نے پھٹی ہوئی آنکھوں سے پوچھا۔

”اور تم نے کیا سنا؟“ وہ برہمی سے بولا۔ ”اُس نے... اُس نے تسلیم کرلیا ہے سبھی کچھ، یہ میں کہہ رہا ہوں۔ اور اَب بھی کوئی شبہ ہے تمھیں؟“

”مگر کیوں؟ کیوں ڈاکٹر صاحب؟ اکبرعلی خاں بیچ میں کہاں آتے تھے۔“ میری آواز ڈوب رہی تھی۔

”یہ تو اُسی سے پوچھتے۔“ ڈاکٹر شکستگی سے بولا۔ ”آدمیوں میں بھی آدمی کہاں اور کتنے ہوتے ہیں۔ وہ آدمی ہی کتنا تھا۔ کچھ لوگ نام کے آدمی ہوتے ہیں، بہ ظاہر آدمی، بہ باطن جان ور، بھیڑیے، گدھ... اُس جنگلی نے ایک بالکل غیرمتعلق آدمی کو مار دیا۔ کچھ بھی نہیں سوچا، ذرا سا بھی خیال نہیں آیا اُسے کہ کس کا نشانہ لے رہا ہے... کون ہے، وہ شخص... اُس کا ایک گھر ہے۔ بیوی بچے ہیں۔ کیسا نفیس آدمی ہے وہ...“ ڈاکٹر رائے آہیں بھرنے لگا اور بولا، ”مجھے اکبرعلی خاں سے ملاقات کا بہت کم موقع ملا، لیکن اُنھیں دیکھ کے احساس ہوا تھا، اِس شہر میں رہتے ہوئے کیسے عمدہ شخص سے محروم رہا ہوں۔ میں نے اُن سے کہا تھا کہ اَب ملاقاتیں رہیں گی اور یہ کوئی رسمی بات نہیں تھی۔ وہ اُن لوگوں میں تھے جن سے دوبارہ ملنے کی خواہش ہوتی ہے... اور وہ اپنا انقوتی۔ وہ بھی بہت یاد آتا ہے۔ بڑا پیارا اور جوشیلا لڑکا تھا۔ اُس نادان نے فرار ہوتے ہوئے لوگوں کے آڑے آنے کی حماقت کی تھی، مگر اکبرعلی خاں کس کے راستے کی رکاوٹ بنے تھے... دو خاندان اُجڑ گئے اُس کمینے کی وجہ سے... اور وہ آسانی سے مرگیا۔“

ڈاکٹر کی دل دوز باتوں سے میرا سینہ کٹ سا رہا تھا۔ دیر تک ہم دونوں سر جھکائے چپ بیٹھے رہے۔ خدمت گار کی آمد پر ڈاکٹر سیدھا ہو گیا۔ خدمت گار نے چائے بنانی چاہی تھی کہ ڈاکٹر نے اُسے واپس کردیا اور خود چائے بنانے لگا۔ مجھے اُس کا ہاتھ روک کے یہ خدمت انجام دینی چاہیے تھی، لیکن میرے ہاتھ پیر ہی اینٹھے ہوئے تھے۔

”کیا سوچ رہے ہو؟“ اُس نے آہستگی سے پوچھا۔

”کچھ نہیں۔“ میں نے ناتوانی سے کہا۔

”ہاں، اَب کہنے کو رہ بھی کیا جاتا ہے۔ وہ لوگ جو چلے گئے، اُس جان ور کے اُٹھ جانے کے بعد واپس تو نہیں آسکتے۔“

میں نے کچھ نہیں کہا۔

”آج کسی وقت اکبرعلی خاں کی بیگم کی تدفین ہوجائے گی۔“ ڈاکٹر یاسیت سے بولا۔ ”اُدھر ڈاکٹری سند اور دیگر تحقیقات مکمل ہونے تک پولیس رازداری برت رہی ہے۔ ظاہر ہے، پولیس کو خدشہ ہوگا کہ اُس پر زیادتی اور ظلم کا کوئی الزام نہ آجائے حالاں کہ میدا اور اُس کے ساتھیوں کے اعتراف کے وقت اُس نے اپنے طور پر ساری احتیاطیں کرلی تھیں، لیکن میدا کے واقعے سے معاملہ پیچیدگی اختیار کرگیا ہے۔ غفلت اور تشدد کے الزامات پولیس پر عائد کیے جاسکتے ہیں، اور زیادہ دیر تک میدا کی خبر روکے بھی نہیں رکھی جائے گی۔ اکبرعلی خاں کی بیگم کالج میں پڑھاتی تھیں اور فلاحی کاموں میں بھی حصہ لیتی تھیں۔ پولیس کے خیال میں ایک بڑا ہجوم جنازے کے ساتھ ہوگا۔ طلبہ ویسے ہی مشتعل ہیں۔ اکبرعلی خاں کے قاتلوں کی گرفتاری تک اُنھوں نے کلاسوں میں جانے سے پہلے ہی انکار کیا ہوا ہے۔ کاروبار کئی دن سے ٹھپ پڑا ہے۔ بیگم کی ناگہانی مستزاد ہوئی، شہر میں سُلگتی آگ اَور بھڑک سکتی ہے۔ اِسے فرو کرنے، لوگوں کا غم و غصہ اور خوف کم کرنے کے لیے پولیس کو میدا کے اعتراف اور اُس کے انجام کی خبر تدفین سے پہلے عام کرنی ہوگی۔“

ڈاکٹر خودکلامی کے انداز میں جانے کیا کیا قیاس آرائیاں کرتا رہا۔ میں نے کچھ سنا، کچھ نہیں۔ میرے سامنے چائے کی پیالی رکھی تھی۔ ”تم نے چائے نہیں لی؟“ اُس نے میری کمر تھپکتے ہوئے کہا، ”ٹھنڈی ہوجائے گی۔“

میں نے بہ عجلت پیالی اُٹھا کے مُنھ سے لگالی۔ ابھی کچھ گرم تھی۔ حلق چیرتے ہوئے دو چار گھونٹوں میں پیالی خالی ہوگئی۔

”ابھی شہر کے معتدل ہونے میں وقت لگنا چاہیے اور میدا کی بات پر یقین آنے میں... افواہوں کا ایک بازار گرم ہوگا۔ ایک عرصے سے یہاں اُس کا راج تھا، شہر میں ایک دوسری حکومت کے مانند۔ کتنے لوگ اِس راج پاٹ سے بالواسطہ طور پہ بھی وابستہ ہوں گے، اُن کا کیا بنے گا۔ گرفتار کچھ لوگ تو جلد ہی چھوڑ دیے جائیں گے... دیکھو، آگے کیا ہوتا ہے۔ پہلے جیسی اڈّے کی سلطنت قائم ہونے میں ایک وقت لگ جائے گا اور شاید کبھی نہ ہوپائے۔ تمھارا کیا خیال ہے؟“

”جی، جی ہاں۔“ میں نے کھوئی ہوئی آواز میں کہا۔

”تمھیں کیا ہوگیا ہے؟“

”میں، میں بالکل ٹھیک ہوں ڈاکٹر صاحب!“ میں نے خود کو سمیٹتے ہوئے کہا۔ ”یہ سارا کچھ بہت...“

”ہاں، بہت عجیب ہے۔“ وہ میری بات کاٹ کے بولا، ”عجیب اور حیران کن، الم ناک بھی۔ اِتنی تیزی سے صورتِ حال یہ شکل اختیار کرلے گی، اِس کی توقع نہیں تھی۔“

میں نے کہنا چاہا، ”اِتنی تیزی سے تو یہ سارا کچھ اُسی کی وجہ سے ممکن ہوا ہے“، لیکن میں نے زبان بند رکھی۔

”مگر ایسا غلط بھی کیا ہے۔“ وہ کسمسا کے بولا، ”مآل کار تو یہی ہونا چاہیے تھا۔“

”ہونا تو کچھ نہیں چاہیے تھا۔“ میں نے اٹکتی زبان سے کہا۔

”بے شک، مگر بدقسمتی سے جو ہوچکا تھا، اور جن لوگوں کی وجہ سے ہوا تھا، اُنھیں باقی رہنے کا کوئی حق نہیں تھا، بہ ہر حال، اَب تمھیں... تمھیں پُرسکون ہونا چاہیے۔“

”جی ہاں۔“

ڈاکٹر ایک حساس آدمی تھا۔ میرے لہجے کی تلخی اُسے محسوس ہوئی ہوگی، کہنے لگا، ”میری مراد ہے، اَب پولیس وغیرہ کی اُلجھنوں سے تم آزاد ہو۔ گو آزادی کا یہ احساس بہت سے
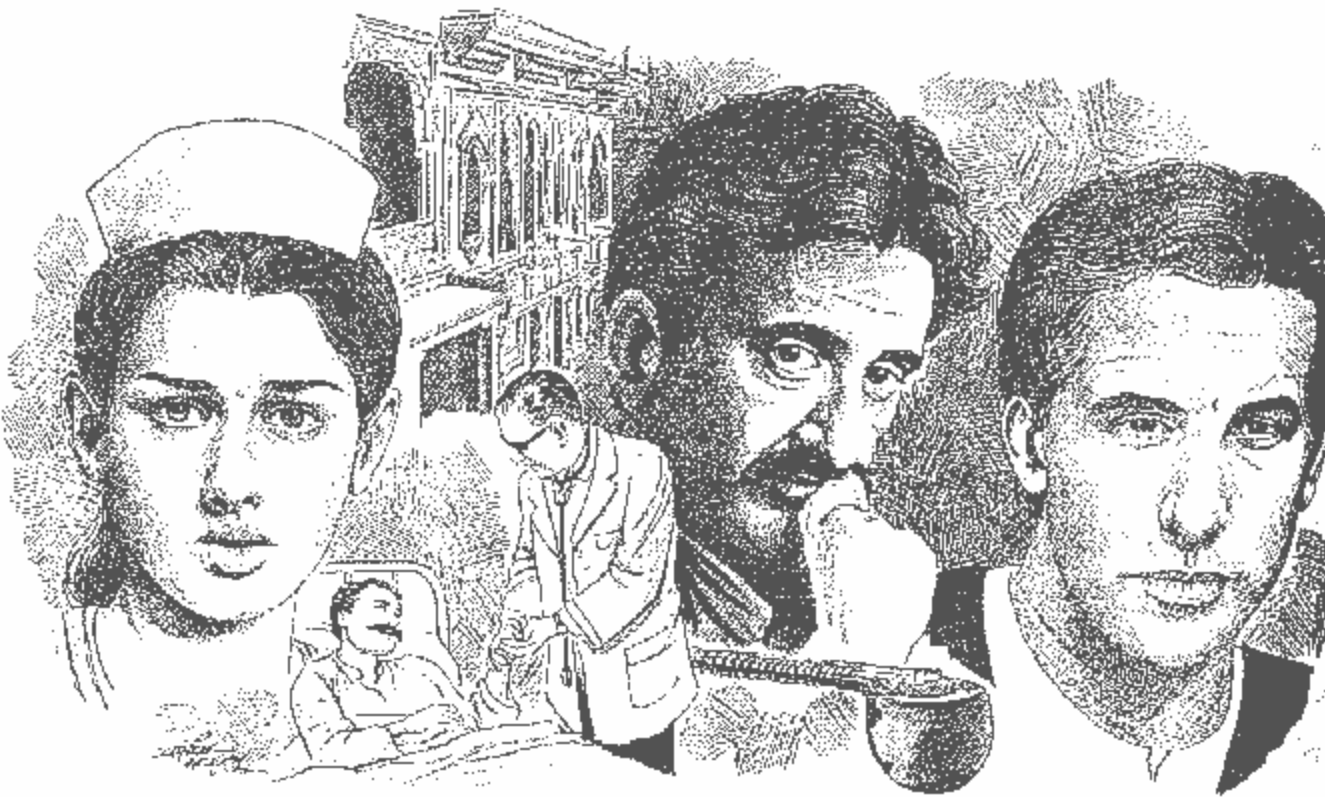
دُکھوں سے آلودہ ہے، مگر تمھاری کوئی لغزش یا نادانی مجھے نظر نہیں آتی۔ تمھیں بھائی کے پاس پہنچنے کی بے چینی تھی، اور راستے بند کر دیے گئے تھے۔ پناہ کے لیے تم کسی گھر میں داخل ہو گئے، بے سوچے سمجھے۔ اتفاق سے وہ گھر اکبر علی خاں کا تھا۔ پھر کوئی چارہ نہ دیکھ کے تم نے انتہا پسندانہ فیصلہ کیا کہ تمھیں خود میدا کے پاس جا کے اُس سے نبرد آزما ہو جانا چاہیے۔ کسی اعتماد ہی میں تم نے یہ قدم اُٹھانے کا ارادہ کیا ہوگا۔ تمھارے نہ چاہتے ہوئے اکبر علی خاں تمھارے ساتھ ہو گئے۔ اُن کی بھی کوئی غلطی نہیں تھی۔ وہ ایک باوضع اور دردمند شخص تھے۔ کاش وہ تمھارے ساتھ نہ جاتے، میدا کے ٹھکانے پر تمھارے ساتھ جو کچھ ہوتا، اُسے تم ہی بھگت لیتے، تم تو اکیلے ہی جانا چاہتے تھے، اور اکبر علی خاں تمھارے وکیل اور طرف دار کی حیثیت سے اُس بدباطن کے سامنے نہ آتے تو اُن کا وقت بھی نہ آ پاتا۔ یہ سارا اتفاقات کا سلسلہ ہے عزیزِ من! اِس میں تم سے کہاں کوتاہی ہوئی۔''

''کوتاہی تو میری ذات کی ہے ڈاکٹر صاحب! میں کبھی ایسا نہیں چاہتا، مگر جانے کیا ہو جاتا ہے۔'' میری آواز بھرا گئی۔ ''لوگ مر جاتے ہیں، گھر برباد ہو جاتے ہیں، ایک جگہ نہیں، کتنی جگہ یہی کچھ ہوتا رہا ہے۔ آپ نے اکبر علی خاں کا گھر نہیں دیکھا، میں نے دیکھا ہے۔ کوئی مثالی گھر ہی ایسا ہو سکتا ہے، کیسے خوش و خرم زندگی کی اُمنگیں لیے ہوئے لوگ، شائستہ، علم دوست، ایک دوسرے پر مر مٹنے والے، لوگوں کے کام آنے والے، بار بار وہ گھر سامنے آ جاتا ہے۔ اور میری آنکھیں بہت جلتی ہیں، کہتے ہیں، بعض لوگوں کے قدم ہی نحس ہوتے ہیں۔ میں اُنھی لوگوں میں ہوں۔''

''ہا، کیا فضول بات کرتے ہو۔'' اُس نے مجھے جھڑک دیا، پھر دھیمے لہجے میں بولا، ''یہ لغو گوئی تم سے مطابقت نہیں رکھتی۔ تم ایک سچے اور بہادر نوجوان ہو، تم نے کب کسی کا بُرا چاہا تھا۔ وہ تو کڑی سے کڑی ملتی گئی اور جس کی وجہ لازماً تم نہیں تھے۔ تمھارا مقابل تو ایک دوسرا آدمی تھا، وحشی، جنونی۔ یہی افسوس ہے کہ ایسے پنج کو تو تنّوں کے آگے ڈالنا چاہیے۔ میں سوچتا ہوں تو بڑی حیرت ہوتی ہے۔ وہ کتنا بڑا بہروپیا تھا، صرف اپنے آپ سے واسطہ رکھتا تھا، کسی طور سے سہی، اُسے اپنی بالادستی سے غرض تھی۔'' میری تائید و تردید سے کیا فرق پڑتا تھا۔ وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔

''مجھے جانا چاہیے۔'' یکایک اُسے بے کلی سی ہوئی۔ اُس نے دستی گھڑی دیکھی اور بولا، ''چند مریض دیکھنے ہیں، انتظار کر رہے ہوں گے۔ تم یہاں بیٹھنا چاہو تو بیٹھو۔ مجھے واپس آنے میں ایک ڈیڑھ گھنٹا لگ سکتا ہے۔ صُبح آنے والے پولیس افسر سے میں نے کہا تھا کہ وہ تفصیلات سے آگاہ کرنے کے لیے ایک بار پھر زحمت کرے۔ آئی جی کی ہدایت پر صُبح وہ بہت کم وقت کے لیے آیا تھا، کسی بھی وقت وہ دوبارہ آ سکتا ہے، لیکن اب کیا، جزئیات سے کیا دل چسپی۔ مجھے تو تمھارا خیال تھا، شکر ہے، تم شرمندہ نہیں ہوئے۔'' وہ صوفے سے اُٹھ گیا تھا۔ میں بھی کھڑا ہو گیا۔ ''تم جا رہے ہو؟'' اُس نے بزرگانہ تیور سے پوچھا۔

''جی ڈاکٹر صاحب!'' میں نے مؤدب لہجے میں کہا۔

''ہاں، یہی ٹھیک ہے۔ اُدھر بھائی کے پاس جاؤ، اور دیکھو! اُسے ابھی کچھ نہ بتانا، اُس کے پاس موجود اپنے ساتھیوں کو بھی تاکید کر دینا۔ میں دوپہر آنے کی کوشش کروں گا، یوں اب ایسی ضرورت بھی نہیں۔ وہ تیزی سے صحت کی طرف مائل ہے۔ تم بھی اب اپنا بار کم کرو، یہ شانے سیدھے کرو۔'' دروازے سے نکلتے ہوئے وہ بولا، ''تمھارے دوسرے ساتھی کو بھی رات تک کمرے میں ٹھیرنے کی اجازت دی گئی تھی، لیکن میں سمجھتا ہوں، اب اُن کا میدا کے ٹھکانے پر واپس جانا مناسب نہیں، کمرے میں رات کو صرف ایک سمجھدار، مریض کے ساتھ رہ سکتا ہے۔''

''آپ بے فکر رہیں، وہ کسی سرائے، ہوٹل میں ٹھیر جائیں گے۔ ایک دو روز کی بات ہے۔''

وہ سوچنے لگا، پھر بولا، ''اُن دونوں کے لیے اسپتال ہی میں کوئی انتظام کرنا چاہیے۔ کیا نام بتایا تھا تم نے اُن کا؟''

''جامو اور زورا۔'' میں نے نیچی آواز سے کہا۔

''اڈّے ہی کے لوگوں کے نام معلوم ہوتے ہیں۔'' وہ پھیکی مسکراہٹ سے بولا، ''میرا خیال ہے، وہ اب اُس طرف کا سوچیں ہی نہیں۔ اُن کا جو سامان اسباب وہاں رکھا ہے، اُس پر خاک ڈالیں، میدا کے علاقے میں بڑی کشیدگی ہوگی۔ پولیس سارے شہر میں پھیلی ہوئی ہے۔ وہاں تو چپّے چپّے پر ہوگی، اور ہاں،

اُن سے کہنا، وہ آج باہر بھی نہ نکلیں، بیگم اکبر علی خاں کے جنازے پر جانے کیسے حالات ہوں۔ حالاں کہ اُس سے بدتر کیا ہوگا جو گزشتہ دنوں ہو چکا ہے۔''

اسپتال کی مرکزی عمارت کے استقبالی وسیع و عریض ہال میں مجھے چھوڑ کے وہ ہاتھ ہلاتا ہوا ایک جانب چلا گیا۔ کچھ دیر میں وہیں کھڑا رہا۔ اب گنتی کے چند سپاہی وہاں نظر آتے تھے۔ اسپتال کے اندرونی حصّوں میں بھی اُن کی تعداد ہونے کے برابر رہ گئی تھی۔

سورج آسمان کے وسط میں پہنچ چکا تھا۔

جامو، زورا اور بجّھل کمرے کے باہر راہ داری کے سائے میں کرسیوں پر یوں بیٹھے ہوئے تھے، جیسے اپنے گھر کے کسی گوشے میں۔ کرسیوں کے سامنے رکھی بیضوی میز بسکٹوں، پھلوں کی تشتریوں اور چائے کی پیالیوں سے بھری تھی۔ اسپتال کے مخصوص نئے دُھلے ہوئے لباس میں بجّھل خاصا تر و تازہ نظر آ رہا تھا۔ پہلے زورا نے مجھے دیکھا اور بے قرار ہو گیا۔ ''ہے، اپنا راجا بھائی۔'' وہ نعرہ لگاتے ہوئے اُٹھا اور آدھے راستے میں مجھے جا لیا، اور بے تحاشا گلے سے لپٹ گیا۔ ''ابھی کیدر سے دادا؟ اِتی دیر ہو گئی؟''

''ڈاکٹر صاحب نے روک لیا تھا۔'' میں نے اُس کے جوش و خروش کا ساتھ دینے کی کوشش کی۔ ''بجّھل بھائی بھی تو بہت ٹھیک لگتے ہیں۔''

''ایک دم فٹ فاٹ، چیچے مافک۔ لگتا ہی نہیں۔ اِتنے دن بستر سے چپکا پڑا تھا۔ دیکھا نہیں رے؟'' وہ چہک کے بولا۔ چند قدم بعد ہم اُن تک پہنچ گئے۔ زورا سبزہ زار سے میرے لیے کرسی اُٹھا لایا۔ پہلے مجھے بٹھایا، پھر خود بیٹھا۔

ڈاکٹر راے کے پاس سے میرے آنے کے بعد بجّھل کو ایک سوال کی تکرار کا عارضہ ہو گیا تھا کہ ڈاکٹر نے اُس کے بارے میں کچھ نیا تو نہیں کہا ہے۔ میں نے حسبِ معمول اُسے مطمئن کرنا چاہا کہ ڈاکٹر نے اطمینان ظاہر کیا ہے اور ایک دو دن بعد چھٹی کر دی جائے گی۔

''ایک دو دن کیوں؟'' وہ خشونت سے بولا۔

میرے بجائے جامو نے رسانی سے کہا، ''ٹھیک ہے اُستاد! اپنی کون سی گاڑی چھوٹ رہی ہے سالی۔ کچھ سوچ سمجھ کے ہی ڈاکٹر بولتا ہوگا۔ اُس کو مریض پاس اٹکائے رکھنے کا شوق تو نہیں ہوگا۔''

بجّھل کی پیشانی سکڑ گئی، اور وہ مجھے گھورتے ہوئے بولا، ''تیرا منہ کیوں پھولا ہوا ہے رے؟''

میرا جسم اکڑ گیا۔ ''مجھے کیا ہوا ہے؟''

''ہاں راجا بھائی!'' زورا نے بے ساختہ بجّھل کی ہم نوائی کی۔ ''ماں قسم، ہم کو بھی تھوڑا کھنچا ہوا، بندھا ہوا لگتا ہے۔ بولو، کیا بات ہے؟''

''کچھ نہیں۔'' میں نے چڑ کے کہا، ''کیا بات ہوتی؟''

اُنھیں مجھ پر یقین نہیں آیا۔ تینوں کی نظریں مجھ پر منڈلانے لگی تھیں اور مجھے خود کو چھپانا مشکل ہو رہا تھا۔

''ڈاکٹر نے کچھ بولا؟ ٹھیک ٹھیک بول۔'' بجّھل نے دھمکتی اور شبہ بھری آواز میں پوچھا، ''اپنے کو فرق نہیں پڑتا۔''

''نہیں پڑتا تو کرید کیوں کر رہے ہو؟'' میں نے ناراضی سے کہا، ''کیا سمجھ رہے ہو تم، میں جھوٹ بول رہا ہوں۔ شام کو وہ آئے تو خود پوچھ لینا اور کاغذ پر دستخط کروا لینا۔''

آدمی کا اپنے ہاتھ پر، اپنی زبان اور حرکات و سکنات پر قابو ہو سکتا ہے، لیکن چہرے کے آتے جاتے رنگوں پر اختیار کے لیے بہت مہارت اور قدرت چاہیے۔ ہر دانا اور ذہین آدمی میں شک کی ایک خوبی یا خامی بہ درجۂ اتم ہوتی ہے۔ میں ڈاکٹر کے پاس سے آ رہا تھا۔ میرے غبار آلودہ چہرے سے بجّھل کے سر میں وہم و گمان کا بیلا نے چاہیے تھے۔ میرا دماغ بھٹکا ہوا تھا اور بجّھل کی دل جوئی کے لیے کوئی شافی عذر نہیں سوجھ رہا تھا، مگر جامو بلا کا معاملہ فہم تھا۔ بات بدلنے کے لیے اُس نے مجھے چائے کی پیش کش کی۔ مجھے کسی چیز کی خواہش نہیں تھی۔ میرا تو دل ہی لوٹ رہا تھا، لیکن میں نے منع نہیں کیا اور مجھے یاد آیا، ابھی صبح کے دورے پر ڈاکٹر نے ازخود بجّھل کو دو تین دن بعد رخصت مل جانے کا مژدہ سنایا تھا۔ بجّھل کے سر دھو جانے کے بعد اب دوبارہ کچھ یاد دلانا، یا یہ ذکر چھیڑنا بے محل تھا۔ ویسے بھی سنگین بیماری سے اُٹھنے اور معمول کے خلاف اِتنے دن کاٹنے کے بعد تنک مزاجی اور زود رنجی کی ایک رعایت رُوبہ

صحت شخص کا حق ہوتی ہے، سو میں نے حجت نہیں کی۔ ٹکوزی سے ڈھکی کیتلی سے جامو نے میرے لیے اہتمام سے چائے بنائی، اور زورا نے بسکٹ کی تشتری آگے رکھ دی۔ بنجھل کا تکدر دُور کرنے کے لیے مجھے کچھ اِسی قسم کے مثبت رویّے کا تاثر دیتے رہنا چاہیے تھا۔ میرے آنے سے پہلے جامو کلکتے کی رُوداد سنا رہا تھا۔ زورا کے اشتیاق پر اُسے بات جاری رکھنے کا بہانہ مل گیا۔ زورا کے اشتیاق کا اظہار بھی دانستہ ہوگا۔ دونوں کا مقصد بنجھل کی توجہ مبذول کیے رکھنا تھا۔ ہرچند انھیں میدا کی خبر سنانے کے لیے میں بری طرح مضطرب تھا، لیکن سرِ دست یہ ممکن نہیں تھا۔

میں چوں کہ اُن کے درمیان موجود نہیں تھا، اِس لیے جامو نے مختصر طور پر پس منظر سے مجھے آگاہ کیا۔ اُس نے بتایا، کلکتے میں سنگھا نامی نوجوان ایک روز اڈّے پر وارد ہوا اور اڈّے سے وابستگی کی درخواست کی۔ سے پور کا وطنی تھا، صاف ستھرا شکل و صورت میں اچھا بھلا، قد میں اُٹھا، جسم کا گٹھا ہوا، ہاتھ پیر کا مضبوط، تیوروں میں بانکا، کم گفتار اور کچھا الگ الگ، کھویا کھویا نظر آتا تھا۔ جامو نے قبولیت میں عجلت نہیں کی۔ کئی دن تک اچھی طرح دیکھا بھالا، پرکھا اور چاقو پر گرفت اور تل کی آزمائش کے بعد ہامی بھرلی۔

عشرے کے قریب گزرا ہوگا کہ ایک رات سونا گاچھی کے بازار کے چودھری کا قاصد ہانپتا کانپتا اڈّے آیا اور دُہائیاں دیں کہ کانتا بائی کے بالاخانے میں سنگھا نے اُدھم مچایا ہوا ہے۔ معلوم ہوا، جب محفل گرم تھی اور حسن و جمال میں بے مثال، دُور دُور تک مشہور نینا رقص کررہی تھی کہ سنگھا نے بالاخانے میں داخل ہو کے نینا کو آغوش میں بھرلیا اور بدسلوکی کی۔ اُسے روکنے کی کوشش کی گئی تو اُس نے چاقو نکال لیا اور محفل میں موجود شائقین کو دھمکی دی کہ وہ سارے وہاں سے چلے جائیں، نینا صرف اُس کی ہے، اور آج کے بعد کسی کے سامنے گائے گی، نہ ناچے گی۔ عام لوگ کانتا بائی کے بالاخانے کا رُخ کم ہی کیا کرتے تھے کہ صاحبانِ ثروت ہی بینا کی دل رُبائی اور عشوہ طرازی کے متحمل ہوسکتے تھے۔ محفل میں اُس وقت شہر کے بااثر لوگ موجود تھے۔ سنگھا کی چاقو نمائی پر وہ آگے پیچھے فرار ہوگئے اور اُن میں سے کسی نے بالاخانے سے اُترتے ہی

پولیس کو مطلع کردیا۔ بازار کے چودھری نے پولیس کے بجائے اڈّے کی طرف قاصد بھیجا تھا کہ یہ بنجھل کے اڈّے کا معاملہ تھا اور سنگھا کا تعلق اڈّے سے مسلّم ہوچکا تھا۔ اُدھر سنگھا کی دیوانگی بڑھتی گئی۔ وہ نینا کو ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔ اُس کی دست درازی سے نازک اندام نینا ایسی دہشت زدہ ہوئی کہ بے ہوش ہوگئی۔ اڈّے کے آدمی پہنچنے سے پہلے پولیس بالاخانے پہنچ گئی، بڑی مشکل سے سنگھا کو قابو میں کیا اور ساتھ لے گئی۔

تین چار دن بعد جامو کی سفارش پر سنگھا کو چھوڑ دیا گیا۔ جامو اُسے اڈّے لے آیا اور سورج غروب ہونے سے پہلے شہر سے نکل جانے اور دوبارہ اپنی صورت نہ دکھانے کا حکم دیا۔ جواب میں سنگھا نے چاقو کھول لیا۔ جامو کے کہنے کے مطابق اُس نے حکمِ عدولی کی اور کہا کہ اڈّے پر اور بھی چاقو باز ہیں، پہلے وہ اُن سے پنجہ آزمائی کرکے حوصلہ نکال لے۔ ضرورت پڑی تو جامو بھی سامنے آجائے گا، جامو نے جمرو کو اُس کے آگے کھڑا کردیا تھا، لیکن سنگھا نے جامو کی پیش کش کم زوری پر محمول کی اور کہنے لگا کہ وہ تو اب اڈّے کی چودھراہٹ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ جامو نے بہت اُس کی ہرزہ سرائی برداشت کی۔ سنگھا نہیں مانا اور للکارتا رہا تو جامو کو اُٹھنا پڑا اور نتیجہ وہی ہوا، جو ہونا چاہیے تھا۔ زیادہ وقت صرف نہیں ہوا۔ جامو نے تین چار پھیروں میں سنگھا کو تہی دست کردیا، اور فرش سے اُس کا چاقو اٹھا کر اور اُس کی طرف اُچھال کے ایک اور موقع دینا چاہا، لیکن سنگھا نے چاقو گرفت میں نہیں لیا، بل کہ ٹھوکر مار کر جامو ہی کی طرف لوٹا دیا، اور سر جھکائے اڈّے سے نکل گیا۔ جامو کے اشارے پر جمرو نے اُس کے پیچھے جا کے کچھ رُپے اُس کی جیب میں ڈال دیے تھے کہ واپسی کے سفر کے لیے اُس کے پاس زادِ راہ ہو، نہ ہو۔ سنگھا نے ایک نظر جمرو کو دیکھا اور جیب سے رُپے نکال کے سڑک پر پھینک دیے اور آہستہ قدموں سے دُور ہوتا رہا۔ جمرو نے پھر اُس کا تعاقب نہیں کیا۔

اڈّے کے آدمیوں نے سمجھ لیا تھا کہ سنگھا کا قصہ تمام ہوگیا ہے۔ رات کی ابھی ابتدا تھی، اڈّے پر کسی نے آکے اطلاع دی کہ کانتا بائی کے بالاخانے پر خون ہوگیا ہے۔ جامو نے صورتِ حال جاننے کے لیے فوراً آدمی دوڑائے۔

ایک ہجوم وہاں موجود تھا اور شور مچا ہوا تھا۔ پولیس نے علاقے کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ اڈّے کے آدمیوں کو اندر جانے سے روک دیا گیا۔ معلوم ہوا کہ ایک نہیں، تین خون ہوئے ہیں۔ بعد کو عینی شاہدوں نے بتایا کہ سورج غروب ہوچکا تھا اور بالاخانے میں موجود ہر کوئی رات کی بزم آرائی کے اہتمام میں مصروف تھا۔ سازندے آچکے تھے، شمعیں روشن کی جارہی تھیں اور لڑکیاں سج بن رہی تھیں۔ نینا بھی تیار ہورہی تھی۔ اچانک سنگھا بالاخانے میں نمودار ہوا، سازندوں نے مزاحمت کی۔ سنگھا انھیں دھکیلتا ہوا اندر بڑھتا گیا۔ پہلے کانتا بائی سے اُس کی مڈبھیڑ ہوئی۔ کانتا نے شور مچانا شروع کیا تھا کہ سنگھا کی ضرب سے دُور جا پڑی۔ سنگھا نینا کے پاس پہنچ گیا اور ساتھ چلنے کی عاجزی کی۔ پھر چاقو نکال کے کہا کہ نینا نہیں مانی تو وہ اُسے ختم کردے گا۔ نینا نے اِدھر اُدھر چھپنے کے جتن کیے، دوسری لڑکیوں کے پاس پناہ حاصل کرنی چاہی، لیکن سبھی کا بُرا حال تھا۔ نینا کا بازو پکڑ کے باہر لے جانے کے لیے سنگھا پلٹ گیا تھا کہ کانتا بائی پھر مزاحم ہوگئی۔ سنگھا نے چاقو چلا کے اُسے دُور کیا اور قریب ہی کہیں سے چادر اُٹھا کے نینا کا جسم ڈھانپنے کی کوشش کی اور نینا بچتی پھڑ پھڑاتی نینا اُس کے قبضے سے نکلنے میں کام یاب ہوگئی۔ وہ سیدھی دوسرے کمرے کی طرف بھاگی اور دروازہ بند کیا چاہتی تھی کہ سنگھا وہاں پہنچ گیا اور اندر کمرے میں جا کے اُس نے دروازہ بند کرلیا۔

کچھ دیر نینا کی سسکیاں سنائی دیتی رہیں، پھر خاموشی چھا گئی۔ خاصی دیر بعد پولیس دروازہ توڑ کے کمرے میں داخل ہوئی تو دونوں خون میں لت پت پڑے تھے، دونوں ختم ہوچکے تھے۔

اُس رات جامو اور اڈّے کے کئی لوگوں کو تھانے طلب کرلیا گیا۔ رات بھر تفتیش ہوتی رہی، مگر یہ محض خانہ پُری تھی۔ جامو کے پاس سنگھا کے بارے میں پولیس کو مطمئن رکھنے کے لیے زیادہ کچھ نہیں تھا۔ صبحِ کاذب کے وقت اُنھیں اڈّے واپس جانے کی اجازت مل پائی۔

سنگھا کا لاشہ مُردہ خانے میں رکھ دیا گیا۔ کلکتے میں کوئی اُس کا پُرسانِ حال نہیں تھا۔ پہلے جے پور، پھر پٹیالا پولیس سے کلکتا پولیس کے رابطے کے نتیجے میں سنگھا کے کوائف معلوم ہوسکے کہ اُس کے محترم و معزز باپ کا تعلق جے پور ہی سے ہے، لیکن ایک عرصے سے وہ پٹیالا کے مہاراجا کے دربار میں اہم منصب پر فائز ہے، سنگھا اُس کا اکلوتا بیٹا تھا، بڑے ناز و نعم میں اُس کی تربیت ہوئی تھی۔ جسمی کس بَل اور حربی فنون کے ساتھ اُسے اعلا تعلیم بھی دی گئی تھی۔ ایک روز مہاراجا کے دربار میں رقص و سرود کی محفل برپا کرنے کے لیے کلکتے سے مدعو کی جانے والی نینا کی ایک جھلک دیکھ کے سنگھا ہوش و حواس سے بیگانہ ہوا۔ اُس نے دوبارہ نینا کے دیدار کرنے کی بڑی تگ و دو کی، لیکن کانتا بائی کا طائفہ مہاراجا کا خاص مہمان تھا، رسائی مشکل تھی۔ پٹیالے میں طائفے کا قیام چند روزہ تھا۔ صرف ایک ہی رات مہاراجا کی عشرت گاہ میں نینا کو اپنی آواز اور رقص کے کمالات پیش کرنے کا شرف حاصل ہوسکا۔

پٹیالے سے کلکتا پولیس کو اطلاعات ملیں کہ نینا کے واپس جانے کے بعد سنگھا اپنے متعلقین کے لیے اجنبی اجنبی سا ہوگیا تھا، اور ایک دن کسی کو کچھ بتائے بغیر وہ گھر سے نکل گیا۔ باپ اور اُس کے زیرِ اثر کارندے قرب و جوار میں، جگہ جگہ اُسے ڈھونڈتے رہے۔ ماں اُس کے غم میں پلنگ سے لگ گئی۔

ارشادات

❀: خاموشی بہت بڑی حکمت ہے۔
(حضرت محمد ﷺ)

❀: انصاف کی ایک گھڑی برسوں کی عبادت سے بہتر ہے۔
(حضرت محمد ﷺ)

❀: عاجز ترین شخص وہ ہے جس کا کوئی دوست نہ ہو۔
(حضرت ابوبکر صدیقؓ)

❀: جو شخص اپنا راز چھپاتا ہے، وہ اپنا اختیار اپنے ہاتھ میں رکھتا ہے۔
(حضرت عمر فاروقؓ)

❀: خاموشی غصے کا بہترین علاج ہے۔
(حضرت عثمان غنیؓ)

❀: انسان کی قابلیت اُس کی زبان کے نیچے پوشیدہ ہے۔
(حضرت علی المرتضیٰؓ)

جانے کتنی رقم سنگھا کے پاس تھی؟ قیاس ہے، کچھ زیادہ نہیں۔ کلکتے آ کے اُس نے سوناگاچھی کا رُخ کیا اور کئی راتیں تو اُتر سے کانتابائی کے بالاخانے جاتا رہا، اور اُس کے پلّے سے پیسے ختم ہوتے گئے۔ ایک رات وہ پہلے کی طرح نذر نہیں گزار پایا تو سبھی کا رویّہ تبدیل ہو گیا۔ اُس نے کانتابائی سے نینا کی بات کی تو اُسے دُھتکار دیا گیا، اور بالاخانے پر اُس کا داخلہ ہی ممنوع قرار دے دیا گیا۔ اس کے بعد ہی سنگھا نے اڈّے کا رُخ کیا تھا۔

جامو دل گیر آواز میں سنگھا کی رُوداد سنا گیا۔ سبھی چپ ہو گئے۔ دیر بعد زورا تلملاتی آواز میں بولا، "یہ کیا ہے دادا؟"

جُھل گہری سانس کھینچ کے رہ گیا۔

"یہ آدمی ایک دم ایسا اُلٹا م کیوں ہو جاتا ہے؟"

"ہو جاتا ہے رے۔" جُھل منمناتے ہوئے بولا۔

"وہی اپن بولتا ہے، ایسا کیسے؟"

"تجھ کو کوئی ملتا تو ایسا نہیں بولتا۔" جامو نے جھینپتی آواز میں کہا، "تو کیا جانے گا۔"

"اپن کے مستک میں نہیں آتا، قسم سے۔" زورا مچل کے بولا، "اچھی ماں باپ اور سارا گھر چھوڑ کے... اُس کا تو گھر بھی بڑا تھا، پڑھا لکھا بھی تھا، کس بات کا گھاٹا تھا اُس کو... ابھی ایک سا ایک..."

"ایک بات کی کمی تھی اُس کو، پڑھائی لکھائی، بڑا گھر، دھن دولت، سارا دھرا رہ جاتا ہے۔" جامو نے تمتماتی آواز میں کہا، "کبھی ایک آدمی جب سامنے کو آ جاتا ہے، جان پڑتا ہے، وہی ہے، بس وہی۔ اُسی کی کمی تھی، تو سمجھو، وہی دُنیا ہوتا ہے۔ پھر کچھ اور دکھائی نہیں دیتا، وہی دُنیا، وہی جان مال۔ اپنا آپ بھی دکھائی نہیں دیتا پھر تو..."

"ایسا!" زورا معصومانہ تعجب سے بولا، اور سر پر اُنگلی گھماتے ہوئے کہنے لگا، "یہ تو تھوڑا پھڈیلا ہونے والا بات لگتا ہے اپن کو۔"

جامو نے میری، پھر جُھل کی طرف کترائی نظروں سے دیکھا، اور جھلّا کے بولا، "تو ایسا ہی بولے گا۔ تجھ کو کیا پتا سالے! اپنے کام سے کام رکھ اور زیادہ چیڑ چیڑ نا کر۔"

جامو کے جھنجھلائے لہجے سے زورا کی سمجھ میں جلد ہی آ گیا کہ سامنے میں بیٹھا ہوں، اور میری موجودگی میں بیہودگر بلاغت سے تجاوز کر رہا ہے۔ وہ پشیمان سا ہو گیا، لیکن میں اُس سادہ دل کا ہدف نہیں تھا، میں خود جو ہدف پر موجود تھا، اور بارہا میں نے خود کو بھی یہی کچھ باور کرانے کی کوشش کی تھی۔

سیورین اتنی دیر سے کہاں غائب تھی۔ اچھا ہوا کہ اُس نے آ کے سبھی کو منتشر کر دیا۔ اُس وقت اُس کی آمد سے مجھ سمیت اُن تینوں کی بھی تشفّی ہوئی تھی۔ سیورین اپنی رَو میں لپکتی ہوئی آئی تھی۔ مجھے دیکھ کے ٹھٹک سی گئی اور پلکیں جھپکانے لگی۔

"تم کب آئے؟"

"ابھی کچھ دیر پہلے ہی۔" میں نے مسکرانا چاہا۔

"سب ٹھیک تو ہے؟" اُس نے تذبذب سے پوچھا۔

ڈاکٹر رائے کے پاس سے میں کسی تازہ اُفتاد کا بار لیے ہی واپس آتا رہا تھا۔ میں نے آنکھیں مینچ کے اُسے تسلّی دی تو اُس کے چہرے پر روشنی سی بکھر گئی۔

اُس نے جُھل سے کمرے میں چلنے کی استدعا کی۔ جُھل کے پیش و پس پر اُس نے کوئی لحاظ نہیں کیا۔ "چلیں، اب اُٹھ جائیں۔" اُس کے لہجے سے ناز برداری عیاں تھی۔ اُس نے اِسی پر اکتفا نہیں کی، جُھل کا ہاتھ تھام کے اُسے اُٹھا دیا۔

"مُورت اُس کی نہیں ہے بس۔" جُھل کو زردیں کی یاد آ رہی تھی۔ اُس کے تیور بھی یہی کچھ تھے۔ "چل ری۔" وہ سپر ڈالتے ہوئے بولا اور کسی معمول کی طرح سیورین کے ساتھ کمرے میں چلا گیا۔

جامو اور زورا بھی اُس کے پیچھے اندر جانا چاہتے تھے۔ میں نے اُنھیں روک لیا۔ کچھ وقت بعد جب مجھے یقین ہو گیا کہ سیورین نے جُھل کو بستر پر دراز کرا دیا ہوگا، میں نے اُن سے بیٹھ جانے کو کہا، اور دھیمے لہجے میں بتایا کہ ڈاکٹر رائے کی زبانی میدا کے بارے میں مجھے کیا معلوم ہوا ہے۔

اُن پر حیرت کا ایک عالم طاری ہوا۔ دونوں کرسی پہ سیدھے بیٹھے نہ رہ سکے۔

"یہ کیا... کیا بولتا ہے راجا بھائی؟" زورا سنسناتی آواز میں بولا، "نہیں، نہیں۔"

"مجھے بھی یقین نہیں آ رہا تھا، لیکن کسی اَور نے نہیں، ڈاکٹر صاحب نے بتایا ہے۔ میدا اب نہیں ہے۔"

"یہ کیسے؟" جامو کی آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں۔ "یہ تُو کیا بول رہا ہے لاڈلے؟"

صبح اسپتال آنے والے پولیس افسر سے ڈاکٹر کو جو کچھ معلوم ہوا تھا، میں نے سنبھے تلے لفظوں میں دُہرا دیا۔

"اپن تو پہلے ہی بولا تھا۔" زورا نے بھڑک کے کہا۔ "بولا تھا نا راجا بھائی! اپن کو میدا ٹھیک آدمی نہیں لگتا۔"

بے شک، زورا نے میدا کے بارے میں کچھ یہی رائے زنی کی تھی، اور جامو نے اُسے لتاڑ دیا تھا۔

میرے بیان سے اُن کی تشفّی ہوا ہو گئی اور وہ پے در پے سوال کرنے لگے۔ میں آموختہ ہی دُہرا اور تکرار ہی کر سکتا تھا کہ اس سے زیادہ میرے علم میں کچھ تھا بھی نہیں۔ ادھوری آگہی وہم و قیاس کا موجب ہوتی ہے۔ وہ اپنے طور پر تبصرے کرنے اور فسانے تخلیق کرنے لگے تھے اور مجھ سے تائید و تردید کے خواہاں تھے۔ میری محتاط روی اُنھیں زچ بھی کر رہی تھی، برہم بھی۔ جامو کو تسلیم نہیں تھا کہ برجو دادا ہی نے سب سے پہلے میدا کے مختصر انجام پر تصدیق کی مہر ثبت کی ہو۔ اُس کا کہنا تھا کہ برجو دادا اڈّے کا ایک کہنہ مشق آدمی تھا، سرد و گرم چشیدہ، پولیس سے بارہا سامنا ہوا ہوگا، اور وہ میدا کا خاص مربی، اُس کے لیے کسی سائے کے مانند تھا، اور اُس کے پاس زندگی ہی کتنی رہ گئی ہے کہ اُس نے وعدہ معاف گواہ بننا گوارا کر لیا۔ اڈّے کے لوگ اِتنے کچے نہیں ہوتے کہ ہلکی بھاری اذیتوں اور عواقب کے خوف سے زبان کھول دیں، اور نہ اِتنے ناعاقبت اندیش کہ دُور و نزدیک دیکھ بھال کیے بغیر ایسی واردات کے لیے آمادہ ہو جائیں۔ کل سہ پہر میدا کو پولیس ساتھ لے گئی تھی، رات تک اِس واردات کی تہ تک کس طرح پہنچ گئی؟

"اب کچھ بھی ہو جامو بھائی!" میں نے ٹھہری ہوئی آواز میں کہا، "کیا کہا جا سکتا ہے۔ تفصیلات تو ڈاکٹر صاحب کو بھی زیادہ معلوم نہیں تھیں۔ میں نے تمھیں بتایا کہ شہر کی پولیس نہیں تھی۔"

"تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟" جامو منتشر لہجے میں بولا۔

"تھوڑا بہت تو ہونا چاہیے۔" میں نے نرمی سے کہا۔

"نہیں لاڈلے! کوئی اَور بات ہے، کدھر کوئی کالا ضرور ہے۔" جامو انکار میں سر ہلاتے ہوئے بولا، "ضرور پولیس کے کان بھرے گئے تھے، مخبری جس کو بولتے ہیں۔"

"ہو سکتا ہے۔" میں نے بحث مناسب نہیں سمجھی۔ جامو کا تجربہ کم نہیں تھا۔ جو بات میرے دل میں کھٹک رہی تھی، اُس زیرک کے ذہن میں رسا ہو چکی تھی۔ مجھے خاموش ہی رہنا تھا۔ میں نے صراحت نہیں کی کہ اِسے 'مخبری' نہیں کہنا چاہیے، مگر ایک شخص پولیس کے اِس یقین اور اعتماد کا سبب لازماً بنا ہوگا کہ کم از کم تین آدمیوں کو ختم کر دینے کی واردات کے پیچھے کن لوگوں کا ہاتھ ہے۔ اُس دن جب میدا میرا چاقو لوٹانے اور اڈّے سے دست کشی کی پیش کش کرنے اسپتال آیا تھا تو ڈاکٹر رائے ہمارے درمیان موجود تھا۔ میدا اُسے وہاں سے ہٹا نہیں سکتا تھا اور اپنی پس پائی اور ندامت کے اظہار کا بھی وہی ایک موقع تھا۔ ڈاکٹر کی وجہ سے اُس نے مبہم انداز میں اُن تین آدمیوں کو انجام سے دوچار کر دینے کا اقرار کیا تھا، جنھوں نے، اُس کے بہ قول، اکبر علی خاں کا خون کر دیا تھا، اور شہر کے اڈّے کی چوکی پر اُس کے ہوتے ہوئے اِس دیدہ دلیری اور ہٹ دھرمی نے اُسے سب کی اور خود اُس کی اپنی نظروں میں رُسوا کر دیا تھا۔ میدا کے اعتراف میں ایسا ابہام بھی نہیں تھا کہ ڈاکٹر جیسا صاحبِ نظر تعبیر نہ کر پاتا، اور ڈاکٹر جیسا انسان دوست آسانی سے درگزر کر دیتا۔ ڈاکٹر کے تکدّر اور رنج کا میں گواہ تھا۔ میدا، ڈاکٹر کو

محض ایک معالج ہی سمجھتا ہوگا، اُسے کیا اندازہ ہوگا کہ ڈاکٹر کیسا ہمہ داں شخص ہے، اُس کی کتنی آنکھیں ہیں۔ میدا کو اِس زعم اور اعتماد سے بھی آسودہ ہونا چاہیے تھا کہ ثبوت تو سات تہ خانوں میں دفن ہیں، ڈاکٹر، میں یا کوئی اور میدا کے موہوم یا علانیہ اعتراف کے باوجود ثبوت وشواہد کے بغیر کیا ضرر رساں ہوسکتا ہے۔ بے دلیل الزام بڑا بے وقعت ہوتا ہے، اڈے کے زور آوروں پر انگلی اُٹھانے کے لیے ایک رندانہ جرأت چاہیے۔

کل صبح ہی ڈاکٹر نے گزشتہ رات آئی جی سے اپنی گفت گو کے بارے میں مجھے بتایا تھا۔ اُس نے آئی جی سے کہا تھا کہ تسلسل سے خوں ریز وارداتیں ہوچکی ہیں تو ثبوت بھی کہیں موجود ہونا چاہیے۔ پولیس کو حوصلہ رکھنا چاہیے کہ ثبوت مرتا نہیں، اور مرتا نہیں تو دست رس سے کچھ ہی فاصلے پر ہے۔ پولیس کو واضح طور پر شبہے کے اہداف معین کر کے یکے بعد دیگرے اُن پر تجربے کرنے چاہییں۔ مفروضے قائم کیے بغیر نتائج کیسے اخذ کیے جاسکتے ہیں۔ میں نے جھجکتے ہوئے کہا تھا، مکمل شواہد کے بغیر پولیس کا کوئی اقدام دیواروں سے سر پھوڑنے کے مترادف ہوگا۔ ڈاکٹر اِس ستم پر دل گرفتہ تھا کہ بہت کچھ جانتے ہوئے بھی ہم کچھ نہیں کر سکتے، اور میں نے کہا تھا، اُوپر رکھی چیز کا حصول دست رس ہی سے ممکن ہے۔ قامت کی بلندی کے لیے بھی کوئی چیز چاہیے جو ارد گرد موجود نہیں۔ یہی صورت پولیس کے بھی پیش نظر ہوگی۔

اور پولیس کو مفروضے تراشنے کی کیا ضرورت تھی۔ ڈاکٹر نے اعتبار کمایا تھا۔ اُس کا فرمودہ سند تھا۔ اُس کے اشارے پر پولیس نے ایک ہی سمت کا رُخ کیا ہوگا جہاں تشیب تھا۔ شک، تذبذب ہے۔ ڈاکٹر کے عطا کیے ہوئے یقین سے پولیس کے آگے راہیں کھلتی گئی ہوں گی۔ شہری پولیس بھی باہر کی پولیس سے بدل دی گئی تھی۔ محکمے کی مروّت، آشنائی کے لحاظ کی کوئی بندش ہی نہیں رہی تھی۔

میں نے جامو اور زورا کو ڈاکٹر کے تلاطم کے بارے میں کچھ نہیں بتایا، خاموش ہی رہا۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے اُلجھتے رہے اور آخر اسی نتیجے پر پہنچے کہ جزئیات سے کیا مرد کار ہے۔ اتنی دیر بعد جامو کو اکبر علی خاں کا خیال آیا، جاں سوز لہجے میں بولا ''اور وکیل صاحب کو بھی اُسی نے... مطلب، اُنھوں ہی نے...''

''ہاں جامو بھائی! اُنھوں ہی نے...'' میں نے کپکپی آواز میں کہا۔ ''کوئی اور نہیں۔''

''مگر کیوں؟'' جامو کرب سے بولا۔

''یہ تو وہی ٹھیک بتا سکتا تھا جامو بھائی!''

''اپنے پلّے کچھ نہیں پڑ رہا ہے ایمان سے۔''

''اپن کو لگتا ہے، کتیا کا جنا تھا میدا حرام کا۔'' زورا مغلظات بکنے لگا۔

دھوپ ابھی زرد نہیں ہوئی تھی۔ میں نے کرسی سے اُٹھ کے ہاتھ پاؤں سیدھے کیے۔ اپنا ہی جسم بوجھ بنا ہوا تھا۔ وہ بھی اُٹھ گئے۔ بہت دیر سے نہ سیورین باہر آئی تھی، نہ ہم اندر جاسکے تھے۔ جامو اور زورا کے کندھے بھی ڈھلک سے گئے تھے۔ آدمی کا جسم بھی کیسا درختوں کے مانند ہوتا ہے۔ کڑی دھوپ ہو یا بند ہوا، پتّے، ڈالیاں خمیدہ ہوجاتی ہیں۔ اُنھوں نے کمرے میں جانے کی جلدی نہیں کی کہ تھکن کے سامنے اُنھیں اپنے دست وبازو اور چہروں سے کوئی منفی تاثر نہیں دینا چاہیے تھا۔ مریض کے ارد گرد کا خوش گوار ماحول بھی اکسیر کا کام کرتا ہے۔ زورا کو اڈے واپس جانے کی فکر لاحق ہوئی۔ ''اپن سوچتا ہے، ابھی اُدھر جانا ٹھیک نہیں داوا۔'' اُس نے اُکھڑی ہوئی آواز میں جامو کو متنبہ کیا۔

میں نے اُنھیں بتایا کہ ڈاکٹر رائے نے بھی یہی مشورہ دیا ہے۔ کمرے میں مریض کے ساتھ صرف ایک آدمی کے ٹھیرنے کی اجازت ہے۔ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ وہ یہیں، اسپتال میں ہم میں سے دو کا انتظام کردیں گے۔

زورا کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ جامو بھی اس مہربانی سے تن آساں نظر آنے لگا۔

''پر اُدھر بھی اپن کا تھوڑا بہت سامان بھی رکھا ہے۔'' زورا تردد سے بولا۔

میں نے اُن سے کہا کہ ڈاکٹر نے سامان پر خاک ڈالنے کو کہا تھا۔ اُدھر نہ معلوم کیا حال ہو، پورا علاقہ پولیس کے حصار میں ہے۔ ڈاکٹر کا خیال ہے کہ اب وہاں کا رُخ کرنا مناسب

نہیں، بل کہ اُس نے جامو اور زورا کے اسپتال سے باہر نکلنے پر بھی پابندی عائد کر دی ہے۔ آج اکبر علی خاں کی بیگم کی تدفین کے وقت شہر کے حالات اُور بگڑ جانے کا اندیشہ ہے۔ پولیس نے تدفین سے پہلے میدا کی خبر عام کر دینے کا ارادہ کیا ہے۔ لوگوں کو اتنی جلد یقین نہیں آسکے گا کہ اُنھیں میدا کے زور و اثر کی عادت ہو گئی تھی۔ جس طرح محکوم کسی ایک حاکم کی حاکمیت کے عادی ہو جاتے ہیں۔ کوئی دن میدا کا آخری دن بھی ہو سکتا ہے، یہ حقیقت تسلیم کرنے میں ایک وقت چاہیے۔ گواہی کے لیے پولیس میدا کے لاشے کی سرِ عام نمائش نہیں کر سکتی، لیکن کئی دن سے شہر پر چھائی دہشت دُور کرنے اور میدا کے طویل غلبہ و تسلط سے نجات اور امان کے احساس کے لیے ہر حربہ آزمائے گی۔

"اب اُدھر کے اڈّے کا کیا بنے گا لاڈلے؟" جامو نے مضطرب لہجے میں پوچھا۔

"اپن کو کیا دادا، جو بھی ہو سالا۔" زورا چیخنا کے بولا، "اپن کا ٹھیکا نہیں۔"

"ہاں جامو بھائی!" میں نے زورا کی تائید کی۔ "ہمارا کیا واسطہ، جو بچ جائیں گے، وہی لڑ جھگڑ کے چوکی کا فیصلہ کر لیں گے، ہمیں تو جتنی جلدی ہو، یہاں سے چلے جانا ہے۔ اب اِس شہر میں ایک پل کے لیے جی نہیں لگتا۔"

"ہاں لاڈلے! وہ تو ہے، اپنے کو تیرا دھیان آتا ہے۔ تُو نے بُرا وقت بتایا۔" جامو میری گردن دبوچتے ہوئے بولا، "استاد کو تو اپنا ہوش ہی نہیں تھا۔ بہت اکیلا تھا تُو۔"

"اِتنا اکیلا بھی نہیں۔" میں نے مایوسی سے کہا۔ "پہلے اکبر علی خاں صاحب تھے، پھر اپنے ڈاکٹر صاحب۔ اکیلے ہونے کی بات نہیں جامو بھائی! پر یہ سارا کچھ..." میرا گلا رُندھ گیا۔

"وہی تو... وہی تو ہم بولتے ہیں لاڈلے! بس جتنا تھا، سُسرا وقت کٹ گیا۔ اب کوئی دیر نہیں۔ اُستاد کو دیکھا نہیں، بالکل پہلے جیسا ہے۔ بڑی بات تو یہ ہے۔"

ہم ابھی باہر ہی کھڑے تھے اور کمرے میں جانا چاہتے تھے کہ سیورین نے دبے پانو آ کے ہمیں چونکا دیا۔ اُسے سامنے دیکھ کے جامو اور زورا کے جسم بل کھا گئے۔ کسی کو خیال نہیں تھا کہ دوپہر گزر چکی ہے۔ یہ یاد دہانی سیورین کی خدمت گزاری کا حصہ نہیں تھی، مگر وہ کچھ اَور ہی لڑکی تھی۔ گھر کی لڑکیاں جیسی کہ ہوتی ہیں، نگہدار، خوش شعار۔ جامو اور زورا نے مجھے دیکھا، اُن کی وجہ سے میں نے منع نہیں کیا، اور سیورین تو بس اشارے کی منتظر تھی۔ بخھل کے آرام کی خاطر اُس نے ہمیں باہر ہی بیٹھے رہنے کی ہدایت کی، اور آدھ گھنٹے میں اسپتال کے طعام خانے سے خدمت گار کھانا لے آئے، ہلکا پھلکا، لیکن بے ذائقہ نہیں۔ زورا اور جامو بھی شاید میری وجہ سے خاموش تھے، وہ بھی بس لقمے ٹونگتے رہے۔ کھانے کے دوران سیورین مسلسل ہمارے اِرد گرد منڈلاتی رہی۔

دوپہر کو کوئی ڈاکٹر بخھل کو دیکھنے نہیں آیا۔ اب اُن کی یہ بے توجہی اطمینان کی علامت تھی۔

خدمت گار کھانے کے برتن میز سے سمیٹ کے واپس جا چکے تھے کہ سیورین گھبرائی ہوئی ہمارے پاس آئی اور کچھ کہنا چاہتی تھی کہ رُک گئی، پھر ہچکچاتے ہوئے انگریزی میں بولی کہ اُسے مجھ سے کوئی ضروری بات کرنی ہے۔ جامو اور زورا سمجھ تو نہ سکے، لیکن سیورین کی سیمابی حالت سے فکرمند ہوئے۔ مجھے اُٹھنا پڑا۔ زورا اور جامو سے کچھ دُور جا کے سراسیمہ لہجے میں اُس نے میدا کے بارے میں بتایا۔

"مجھے معلوم ہے۔" میں نے آنکھیں بند کر لیں اور شکر کا سانس لیا کہ سنانے کو اُس کے پاس کوئی ایسی ویسی بات نہیں تھی۔

"تمھیں معلوم ہے؟" وہ حیرانی سے بولی۔ "مجھے تو ابھی طعام خانے سے آنے والے خدمت گاروں نے بتایا۔ کہ رہے تھے، سارے شہر میں یہی چرچا ہے۔"

"اور کچھ تو نہیں بتایا اُنھوں نے؟" میں نے تحمل سے پوچھا۔

"کچھ اور بھی ہے؟" اُس نے ہراساں آواز میں کہا، "جو تمھیں معلوم ہے۔"

"نہیں، اِس سے زیادہ نہیں۔"

"تم نے مجھے نہیں بتایا۔"

"تم سے بات کرنے کا موقع کہاں ملا، اور تم کیا کرتیں جان کر، اَور پریشان ہو جاتیں۔"

"یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں، سنا ہے، شہر میں بہت خوف و ہراس

ہے۔ لوگ طرح طرح کی باتیں کر رہے ہیں۔ پولیس کہتی ہے، اُس نے خود کو ختم کر لیا۔"

"کچھ بھی ہو، اب وہ نہیں ہے۔" میدا کے لیے میری زبان پر بہت آگ اُمڈی، مگر سامنے سیورین تھی۔ چیزیں ہی نہیں، آدمی بھی کانچ کے بنے ہوتے ہیں۔

"اب کچھ اَور..." وہ بدحواسی سے بولی، "اب کیا ہوگا... میدا کے بعد...؟"

"کوئی اَور آ جائے گا، لیکن وہ میدا نہیں ہوگا۔" میری رتیلی آواز بھی اُس نازک اندام پر گراں ہوگی۔

اُس کے چہرے پر چھائی کشاکش دیکھ کے میں نے پُرسکون لہجے میں کہا۔ "تم کیوں پریشان ہوتی ہو؟"

"تمھیں تو کچھ..."

"مجھے کیا ہوتا!" اُس کی خاطر جمعی کے لیے میں نے مسکرانے کی کوشش کی۔ "میرا کیا تعلق؟"

"سلسلہ تو تمھیں سے شروع ہوا تھا۔"

"اور سمجھو، اُس پر ختم ہو گیا۔"

"مگر کیا واقعی اُس نے خود کو...؟"

"ڈاکٹر صاحب کو یہی بتایا گیا ہے۔"

اُس کی بے چینی دُور نہ ہو سکی اور وہ کسی قدر ہیبت زدہ لہجے میں بولی، "لیکن اُس کے لوگ! وہ سب تو بہت خطرناک ہیں۔ ایک ہی آدمی تو گیا ہے۔"

"ہاں، وہ تو ہے۔ اُن میں سے کچھ تو جیل چلے جائیں گے، کچھ چھوٹ جائیں گے۔ کچھ دل برداشتہ ہو کے شاید یا تو یہ شہر ہی چھوڑ دیں گے، یا اڈّا گیری کا کام۔"

"میدا اُن کی پشت و پناہ تھا، اُن کا ولی نعمت۔ وہ اُن سے جدا ہو گیا ہے۔"

"میری وجہ سے کیا...؟" میں نے تندی سے کہا۔

"لیکن وہ خطرناک ہی نہیں، پاگل بھی تو ہیں۔"

"تو! تو کیا کیا جائے؟"

وہ جلتی بجھتی نظروں سے مجھے دیکھا کی اور کچھ تامّل کے بعد شکایتی انداز میں بولی، "تم سے تو اب بات کرنی بھی مشکل ہو گئی ہے۔" اُس کی شکایت میں گہری اُداسی تھی۔

"میں تو یہیں ہوں، تم سارا کچھ دیکھ ہی رہی ہو۔"

"میں کچھ کہوں؟" وہ فرش پر نظریں جماتے ہوئے بولی۔

"کیا بات ہے؟" میں نے چونک کے پوچھا۔

"تم یہیں ہو، اور تم سے بات نہیں ہو پا رہی... تو لگتا ہے، تم بہت دُور ہو، سامنے ہو کے بھی بہت دُور۔"

"تم بھی عجیب ہو۔" بے ارادہ میں نے اُس کے بازو پر ہلکی سی دھپ لگائی۔ اُس کی آنکھوں میں چنگاریاں سی لپکیں، پھر آنسو چھلک آئے۔ اِن لڑکیوں کے پاس آنسوؤں کی بڑی اِفراط ہوتی ہے۔ قریب ہی زورا اور جامو بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ تیزی سے کمرے میں چلی گئی۔ اُسے آواز دینے اور اُس کے پیچھے جانے کو میرے قدم بڑھے تھے، لیکن میں نے خود کو تھام لیا۔

سہ پہر بعد بخھل سبزہ زار میں آ کے بیٹھ گیا۔ سیورین نے شام کی چائے کا وہیں انتظام کروا دیا تھا۔ سہ پہر کے بعد شام تھکی تھکی نظر آتی ہے۔ دھوپ ہے بھی، نہیں بھی، یا دھوپ جیسے بوڑھی ہو گئی ہو۔ پھر جب سورج ساری دھوپ سمیٹ لیتا ہے

اور اُجالا بھی نہیں جاتا، جب شام نکھرتی ہے، اور کتنی دیر کے لیے، اِدھر آئی، اُدھر گئی۔

سورج واپس جا چکا تھا۔ جھلّل سبزہ زار ہی میں دھرنا دیے رہتا کہ سیورین نے آکے اُسے اُٹھا دیا۔ اسپتال کے کسی ملازم نے اُسے ڈاکٹر رائے کی آمد کی اطلاع دی تھی۔ ایمی بھی آ چکی تھی۔ کمرا صاف تھا، مگر دونوں نے ایک بار پھر جلدی جلدی چیزیں درست کر دیں۔ ایمی کے اصرار کے باوجود بستر کے بجائے جھلّل صوفے ہی پر جم گیا۔ اس میں کچھ زعم ڈاکٹر کو اپنی مکمّل بحالی کا تاثر دینے کا بھی ہوگی۔ بستر بڑی راحت ہے، لیکن خواہش اور ضرورت ہو، تبھی۔ راحت کے لیے ایک استطاعت چاہیے۔ ہمہ وقت کی راحت سے جی پھرنے لگتا ہے، اور جبری راحت تو آدمی کو گوارا ہی نہیں۔ آدمی کی مرضی شاید سب سے بڑی راحت اور دولت ہے، اور یہ بات تو کسی خواب کی طرح ہے۔ آدمی کب اور کہاں اپنی مرضی کا مالک ہوتا ہے۔ بس اتنا ہے کہ کسے کتنا اپنی مرضی کا اختیار ہے۔

سب منتظر تھے۔ سورج کا بچا کھچا اُجالا بھی ماند پڑ چکا تھا۔ کمرے کی روشنیاں تو دیر سے جلی ہوئی تھیں۔ ڈاکٹر رائے کی آمد کی خبر سن کے سیورین نے ابھی تک اسپتال کا لباس تبدیل نہیں کیا تھا۔ ایمی نے اُسے گھر چلے جانے کی ہدایت کی تھی، لیکن وہ ٹھیری رہی۔ اندھیرا پوری طرح حاوی ہو چکا تھا کہ ڈاکٹر رائے، مددگار نوجوان ڈاکٹر اور اَدھیڑ نرس کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ ایمی، سیورین، زورا، جامو اور میں تو مستعد ہی تھے، جھلّل بھی کھڑا ہو گیا۔ ڈاکٹر پہلے تو کچھ جھجکا، پھر تپاک سے ہاتھ بڑھا دیا۔ جھلّل نے دونوں ہاتھوں میں اُس کا ہاتھ جکڑ کے سینے سے لگا لیا۔

"کیا اُستاد! کیسا لگ رہا ہے؟" ڈاکٹر نے مسکرا کے پوچھا۔

"جھلّل نے ممنونیت کی نظروں سے اُسے دیکھا اور زبان سے کچھ نہیں کہا۔

"لگتا ہے، جانے کی بڑی جلدی ہے۔"

جھلّل نے ہونٹ بھینچ لیے۔

"ٹھیک ہے، دیکھتے ہیں، کتنا جلدی جا سکنے کا ہے۔"

ڈاکٹر نے اُسے بستر پر لیٹ جانے کا اشارہ کیا۔ جھلّل نے بہ اکراہ تعمیل کی۔ میں، زورا اور جامو باہر چلے آئے۔ کمرے کا دروازہ کھلا ہی رہا۔ دس بارہ منٹ سے اُوپر نہیں ہوئے ہوں گے کہ ڈاکٹر باہر آ گیا۔ دروازے کے پاس ہم تینوں کھڑے ہوئے تھے۔ زورا اور جامو نے اُسے سلام کیا اور دوبارہ ہاتھ باندھ لیے۔

"پرسوں وہ جا سکتا ہے۔" ڈاکٹر نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے انگریزی میں کہا اور مجھے ساتھ آنے کا حکم دیا۔ مجھے یقین تھا، یہی کچھ ہوگا۔

اپنے ساتھی ڈاکٹر اور نرس کو ہاتھ ہلا کر رخصت کرنے کے بعد وہ سبزہ زار میں رکھی ہوئی کرسیوں تک آ گیا۔ جامو اور زورا نے مناسب سمجھا کہ کمرے میں چلے جائیں اور ہمارے سامنے نہ رہیں۔

"جیسا کہ اندازہ تھا۔" اُس نے کسی تمہید کے بغیر کہا، "لوگوں کو یقین نہیں آ رہا کہ میدا نے خود کو ختم کیا ہے، یا وہ پولیس کے جبر و تشدد کا نشانہ بنا ہے۔"

مجھے تبصرہ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔

"بہ ہر حال، پولیس نے یہ اطلاع لوگوں تک پہنچانے کے لیے احتیاطاً سپاہیوں کو ساری صورتِ حال سے آگاہ کر دیا تھا، اور اُنھیں تلقین کی تھی کہ خود کسی قسم کی قیاس آرائی نہ کریں۔ شہر کی جانب بھیجے جانے والے تازہ پولیس دستوں کو میدا کی لاش بھی دکھا دی گئی تھی کہ وہ شہادتوں کے امین رہیں، اچھی طرح جان لیں کہ میدا کے جسم پر تشدد کے نشانات نہیں ہیں، اعترافی کاغذات بھی اُنھیں دکھائے گئے تھے جن پر میدا کے دست خط اور انگوٹھے کے نشان ثبت تھے۔

"صبح صبح آئی جی نے اکبر علی خاں کے گھر حاضری دے کے اُس کے بڑے بھائی سکندر علی خاں کو تمام حقائق سے باخبر کر دیا تھا۔ تمام شہادتیں اور دستاویزات وہ ساتھ لے گیا تھا۔ سکندر علی خاں اپنی بھاوج کی ناگہانی کے صدمے سے نڈھال تھا۔ سوگ واروں میں گھرا ہوا تھا، تدفین کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ وہ آئی جی سے کیا جرح کرتا اور جرح کرنے کے لیے رہ بھی کیا گیا تھا۔ چور سے لوٹا ہوا مال برآمد ہو سکتا ہے، قاتل سے کیا برآمد ہو۔ آج جمعہ تھا، جمعے کی فضیلت کے خیال سے بیگم کا جنازہ اُٹھانے میں تاخیر کر دی گئی تھی، تا کہ نماز کا مجمع بھی شامل

ہو جائے۔ سنا ہے، ہر قسم کے لوگ جنازے میں شریک تھے۔ بہت بڑا ہجوم تھا۔ بیگم کے شاگرد طلبہ آہ و زاری کر رہے تھے۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ آس پاس کے دیہات میں کسانوں کے بچوں کی تعلیم کے لیے بیگم نے کچی پکی درس گاہیں کھولی تھیں، سو دیہات سے آنے والوں کی بھی ایک بڑی تعداد جنازے کے ساتھ تھی۔ سہ پہر تین بجے کے قریب اپنے شوہر کے پہلو میں بیگم کو آبائی قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔

"جنازے میں شریک لوگوں میں ہر ایک کو یہی جستجو تھی کہ اصل واقعہ کیا ہے۔ پہلے یہ بات چند لوگوں تک محدود تھی۔ اب قریباً سبھی پر منکشف ہے کہ ایک روز کوئی اجنبی نوجوان چاقو کھولے وکیل صاحب کے گھر میں دندناتا ہوا داخل ہو گیا تھا اور ردِ عمل میں اکبر علی خاں اُس کے اِتنے قریب آ گئے تھے کہ میدا کے ٹھکانے پر اُس کے ساتھ چلے گئے۔ وہ نوجوان کس زعم میں میدا جیسے سرکش استاد سے چاقو آزمائی کرنے اور اُسے چوکی سے بے دخل کر دینے کے ارادے سے گیا تھا۔ میدا کی نظر میں اکبر علی خاں اِتنے اہم ہو گئے تھے کہ تمھیں متزلزل کرنے کے لیے وہ اکبر علی خاں کا خون کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ اکبر علی خاں کی کوئی مجبوری اُنھیں میدا کے ٹھکانے پر تمھارے ساتھ لے گئی تھی۔ وہ تمھارے کسی دباؤ میں تم سے قریب ہوئے کہ تم ایک بڑے چاقو باز ہو اور اڈّوں سے تمھارا بھی تعلق ہے۔ میدا جیسا اُستاد اسپتال میں تمھارے قدموں پر چاقو ڈالنے اور اڈّا چھوڑ دینے پر کیوں مجبور ہو گیا تھا۔ ظاہر ہے، چیونٹیاں تو رینگنی چاہییں سروں میں۔ لوگ کہانیاں سنا رہے، سن رہے اور کہانیاں بنا رہے ہیں۔ وہ تمھیں دیکھنا چاہتے ہیں۔ اُنھیں معلوم ہے، تم اسپتال میں ہو، اور پولیس کی ہدایت پر تمھیں پہلے اکبر علی خاں، اور اَب اُس کی بیگم کی تدفین میں شرکت سے روک دیا گیا ہے۔ پولیس تمھاری حفاظت یا تم پر نگاہ رکھنے کی خاطر اسپتال میں تعینات کی گئی تھی۔ پولیس افسر بتا رہا تھا، قسم قسم کی چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں، اور تمھیں بتاؤں، پولیس نے اَب دوبارہ اسپتال میں ایک دستہ تعینات کر دیا ہے، اِس کمرے کے اطراف میں..."

"آپ کیوں ڈاکٹر صاحب؟" بہت دیر بعد میں نے زبان کھولی۔
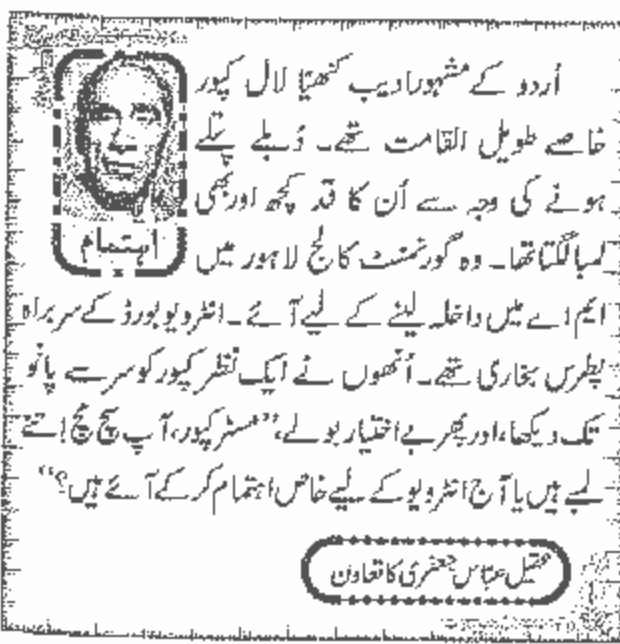
> ## اہتمام
>
> اُردو کے مشہور ادیب کنھیا لال کپور خاصے طویل القامت تھے۔ دُبلے پتلے ہونے کی وجہ سے اُن کا قد کچھ اور بھی لمبا لگتا تھا۔ وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں ایم اے میں داخلہ لینے کے لیے آئے۔ انٹرویو بورڈ کے سربراہ پطرس بخاری تھے۔ اُنھوں نے ایک نظر کپور کو سر سے پانو تک دیکھا، اور پھر بے اختیار بولے، "مسٹر کپور، آپ سچ مچ اِتنے لمبے ہیں یا آج انٹرویو کے لیے خاص اہتمام کر کے آئے ہیں؟"
>
> مغیث عباس جعفری کا تعاون

"تم اِسے دُور دراز احتیاط ہی کہہ سکتے ہو۔"

"میرے لیے؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"یہی کہا جا سکتا ہے، میرے لیے تو نہیں۔"

"لیکن اڈّے کے سارے لوگ تو بند کر دیے گئے ہیں۔"

"ممکن ہے، کچھ باقی رہ گئے ہوں، یہاں کے، یا باہر کے۔ یاد پڑتا ہے تمھی نے ایسا کچھ بتایا تھا، میدا نے باہر کے چند لوگوں سے بھی تو مدد مانگی ہوگی۔ پولیس نے اُن میں سے دو ایک کو پکڑ لیا ہے، ابھی دو ایک باقی ہیں... اور اکبر علی خاں یا بیگم کا کوئی شیدائی بھی تو پاگل ہو سکتا ہے۔ پولیس نے بہت کچھ صاف کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن پولیس پر یہاں کے لوگوں کا اعتماد نہیں۔ خیر چھوڑو۔" وہ کسی قدر اُکتائے ہوئے لہجے میں بولا، "میں بھی نہیں سمجھتا کہ اب پولیس کے یہاں رہنے کا کوئی جواز رہتا ہے۔ تم بتاؤ، رات گھر آ رہے ہو۔ تمھارے پاس دو ہی راتیں ہیں، آج کی اور کل کی، یہ دو راتیں ہمارے ساتھ گزارو۔ بینا تمھیں پوچھ رہی تھی۔ میں نے کہا، آج رات شاید تم آ سکو۔"

"کیسی ہیں وہ؟" میں نے جھکتی آواز میں کہا۔

"ٹھیک ہے، اپنے آپ میں مست، تمھارا ذکر مسلسل کرتی رہتی ہے۔"

"میں نے بھی کئی بار سوچا، آپ کی طرف جاؤں۔ اُن سے وعدہ بھی کر کے آیا تھا۔ اُن کی تصویریں، بل کہ نوادر دیکھنے کا اشتیاق ہے، اور اُنھیں دیکھنے کا بھی۔ وہ خود بہت یکتا اور قابلِ دید لڑکی ہیں۔" میری زبان بس میں نہیں رہی اور

میں نے بہ عجلت کہا، "ایک غیر معمولی، عمدہ اور دل کش خاتون۔"
ڈاکٹر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ چھلک پڑی۔ "اور یہی کچھ وہ تمھارے بارے میں کہتی ہے۔"

"میں کہاں اور کیا ڈاکٹر صاحب۔" میں نے کھسیائی آواز میں کہا، "میں اتنی عزت اور مسرت کا سزاوار کہاں۔ مجھے اُن کے پاس جانا تھا، لیکن آپ تو دیکھ ہی رہے ہیں۔"

"ہاں۔" وہ سر ہلاتے ہوئے بولا، "میں نے اُسے سارا کچھ بتایا... تو آج تو آ رہے ہو، آج رات، بل کہ کچھ دیر بعد؟"

میں نے جھجکتے ہوئے کہا، "آج رہنے نہ دیں ڈاکٹر صاحب؟"

"کوئی مصروفیت؟"

"بس ڈاکٹر صاحب!"

"طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

"جی بالکل۔" میرا جسم اکڑ گیا۔

"اِن پے بہ پے واقعات سے متاثر ہونا چاہیے۔ میں تمھیں نہیں بتانا چاہتا تھا، لیکن خیال آیا، لاعلمی تمھیں اور بوجھل رکھے گی۔" وہ یگانگت سے بولا، "آ جاؤ تو اچھا ہے، کچھ وقت گزر جائے گا، ماحول کی تبدیلی بھی ایک علاج ہے۔"

میں چپ رہا۔

اور میرے چہرے پر چھائی کشیدگی اُس صاحب نظر سے چھپی نہ رہ سکی، اُس نے بُردباری سے کہا۔ "بہ ہر حال، جیسا تم کہتے ہو کل آ جانا۔ میں اُس سے کہہ دوں گا، آج انتظار نہ کرے۔"
میں نے شکریہ ادا کرنا چاہا، اور جانے کیوں یہ ایک لفظ میری زبان پر اٹک کے رہ گیا۔ کچھ مجھے اِس لفظ کی فرسودگی کا گمان ہوا۔
وہ کرسی سے اُٹھ گیا۔ اسپتال کی طرف جانے کے بجائے اُس کا رُخ گھر کی جانب تھا۔ میں نے اُس کا ساتھ دیا، پھر چلتے چلتے وہ ٹھیر گیا اور بھولا ہوا کچھ یاد آ جانے کی اُلجھن چہرے پر ہویدا ہوئی۔ اُس نے جامو اور زورا کی شب بسری کے انتظام کے بارے میں بتایا اور کہنے لگا کہ کل صبح اُس کے شخصی معاملات کے معاون چھاگلا کے ذریعے گرانڈ ہوٹل سے کسی آدمی کو بلا کے وہاں رکھا باقی سامان منگوا لیا جائے اور وہیں پر ہوٹل کے واجبات کی ادائی کر دی جائے۔ ہمارے لیے اسپتال سے بہ راہِ راست اسٹیشن روانگی مناسب رہے گی۔

اسپتال کی چار دیواری تک اُسے رخصت کرنے کے ارادے سے میں اُس کے ساتھ چل پڑا تھا لیکن اُس نے مجھے لوٹا دیا۔
مجھے احساس تھا، وہ کوئی غبار لے کے نہ گیا ہو، مگر میری معذرت اپنے عزم کا حاصل تھی جو میں نے گذشتہ مرتبہ اُس کے گھر سے آنے کے بعد ساری رات ایک ہیجان و اضطراب کے بعد کیا تھا اور مجھے ایک گونہ سکون ہوا تھا، آج نہیں تو کل یہ صورت تو پیش آ تی تھی۔

میں اُس کے ساتھ زیادہ دُور نہ جا سکا تھا، اِس لیے جلد ہی واپس آ گیا۔ کمرے میں سیورین کے موجود ہونے پر مجھے حیرت ہوئی۔ اُس نے اپنا گھریلو لباس تبدیل کر لیا تھا اور بُتھل کے پاس بیٹھی مشتاقانہ، نیازمندانہ انداز میں باتیں کر رہی تھی، جامو اور زورا بھی قریب ہی موجود تھے۔ لگتا تھا، برسوں سے سیورین سے شناسائی ہے۔ ابھی بھی وہیں تھی۔ کسی ڈاکٹر کی آمد کا اب امکان نہیں تھا۔ میری آمد دخل اندازی کا باعث ہوئی، جیسے کوئی اجنبی اُن کے درمیان آ گیا ہو۔ مجھے دیکھتے ہی بُتھل کو 'شب بہ خیر' کہتے ہوئے سیورین اُٹھ گئی۔

"تم ابھی تک یہیں ہو؟" میں نے عمداً انگریزی میں پوچھا۔

"تمھارا انتظار کر رہی تھی۔" وہ دبی زبان سے بولی۔

"مگر بہت وقت ہو گیا ہے۔" میں نے فکرمندی سے کہا۔

"کبھی کبھی ہو جاتا ہے اتنا وقت بھی۔" بابا سے دل چسپ باتیں ہو رہی تھیں۔ وقت کا اندازہ بھی نہیں ہوا۔

"تمھیں اب جانا چاہیے۔"

"سچ کہوں، دل ہی نہیں چاہتا۔"

میں پھر کیا کہتا۔ اُسے دیکھتا رہ گیا۔

"یہ تو بہت الگ لوگ ہیں۔ اِن کا بس نہیں چل رہا تھا کہ میرے لیے کیا کریں۔ بار بار زری کا ذکر کرتے رہے۔ کیا میں واقعی کچھ اُس جیسی ہوں؟" اُس نے معصومیت سے پوچھا۔

"ہاں، کچھ کچھ، بل کہ بہت کچھ۔" میں نے بھی سچ کہا۔

"اُس کا نام اِتنی بار سنا ہے کہ اُسے دیکھنے، اُس سے ملنے کے لیے دل مچلتا ہے۔"

"آئینہ تو گھر میں ہے تمھارے، گھر جا کے سامنے کھڑی ہو جانا۔"

میری سخن طرازی لمحوں بعد اُس کی سمجھ میں آئی اور اُس کے رخساروں سے کرنیں سی پھوٹنے لگیں۔ "شکر ہے، اِس وقت تم کسی کشاکش سے دوچار نہیں ہو، ورنہ تو..."
کمرے میں صرف ایک ہی میری اُس کی زبان سمجھ رہی تھی اور زیرِ لب مسکرا رہی تھی۔ تادیر اُن لوگوں کی موجودی میں کسی ایسی زبان میں بات کرنا جس سے وہ ناواقف ہوں، آداب کے منافی تھا۔ میں نے ہندستانی میں سیورین سے بات شروع کی تو اُسے بھی نارروائی کا احساس ہوا۔ میں نے اُسے تاکید کی تھی کہ کل صبح وہ ناشتے وغیرہ کی زحمت نہ کرے۔

"کیوں نہیں۔" وہ چمک کے بولی، "آج تو زورا اور جامو بھائی بھی ہیں۔"

"اِسی لیے کہہ رہا ہوں۔ اِتنی دیر سے گھر جا رہی ہو۔ تم اہتمام سے باز نہیں آ ؤ گی۔ جاتے ہی صبح کی تیاری میں لگ جاؤ گی۔" میں نے منا ہمانہ انداز میں کہا، "یہاں اسپتال میں معقول انتظام ہے، خصوصاً اِن کمروں کے لیے۔"

"کچھ نہیں، میری فکر نہ کرو۔ مجھے کوئی پریشانی نہ ہو گی۔ مجھے تو خوشی ملتی ہے۔"

"ہاں سسٹر! ابھی راجا بھائی ایک دم ٹھیک بولتا ہے۔ ناشتا کا کوئی چکر و کرمت ڈالو۔ گھر جا کے ابھی آ کھا رات سونے کا ہے بس!" زورا نے مشفقانہ تیور سے کہا۔

سیورین نے سنی اَن سنی کر دی۔ سب کو 'خدا حافظ' کہتی، ہاتھ ہلاتی ہوئی تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔ اُسے راہ داری کے سرے تک رخصت کرنا میرا معمول ہو گیا تھا۔ زورا اور جامو بھی اُٹھ گئے تھے۔ میں نے اُنھیں روک دیا۔ کمرے سے چند قدم دُور جا کے سیورین ٹھیر گئی اور مضطربانہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ میں نے جانا، کوئی چیز بھول گئی ہے، میں نے وجہ پوچھی۔

"کچھ کہنا ہے تم سے۔" اُس کی آواز اُمڈ رہی تھی۔

میری سوالی نظریں اُس پر مرکوز ہو گئیں۔ "کیا بات ہے؟"

"میں واقعی کیسی لڑکی ہوں؟"

"یہ کیا... کیا مطلب، تمھیں کسی سند کی ضرورت کیوں پڑ گئی؟ تم اچھی ہو۔"

"میری کوئی بات تمھیں ناگوار تو نہیں گزری؟"

"یہ خیال تمھیں کیوں آیا، مسئلہ کیا ہے؟"

"تم چاہو تو مسئلہ کوئی بھی نہیں۔"

"میں چاہوں...؟ کیا کہنا چاہتی ہو؟" میں نے ناگواری سے پوچھا، "کیا ہے؟"

"میں بھی تم لوگوں کے ساتھ جانا چاہتی ہوں۔" اُس نے رُکی رُکی آواز میں کہا۔ میں گنگ رہ گیا۔

"یہی بنتی کرنی تھی تم سے۔" اُس کے ہونٹ دھڑک رہے تھے۔

"تم اپنے ہوش و حواس میں تو ہو۔" میں نے اضطراری لہجے میں کہا، "کہاں، کہاں جانا چاہتی ہو؟"

"تمھارے ساتھ، جہاں تم جاؤ، جہاں بھی۔"

"تمھیں معلوم ہے، تم کیا کہہ رہی ہو؟"

"میرا یہاں کوئی نہیں۔ جو ہیں، دُور دُور کے ہیں۔ بس مجھے ساتھ لے چلو، کسی بھی حیثیت سے، اور کسی حیثیت کے بغیر بھی۔ میں تم پر، یا کسی پر کوئی بوجھ نہیں بنوں گی۔ میرا وعدہ ہے تم سے، میں تمھاری، بابا کی اور اُس کی... زری کی خدمت کرتی رہوں گی۔"
وہ ڈوبتی ڈولتی آواز میں بولی۔

لمحوں تک مجھ سے کچھ کہا نہ جا سکا، پھر میں نے بہ مشکل، اپنی آواز، اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے نرم روی اختیار کی۔

"تم ہمارے بارے میں کتنا جانتی ہو؟"

"جتنا جان چکی ہوں، اُتنا بہت ہے۔"

"تم بچوں کی سی باتیں نہیں کر رہیں؟" میں نے بھیگی آواز میں کہا، "اِتنا بڑا فیصلہ تم نے اِتنی آسانی سے کیسے کر لیا؟"

"سوچ سمجھ کر کیا ہے۔" اُس کے لہجے میں یقین تھا۔

"اور میں نے بابا سے بھی بات کی ہے۔"

"تم نے بُتھل بھائی سے بھی کہا ہے یہی کچھ؟" میں نے بدحواسی سے پوچھا، "پھر... پھر اُنھوں نے، اُنھوں نے کیا جواب دیا؟"

"اُنھوں نے تمھارے بارے میں کہا ہے۔ کہہ رہے تھے، تمھیں اگر کوئی اعتراض نہ ہو۔"

"یہ کہا اُنھوں نے؟" مجھے حیرانی ہوئی اور میں نے کسی دلیل سے اجتناب کیا۔ "پھر میرا کیا ہے۔" میں نے کہا، "وہ

آمادہ ہیں تو میرے اعتراض کی کیا گنجائش ہے۔ اصل میں تو وہ بتھل بھائی اور اُن کی بیٹی ہی کا گھر ہے۔"

"تمھارا کچھ نہیں ہے؟" وہ تیکھی آواز میں بولی۔

"میں کیا! سارا کچھ تو بتھل بھائی کا ہے۔"

"تم نہیں چاہتے، میں بھی وہاں رہوں، اُن لوگوں کے ساتھ۔ کیا میں دوسروں کی طرح اُس گھر کی ایک فرد نہیں بن سکتی؟"

"کیوں نہیں بن سکتیں، مگر کیوں؟ تمھیں اُس گھر میں بسنے والوں کے واقعات معلوم ہیں؟"

"بابا نے کچھ کچھ اشارتاً بتایا ہے، وہاں کون کون ہے، اور وہ سارے کس طرح ایک دوسرے کے لیے ایثار پر آمادہ رہتے ہیں۔"

"اُنھوں نے نہیں بتایا کہ وہ سارے کن حالات میں وہاں آئے ہیں، کس بے چارگی کے عالم میں؟"

"میں بھی کسی بے چارگی میں وہاں جانا چاہتی ہوں۔"

"تم... تم کس مصیبت سے دوچار ہو؟"

"میں بہت اکیلی ہوں۔ میں تمھیں کیا بتاؤں۔" وہ روہانسی ہوگئی۔ "میرا کوئی نہیں ہے۔"

"لیکن ہمارے یہاں آنے سے پہلے بھی تو تم۔"

"وہ اور بات تھی۔ جب تم یہاں نہیں آئے تھے... تم، بابا، زورا اور رجامو بھائی۔"

میں نے اُس سے کہا کہ ہمیں یہاں آئے ہوئے دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔ بیش تر بتھل حواس سے بیگانہ رہا، اور درمیان میں اَن ہونے سانحے پیش آتے رہے۔ اِن دنوں میں جو کچھ اُسے دیکھنا، سننا اور سہنا پڑا ہے، اُس نے کبھی تصور نہ کیا ہوگا، اڈے، چاقو، پولیس، خون... اور میں نے کہا، اُسے کیا معلوم ہے، خانم، نیساں اور سلما حیدرآباد سے، منیر علی کا خاندان جیسلمیر سے، فروزاں اور یاسمن آسن سول سے، اور خود زریں کس عذاب سے گزر کے اُس پناہ گاہ تک پہنچ پائی ہے۔ اُن سب کا وہاں اِکھٹے ہو جانا ایک اتفاق ہے، یا مجبوری ہے۔ سیورین کی کیا مجبوری ہے؟ وہ ایک منظم زندگی گزار رہی ہے، نہایت محترم اور مقدس پیشے سے وابستہ ہے، یہاں اُس کا گھر ہے، یہ گلیاں، محلّے، یہاں کے موسموں کی وہ عادی ہے۔ میں گواہ ہوں، اُس سے ڈاکٹر رائے کا سلوک کس قدر مربیانہ ہے۔ سبھی اُس کی عزت کرتے ہیں، اور وہ کوئی عام نرس نہیں۔ اِن خاص کمروں میں اُس کی تعیناتی ہے، اپنے کام میں مہارت اور مستعدی ہی کے سبب سے۔ نئی جگہ تو نئی ہوتی ہے۔ زریں کی حویلی تو ایک چاردیواری ہے۔ اُس چاردیواری میں بے شک اُن ستم رسیدگاں نے عزت اور عافیت کی ایک دُنیا آباد کر لی ہے۔ یہ بھی واقعہ ہے کہ وہاں سب ایک دوسرے کا احترام کرتے ہیں، اور احسان و ایثار کے لیے آمادہ رہتے ہیں، لیکن وہ اور دُنیا ہے۔ یہاں سے کوئی مطابقت نہیں ہے۔

میں نے اُس سے اور بھی بہت کچھ کہا، مگر اُس نے عزم کر رکھا تھا۔ کہنے لگی کہ اُس نے پہلی مرتبہ ایسے لوگ دیکھے ہیں جو دوسروں سے بہت مختلف ہیں۔ دریادل، اِرادوں کے پختہ، تحفظ، توانائی اور سلامتی کی علامت۔ اِن کے پاس بڑی چھاؤں ہے۔ اِنھیں دیکھ کے احساس ہوا کہ وہ تو بڑی گھٹی ہوئی زندگی بسر کرتی رہی ہے۔ وہ تو بہت حریص، بدنگاہ اور سوداگر لوگوں میں گھری رہی ہے، وقت پر کنارے ہو جانے، آنکھیں چُرا جانے والے لوگ۔ اسپتال میں طرح طرح کے مریضوں سے اُس کا واسطہ پڑتا رہا ہے۔ اُن میں سے بیش تر اُسے ساتھ لے جانے کی کوشش کرتے رہے، کسی نے اُس کے دام پوچھے، کسی نے اُس کی قیمت لگائی، کسی نے اپنے راج محل کی زینت بنانا چاہا، کسی نے دُنیا بھر کی آسائش فراہم کرنے کے دعوے کیے۔ عورت شاید مرد سے زیادہ حساس اور نگاہ شناس ہوتی ہے۔ وہ کیا بتائے، کس طرح اُس نے اپنا دامن بچائے رکھا ہے۔ سیورین نے رُندھی ہوئی آواز میں بتایا کہ اُس کی ماں ہے نہ باپ، رشتے کی ایک مہربان چچی اپنا گھر چھوڑ کے اُس کے گھر آ بسی ہے، اُسی کی دُسراتھ کے لیے۔ کہنے لگی کہ وہ ڈاکٹر بننا چاہتی تھی، اور یقیناً بن جاتی، لیکن کوئی بھی ساتھ نہ رہا تو اُس نے اپنا ساتھ بھی چھوڑ دیا، اُس نے خود کو ترک کر دیا۔ پر یہ زندگی ہے، کتنی ہی بیگانہ ہو، آدمی کھینچے، دھکیلے جاتا ہے۔ وہ کہہ رہی تھی، اُس نے تکرار کی کہ ہمارے یہاں آنے کے بعد اُسے کسی دریچے کے کھل جانے کا گمان ہوا، کوئی دریچہ کھل گیا ہو جیسے اور تازہ ہوا اور روشنی در آئی ہو۔ اُس کے ویراں کدے میں کونپلیں سی پھوٹنے لگیں اور بچھڑے ہوئے خواب اُس کے پاس لوٹ آئے۔

میں نے بہت کچھ کہنا چاہا، لیکن میرے اِدّعا میں کوئی
ائی تھی، یا اُس کا ارادہ میری دلیلوں سے زیادہ توانا تھا۔
ہنے لگی کہ کیا اُس نے واقعی کوئی بڑی ناروا بات کہی ہے، جو
امکان سے باہر ہے۔ کیا میرے تذبذب کا سبب یہ ہے کہ
دوسروں کی طرح اُسے کوئی حادثہ یا سانحہ پیش نہیں آسکا ہے،
وہ بے بسی اور محرومی کے اُس پیمانے پر پوری نہیں اُترتی جو
ہم نے زرّیں کی حویلی میں داخلے اور سکونت کے لیے مقرر
کیا ہے، یا وہ اُن کی طرح نہیں ہے جو وہاں موجود ہیں، وہ
کوئی غیر لڑکی ہے، کوئی اچھوت، میرے کہنے کے مطابق،
وہ ایک چار دیواری ہے، لیکن زنداں تو نہیں ہے۔ اُس کے
وہاں چلے جانے سے کچھ منتشر ہوجانے کا اندیشہ ہے، اور
کیا اُس زنداں سے واپسی کا کوئی راستہ نہیں۔ کہنے لگی، کیا
آدمی کبھی کچھ وہی ہوتا ہے جو نظر آتا ہے۔ اُس کا دمکتا
رنگ، چمکتی آنکھیں، خوش رفتاری، خوش گفتاری، یہ نظم وضبط،
سلیقہ شعاری کسی سرایت کیے ہوئے خوف کا مآل بھی تو
ہوسکتی ہے۔ آدمی کو کبھی غصہ بھی تو آنا چاہیے، وہ اونچی
آواز میں بات کرنے کو ترس گئی ہے۔ پیشہ ورانہ خوش خلقی تو
کوئی جبر ہے، یا بے حسی۔ آدمی کا سب سے بڑا دُکھ خوابیدگی
کے باوجود خوابوں سے محرومی ہے۔

میں نے ہاتھ اُٹھا کے اُسے روک دیا۔ ''خدا کے لیے اِتنا
مت کہو۔'' میں نے التجا کی۔ ''میں شاید وضاحت نہیں کر پایا،
نہیں کر پا رہا ہوں۔ مجھے بتاؤ، تم نے میری پاگل بھائی کی
وجہ سے یہ فیصلہ کیا ہے؟ تم چھاؤنی کی بات کرتی ہو، تو ہم وہاں
کب اور کتنا رہ پاتے ہیں۔ ہم تو مستقل سفر میں رہتے ہیں، اور
سفر میں کیوں رہتے ہیں، یہ تمھیں کیا معلوم ہے۔''

''کچھ کچھ بابا نے مجھے بتایا ہے۔'' وہ گھٹی ہوئی آواز میں بولی۔

''تمھیں کچھ بتایا ہے اُنھوں نے؟'' میں نے حیرت سے
پوچھا ''کیا... کیا بتایا ہے؟''

''یہی کہ تمھیں کسی کھوئے ہوئے کی تلاش ہے۔'' وہ
اُداسی سے بولی۔ ''تمھارا کام بس یہی رہ گیا ہے۔ میری دُعا ہے،
کاش، وہ تمھیں جلد مل جائے، لیکن اِس کا یہ مطلب کہاں
ہوتا ہے، تمھاری مراد بر آنے کے بعد تم وہ نہیں رہو گے جو
تم ہو۔ تمھارے سائے اور روشنی میں کمی ہوجائے گی۔ تمھارا
دل تنگ ہوجائے گا۔ تم تو اور سائے دار اور توانا ہو جاؤ گے۔''

میں نے اُسے غور سے دیکھا، وہ ایک خوش اندام لڑکی،
شاخِ نازک کی طرح جس کا سراپا، رنگ شفق گوں، نقش و نگار
تراشیدہ۔ وہ کیسی باتیں کر رہی ہے، کسی نے سچ کہا ہے، آدمی تو
اپنے ذرّوں سے تشکیل و تجمیل ہوتا ہے۔ سامنے کے، یا نظر آنے
والے مظاہر کی دل فریبی کو باطنی اوصاف دو آتشہ کر دیتے ہیں۔
جو آئینے کا شیوہ ہے، وہی آنکھ کا۔ آئینے کو کتنا نظر آتا ہے، اور
آنکھ کی رسائی کس قدر ہے۔ اصل تو جو ہر نادیدہ ہے، تراشیدہ فکر،
شہابی، چمپئی خیال، جذبہ و احساس کی خوش قامتی، نرمی و نازکی اور
فراوانی، اور گونا گونی، سراپا تو تبھی مکمل سمجھنا چاہیے۔

بے اختیار میرا جی اُسے سینے سے لگا لینے کو اُمڈا، لیکن پھر میں
ٹھٹک کے رہ گیا۔ ہم کمرے کے باہر کچھ فاصلے پر کھڑے تھے۔
اسپتال کے اِس حصے میں بہت سکون ہوتا تھا، اور اُس وقت تو
چہل پہل نہ ہونے کے برابر تھی۔ سوئی سوئی سی روشنی ہر طرف
چھائی ہوئی تھی۔ رات کی خاموشی میں ہریالی کو بھی جیسے گویائی
مل جاتی ہے۔ لگتا تھا، سرگوشیاں کر رہی ہو۔ میں نے کچھ کہنا چاہا، اور
نہ کہہ سکا، خاموش کھڑا اُسے دیکھتا رہا۔ لمحے گزر گئے، پھر میں نے
تھکی آواز میں اُسے ٹوکا، ''گھر جاؤ اَب، دیر بہت ہوگئی ہے۔''

اُس نے بھی پھر زبان نہیں کھولی، راہ داری کے موڑ پر وہ
جدا ہوجاتی تھی۔ وقت گزر جانے کی وجہ سے مجھے دُور تک اُس
کے ساتھ جانا چاہیے تھا، لیکن اُس نے مجھے روک دیا، اور
جاتے وقت اُس کی گراں خاطری کا مجھے شدت سے احساس ہوا،
سو اُس کی دل دہی کے لیے میں نے فرمائش کی۔ ''سنو!
وقت ملے تو صبح ناشتے میں ذرا سے میٹھے چاول لیتی آنا... زیادہ
بالکل نہیں۔'' میرے لہجے میں یقیناً کسی استحقاق کی آمیزش تھی۔
وہ پھر رُک گئی اور اُس کی پلکیں جھکنے لگیں اور اُس کی
آنکھوں میں ستارے چمکنے لگے۔ ''تمھیں پسند ہیں؟''

''بس ایسے ہی۔'' میں نے مسکرانے کی کوشش کی۔ ''اچھے
لگتے ہیں، اَب تو دن ہوگئے۔''

میری تدبیر کارگر ہوئی۔ اُس کی رفتار ہی بدل گئی، جیسے
تیرنے لگی ہو، یا اُڑنے۔

1.

2.

کمرے میں وہ تینوں میرے منتظر تھے۔ مجھے دیکھ کے بے چین سے ہوئے، لیکن کوئی سوال نہیں کیا۔ بجھّل بستر پر نیم دراز تھا، جامو اور زورا، اس کی پائنتی بیٹھے ہوئے تھے۔ زورا اُس کے پیر دبا رہا تھا۔

صوفے پر میرے بیٹھ جانے کے بعد بجھّل نے الکساتی آواز میں پوچھا، ''کچھ بولی رے تجھ سے؟''

''ہاں۔'' میں نے سر جھٹک کے کہا۔

''اُلٹی کھوپڑیا کی ہے۔ تُو نے کیا بولا؟''

''تمھارے بعد میں کیا کہہ سکتا تھا؟'' میں نے ترشی سے کہا۔

''نہیں مانتی، اِس واسطے تجھ پر ڈال دیا تھا۔ تُو ہی اُس کی بولی میں سمجھائے گا۔ وہ تو بڑا مان کرتی ہے۔''

''ٹھیک ہے، اُستاد!'' زورا مچل کے بولا، ''ابھی ایک کے بڑھنے پہ کیا ایدر سے اُودر ہو جانے کا ہے۔''

''بہت پیاری ہے، اُستاد!'' جامو نے وارفتگی سے تائید کی، ''اُدھر اُن جیسی جیسی لگتی ہے، قسم سے۔ اُن سے پچھڑی ہو جیسے۔ وہ جو بولتے نا، ایک کو اُٹھاؤ، دوسرے کو بٹھاؤ۔''

بجھّل کی پیشانی تنگ ہو گئی۔ اُس نے کچھ نہیں کہا۔ مجھے بھی خاموشی ہی بہتر لگی۔

ایمی نے کسی خدمت گار کے ذریعے اسپتال کے طعام خانے سے رات کے کھانے کا انتظام کر دیا تھا۔ بجھّل بھی شریک ہو گیا، مناسب ہی کھانا تھا۔ کھانے کے بعد تازہ ہوا کے لیے وہ باہر آ کے بیٹھ گئے۔ ہلکی ہلکی بوندا باندی کی وجہ سے مینڈک اور جھینگر غل مچانے لگے تھے۔ بارش کا پانی سبزے کی سب سے مرغوب غذا ہے۔ ہر سُو تیز مہک اُٹھنے لگتی ہے۔ خوش بُو کے بھی شاید رنگ ہوتے ہیں۔ سبزے سے اُٹھتی مہک سے ہرے رنگ کا گمان ہوتا ہے، گلاب کی خوش بُو سے گلابی، شہابی، چمپا سے سنہری اور موتیا سے نقرئی رنگت کا۔ جتنے رنگ کے پھول، اُتنے خوش بُو کے رنگ۔ کئی رنگ کے پھول خوش بُوؤں کا آمیزہ ہوتے ہیں؛ عطرِ مجموعہ۔ ہم سائبان میں بیٹھے تھے، سائبان میں بارش کا لطف ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ راہ داری کی چوڑائی اچھی خاصی اور چھت بھی خاصی اونچی تھی۔ پانی ہم سے دُور تھا، لیکن محسوس ہو رہا تھا، ہم بھی بھیگ رہے ہیں۔ بارش سے عجب خوش گوار منظر ہو گیا تھا۔

اچانک بجھّل کے جسم میں ہڑک اُٹھی۔ جامو اور زورا دن بھر اسپتال میں رہے تھے، اور اَب رات کو بھی موجود تھے۔ جامو کے بہ قول، میدا اُستاد زخمی ہو جانے کی وجہ سے نہ آ سکا تھا، لیکن اڈّے کے دوسرے لوگوں کے نہ آنے پر بجھّل کو کھلنا چاہیے تھا۔ کل اوّل پہر اور اُس سے پچھلے دن بجھّل کے پاس آ کے میدا کی شیدائیت کا حال ہم نے دیکھا تھا، کیسا بچھا بچھا جاتا تھا، بجھّل سے اپنی پرانی نیازمندی کا ذکر بار بار کرتا تھا، کچھ یہی کیفیت بر جو دادا کی تھی۔ میدا زخمی تھا تو اڈّے کے دوسرے آدمی اُس کی نیابت، میدا کی جانب سے معذرت کرنے اور بجھّل سے اپنی لگاوٹ کا اظہار کرنے آ سکتے تھے۔ اِدھر اسپتال میں دن بھر ٹکے رہنے کا جواز تو جامو اور زورا کے پاس موجود تھا کہ ڈاکٹر رائے کی نوازشِ خسروانہ ہے، لیکن اَب رات کو اسپتال کے سخت قواعد کے خلاف وہ ٹھیرے ہوئے تھے، اور کمرے میں مزید صرف ایک بستر کی گنجائش رکھی گئی تھی۔ اِتنا وقت گزر جانے کے بعد اَب کہیں اُن کے جانے کے آثار بھی

نظر نہیں آتے تھے۔ بجھّل نے میدا کے نہ آنے کی وجہ جاننے کے بجائے حتمی انداز میں کہا، ''اُلٹا ہو گیا رے حرام کا جنا۔''

جامو اور زورا چونک پڑے۔ وہ کیا جواب دیتے۔ ''ہاں اُستاد! لگتا ہے، لگتا ہے، تھوڑا سا اُلٹا سیدھا ہو گیا۔ میدا اُستاد تو خیر آج نہیں آ سکتا تھا، لیکن دوسرے لوگ، بر جو دادا...!'' جامو نے اُسے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

''سیدھا بول رے۔'' بجھّل بگڑ کے بولا۔

''ہم لوگ تو، تم کو پتا ہے، سویرے سویرے واں سے نکلے تھے۔ پیچھے اُدھر کوئی چکر ہُوا تو کیا بول سکتے ہیں۔'' جامو نے بہ ظاہر سادگی سے کہا۔

بجھّل کے چہرے سے ظاہر تھا، اُسے یقین نہیں آ رہا ہے۔ اُس کی نظر زورا پر گئی، اور زورا کی بے نیازی سے اُسے اندازہ ہو گیا کہ زورا بھی جامو ہی کی زبان بولے گا۔

میرے جی میں آیا، آج نہیں تو کل اُسے سارا کچھ معلوم ہو ہی جانا ہے۔ کل صبح بھی میدا یا اڈّے کا کوئی اور آدمی اُس کی عیادت کو نہیں آئے گا، اور اسپتال سے چھٹی ملنے تک زورا اور جامو یہیں رہیں گے۔ لیکن میں کہاں سے شروع کرتا۔ اِتنا بتانے سے کہ میدا اَب اِس دُنیا میں نہیں ہے، کل تک وہ بے شک ہر طرح چوکس یہاں بیٹھا ہوا تھا۔ پر اَب وہ کبھی نہ آ پائے گا، وہ اور فی الحال اُس کے قریب ترین ساتھیوں میں سے کوئی بھی۔ بجھّل کو میں کیا کیا اور کس حد تک بتا پاتا۔ میں نے خود کو تھام لیا۔ خدا خدا کر کے تو اُس کی بحالی کی صورت پیدا ہوئی ہے۔ ہر بات اپنے وقت پر اچھی لگتی ہے۔ بے محل حقیقت بیانی یاوہ گوئی ہو جاتی ہے۔

بجھّل نے بھی چپ سادھ لی۔ اُسے احساس ہونا چاہیے تھا کہ اُس کے معتمدوں کی پہلو تہی اور لب بستگی بے سبب نہیں ہو گی۔ جنھیں کسی طرح کی مرتبت نصیب ہے، اُن پر اپنے حلقہ بگوشوں کا لحاظ بھی واجب ہے۔ ارادت مندوں سے اُن کی توفیق اور مقدرت سے سوا کی توقع نہیں کرنی چاہیے۔ اسپتال میں زیرِ علاج کسی عام مریض سے اُس کے پرسانِ حال باہر کے بکھیڑوں کے ذکر کی احتیاط کرتے ہیں۔

دیر تک وہ راہ داری میں بیٹھے بجلی کی چمک اور بارش کی

آنکھ مچولی کا نظارہ کرتے رہے۔ بارش کبھی تیز ہو جاتی، کبھی دھیمی پڑ جاتی۔ بادل مسلسل گرج رہے، یا تڑپ رہے تھے، جیسے آسمان پھٹ پڑے گا اور دُنیا آج ہی تمام ہو جائے گی۔ یوں دُنیا تو روز ہی تمام ہوتی ہے۔ آدمی کے لیے تو اُسی دن ختم ہو جاتی ہے جب وہ دُنیا سے چلا جاتا ہے۔

رات گئے جامو اور زورا کو نرس ایمی اِنھی خاص کمروں کے حصے میں واقع ایک خالی کمرے میں لے گئی، بالکل اُسی طرز کا کمرا جہاں بجھّل کو رکھا گیا تھا، کشادہ، روشن اور ساز و سامان سے آراستہ۔ معلوم ہُوا، جاتے وقت ڈاکٹر رائے، ایمی کو ہدایت کر گیا تھا۔ یہ کیسی اعلا ظرفی، کس درجے کی خوش خلقی تھی کہ اُسے دُور افتادگاں جامو اور زورا کی شب بسری کا خیال رہا، اور اُس نے کسی ایسی ویسی جگہ کے بجائے یہ خاص کمرا تفویض کیا۔ ایمی کے فراہم کیے ہوئے مریضوں کے مخصوص کپڑے پہن کے جامو اور زورا بھی مریض نظر آنے لگے تھے۔ ایمی شوخی سے کہنے لگی کہ اَب بس انجکشن کے لیے تیار ہو جاؤ۔

کچھ وقت اُن کے پاس بیٹھ کے میں ایمی کے ساتھ اپنے کمرے میں واپس آ گیا۔ دواؤں کا اثر ہو گا کہ جلد ہی بجھّل کی

آنکھ لگ گئی تھی۔ مجھے نیند نہیں آ رہی تھی، ایمی کا تو کام ہی شب بیداری کا تھا، اپنے چھوٹے موٹے کاموں سے نمٹ کے میرے پاس صوفے پر آ کے بیٹھ گئی، دیر تک چپ رہی، پھر سرگوشی میں بولی۔ ”جا رہے ہو میری جان!“

میں نے کہا، ”جانا تو کبھی تھا ہی۔“

حسرتی لہجے میں کہنے لگی، ”کچھ دن اَور رُک جاتے۔“

میں نے کہا، ”یہ بھی بہت دن ہو گئے۔ اَب اَور رُکنے کو مت کہو، جتنے دن ہم یہاں رہیں گے، کچھ نہ کچھ ہوتا رہے گا۔ بہتر ہے، جلد سے جلد ہم یہاں سے چلے جائیں۔“

بھرائی ہوئی آواز میں بولی، ”بہت یاد آؤ گے، خداوند جانتا ہے، تمھیں دیکھ کے لگتا ہے، کوئی کھویا ہوا مل گیا ہے۔ آئے دن یہاں طرح طرح کے لوگ آتے ہیں، آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ اُن کی صورتیں بھی یاد نہیں رہتیں، لیکن تم جیسے لوگوں کے ساتھ وقت گزارنے کا یہ پہلا تجربہ ہے۔ تم تو نقش چھوڑ کے جا رہے ہو۔“ پھر بچوں کے سے لہجے میں پوچھنے لگی کہ کیا کبھی وہ بھی مجھے یاد آئے گی۔ میں کیا جواب دیتا، میں نے کہا۔ ”بالکل نہیں۔“ وہ کھلکھلا پڑی، مجھے بازو میں سمیٹ لیا، اور میرا ہاتھ آنکھوں سے مَس کرنے لگی، پھر کیا ہوا کہ رونے لگی۔ دُنیا میں لوگ بہت بُرے ہوتے ہیں تو اچھے بھی بہت ہوتے ہیں۔

رات کے آخری پہر نیند نے آ لیا تھا، لیکن مُنہ اندھیرے آنکھ کھل گئی، بجھل ابھی غافل تھا۔ مُنہ ہاتھ دھو کے میں راہ داری میں آ کے بیٹھ گیا۔ صبح منظر ہی مختلف ہو گیا تھا، آسمان صاف، بادلوں کا نام نشان نہیں۔ بارش کے بعد آسمان بھی دُھل جاتا ہے، اور سبزہ، لگتا ہے، سبزے کے رنگ میں سونا آمیز ہو گیا ہو، اور اِس آمیزش، اِس بہروپ سے سبزہ چمکنے لگا ہو۔ آٹھ بج کر چند منٹ ہی اوپر ہوئے ہوں گے کہ لدے پھندے ایک خدمت گار کے ساتھ سیورین راہ داری میں طلوع ہوئی، اُجلی اُجلی، کِھلی کِھلی، بارش نے جیسے اُسے بھی کچھ اَور نکھار دیا ہو۔ مجھے دیکھ کے رفتار تیز ہو گئی۔ اُس کے ہاتھوں میں بھی سامان تھا۔ میں نے لپک کے اُسے جا لیا اور بہ عجلت سامان اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ نیلی ساری میں ملبوس تھی۔ ساری اُس پر خوب جچتی، سجتی تھی۔ اُس کا دھان پان سراپا اور کشیدہ، اَور کمان ہو جاتا تھا۔ ”جامو اور زورا بھائی کہاں ہیں؟“ کمرے میں آ کے اُس نے گھبرائے ہوئے انداز میں پوچھا۔

میں نے اُسے بتایا کہ ابھی آتے ہوں گے، رات خاصی دیر سے سوئے تھے، اور کیا معلوم، سوئے بھی یا نہیں۔

”اُنھیں بلا لیں، سارا گرم گرم ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے آنے میں بہت دیر ہے۔ اچھا ہے، اُن کے آنے سے پہلے ہم نمٹ جائیں۔ بعد کو یہ کھانوں کی خوش بُو بھی کمرے سے دُور کرنی ہے، دیکھا نہیں اُس دن۔ اُن کی ناک کتنی تیز ہے۔“ وہ تیز تیز آواز میں بولی۔

اُس کی آواز پر بجھل بھی بستر سے اُٹھ گیا۔ سیورین اُمڈتی ہوئی اُس کے سینے میں جا چھپی۔ بجھل نے اُس کے سر پر ہاتھ رکھا اور پیشانی کا بوسہ لیا۔

”بس بابا، آج آپ ہاتھ مت روکنا۔“ اُس نے نازبردارانہ لہجے میں کہا، ”آپ کا سارا کچھ دھیان میں رکھ کے لائی ہوں۔“

”تاری! اَب کیا رکھا ہے۔“ بجھل بجھی ہوئی آواز میں بولا، ”بالکل ٹھیک ہوں میں۔ دیکھنا، کیسا ہاتھ چلتا ہے۔“ پلٹتے ہوئے جانے کیوں اُس کی نظر مجھ پر، پھر ایمی پر گئی اور اُس کے ہونٹوں پر تبسم کِھل گیا۔

کسی خدمت گار نے جامو اور زورا کے کمرے میں جا کے اُنھیں مطلع کر دیا تھا۔ جتنی دیر میں وہ آئے، ایمی اور سیورین نے میز پر تشتریاں سجا دیں، شکر ہے، جامو اور زورا نے رات والا مریضوں کا لباس تبدیل کر لیا تھا اور اپنے اصل حلیے میں آ گئے تھے۔ ناشتے کے اہتمام میں سیورین شاید رات بھر جاگتی رہی ہو، مگر چہرے پر تھکاوٹ کے آثار مطلق نہیں تھے۔ خوشی میں آدمی پر تھکن ایسی طاری نہیں ہوتی۔ خوشی بھی تو نیند کے، نشے کے مانند ہے۔ میٹھے چاولوں کا ڈونگا اُس نے چپکے سے میری طرف کھسکا دیا۔ خاصی توجہ سے چاول پکائے گئے تھے، دانہ دانہ الگ تھا، جیسے دانہ دانہ الگ پکایا گیا ہو۔ میٹھا بھی بس میٹھے کی حد تک تھا، چاولوں پر غالب نہیں آیا تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ بالائی سے لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ بالائی بھی وافر تھی۔ عورتیں چاہے کتنی ہی زندگی کے دیگر معاملات میں فعّال اور سرگرم ہوں، گھر اور گھریلو امور سے اُن کی نسبت طبعی ہوتی ہے۔

چھوٹی چھوٹی پوریاں، ترکاری، انڈے کا حلوہ، ٹوسٹ، مکھن، شہد، میدے کی نمکین اور میٹھی ٹکیاں وغیرہ... جانے کیا کیا، البتہ گوشت کی کوئی چیز نہیں تھی۔ جامو اور زورا بار بار ستائشی نظروں سے سیورین کو دیکھتے تھے اور اُس کے رخساروں پر لالی بکھر جاتی تھی۔

ٹھیک دس بجے ڈاکٹر کی آمد ممکن ہوئی۔ کمرا بالکل صاف تھا۔ ایمی اور سیورین نے تمام کھڑکیاں کھول دی تھیں اور تیز پنکھا چلا دیا تھا کہ کسی قسم کی مہک باقی نہ رہے۔ ڈاکٹر رائے کے ساتھ دو نوجوان ڈاکٹروں کے علاوہ گورا ڈاکٹر بھی تھا۔ وہ پہلے بھی یہاں آ چکا تھا۔ ڈاکٹر کو اشارہ کرنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ میں، جامو اور زورا اُسے دیکھتے ہی کمرے سے نکل گئے اور راہ داری میں کرسیوں پر بیٹھنے کے بجائے کھڑے رہے۔ دس پندرہ منٹ بعد ڈاکٹر رائے اپنے ساتھیوں سمیت باہر آ گیا۔ کمرے سے نکلتے ہوئے وہ گفت گو میں ایسا محو تھا کہ ہم پر نظر نہ پڑ سکی۔ گورے ڈاکٹر نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ اُس نے مسکراتے ہوئے رسمی وداعی انداز میں ہاتھ ہلایا تو ڈاکٹر رائے کو سامنے میری موجودی کا احساس ہوا۔ چند قدم کا فاصلہ طے کر کے ساتھی ڈاکٹروں سے معذرت کرتا ہوا وہ سیدھا میری طرف بڑھا۔ ”گیارہ بجے آئی جی یہاں آئے گا۔“ دستی گھڑی پر طائرانہ نظر ڈال کے اُس نے تنبیہی لہجے میں کہا، ”وہ تم سے ملنا چاہتا ہے۔“

”مجھ سے!“ میں نے چونک کے کہا۔ ”اَب کیوں؟“

”یہ اُسی سے پوچھنا۔“ وہ بے اعتنائی سے بولا۔

”اَب کیا... اَب کیا ڈاکٹر صاحب؟“

”تم سے بات کرنا چاہتا ہے۔“ اُس نے سرسری طور پر کہا، ”وقت پر اُس طرف آ جانا۔“ یہ حکم دیتے ہی وہ فوراً چل پڑا۔

میں نے پوچھنا چاہا کہ کس طرف، لیکن وہ مڑ چکا تھا۔ ظاہر ہے، اُس کی مراد اُس کا دفتر ہی ہو گی۔ اُسے بہت جلدی تھی، یا گورے ڈاکٹر کی ہمراہی کی وجہ سے وہ زیادہ بات نہیں کر سکا تھا، اور مجھ میں اُسے روک کے وضاحت طلب کرنے کی جرأت نہیں تھی۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا، آئی جی کا مجھ سے ملاقات کا کیا مقصد ہو سکتا ہے، اَب کیا پھر کوئی اَور...

دس بج کر بیس منٹ ہو رہے تھے۔ گیارہ بجنے میں زیادہ وقت نہیں تھا۔ یہ مختصر وقت کاٹنا مشکل ہو گیا۔ ڈاکٹر حسبِ عادت مجھ سے انگریزی میں مخاطب ہوا تھا۔ آئی جی کا ذکر ایک ہی بار آیا تھا، لیکن زورا اور جامو کے کان بھی اُن کے دیدوں جیسے تھے۔ میری وحشت دیکھ کے کرید کرنے لگے۔ میں نے اُنھیں بتایا تو

وہ بھی مکدر ہوئے، حیران اور پریشان بھی۔

گیارہ بجنے میں آدھ گھنٹا باقی تھا۔ میں نے کمرے میں جا کے حلیہ درست کیا۔ بچّھل بھی میرے ساتھ باہر آ گیا۔ زورا اور جامو کو تو معلوم تھا، بچّھل سے کچھ کہے بغیر میں آہستہ قدموں سے چلتا ہوا راہ داری سے دُور ہو گیا۔ پولیس کی نفری موجود تھی، لیکن صرف اِن خاص کمروں کے حصے کے اطراف۔ چند منٹ بعد مرکزی عمارت آ گئی، اور سب سے پہلے چھا گلا سے مڈبھیڑ ہوئی۔ وہ میرے انتظار میں باہر ٹہل رہا تھا۔ اُسی نے مجھے ڈاکٹر کے کمرے میں پہنچایا اور بتایا کہ چند مریضوں سے نمٹ کے کسی بھی لمحے ڈاکٹر پہنچا چاہتا ہے۔ جی میں آیا، چھا گلا ہی سے کچھ معلوم کروں، لیکن اچھا نہیں لگا۔ مجھے صوفے پر بٹھا کے اور رسمی خیر خیریت پوچھ کے چھا گلا چلا گیا۔ میں گُنگ بیٹھا دیواری گھڑی دیکھتا رہا۔ وقت بھی کبھی کیسا بے حس ہو جاتا ہے۔

گھڑی نے گیارہ بجائے تھے، اور ابھی تین ہی منٹ اوپر ہوئے تھے کہ کمرے کے باہر وزنی جوتوں کی آہٹیں گونجیں۔ میں بے ارادہ اُٹھ گیا اور ارادتاً بیٹھ گیا، اور مجھے پھر کھڑا ہونا پڑا۔ پولیس کی یہ پابندیٔ وقت تعجب خیز تھی۔ وہ آئی جی ہی تھا۔ چھا گلا کی معیت میں تیزی سے کمرے میں داخل ہوا۔ اُس کے ساتھ وہی دو افسر تھے جو پہلے بھی اُس کے ہم راہ آئے تھے۔ تینوں کا رُخ میری طرف ہو گیا۔ آئی جی میرے مقابل آ کے ٹھیر گیا اور اُس کی تیز چمکیلی نظریں میرے چہرے پر جم گئیں، پھر اُس نے فوجیانہ انداز میں ہاتھ بڑھایا۔ اُس کا مدعا سمجھنے میں مجھے دیر لگی، لیکن یہ بس چند لمحوں کا تردّد تھا۔ میں نے بھی بدحواسی سے اپنا ہاتھ اُس کی طرف بڑھا دیا۔ اُس نے میرا ہاتھ زور سے جکڑ لیا اور جکڑے رہا۔ اُس دم مجھے ایسا لگا جیسے میرے جسم سے بندھی رسّیاں کُھل گئی ہوں۔ اُس نے میرا حال پوچھا اور بچّھل کا۔ میں نے ہکلاتی زبان میں اُس کا شکریہ ادا کرنا چاہا، اور مجھے نہیں معلوم، میں کچھ کہہ سکا بھی یا نہیں۔

"معذرت۔ میرے پاس وقت کم ہے۔ کل تم جا رہے ہو، تم سے ملاقات نہ ہوتی تو ایک خلش رہ جاتی۔" مجھے یقین نہیں آ رہا تھا، یہ کسی پولیس والے کا لہجہ ہے، مگر آئی جی ہی مجھ سے مخاطب تھا۔ کہنے لگا، "افسوس ہے، زیادہ دیر نہیں ٹھیر سکتا۔ ابھی شہر کے حالات معمول پر نہیں آ سکے ہیں اور ہر طرف نگاہ رکھنی پڑ رہی ہے۔ ہم نے تمھارے بارے میں کلکتا پولیس سے معلومات حاصل کی ہیں، یہ ضروری تھا، ہماری اپنی تسلّی اور یہاں کے پولیس ریکارڈ کی تکمیل کے لیے۔ تم سے لڑکپن کی عمر میں دو قتل ہوئے تھے؟" میں نے حیرانی سے اُسے دیکھا تو وہ ہاتھ اُٹھا کے جلدی سے بولا، "اور وجہ بھی معلوم ہوئی۔ کسی لڑکی کو وحشیوں سے بچانے کے لیے تم نے دو آدمیوں کو چاقو گھونپ دیے تھے۔ سات سال کی سزا کے دوران تم نے تعلیمی سلسلہ جاری رکھا اور ایم اے کی سند حاصل کی۔ تم جیل میں نہایت اچھے قیدی ثابت ہوئے... یہی پوچھنا... تم ظہیر خاں، بابر زماں خاں اور لاڈلے! تم کیسے حیران کُن نوجوان ہو۔ تم بتاؤ، تمھیں کس نام سے پکارا جائے۔"

"جو آپ کو بہتر لگے۔ میرے لیے سبھی ایک جیسے ہیں۔" اِس اثنا میں مجھے اپنی سانسیں ہموار کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ میں نے ٹھیری ہوئی آواز میں کہا، "آپ تو سب کچھ جان ہی گئے ہیں، جیل میں نام بدلنا مجبوری تھی۔ میرا خیال ہے، ناموں سے کچھ ایسا فرق نہیں پڑتا۔"

"بے شک، تم ٹھیک کہتے ہو۔" وہ جوشیلے لہجے میں بولا، "لیکن ہم یہ نہیں جان سکے کہ وہ لڑکی کون تھی؟ تم کہاں سے آئے تھے؟ اور یہ تم بتاؤ گے بھی نہیں۔"

میں خاموش رہا۔

"معلوم ہوا ہے کہ تم اڈّا گیری کے لیے ہر اعتبار سے مکمل ہو، چاقو، بلم، لاٹھی، زور، ہر طرح سے لیس۔ تمھارے ہاتھ میں پھرتی ہے، نگاہ تیز ہے، ہوش مندی سے کسی کے سامنے آتے ہو، لیکن اڈّوں سے تمھاری وابستگی واجبی ہے۔ اڈّا گیری سے تمھیں کوئی دل چسپی نہیں۔ عرصے سے تم اپنے مربی اُستاد بچّھل کے ساتھ مسلسل سفر میں رہتے ہو، کسی کی تلاش میں۔ ہو سکتا ہے، اُسی لڑکی کی تلاش میں... یا کسی اور کی۔ اطمینان رکھو، ہم تم سے پوچھیں گے نہیں۔ کلکتے میں مقدمۂ قتل کے دوران بھی تم نے اُس لڑکی کا ذکر کرنا اور نام لینا گوارا نہیں کیا اور اپنا مقدمہ کم زور کر لیا۔"

میں ایک مضطرب نگاہ سے اُسے دیکھ کے رہ گیا۔

"بہرحال، اِس وقت ہمارے یہاں آنے کا مقصد تمھیں

اپنی معلومات سے متاثر کرنا نہیں، تمھارا اور ڈاکٹر صاحب کا شکریہ ادا کرنا تھا۔" وہ سنجیدگی سے بولا، "تمھاری وجہ سے ہم سُرخ رُو ہو سکے۔"

"میں کیا..." میرا جسم سکڑ گیا۔ "میں کہاں... شکریہ ضروری ہے تو اِس کے سزاوار ڈاکٹر صاحب ہیں۔"

"تم نے سچ بولا، ڈاکٹر صاحب سے اور ہم سے... بدترین حالات میں سچ بولا... کوئی افترا، مبالغہ نہیں... اور ڈاکٹر صاحب نے ہماری رہنمائی کی۔"

"مجھے نہیں معلوم، ڈاکٹر صاحب نے آپ کی کیا رہنمائی کی، لیکن میں سمجھتا ہوں، میں نے تو کچھ نہیں کیا۔ آپ سچ کی بات کر رہے ہیں۔ میرے پاس چارہ بھی کیا تھا۔"

"ڈاکٹر صاحب تو ہمارے لیے ایک دریافت ہیں، وہ انسان دوست، حق جُو، جہاں دیدہ اور بے باک شخص... اُن کی بصیرت اور حکمت کے تو ہم معترف ہیں۔ اُنھوں نے ہمارا اعتماد بحال کیا۔ یہ اُنھی کی دلیلوں کا کرشمہ تھا کہ ہم سے، جُرم کہو یا گناہ، سرزد ہوتے ہوتے رہ گیا۔ ہم تو تمھیں ساتھ لے جانے کے ارادے ہی سے آئے تھے، معلوم تھا کہ ڈاکٹر صاحب سے تمھارا کوئی تعلق نہیں ہے، لیکن وہ تمھارے لیے دیوار بن گئے، اور اُن کی توانائی کا سبب تم تھے، تمھارا سچ۔ اُنھوں نے ہمیں قائل کیا، ہم پر زور دیا کہ پولیس کے روایتی طریقوں سے ہٹ کے کوئی اقدام کرنے کی جرأت کریں۔ اُنھوں نے ہمارے لیے ایک سمت مقرر کی، ورنہ ہم تو بھٹکتے رہتے۔ اپنی روش کے خلاف ہم نے اُن کی ہدایات آزمائیں، اور کسی قدر اپنی حدود سے بھی تجاوز کیا۔ میدا کو چھیڑنے کے بجائے ہم نے اُس کے چھوٹے بڑے ساتھیوں سے باز پُرس کی ابتدا کی۔ ڈاکٹر صاحب نے ہمیں شہر کی پولیس بدل دینے کا مشورہ دیا تھا۔ ہمارے عزم کی پختگی کی وجہ ڈاکٹر صاحب ہی تھے۔"

ڈاکٹر رائے کی آمد سے آئی جی منتشر سا ہو گیا۔ میرے سامنے سے ہٹ کے اُس نے ڈاکٹر سے ہاتھ ملایا۔

"معافی چاہتا ہوں، کچھ دیر ہو گئی۔" ڈاکٹر نے متانت سے کہا، "ایک مریض کی حالت بہتر نہیں تھی... اور یہ کیا؟ آپ لوگ ابھی تک کھڑے ہیں۔"

"کریڈٹ کارڈ کے بڑھتے ہوئے استعمال نے مجھے فکرمند کر دیا ہے۔"

"آئے زیادہ وقت نہیں ہوا ڈاکٹر صاحب، اور کھڑے کھڑے ہی آنا تھا۔" آئی جی نے تمام تر ادب سے کہا، "آپ اندازہ کر سکتے ہیں، سرِدست مصروفیت کا کیا عالم ہوگا۔ بس آپ دونوں کا شکریہ ادا کرنا تھا، آپ نے ہمارے لیے..."

ڈاکٹر نے اُسے روک دیا۔ "چائے کا وقت تو دیجیے۔"

آئی جی نے معذرت کر لی۔ "آپ سے تو ملاقاتیں رہیں گی ڈاکٹر صاحب... اگر آپ نے وقت دیا؟" وہ لجاجت سے بولا، "ہم نے تو آپ کا گھر دیکھ لیا ہے، اور مسائل تو پیش آتے رہیں گے۔" پھر وہ میری طرف مُنہ کر کے بولا، "اصل میں اِس نوجوان کے پاس آنا ضروری تھا کہ اِسے کل چلے جانا ہے، اور اِس سے تو بہت سی باتیں کرنے کو جی چاہتا ہے۔"

"یہ ایسا ہی ہے۔" ڈاکٹر نے شگفتگی سے کہا، "کتنی ہی بار ملاقات ہو، تشنگی کا احساس رہتا ہے۔"

میں نے سر جھکا لیا۔ میرے لیے یہ ایک حادثہ ہی تھا کہ ہمکتے ہوئے انداز میں آئی جی مجھ سے بغل گیر ہو گیا۔ "ہمیں اب اجازت دو۔" اُس کی آواز پر کوئی بار سا تھا۔

اُس کے ساتھی افسروں نے بھی گرم جوشی سے مصافحہ کیا۔ میری تو کچھ عقل میں نہیں آ رہا تھا کہ مجھے کیا کہنا اور کس طرح اُنھیں رخصت کرنا چاہیے۔ اُنھیں واقعی جلدی تھی۔ کمرے سے نکل جانے میں اُنھوں نے کوئی لمحہ نہیں گنوایا، اُن کے پیچھے ڈاکٹر، پھر میں بھی باہر آ گیا۔

مرکزی عمارت کے پورچ میں موٹر کھڑی تھی۔ اُن کی رفتار تیز تھی، بالکل سپاہیانہ۔ اُن کا ساتھ دینے کے لیے

ڈاکٹر راے اور مجھے لپکنا پڑا۔ آئی جی موٹر میں بیٹھ گیا تھا کہ مجھے خیال آیا، میں نے ہاتھ اُٹھا کے اُس سے کچھ کہنا چاہا۔
اُس نے ڈرائیور کو موٹر بند کرنے کا حکم دیا۔ مجھے حیرت ہوئی۔ وہ جھٹ موٹر سے اُتر آیا، اُس کے ساتھ دونوں افسر بھی۔
مذبذب لہجے میں اُس نے مجھ سے پوچھا، ''کوئی مسئلہ؟''
''ایک گزارش ہے۔'' میرا لہجہ عاجزانہ تھا۔ ''کیا یہ ممکن ہے کہ مجھے اکبر علی خاں صاحب کے گھر جانے کی اجازت مل جائے؟''
وہ فوراً کوئی جواب نہ دے سکا، ماتحتوں پر نظر کی، پھر ڈاکٹر کی طرف دیکھا۔
''نہیں، ممکن نہیں۔'' ڈاکٹر نے قطعی آواز میں دخل دیا۔
''ہاں، ڈاکٹر صاحب ٹھیک کہتے ہیں۔ وہاں تو ہر وقت سوگ واروں کا ہجوم ہے، اور اُن میں طرح طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ بیگم کے چلے جانے پر تو وہ گھر بالکل اُجڑ گیا ہے۔'' آئی جی تأسف سے بولا، ''ہم نے تمھاری طرف سے سکندر علی خاں کو مطمئن کر دیا ہے کہ ہمی نے تمھارا راستہ روک رکھا ہے۔ اُس کی حالت بھی ٹھیک نہیں، تین چار روز اور یہاں رہے گا، پھر بچی کو ساتھ لے کے دکن چلا جائے گا۔''
میں چپ ہو گیا۔
''ہم تمھارا دُکھ، تمھاری خلش محسوس کر سکتے ہیں، اور ہم نے ہر زاویے سے غور کیا، کسی جگہ بھی ہمیں تمھارا دوش نظر نہیں آیا۔ تم سے ایک چُوک ضرور ہوئی، اِسے چُوک کہنا بھی چاہیے یا نہیں۔ ڈاک خانے میں میدا کا جیب کترا ساتھی تمھارا بٹوا لے کے بھاگ کھڑا ہوا تھا تو تم اُس پر خاک ڈال دیتے۔ پھر کچھ بھی نہ ہوتا۔ ہمیں یہ حقیقت بھی تسلیم ہے کہ تم جیسے نوجوان... اور شاید کسی کے لیے بھی خود کو قابو میں رکھنا مشکل تھا، تمھیں فطری طور پر اُس کا تعاقب کرنا چاہیے تھا... اور ہاں، ایک دوسری چُوک، وہ بھی نادانستہ تھی کہ میدا کے ٹھکانے پر جا کے اُستاد جُھمّل کا نام تمھاری زبان پر نہ آ سکا۔ آ جاتا تو صورت بالکل مختلف ہوتی۔ میدا نہایت سفلہ اور چالاک آدمی تھا۔ وہ جان گیا تھا کہ تم یوں ہی سینہ تان کے اُس کے سامنے نہیں آئے ہو گے۔ کاش، وہ تمھارے مقابل آ جاتا۔ ہمیں یقین ہے، پھر اُس کا کیا حشر ہوتا، لیکن بنیادی طور پر وہ اڈّے کا آدمی نہیں تھا، بڑا کمینہ صفت، درندہ خصلت تھا وہ۔ ہمیں صدمہ ہے تو اکبر علی خاں کا۔ اُن کے گھر جا کے دل ڈوبنے لگتا ہے، بچّے دیکھ کے، سکندر علی خاں سے مل کے۔ بچّے تو ٹوٹ پھوٹ سے گئے ہیں، یہی حال اُن کے تایا کا ہے۔''
آئی جی کی آواز بھاری ہو گئی۔
ڈاکٹر نے اُس کی کمر پر ہاتھ رکھ کے موٹر کی طرف اشارہ کیا، اور موٹر جلد ہی دُور چلی گئی۔

❁ میں نے اجازت چاہی تھی، لیکن ڈاکٹر راے مجھے ساتھ لے آیا اور کمرے میں آ کے دیر تک گُم سُم بیٹھا رہا۔ میرا کچھ پوچھنا یا ٹوکنا سُوءِ ادب ہوتا۔ لگتا تھا، مجھ سے کچھ کہنا چاہتا ہے اور زبان کھولنے سے پہلے اپنے مدعا کی پیمائش کر رہا ہے، قدر و قیمت، اثری و بے اثری کا تخمینہ، یوں خالی الذہنی میں بھی کچھ یہی کیفیت ہوتی ہے، مگر ڈاکٹر جیسے ایک پُر مایہ شخص کے ذہن میں ہر وقت خیالوں کی یورش ہوتی چاہیے۔ آج کے وقت وہ خدمت گار سے چاے کے لیے کہہ آیا تھا۔ چند منٹ بعد چاے آ گئی اور ڈاکٹر میز والی کرسی سے اُٹھ کے صوفے پر میرے پاس آ بیٹھا۔ خدمت گار چاے بنا کے چلا گیا تو چند گھونٹ لے کے اُس نے بتایا کہ اُس کا معاون چھاگلا ہمارے جانے تک مسلسل ہمارے رابطے میں رہے گا۔ چھاگلا نے گرانڈ ہوٹل سے ہمارا بقایا سامان لینے اور ہوٹل کا حساب چکتا کرنے کے لیے اپنا ایک خاص کارندہ بھیج دیا ہے۔ توقع ہے کہ ہوٹل کا منیجر ہوٹل میں رکھی ہوئی میری نقد رقم حوالے کرنے اور رسید لینے خود آئے گا۔ قبل از وقت ہمارے لیے ریل کے ٹکٹوں اور ڈبّے میں جگہ کی فراہمی کے لیے بھی چھاگلا ہی سے کہا جائے۔
اُس نے میرے آگے نمکین بسکٹوں کی تشتری رکھ دی اور ستائے انداز میں بولا، ''تم لوگ کلکتے جا رہے ہو یا فیض آباد؟''
''میری خواہش تو فیض آباد جانے کی ہے، وہاں گھر ہے۔ جُھمّل بھائی کو کچھ دن آرام کرنا چاہیے۔''
''وہ اب بالکل ٹھیک ہے، دماغ پر سُوجن نہیں۔ اُس کی اِتنی فکر مت کرو۔''
''لیکن ابھی آرام تو بہ تر ہی رہے گا۔''

اُس نے ہنکاری بھری اور کچھ توقف کے بعد آہستگی سے بولا، ''رات کو آ رہے ہو؟ بینا کہہ رہی تھی، کچھ پہلے آ جانا۔''
''جی...'' میری آواز ڈگمگا گئی۔
''اور کہہ رہی تھی، کچھ خاص پسند ہو تو پوچھ لوں۔''
''کیا ڈاکٹر صاحب!'' میں نے کھسیائی آواز میں کہا، ''آپ کے ہاں تو کبھی کچھ کسی نعمت کے مانند ہے، لیکن...''
وہ صوفے پر سیدھا ہو گیا۔ ''لیکن کیا؟''
میں نے بہ مشکل کہا، ''مجھے معاف کیجیے۔ مت بلایئے مجھے۔''
''کیا... کیا بات ہے؟''
''غالباً میرا گھر نہ آنا ہی بہ تر رہے گا۔''
اُس کے ہونٹ کُھل گئے، آنکھیں بھنچ گئیں۔
''آپ نے غور نہیں کیا ڈاکٹر صاحب!'' میں نے بساط بھر انکسار سے کہا، ''اجازت ہو تو جسارت کروں؟''
''ہاں ہاں، کہو، کیا کہنا چاہتے ہو۔''
''آپ نے اُس رات مجھے گھر سے رخصت کرتے ہوئے ایک بات کہی تھی۔ ہو سکتا ہے، آپ نے یوں ہی اپنا ایک خیال ظاہر کر دیا ہو، لیکن مجھے اپنی سماعت پر شبہہ ہوتا رہا۔ میں آپ کو کیا بتاؤں، وہ رات کیسی بے چینی سے گزری۔ آپ نے مجھے کیسے مرتبے سے نوازنے کی دریا دلی کی تھی۔ ایک ایسے شخص کے لیے، جس سے آپ کا واسطہ چند روزہ تھا، یہ کیسی وسیع القلبی اور روشن خیالی ہے۔ میں اِس کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اُس وقت میں آپ سے کچھ نہ کہہ پایا کہ جو میں نے سُنا ہے، واقعی آپ نے کہا ہے، مجھے تو کسی خواب کا گمان ہوتا تھا، اور میں آپ سے کہہ بھی کیا پاتا۔ شاید آپ کو یاد ہو، میں نے آپ کو پہلے ہی بتایا تھا کہ کوئی مجھ سے بچھڑ گیا ہے۔ روز لوگ ایک دوسرے سے بچھڑ جاتے ہیں، مگر کوئی رگِ جاں ہوتا ہے، متاعِ جاں۔ اُس کے بغیر آدمی ادھورا رہ جاتا ہے۔ مجھے، میری منزل مجھ سے کھو گئی ہے۔ عرصہ ہو گیا، میرا کام شہر شہر، گلی کوچے اُسے ڈھونڈنا رہ گیا ہے، میری وجہ سے میرا آباد گھر ویران ہو گیا، ماں بیٹے کی جدائی میں سو گئی، بہن بھی کوٹھے پر چلی گئی، اور وہ بھی مر گئی۔ پر اب پھر سے ایک گھر بن گیا ہے، باپ ہیں، بہنیں اور بھائی ہیں... اور ایک گھر نہیں... دو دو گھر... لیکن میرا تو کوئی بھی گھر نہیں ہے۔ گھر تو گھر میں رہنے سے ہوتا ہے، مجھے اپنے گھر میں رہنے کی سعادت اور مسرت عرصے سے نصیب نہیں ہے کہ میرا کہیں جی نہیں لگتا۔ میں تو کب سے دربہ در ہوں۔''
ڈاکٹر بے حس و حرکت آنکھیں بند کیے بیٹھا رہا۔
میں نے اُس سے کہا کہ اُس کی بیٹی بینا تو قدرت کے کسی شاہ کار کے مانند ہے، ایک بے پناہ لڑکی۔ جس پہلو سے دیکھیے، حُسن و جمال میں یکتا، باطنی صفات میں بہ درجۂ کمال۔ علم، ہنر، سلیقہ، فکر اور رفتار گفتار میں ایک مثال۔ کسی میں اتنی خوبیاں شاذ و نادر ہی یک جا ہو پاتی ہیں۔ اِس پر مستزاد، وہ کس صاحبِ کمال کی بیٹی ہے، ایک مسیحا نفس، فرشتہ خصلت باپ کی۔ کون نا ہنجار اُس سے نسبت کا خواہاں نہ ہو گا۔ وہ تو کوئی بدبخت ہی ہو گا۔
''بس کرو۔'' میرے ہاتھ پر زور ڈال کے ڈاکٹر کسی قدر ناراضی سے بولا، ''اِتنا مت کہو۔''
''مجھے کہنے دیجیے۔'' میری آواز کی سوزش اختیاری نہیں تھی۔ میں نے کہا، ''مجھے اندازہ ہے، آپ نے اپنی بیٹی کا عندیہ جانے، یا محسوس کیے بغیر اِتنی بڑی، اِتنی اہم بات مُنہ سے نہ نکالی ہو گی۔ اِس کا ایک ہی جواب ہو سکتا ہے، کوئی دوسرا نہیں۔ کوئی دوسرا تو کوئی نامراد ہی دے سکتا ہے۔''
میں نے کہا، ''رات بھر کے کرب و انتشار کے بعد میں پُر سکون ہو گیا۔ یوں کہیے کہ میں جو آپ کی داد و دہش کے سحر میں اپنا ارادہ کھو بیٹھا تھا، مجھے بازیاب ہو گیا۔ میں نے طے کیا کہ ڈاکٹر راے جیسے زندگی شناس اور زمانہ آشنا سے بات کرنا

چند پندِ سُودمند

❁ انسان جتنی محنت خامی چھپانے میں صَرف کرتا ہے، اُتنی محنت میں وہ خامی دُور کی جا سکتی ہے۔
❁ اپنی اولاد کو ہم بہت کچھ سمجھانا چاہتے ہیں، لیکن وہ نہیں سمجھتی۔ ہماری اولاد بھی ہمیں بہت کچھ سمجھانا چاہتی ہے، لیکن ہم نہیں سمجھتے۔
❁ کچھ لوگ زندگی میں مردہ ہوتے ہیں اور کچھ لوگ مرنے کے بعد بھی زندہ رہتے ہیں۔

(فرمودات واصف علی واصف ❁ تعاون: رانا احمد سعید خاں)

ایسا مشکل نہیں۔ میں نے یہ طے کرلیا تھا کہ آپ کے سامنے سارا احوال آئینہ کردوں گا، لیکن آپ کا سامنا ہونے پر ہمت جواب دے جاتی تھی۔ ایک نہایت نازک خیال آدمی کے شیشۂ احساس پر ٹھیس لگ جانے کا اندیشہ گھیر لیتا تھا۔"

وہ مسکرانے لگا اور میرے ہاتھ پر مکا مارتے ہوئے بولا، "وحشت! کیسی باتیں کرتے ہو۔ مجھے تو تمھارا جواب اُسی وقت مل گیا تھا جب تم کوئی جواب نہ دے پائے تھے۔ میں نے ایک خواہش ظاہر کی تھی۔ اِس کا مطلب حکم نہیں تھا۔ بینا کے علاوہ کچھ تمھارا خیال بھی تھا کہ تم اپنے دیگر پس منظر کے باوجود ایک لائق، تعلیم یافتہ، سلیم الطبع، پُرجوش اور جرأت مند نوجوان ہو۔ تم میں بہ قولِ شخصے، سایہ اور ستون بننے کی صلاحیت ہے۔ تمھیں تو کہیں اور ہونا چاہیے۔ خیال تھا، عرصے سے تم کسی سراب کے تعاقب میں ہو تو کچھ زندگی کی طرف بھی دیکھو، زندگی کو زندگی کی طرح برتو۔ یہ اِتنی محدود نہیں ہے، اور تم سے تم تک اور تمھاری کسی معیّن منزل تک نہیں ہے۔ بے شک میری تجویز میں بینا کی پسندیدگی شامل تھی، لیکن کیا ضروری ہے کہ تم، بہ ہر حال، مجھ سے متفق ہو، اور کیا ضروری ہے کہ کسی ربط وارتباط کے لیے کوئی ایک مخصوص رشتہ ہی بنیاد بنے۔ تم نے یہ کیوں سمجھ لیا کہ تمھارے پاس مثبت جواب نہیں ہے تو تم کسی احسان فراموشی، محسن کُشی کے مرتکب ہو جاؤ گے۔ میرا تم پر کوئی حق نہیں ہے، اور نہ ہی بینا پر۔ تم بھی ایک اکائی ہو، بینا بھی۔ تمھاری طرح بینا کی بھی ایک ذات ہے۔ اُسے یا تمھیں مشورہ تو دیا جا سکتا ہے، لیکن اپنی خواہش مسلّط کرنا اَنسب نہیں۔ رشتوں میں حق کی بات شدّومد سے کی جاتی ہے۔ یہ حق بڑا مبہم لفظ ہے۔ اِس کی پیمائش کسی کو نہیں معلوم۔ حق سے مراد کوئی ضابطہ، قاعدہ، قانون اور روایت ہے، لیکن رشتے تو تعلقِ خاطر سے استوار ہوتے ہیں۔ کون کس سے کتنا مانوس ہے، کسے کون کتنا مرغوب ہے۔ شیدائیت حق پر نہیں، خودرَو ہونی چاہیے، از خود رفتہ۔ بینا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے انگلستان سے اِس لیے آ گئی کہ اُس کا باپ اکیلا ہے اور اُسے اپنے باپ کی خدمت کرنی چاہیے۔ نہیں، قطعاً نہیں۔ وہ اِس لیے یہاں نہیں آئی کہ میں اُس کا باپ ہوں۔ وہ اِس لیے آئی کہ وہ ایک شخص سے محبت کرتی ہے جو اتفاق سے اُس کا باپ بھی ہے۔ اُس نے میری اپنی چاہتوں میں ایک وقت گزارا ہے۔ میرے بیٹے نہیں آئے، اور مجھے اُن سے کوئی شکایت نہیں۔ بینا نہیں آتی تو مجھے اُس سے بھی کوئی شکوہ نہ ہوتا۔ ذمّے داری، یا ایک روایتی لفظ، فرض کی ادائی سے حق کا جواز نہیں بنتا۔ میں نے، ہر چند، ایک باپ کی حیثیت سے اپنی ذمّے داری پوری کرنے کی کوشش کی ہے۔ فرض کی ادائی اور ذمّے داری کی تکمیل کسی مبادلے، معاوضے، یا حق سے مشروط نہیں کرنی چاہیے۔ سمجھے!" یکایک اُس نے سر جھٹکا اور خود کو سرزنش کرنے لگا۔ "میں تو بھٹک گیا۔ یہ میں کہاں سے کہاں چلا گیا... میں تم سے کیا کہنا چاہتا تھا۔" وہ اُلجھ کے بولا۔

"آپ بالکل نہیں بھکے اور بھٹکے۔" میں نے ستائشی لہجے میں کہا، "آپ کیسی زندگی آموز باتیں کر رہے ہیں۔"

"میں تمھاری وضاحتوں پر ٹوک رہا تھا اور خود... میں واقعی بوڑھا ہو گیا ہوں۔" اُس نے چند لمحے تامّل کیا۔ حلق میں باقی چائے انڈیل کے وہ نسبتاً پُرسکون آواز میں بولا، "بینا ایک معاملہ فہم اور ہوش مند لڑکی ہے۔ وہ ایسی جذباتی نہیں، عمر چاہے کیسی ہی جذباتی ہو۔ پڑھا لکھا آدمی دلیلیں ڈھونڈ لیتا ہے، یا یوں کہو، دلیلوں میں اُسے پناہ مل جاتی ہے۔

مجھے احساس ہے، میری ایک دُور دراز خواہش کا اظہار تمھارے لیے بہت غیر متوقع ہوگا، اور یقیناً تم نے ایک مشکل وقت گزارا ہوگا۔ خصوصاً اِس صورتِ حال میں کہ تم اپنے ماضی کی کسی گرہ میں بندھے ہوئے ہو، مگر میرے خیال میں یہ کچھ ایسی ناروائی بھی نہیں تھی۔ جب تم گھر آئے تو دونوں ہی میرے سامنے تھے، تمھیں دیکھ کے، تم سے مل کے جانے کتنے زمانوں بعد بینا اپنے اصل روپ میں نظر آئی۔ میری نگاہ سے اگر کوئی لغزش نہیں ہوئی تو تم بھی مجھے خاصے مختلف دکھائی دیے، جیسے نیا ماحول اور نیا منظر تمھارے لیے دل کشی، راحت وسکون کا باعث بنا ہے۔ تم نے بڑی فکر آفریں اور دل نشیں باتیں کیں، اُس رات کچھ دیر کے لیے سہی، مگر تم دونوں کے چہروں پر چھلکتی چاندنی کا میں نے نظارہ کیا تھا اور محظوظ ہوا تھا۔ میں تمھیں بتاؤں، میں جانتا ہوں اچھی طرح، میرے سامنے آ کے وہ شعبدے باز بڑی وارفتگی اور سرخوشی کا تماشا کرتی ہے مگر اُس رات واقعی اُس کی

آنکھوں کی تابانی دیدنی تھی، ارادی نہیں، بے ساختہ۔ کتنے آئے اور چلے گئے۔ اُس نے سنگ دلی سے اُنھیں نظرانداز کر دیا۔ وہ ایک مہم جو لڑکی ہے، کج فہم، کم ارادہ اور کم حوصلہ نہیں۔ وہ خاصی متحمل مزاج ہے، موسموں کے سرد و گرم سے آشنا۔ میں سمجھتا ہوں، تمھارے گھر آنے میں کوئی حرج نہیں۔ وہ خوش ہو گی، اور میں تو بس اُسے خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔ اُس کی عمر تو زندگی بٹورنے کی ہے، اور میں تو بہت پیچھا اُسی کے لیے قائم ہوں۔"

"میں آ جاؤں گا، آپ کے حکم سے سرتابی کی مجال مجھ میں نہیں ہے۔" میں نے تمام تر ادب اور احترام سے کہا۔ "جو میں کہنا چاہتا تھا، شاید اُس کے بیان پر قادر نہیں، لیکن آپ نے خود ہی میرے گریز اور امتناع کے اسباب کی نشاں دہی کر دی ہے۔ بے شک اُس رات میرے گھر آنے پہ آپ کا مشاہدہ عین واقعہ ہے۔ وہاں جا کے مجھے ایسا لگا جیسے میں تو کسی طلسم کدے میں آ گیا ہوں، کسی چمن زار میں، نہیں تو روشنیوں میں آ گیا ہوں، مجھ پر تو ساتواں دَر وا ہو گیا ہے، اور چراغ میری دسترس میں ہے۔ بس ذرا ہاتھ بڑھانے کی دیر ہے۔ میں تو وہاں جا کے خود کو بھول گیا تھا، اور میں تو کوئی اور آدمی ہو گیا تھا، اور جب آپ نے یہ کہا کہ یہ سارا آئینہ خانہ، یہ رنگ اور روشنیاں، اور یہ گلستان تمھارا ہو سکتا ہے تو میری حالت اُس پس ماندہ، درماندہ، اُس قسمت گزیدہ کی سی ہوئی جس پر قدرت اچانک مہربان ہو جائے۔ لیکن جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا، رات بھر کے گرداب اور ہیجان کے بعد میں، بہ ہر حال، اپنے پاس واپس آ گیا تھا۔ آپ نے بینا کے تحمّل کی بات کی ہے، اور حوصلہ مندی کی، مگر آپ نے میرے لیے نہیں سوچا۔ وہ کتنی ہی مضبوط اعصاب کی ہو، لیکن میرا بھی تو کچھ خیال کیجیے۔ میں تو اپنی بات کر رہا ہوں۔ میں جو اپنے آپ سے ہراساں ہوں۔ نقش جمنے کے لیے وقت کی کوئی شرط نہیں ہوتی۔ ایک لمحہ بھی نقش ہو جاتا ہے اور جزوِ جاں بن جاتا ہے۔ وہ دریچے ہی کیوں کھولے جائیں، جن کے پار کسی مطلوب کے گزرنے کا امکان ہو اور مطلوب کو بھی تو کسی گرہ سے مبرّا ہونا چاہیے، اور مطلوب کو بھی تو کوئی مطلوب ہو سکتا ہے۔ آپ نے ایک زندگی کے تجربے کیے ہیں، ایک منطق ماورائے عقل کی بھی ہوتی ہے،

شوق کی، خود فراموشی کی، خود شکنی کی، ہر عمر اور ہر فرد میں، جس کا درجہ اور پیمانہ مختلف ہوتا ہے۔ آدمی صرف سر ہی نہیں ہوتا، سر کے نیچے بھی بہت کچھ ہوتا ہے، بہت سمندر، آگ اور شور اُٹھائے اور چھپائے ہوئے۔ دو اور دو پانچ کے آپ بھی قائل نظر آتے ہیں، لیکن کبھی حاصل جمع چھ، سات، دس اور بے شمار بھی ہوتا ہے۔ باہم آمادگیاں ہوں تو کونپلیں پھوٹنے لگتی ہیں، دیے خود بہ خود روشن ہو جاتے ہیں۔ وہ نازک اندام، کانچ کا جس کا سراپا ہے، دل بھی اُس کا کانچ کا ہونا چاہیے۔ وہ تو ویسے بھی ایک مصوّر ہے، خوابوں اور خیالوں میں بسنے، رنگوں اور سازوں سے کھیلنے والی لڑکی۔ اُسے کیوں کسی آزمائش سے دوچار کیا جائے... اور میں بھی دو آدمی نہیں ہوں ڈاکٹر صاحب! میں اپنی منزل سے بچھڑ گیا تو میں خود سے نہ بچھڑ جاؤں اور پشیمانی اور پس پائی کے کسی احساس میں تا دیر شاید باقی نہ رہوں۔ مجھے تو آخر دم تک اُسے ڈھونڈنا ہے۔ میرا دل کہتا ہے، وہ میری منتظر ہے، وہ بھی کسی آسرے، کسی یقین میں زندہ ہے۔"

ڈاکٹر راے صوفے سے اُٹھ گیا۔ میں بھی کھڑا ہو گیا۔ اُس نے غور سے میری طرف دیکھا، اور دیکھتا رہا۔ اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ جھلکنے لگی۔ اُس کی آنکھیں بھی چمک رہی تھیں۔ اُس نے بازو پھیلا دیے، میں بھی اُس کے سینے سے جا لگا۔

❄ میرے پیچھے اُنھوں نے سارا کچھ طے کر لیا تھا۔ یہ ڈاکٹر راے کا دیا ہوا اعتماد ہی ہوگا کہ مخمل نے فیض آباد جانے سے انکار کر دیا تھا۔ کمرے میں میرے پہنچنے کے چند منٹ بعد ذرا اشارے سے مجھے باہر لے آیا، اور اُس نے ایکی، سیورین، جامو، مخمل اور اپنے درمیان ہونے والے فیصلے سے آگاہ کیا۔

اُس کے کہنے کے مطابق، سیورین ہمارے ساتھ نہیں جارہی تھی۔ وہ تو ساتھ جانے ہی پر مُصر تھی، لیکن یہ کسی طور مناسب نہیں تھا۔ بتھل کی تاکید پر مان گئی، اور طے یہ ہوا کہ ہمارے چلے جانے کے بعد وہ لمبی چھٹی کے لیے درخواست دے گی، آبائی گھر ساتھ رہنے والی آنٹی کی تحویل میں دینے کے لیے قانونی دستاویز، مختار نامہ وغیرہ تیار کرائے گی، کلکتے میں زورا اور جامو سے خط اور تار کے ذریعے اُس کا رابطہ مستقل رہے گا، اپنے ضروری کاموں سے نمٹ کے وہ جامو اور زورا کو مطلع کردے گی۔ دونوں معیّنہ تاریخ اور وقت پر جس گاڑی سے پٹنا اسٹیشن آئیں گے، سیورین اسٹیشن پر اُن کی منتظر ہوگی اور اُسی گاڑی سے اُن کے ساتھ فیض آباد روانہ ہوجائے گی۔ جامو اور زورا پٹنا شہر میں داخل نہیں ہوں گے۔ دس بارہ یا بیس منٹ جتنی دیر گاڑی اسٹیشن پر رُکتی ہے، اُتنے ہی وقت کے لیے وہ برائے نام پٹنے میں رہیں گے۔

میں نے خاموشی سے سن لیا اور کچھ نہیں کہا۔ سیورین سامنے آئی تو رخسار دمک رہے تھے، بل کہ کرنیں سی پھوٹ رہی تھیں۔ کچھ شرمائی شرمائی اور ہلکی پھلکی بھی لگ رہی تھی۔ مجھے بھی اپنا چہرہ شکنوں سے عاری رکھنا چاہیے تھا کہ اب میرے انگلی اُٹھانے اور مآل اندیشی میں پڑنے کا وقت گزر چکا تھا۔

کوئی ایک بجے کے قریب چھاگلا، گرانڈ ہوٹل کے منیجر اور اُس کے دو کارندوں کے ہم راہ راہ داری میں آتا دکھائی دیا۔ ہم سب باہر ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ منیجر حساب کتاب اور ہوٹل میں رکھا ہمارا مختصر سامان بھی ساتھ لایا تھا۔ بیس ہزار رُپے کی رقم، جو میں نے اُس کے پاس بہ طورِ امانت رکھوائی تھی، اُس نے واپس کردی اور چھاگلا کے دست خطوں کی گواہی کے بعد مجھ سے رسید لکھوالی۔ منیجر افسوس کررہا تھا کہ ایک رات بھی ہم ہوٹل میں قیام نہ کرسکے۔ پہلے دن صرف ایک سوا گھنٹے کے لیے غسل اور لباس کی تبدیلی کے لیے میں نے کمرا استعمال کیا تھا اور ہمیں ایک بڑی رقم ادا کرنی پڑ رہی ہے۔ میں نے کوئی درخواست نہیں کی تھی، لیکن انتظامیہ نے ازخود تھوڑی بہت رعایت کردی تھی۔

دوپہر کو سیورین نے اسپتال کے طعام خانے سے کھانے کا انتظام کردیا تھا۔ بھوک ایسی تھی بھی نہیں، لیکن صبح، دوپہر، رات کھانے کی رسم کی تکمیل بھی تو واجب ہے۔ دوپہر کو ڈاکٹر رائے بتھل کو دیکھنے نہیں آیا۔ اُس کے بجائے ایک اُدھیڑ ڈاکٹر نے خانہ پُری کے انداز میں دَورہ کیا اور چند منٹ کے معائنے کے بعد بتھل کو سکون و عافیت کی نوید دیتا چلا گیا۔

چھاگلا کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ پولیس نے اڈّے کے بہت سے آدمی رہا کردیے ہیں اور میدا کی میت اُن کے حوالے کردی گئی ہے کہ اُنھی کے ہاتھوں اُس کی آخری رسوم انجام پائیں۔ چھاگلا بتا رہا تھا کہ صبح اِکا دُکا دکانیں کھُلی تھیں، لیکن اڈّے کے آدمیوں کی رہائی اور اُنھیں میدا کی میت کی تحویل کی خبر سن کے لوگوں نے خود کو گھروں تک محدود کرلیا ہے۔ سارا شہر بند ہے، سڑکوں پر سناٹا ہے اور زیادہ تر پولیس اور افواہیں گشت کررہی ہیں۔ چھاگلا آج کسی ذاتی ملازم کی طرح ہماری خدمت پر مامور تھا۔ ٹکٹوں کی خریداری کے لیے اُس نے اپنا معاون اسٹیشن بھیج دیا تھا۔ شام تک اسپتال کے واجبات بھی ادا ہوگئے۔

شام کی چائے کا اہتمام چھاگلا کی طرف سے کیا گیا تھا۔ جس کمرے میں جامو اور زورا نے شب بسری کی تھی، وہیں میز لگادی گئی تھی۔ چاٹ پکوڑے، دہی بڑے، قسم قسم کے انگریزی بسکٹ اور چائے کی کیتلی، ڈونگوں اور تشتریوں سے میز سجی ہوئی تھی۔ ہمارے اصرار کے باوجود چھاگلا ساتھ نہیں بیٹھا اور ہوٹل کے پیشہ ور خدمت گاروں کی طرح ہمارے آگے چیزیں پیش کرتا رہا۔ سیورین اور اسپتال کے دو ایک کارندے بھی اُس کا ہاتھ بٹا رہے تھے۔ سورج غروب ہونے سے پہلے امی آگئی تھی اور لباس کی تبدیلی کے باوجود سیورین ٹھیری رہی۔

اندھیرا گہرا ہوگیا تھا اور آہستہ آہستہ رات حاوی آگئی تھی۔ سبھی ڈاکٹر رائے کے منتظر تھے۔ وہ نہیں آیا۔ جیسے جیسے وقت بڑھتا گیا، مجھے تشویش ہونے لگی۔ ایک ہی پہر کی تو بات تھی، کل صبح ہمیں چلے جانا ہے۔ ڈاکٹر کو آنا چاہیے تھا۔ کہیں گھر جا کے اُس نے میری عرض داشت پر نظرِ ثانی تو نہیں کی۔ گھر جا کے اُس کا سامنا بیتا سے ہوا ہوگا۔ ڈاکٹر اُس سے کیا کہہ پایا ہوگا۔ وہ کتنا ہی بیٹی سے سچ بولتا ہو، میرے عذر رنجوں کے ٹوں بتھل نہ کرسکے گا، پھر بیتا کیا مطمئن ہوسکے گی۔ ڈھندلے عذر ذہین آدمی کو اور مضطرب کردیتے ہیں۔ مجھے گھبراہٹ ہونے لگی تھی۔ جامو اور زورا میرے ساتھ تھے اور ہم راہ داری میں ٹہلتے ہوئے ڈاکٹر رائے کی راہ تک رہے تھے۔ ساڑھے نو بجے ہوں گے کہ ایک نوجوان ڈاکٹر کی آمد سے صاف ہوگیا کہ ڈاکٹر رائے اب نہیں آئے گا۔ ڈاکٹر نِل پیر پہلے بھی کئی بار آچکا تھا، کچھ کھلنڈرا اور بے پروا قسم کا نوجوان تھا۔ یہ اُس کی شوخی ہی تھی کہ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا، واپس ہوتے وقت اُس نے منکشف کیا کہ ڈاکٹر رائے گھر پر کسی مصروفیت کی وجہ سے اِس وقت نہ آسکے، اُنھوں نے معذرت کی ہے اور کہا ہے کہ صبح وہ جلد ہی یہاں پہنچیں گے۔ جی میں آیا، ڈاکٹر نِل پیر کو طمانچا رسید کروں کہ وہ یہ بات پہلے بھی بتا سکتا تھا، لیکن ہاتھ مَلتا رہ گیا۔ آخری دن مجھے کوئی غلط تاثر قائم نہیں کرنا چاہیے تھا۔

دس بجے تک سیورین ٹھیری ہوئی تھی۔ بہ مشکل گھر جانے پر آمادہ ہوئی۔ اُس کے جاتے وقت مجھے یاد آیا کہ میں نے انتولی کے خاندان اور اُس کی بیوی کی اعانت کے لیے سیورین سے کچھ کہا تھا۔ سیورین نے مجھے یاد نہیں دلایا تو اِس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں اِسے کوئی رعایت جانوں۔ ہوٹل سے آنے والے سامان میں چیک بُک بھی موجود تھی۔ صبح وقت ملے نہ ملے، اِس لیے میں نے سیورین کو روک لیا اور پوچھا کہ انتولی کے خاندان کے لیے کتنی رقم کا چیک کاٹنا مناسب ہوگا۔ اُس نے بتایا کہ شہر کی عیسائی مشنری اپنے لوگوں کا خیال رکھتی ہے۔ اُس نے شیری کی کفالت کے لیے ماہانہ وظیفہ مقرر کردیا ہے۔ شیری کی حالت بہت خراب ہے۔ اُسے تو اپنا ہی ہوش نہیں۔ خدا ہی اُسے زندگی لوٹا سکتا ہے۔ میں نے لاکھ رُپے کا چیک کاٹنے کی بات کی تو سیورین گُم سُم سی ہوگئی۔ میں نے کچھ اَور سمجھا اور پوچھا کہ کم ہو تو اضافہ کیا جاسکتا ہے۔ کہنے لگی کہ اِس سے نصف بھی بڑی رقم ہوگی، لیکن ابھی تو وہ یہیں ہے، اِسی شہر میں۔ آنے والے دنوں میں صورتِ حال دیکھ کے وہ مجھے مطلع کردے گی۔ میں نے اُس سے کہا بھی کہ مجھے رُپے پیسے کی کوئی کمی نہیں ہے اور نہ ایسی ضرورت پڑتی ہے۔ پچاس ہزار کا چیک میں لکھے دیتا ہوں۔ اِسے سیورین پاس رکھے۔ چیک میں کوئی نام مندرج نہیں ہوگا۔ سیورین جسے مناسب سمجھے، اُسی کا نام لکھ دے، عیسائی مشنری کا نام بھی لکھا جاسکتا ہے۔ سیورین تیار نہیں ہوئی۔ بحث کا وقت نہیں تھا۔ اُسے بہت دیر ہوگئی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ آج کی رات وہ شاید سو بھی نہ پائے، میرے کہنے کا کچھ حاصل بھی نہیں تھا۔ کیوں کہ اَب مجھی سے اُس کا واسطہ نہیں تھا، جامو بھائی اور زورا بھائی اور بتھل بابا بھی اُس کے نگہدار تھے۔

رات کو دیر تک ہم باہر ہی بیٹھے رہے۔ آسمان صاف تھا اور گزشتہ رات کی مسلسل بارش سے خنکی ہوگئی تھی۔ نیند ہی نہیں آرہی تھی۔ دیر رات گئے بتھل کے کسمسانے پر وہ اُٹھے۔ جامو اور زورا اُسی کمرے میں چلے گئے جہاں اُنھوں نے کل رات بسیرا کیا تھا۔ میں اپنے کمرے میں آگیا۔ بستر پر لیٹتے ہی بتھل کی آنکھ لگ گئی۔ میں اور امی چپکے چپکے باتیں کرتے رہے۔ پھر امی کی خواہش پر میں بھی بستر پر آگیا۔ وہ بہت آزردہ تھی۔ ہلکے ہلکے ہاتھوں سے میرا سر دباتی اور بالوں میں اُنگلیاں پھیرتی رہی۔ اُس کی انگلیوں میں امی جیسی لپک تھی اور اُتنی ہی نرمی۔ جانے کس وقت مجھے نیند آگئی، یا امی نے مجھے سُلا دیا۔

ساڑھے گیارہ بجے دلّی سے آنے والی گاڑی پٹنا اسٹیشن آتی تھی۔ ہمیں زیادہ سے زیادہ ساڑھے دس سے پہلے اسپتال سے روانہ ہوجانا چاہیے تھا۔ سفر درپیش ہو تو نیند بھی اُچٹتی ہوئی

پشتو کہاوتیں

- غریب کو لحاف نہیں ملتا تھا، جب مل گیا تو دوپہر تک اُس میں لیٹا رہا۔
- غریب کو کمبل نہیں ملتا تھا، جب مل گیا تو کہنے لگا، یہ بارہ گز کا نہیں ہے۔
- جو سوئیں گے، وہ خواب بھی دیکھیں گے۔
- بادشاہ کی شال، دھوبی کی دھوتی۔
- ننگے کو بھیگنے کا کیا ڈر۔
- بجلی کی چمک میں کس نے سوئی میں دھاگا ڈالا ہے۔
- چمار کا گھر ویسے بھی گندا تھا، اوپر سے مینہ بھی برسا۔
- گدھے کی دُم، جس طرف سے بھی ناپو ایک برابر۔
- پت جھڑ میں پتے بغیر ہوا کے گرتے ہیں۔
- بدنصیبوں کا حصہ بھی تھوڑا ہوتا ہے۔
- جوانی کی بے کاری، بڑھاپے کا روگ۔

انتخاب: رفیق احمد نقش

آتی ہے۔ کسی کو جگانے کی ضرورت نہیں پڑی۔ سبھی صبح سویرے اُٹھ گئے، اور آٹھ بجے سے پہلے سیورین بھی آ گئی۔ ناشتے کے سامان کے علاوہ اُس کے پیچھے آنے والے خدمت گار کے ہاتھ میں مطبخی (ٹفن کیریر) بھی تھی۔ یہ مطبخی زرّیں نے فیض آباد سے چلتے وقت ہمارے سپرد کی تھی اور کل دوپہر ہوٹل میں رکھے سامان میں واپس آئی تھی۔ سیورین تو اِسے دیکھ کے نہال ہوگئی، کسی سے پوچھے بغیر ساتھ لے گئی اور اَب یقیناً بھر کے لائی ہوگی، حالاں کہ سفر اِتنا طویل نہیں تھا۔ پٹنے سے کلکتے کا فاصلہ تین سو میل کے قریب ہے، زیادہ سے زیادہ بارہ گھنٹے کا سفر۔

کسی بھی وقت ڈاکٹر رائے کی آمد کے اندیشے میں سیورین نے اُسی کمرے میں ناشتا لگوا دیا جہاں کل چھا گلا نے شام کی چائے پر ہمیں مدعو کیا تھا۔ سبھی کو جلدی تھی، لیکن سیورین اپنی ضد کی پکّی تھی۔ رات سبھی نے اُسے منع کیا تھا کہ صبح وہ کچھ بھی نہ لائے۔ اُس نے اپنی آنٹی کو بھی ساری رات جگایا ہوگا۔ ناشتا اِس سے زیادہ کیا ہو سکتا ہے۔ شاید کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔ جانے مطبخی میں کیا کیا بھرا ہوگا۔ کسی نے کہا ہے، علم و ہنر، خوش صورتی، خوش نہادی اعلا درجے کی انسانی خوبیاں ہیں، لیکن سب سے بڑی خوبی ایثار پیشگی اور خدمت گزاری ہے۔ آدمی کو پھر آدمی جکڑ سا لیتا ہے۔

جلدی کرتے کرتے بھی نو بج گئے۔ ایمی بار بار باہر جا کے ڈاکٹر کی آمد کے بارے میں سُن گُن لے آتی تھی۔ جامو اور زورا نے میرے اور بجھل کے کپڑے پہن لیے تھے۔ اُن کے ناپ کے تو نہیں تھے۔ مگر کرتے اور پاجامے میں اِتنی گنجائش ہوتی ہے۔ واسکٹ میں عیب اور چھپ گئے۔ بجھل بھی اپنی جُون میں آ چکا تھا۔ اِتنے دنوں بعد اپنے اصل لباس میں وہ عجیب عجیب سا لگ رہا تھا۔ میں نے تو صبح ہی زرّیں کا سلوایا ہوا نیا کُرتا اور پاجامہ پہن لیا تھا، اوپر سے خاکی رنگت کی کھادی واسکٹ۔ سبھی نئے نئے سے ہوگئے تھے۔

ساڑھے نو بج گئے۔ چھا گلا بھی آ گیا۔ ڈاکٹر رائے نہیں آیا۔ سبھی راہ داری میں کرسیوں پر بیٹھے اُس کا انتظار کھینچ رہے تھے۔ گاڑی کے روانہ ہونے اور وقت پر ہمارے اِسٹیشن پہنچ جانے کا ڈاکٹر کو اندازہ ہوگا۔ اور اگر وہ نہیں آ پایا؟ اِس واہمے نے میرے

سر میں جالا بُننا شروع کر دیا تھا۔ تو کیا ہم اُس سے وداع ہوئے بغیر چلے جائیں؟ چھا گلا کو ڈاکٹر کی آمد کا پورا یقین تھا۔ دس بجے والے تھے۔ چھا گلا بھی بے چین نظر آنے لگا۔ راہ داری میں ٹہلتے ہوئے دستی گھڑی دیکھتا جاتا۔ میں نے تو اپنے طور پر ارادہ کر لیا تھا، ڈاکٹر کے نہ آنے کی صورت میں ہم سفر ملتوی کر دیں گے، اور بھی کئی گاڑیاں پٹنے سے کلکتے جاتی ہیں۔ ڈاکٹر رائے سے ملے بغیر یہاں سے چلے جانا ناروا تھا۔

ابھی دس بج کر تین چار ہی منٹ گزر رہے ہوں گے کہ بائیں سمت سے ڈاکٹر رائے متوازن قدموں سے راہ داری میں آتا دکھائی دیا۔ وہ اکیلا تھا۔ اُسے دیکھ کے چھا گلا تیزی سے اُس کی طرف بڑھا اور سبھی کھڑے ہوگئے۔ کمرے میں جانے کے بجائے ڈاکٹر باہر رکھی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گیا۔ اُس کے بیٹھنے کے بعد بجھل نے بھی کرسی سنبھال لی۔ جامو اور زورا کچھ دُور ہٹ گئے۔ ڈاکٹر کی ہدایت پر میں بھی اُس کے پہلو کی کرسی پر دراز ہو گیا۔ کسی تاخیر کے بغیر ایمی نے طبّی احوال کے کاغذات باہر ہی ڈاکٹر کے ملاحظے کے لیے پیش کر دیے۔ ڈاکٹر اُنھیں بہ غور دیکھتا رہا، پھر مسکراتے ہوئے بولا، ''وقت پر اسپتال آ گئے تھے اُستاد!''

''اسپتال نہیں، آپ کے پاس۔ اسپتال تو سارا آپ ہی ہیں۔'' بجھل نے ممنونیت سے لب ریز آواز میں کہا۔ ''آپ نے اپنے سے بہت کیا، ہم کو بولو، ہم کیا کریں؟''

ڈاکٹر ہنسنے لگا۔ ''تم نے ہم کو ایک آدمی دیا... یہ جوان۔'' اُس نے میری جانب انگلی اُٹھائی اور بولا، ''آپ اِس کو ہم سے واپس لے جا رہے ہو۔''

''بس میں ہوتا تو آپ ہی کو دے دیتے۔'' بجھل نے سنجیدہ آواز میں کہا، ''پر کیا بولیں، بہت بکٹ ہے، بڑا نٹ کھٹ صاحب!''

''اِسی واسطے تو اُستاد۔'' ڈاکٹر لطف لے کے بولا، ''لوگ بولتے ہیں، ہر آدمی کا مول ہوتا ہے۔ اِس کا کوئی مول ہو تو بولو۔''

بجھل کے شانے سکڑنے اور پھیل گئے۔ ''اِس کا کوئی مول نہیں۔ ہوتا تو پہلی بولی ہم ہی لگاتے۔''

''تمھارا ہی تو ہے اُستاد، اوپر سے نیچے تک۔ ہم نے دیکھا ہے، تم کو اِدھر اپنا پتا نہیں تھا تو یہ کیسا لَوٹا تھا۔ اِس نے

اپنے سے تھوڑی لڑائی بھی کی ہے۔ تم کو کچھ ہو جاتا تو یہ ہم کو نہیں چھوڑتا۔''

''کیا ڈاکٹر صاحب!'' میں نے تندی سے دخل دیا۔ ''کیسی بات کرتے ہیں آپ۔ میں تو آپ کی منّت ہی کرتا رہا ہوں۔ شروع میں ہاں ضرور... کوئی اُلٹی سیدھی بات مُنھ سے نکل گئی ہو تو... اَن جانے میں... آپ معاف کر دیں۔''

''ہاں صاحب! ایسا ویسا کچھ بولا ہو تو معافی دے دیں۔'' بجھل سفارشی انداز میں بولا، ''کبھی یہ بہت اُلٹ سُلٹ کرتا ہے۔ جلدی گھوم جاتا ہے۔''

''اور اِسی کارن اچھا لگتا ہے۔'' ڈاکٹر نے بے تامّل کہا۔

''آپ کی بڑائی ہے صاحب!'' بجھل انکسار سے بولا۔

بجھل کا شانہ تھپ تھپاتے ہوئے ڈاکٹر رائے اُٹھ گیا اور قریب موجود چھا گلا کی طرف متوجہ ہوا۔ اُس نے انگریزی میں چھا گلا سے معلوم کیا کہ کیا طبّی احوال نامہ میرے حوالے کر دیا گیا ہے۔ جواب میں چھا گلا نے کوٹ کی اندرونی جیب سے پھولا ہوا ایک بڑا لفافہ مجھے تھما دیا۔ ڈاکٹر پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔ اُس نے بتایا کہ لفافے میں بجھل کی بیماری کی تشخیص اور مرحلے وار علاج کی تفصیل درج ہے۔ کسی جگہ اِس قسم کی شکایت دوبارہ نمودار ہونے کی صورت میں متعلق ڈاکٹر کو لازماً یہ رپورٹ دکھائی جائے۔ یوں شکایت کا اعادہ ہونے کا کوئی امکان نہیں۔ لفافے میں ایک نسخہ بھی ہے۔ اِس میں لکھی دوائیں ہفتے بھر تک استعمال کرائی جاتی رہیں تو اچھا رہے گا۔ نسخے میں توانائی کی بحالی کی ادویہ بھی ہیں۔

ڈاکٹر کی ابرو کی جنبش پر ہمہ دم مستعد چھا گلا دُور کھڑے خدمت گار کے پاس رکھا ہوا گل دستہ لے آیا۔ ڈاکٹر نے اُسے بجھل کے آگے پیش کر دیا۔

''یہ کیا ڈاکٹر صاحب۔'' بجھل نے جلتی بجھتی آواز میں کہا۔

پیشانی کی خندگی کے سوا ڈاکٹر نے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں سمجھی، اور یکا یک ہلچل سی مچ گئی۔ میری آنکھوں کے لیے وہ ایک ناقابلِ اعتبار منظر تھا۔ پیازی رنگت کی ساری میں ملبوس ڈاکٹر رائے کی بیٹی بینا کو سب سے پہلے ایمی نے دیکھا اور وہ خود کو روک نہ سکی۔ دیکھتے ہی اُس کی طرف دوڑ پڑی، اُس کے پیچھے

''اِس سال ہم ہر گاؤں کے لیے ریڈیو جنریٹر فراہم کریں گے، اگلے سال بجلی کے تار لگائیں گے، اُس سے اگلے سال بجلی مہیا کرنے کی کوشش کریں گے۔''

سیورین بھی۔ بینا کے عقب کچھ فاصلے پر ایک ملازم کے ہاتھ میں بھی گل دستہ تھا۔ سبھی کی نظریں بینا پر مرکوز ہوگئیں۔ وہ شاہانہ انداز سے نپے تلے قدم اُٹھاتی ہمارے پاس آ گئی۔ پہلے مجھی سے آنکھیں چار ہوئیں تو ایک رنگ سا اُس کے چہرے پر آ کے گزر گیا۔ میرا تو جسم لمحے بھر کے لیے جیسے سُن ہوگیا۔

''میری بیٹی بینا۔'' ڈاکٹر نے بجھل سے کہا۔ اُس کے لہجے میں فخر بھی تھا، ناز بھی۔

بینا نے ہاتھ جوڑ کے نمسکار کیا۔ ملازم نے آگے آ کے گل دستہ اُسے پیش کیا۔ بینا نے تمکنت سے بجھل کے سامنے کر دیا۔ بجھل کی آنکھوں میں خیرگی سی ہویدا ہوئی۔ وہ جھجکتی آواز میں بولا، ''یہ تو کوئی مورتی ہے ڈاکٹر صاحب!''

''تم کو دیکھنا چاہتی تھی، پر ٹائم ہی نہیں ملا۔'' ڈاکٹر نے اشتیاق سے کہا۔

''یہ تو خود درشن کے لیے ہے۔'' بجھل نے بینا کے سر پر ہاتھ رکھا اور ٹھوڑی اُٹھا کے لمحوں تک تکتا رہا، اور اُس نے بے اختیار بینا کو بازوؤں میں دبوچ لیا۔ ''یہ تو آپ ہی کی بٹیا ہو سکتی ہے۔''

بینا کا سراپا دُہرا ہو گیا۔

''آپ ابھی بولتے تھے، ہر آدمی کا مول ہوتا ہے۔ اِس کا کوئی مول ہو تو اپنے کو بولو۔''

ڈاکٹر ہنس پڑا۔ ''یہ بھی اِسی کی طرح ہے۔'' وہ میری جانب نگاہ اُٹھا کے بولا، ''تمھارے لاڈلے کی طرح۔''

بچھل کچھ فکر مند ہوا، پھر شاید اِس مفاہمت سے کہ ڈاکٹر کی زبان سے میرے لیے 'لاڈلے' کا خطاب روانی میں ادا ہوا ہے، اور کوئی معنی خیزی نہیں، وہ استوار ہو گیا، مگر ثانیے بھر بعد پھر مضطرب نظر آنے لگا۔ جیبوں میں ہاتھ ڈالا اور نکال لیا۔ صبح جب وہ نیا لباس پہن کے تیار ہو گیا تھا، میں نے ہوٹل میں رکھی نقدی اور اپنے پاس محفوظ ہیروں بھری مخملی تھیلیاں اُسے واپس کر دی تھی کہ پہلے بھی یہ اُسی کی تحویل میں تھیں۔ اور معاً اُسے کیا ہوا۔ پاس کھڑی بینا کی کلائی گرفت میں لے کے اُس نے اُٹھی ہوئی آواز میں کہا، ''اپنے ساتھ آؤ بٹیا۔''

بینا حیران ہوئی، پہلے ڈاکٹر کو، پھر مجھے دیکھا۔ بچھل نے تذبذب کی مہلت نہیں دی۔ دو ڈھائی گز کی دُوری عبور کر کے وہ اُسے کمرے میں لے گیا۔ ڈاکٹر میرے ساتھ پُرسکون حالت میں کھڑا رہا۔ منٹ ڈیڑھ منٹ کے عرصے میں دونوں باہر آ گئے۔ بینا کا چہرہ دہک رہا تھا۔ بچھل کا بازو اُس کے شانے پر تھا اور وہ اُس کے پہلو میں سمٹی ہوئی کمرے سے واپس آئی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں جھلملاتی نمی صاف نظر آ رہی تھی۔

بینا کو یوں اپنے ساتھ کمرے میں لے جانے کی ایک ہی وجہ ہو سکتی تھی کہ وہ بینا کو کچھ نذر کرنا چاہتا تھا۔ سب کے سامنے اِس کا اظہار، جیب سے کچھ نکالنا معیوب بات تھی۔ بچھل نے کوئی نادر ہیرا ہی اُسے بھینٹ کیا ہوگا۔ نقدی کا تو سوال نہیں پیدا ہوتا تھا۔ بینا نے یقیناً منع کیا ہوگا، لیکن بچھل کو منع کرنا آسان نہیں تھا۔ میرا خیال تھا، وہ واپس آ کے اپنے باپ کو کچھ بتائے گی، مگر میں بھول گیا تھا، وہ ایک اور قسم کی لڑکی تھی۔ آداب سے بہ تمام و کمال آراستہ اور پُراعتماد۔ اُسے خود بھی فیصلے کرنے آتے تھے۔

''کبھی لوٹیں گے ڈاکٹر صاحب پھر۔'' بچھل نے اُمڈتی آواز میں کہا۔

''خوشی ہوگی اُستاد۔'' ڈاکٹر شوخی سے بولا، ''مگر پہلے کی طرح نہیں۔''

''نا، نا، صاحب، اَب کے ایسے نہیں۔ اَب آپ کو سلام کرنے آئیں گے، آپ کو پوچھنے، اور بٹیا کو دیکھنے۔''

ڈاکٹر کا جواب مُنہ ہی میں رہ گیا۔ سامنے سے مکلف وردی میں ملبوس ایک نوجوان پولیس افسر چند سپاہیوں کے ساتھ راہ داری کی طرف بڑھتا نظر آیا۔ میں اُسے پہچان گیا۔ وہی افسر، جو پہلے بھی دو مرتبہ آئی جی کی معیت میں اسپتال آ چکا تھا۔ ہمارے پاس پہنچ کے اُس نے سیلوٹ کے انداز میں ڈاکٹر، پھر مجھے سلام کیا۔ اُس کے پاس بھی گل دستہ تھا۔ ہاتھ اُٹھانے پر ایک سپاہی نے تیز قدموں سے آ کے گل دستہ اُس کے حوالے کیا۔ ''یہ آئی جی کی طرف سے ہے۔'' پولیس افسر نے ڈاکٹر راے سے انگریزی میں کہا۔

ڈاکٹر نے بچھل کی طرف بازو پھیلا دیا۔ پولیس افسر نے دوسرے لمحے مستعدی سے بچھل کو سلام کیا اور گل دستہ اُس کی جانب بڑھا دیا۔

''یہ... یہ کیا ہے ڈاکٹر صاحب؟'' بچھل اُلجھ کے بولا۔

''یہ پھول آئی جی پولیس نے تمھارے واسطے بھیجے ہیں۔'' ڈاکٹر نے زیرِ لب تبسم سے کہا۔

''اپنے واسطے؟'' بچھل کی پیشانی پہ جال پڑ گیا۔

''ہاں، تمھارے واسطے، میرے واسطے بالکل نہیں۔''

''پر یہ آئی جی سے اپنا کیا...''

بچھل کی کش مکش دُور کرنے کے لیے ڈاکٹر نے شگفتگی سے کہا۔

''آئی جی صاحب اپنے دوست ہیں۔''

''صاف صاف بولو صاحب!'' بچھل جز بز ہو کے بولا۔

''گاڑی میں تم کو یہ لوگ سارا بول دیں گے۔'' ڈاکٹر نے ہاتھ ہلا کے اُسے تسلی دینے کی کوشش کی۔ ''اب چلنے کی تیاری کرو۔ ٹائم تھوڑا رہ گیا ہے۔ شہر کی کنڈیشن ٹھیک نہیں۔ تم کو پولیس کے ساتھ پولیس کی موٹر میں جانا ہے۔''

''پولیس کے ساتھ؟'' بچھل نے ترشی سے پوچھا۔

''ہاں اُستاد، تمھاری سیفٹی کے لیے۔ ہماری ریکویسٹ پہ آئی جی نے یہ ارینجمینٹ کیا ہے۔''

بچھل کی حیرت دو چند ہوئی۔ ''کیا صاحب...''

ڈاکٹر نے اُس کی کمر پہ ہاتھ رکھ کے آگے جانے کا اشارہ کیا۔ بچھل بڑبڑاتا رہ گیا۔ اسپتال کے کارندے ہمارا مختصر سامان کمرے سے باہر لے آئے تھے۔ بچھل آگے نہیں گیا۔ اپنے تردد کے باوجود وہ راہ داری میں تھم کے پاس گُپ چپ کھڑی ایمی کے پاس گیا۔ اُس نے ایمی کے ہاتھ تھام کے کچھ کہا، پھر وہ سیوورین کی طرف پلٹا۔ اُس کے سر پہ ہاتھ پھیرا۔ سیوورین سر جھکائے ہوئے تھی، سسکنے لگی۔ بچھل نے اُسے سینے سے لگا لیا اور پیشانی کو بوسہ دیا۔

پولیس افسر کچھ دُور جا کے ہمارے انتظار میں ٹھیر گیا تھا۔ اُس وقت جیسے کسی نے مجھے ٹہوکا دیا۔ بینا کی طرح بچھل کو سیوورین اور ایمی کا بھی خیال رکھنا چاہیے تھا۔ اسپتال کے ملازم بھی شب و روز ہماری خدمت میں حاضر رہے تھے، لیکن بچھل کو ٹوکنے کا وقت گزر چکا تھا، اور خود کو دلاسا دینے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ بچھل سے ایسی چوک ممکن تو نہیں ہے۔ اُسے تو نازکی کا بہت خیال رہتا ہے۔

بچھل کے چلنے پر سبھی حرکت میں آ گئے۔ بینا نزدیک ہی تھی، مجھے اُس سے کچھ کہنا چاہیے تھا، لیکن کیا کہوں اور کہاں سے شروع کروں۔ کوئی سرا ہی نہیں مل رہا تھا، چند قدم کا فاصلہ طے کر کے میں اُس کے پاس چلا گیا۔ مجھے اِتنا قریب دیکھ کے وہ پلکیں جھپکانے لگی۔ میں نے آہستگی سے کہا، ''مجھے افسوس ہے، دوبارہ آنا نہ ہو سکا۔''

''آپ کا انتظار رہا۔'' اُس کی آواز کی کھنک یاسیت سے آلودہ تھی۔

''بس، کیا بتاؤں۔'' میں نے پژمردگی سے کہا، ''ارادہ کیا اور رہ گیا۔''

''پاپا نے مجھے کچھ بتایا ہے۔'' وہ دھیرے سے بولی۔

''کیا... کیا بتایا اُنھوں نے؟'' میں نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔

''زیادہ نہیں، اندازہ ہو چلا تھا کہ پورا سچ بتانا اُنھیں دشوار ہو رہا ہے، سو اصرار نہیں کیا۔ باقی پھر خود ہی اخذ کر لینا بہتر تھا۔''

کسی وضاحت کا وقت اور موقع نہیں تھا، اور وضاحت بھی کیا کرتا، میں چپ رہا۔

''آپ کے لیے دُعا کرتے رہیں گے۔ کاش، اِس مرتبہ سفر سے آپ سُرخ رُو واپس ہوں... اور جب ایسا ہو تو ایک بار یہاں ضرور آئیے گا۔''

''ضرور... ضرور۔'' میری آواز دھڑک رہی تھی۔

''بہ ہر حال۔'' وہ ہچکچاتے ہوئے شائستگی سے بولی۔ ''آپ کی آمد یاد رہے گی۔''

میں نے کہنا چاہا، 'مجھے بھی'، لیکن میری زبان اکڑ کے رہ گئی۔ میں نے ڈبڈبائی آنکھوں سے اُس کی طرف دیکھا۔ وہ سراپا بہار تھی۔ میرا جی چاہا، اُسے گلے سے لگا لوں۔ اُس کی آنکھیں بھی چھلک رہی تھیں۔ میں پھر آگے بڑھ گیا۔

وہ مرکزی عمارت کی طرف نہیں گئے۔ پولیس افسر کی رہنمائی میں ہم چاروں اسپتال کے پچھواڑے آ گئے۔ یہاں تین چار قسم کی موٹریں کھڑی تھیں، کچھ اور مسلح سپاہی بھی موجود تھے۔ پہلے ہی کئی حیرانیاں بچھل کو مکدر اور مضطرب کیے ہوں گی کہ میدا اور اڈے کے کسی آدمی نے اسپتال کا رُخ کیوں نہیں کیا اور اِس موقع پر بھی کوئی کیوں موجود نہیں ہے۔ دو دن سے جامو اور زورا بھی اڈے واپس نہیں گئے تھے، نہ اسپتال سے باہر نکلے تھے، اسپتال کے ضابطے کے خلاف یہاں ٹھیرے ہوئے تھے، اَب پولیس کی نگرانی میں روانگی مزید تشویش اور وحشت کا سبب ہونی چاہیے تھی، لیکن اُس نے کچھ نہیں پوچھا، خاموشی سے موٹر کی اگلی نشست پر ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گیا۔ میں زورا، اور جامو شخص ٹھسا کے پچھلی نشست پر

تھم گئے۔ ہمارے آگے پیچھے پولیس کی تین موٹریں تھیں۔

ابر چھایا ہوا تھا اور بادل برسا ہی چاہتے تھے۔ سڑکوں پر سناٹے کی وجہ سے موٹروں کی رفتار تیز تھی۔ بازار بند تھے اور ہر طرف کرفیو جیسی ہیبت طاری تھی۔ راہ گیروں کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی۔ تھوڑی تھوڑی دُور بعد سڑکوں پر تعینات سپاہیوں کی سیٹیاں گونجتی رہیں اور جلد ہی موٹروں نے ہمیں اسٹیشن پہنچادیا۔

یہاں بھی اسٹیشن کی عام گذرگاہ کے سامنے موٹریں نہیں رُکیں۔ وہ ہمیں اسٹیشن سے ملحق مال گودام کے راستے سے اندر لے گئے۔ پلیٹ فارم پر بھی بھیڑ بھاڑ خاصی کم تھی۔ ہم وقت سے کچھ پہلے پہنچ گئے تھے، اور معلوم ہوا، گاڑی مقررہ وقت پر نہیں آ رہی، پندرہ منٹ کی تاخیر کا اعلان کیا جاچکا ہے۔ اُنھوں نے ہمیں اوّل درجے کی وسیع اور روشن انتظار گاہ میں پہنچا دیا، جہاں عورتوں مردوں اور بچوں پر مشتمل ایک ہی کنبے کے آٹھ دس افراد خوش گپیوں میں مصروف تھے، اور ایک شور مچا ہوا تھا۔ ہمیں اور ہمارے ساتھ پولیس دیکھ کے سبھی چپ ہوگئے اور جب اُنھوں نے اچھی طرح جان لیا کہ سپاہی باہر چلے گئے ہیں، صرف پولیس افسر رہ گیا ہے اور ہم سے اُس کے تیور مخاصمانہ نہیں، تبھی اُنھیں قرار آیا۔ پولیس افسر نے چائے وغیرہ کا تکلف کرنا چاہا، سبھی نے منع کردیا، پھر چندمنٹ بعد واپس آنے کا کہہ کے وہ بھی باہر چلا گیا۔ ہم چاروں عملاً ایک دوسرے سے بے حد قریب اور اصلاً ایک دوسرے سے بہت دُور، بیگانہ بیگانہ سے بیٹھے رہے۔ مجھے، زورا اور جامو کو بتھل کی کبیدگی کا شدت سے احساس تھا۔ بتھل اپنی لاعلمی سے بے چین تھا اور ہمیں اپنی دانستہ زباں بندی سے عجب خجالت اور بے بسی محسوس ہورہی تھی۔

بیس پچیس منٹ کا وقت کسی طور گزر گیا کہ وقت کا کام گزرنا ہے، اور کبھی یہ بہت غنیمت لگتا ہے کہ وقت ٹھہرتا نہیں، گزر جاتا ہے۔ کاش، وقت آدمی کا تابع ہوا کرتا، گھوڑے کی طرح اور موٹر کی طرح جب چاہا، گھوڑے کو لگام دے دی، جب چاہا، موٹر تیز دوڑا دی۔ دیکھا جائے تو یہی کچھ ہوتا رہا ہے، آدمی ابتدا سے وقت پر غلبہ و تسلط کی کوشش کررہا ہے، اور اس کوشش میں بہت کچھ حاصل کرلیا ہے، موٹر، ریل گاڑی، ہوائی جہاز، لیکن جو وقت آدمی کے دل پر گزرتا ہے، وہ اُسے ٹھیرانے اور جلد سے جلد گزار دینے کی کوئی تدبیر نہ کرپایا۔

گاڑی کی آمد کا گجر بجنے لگا تو پولیس افسر واپس آ گیا، اور جب تک اُس نے ہمیں ڈبّے میں پہنچا اور نشستوں پر بٹھا نہیں دیا، اور گاڑی نے حرکت نہیں کی، وہ مستقل ہمارے پاس رہا، اِدھر باوردی اور سادہ پوش سپاہی ڈبّے کے اردگرد منڈلاتے رہے۔

اوّل درجے کے اِس ڈبّے میں ہمارے سوا کوئی اَور مسافر نہیں تھا۔ گاڑی کے رفتار پکڑنے اور شہر سے دُور ہونے پر میری طرح اُنھوں نے بھی سکون کی سانس لی ہوگی۔ میں تو اُوپر کی برتھ پر آ کے دراز ہوگیا۔ مجھ میں بتھل کی بے خبری اور بیماری کے دوران ہونے والے سانحوں کی رُوداد دُہرانے کی ہمت نہیں تھی۔ وہ سارا کچھ بہت کرب ناک تھا۔ گیارہ بارہ دن پہلے ہم فیض آباد سے چلے تھے۔ اور ایک دن، ایک رات بعد، عشرے بھر پہلے پٹنا پہنچے تھے۔ ایک عشرے میں شہر کیسا بدل گیا تھا۔ برتھ پر آ کے میرا تو جسم ہی بکھرنے لگا۔ لگتا تھا، ایک زمانے سے نہیں سوسکا ہوں۔ مجھے کچھ نہیں معلوم، زورا اور جامو نے وہ ساری اذیتیں کس طرح بتھل کو منتقل کیں جن سے میرا واسطہ پڑا تھا، اور جن سے بہ وجوہ بتھل کو لاعلم رکھا گیا تھا۔ مجھے تو گہری نیند نے آ لیا۔ کتنے اسٹیشن آئے۔ گاڑی کہاں کہاں اور کتنی دیر ٹھیری، مجھے کچھ خبر نہ ہوسکی۔

بازو پر ہلکی دستکیں دے کے زورا نے مجھے جھنجھوڑا دیا، گاڑی کسی اسٹیشن پر رُکی ہوئی تھی۔ برتھ سے اُتر کے اور منہ ہاتھ دھو کے پھر میں بھی اُن کے درمیان آ بیٹھا، اور آنکھیں کچھ کھلیں تو نظر سیدھی بتھل پر گئی۔ سامنے کی برتھ پر وہ لشت سے کمر لگائے کسی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ مجھے دیکھا، اُٹھ کے میرے پاس آنا چاہتا تھا کہ میں خود ہی اُس کے پاس چلا گیا۔ ہاتھ پھیلا کے اُس نے میرے شانے پر رکھا اور خود سے قریب کرلیا، اور اچھا ہوا جو کچھ نہیں کہا۔ میرا بازو دبوچ کے رہ گیا۔ میری آنکھیں سلگنے لگی تھیں، لیکن میں نے آنکھوں ہی میں آنسو گھونٹ لیے۔

زورا نے مطبخی کھول دی تھی۔ سیورین نے التزام رکھا تھا کہ جلد خراب ہوجانے والی کوئی چیز نہ ہو، زیادہ تیل کی چیز نگ

بزی تھی، چنے کی دال کا حلوا تھا اور پوریوں کے علاوہ میدے کی میٹھی ٹکیاں، سفید کپڑے سے بندھی مطبخی میں الگ سے شیشے کا ڈونگا بھی رکھا ہوا تھا۔ اُس میں سادہ میٹھے چاول تھے، پلیٹیں، گلاس اور چمچے بھی ساتھ رکھنا وہ نہیں بھولی تھی۔ تیز بارش ہورہی تھی۔ زورا نے مجھے بتایا کہ سارے راستے یہی حال رہا ہے۔ اسی وجہ سے گاڑی کی رفتار متاثر ہوتی رہی ہے، پٹڑیوں اور پلیوں پر تو رینگتی ہوئی گزری ہے اور انجن تو مسلسل گرجتا رہا ہے۔ اِس وقت نو بج رہے تھے، یعنی ہمیں پٹنے سے چلے ہوئے نو گھنٹے کے لگ بھگ ہورہے تھے۔ آگے غالباً مزید بارش کی اطلاع پر گاڑی اِس اسٹیشن پہ ٹھیر گئی تھی۔ بہت کم چہل پہل تھی۔ صرف خوانچے والوں کا شور گونج رہا تھا اور اُن کی صدائیں بھی جیسے بھیگ گئی تھیں۔ زورا نے کسی خوانچے والے کے ذریعے پانی اور چائے کا انتظام کرلیا۔ کھانا دیکھ کے بھوک بیدار ہوگئی۔ بارش میں بھوک کچھ بڑھ جاتی ہے۔ چاروں نے مطبخی تقریباً خالی کردی اور سیورین کی باتیں کرتے رہے، اُس کی خوش لباسی، خوش شعاری، سلیقے اور نفاست کی باتیں۔

کوئی آدھ گھنٹے بعد بارش ہلکی ہوجانے پر گاڑی نے کھسکنا شروع کیا، اور آگے جا کے رفتار پکڑلی، ابھی کلکتا دُور تھا کہ بارش پھر شروع ہوگئی۔ شروع ہوگئی، یا پہلے سے جاری تھی۔

دو بجنے میں چند منٹ باقی تھے کہ ہاوڑا اسٹیشن پر گاڑی نے کہیں اپنا سفر تمام کیا۔ بارش اور دیر رات کی وجہ سے سڑکیں سُونی پڑی تھیں۔ پھر بھی اڈّے تک پہنچتے پہنچتے ڈھائی بج گئے۔ ساری عمارت سکوت میں لپٹی ہوئی تھی۔ ہمیں دیکھ کے کہرام سا مچ گیا۔ جامو، جمرو اور زورا کو اُنھیں پرسکون رکھنے میں خاصی دشواری ہوئی۔ وہ کسی کو بتھل کی بیماری کے متعلق بتانا نہیں چاہتے تھے اور بتھل کو زیادہ سے زیادہ آرام پہنچانے کے لیے بھی فکرمند تھے۔

اڈّے پر موجود سبھی کو تاکید کردی گئی کہ وہ بتھل کی کلکتے آمد کی خبر عام نہ کریں، مگر جنگل کی آگ کی طرح شہر میں خبر پھیل چکی تھی۔ گیارہ بجے تک اڈّے کی عمارت کے اندر اور باہر ایک خلقت جمع ہوگئی۔ بتھل نے عرصے بعد کلکتے کا رُخ کیا تھا۔

اڈّے کے آس پاس کے مکین، پرانے واقف کار، دُکان دار، فیکٹریوں والے، بوڑھوں اور جوانوں کی ایک کثیر تعداد اڈّے کی طرف اُمڈتی رہی، اُن میں کچھ عورتیں بھی شامل تھیں۔ عمارت میں شور بہت بڑھ گیا تو بتھل کو کمرے سے باہر آنا اور چوکی پر بیٹھنا پڑا۔ لوگ حسبِ استطاعت مٹھائی کے دونوں، پھلوں اور پھولوں کے ٹوکروں سے لدے پھندے آتے رہے۔ سوناگاچی سے بھی کئی پیغام آئے تھے، جمرو کی زبانی معلوم ہوا کہ اِن دنوں بازار کے علاقے میں گلاب بانو شاہ جہاں پور والی کے بالاخانے کی بڑی دھوم ہے۔ اُس کے پاس اپنے فن میں ماہر، ایک سے ایک حسین لڑکیوں کا طائفہ ہے۔ بتھل کے لیے گلاب بانو کا ہرکارہ نذر اور پیغام لے کے آیا تھا کہ مناسب ہو تو آج رات اُس کی تربیت یافتہ شاردا پہلی بار بتھل کے سامنے محفل آرا ہو، اور بتھل کو بالاخانے آنے میں کوئی عذر ہو تو اڈّے پر بھی محفل برپا کی جاسکتی ہے۔ بتھل کے بجائے جامو نے اُسی تکلف سے جواب دیا، جس تکلف سے پیغام آیا تھا۔ اُس نے گلاب بانو کی نذر اور دعوتِ رقص و سرود پر شکریہ ادا کیا اور کہا کہ چند دنوں کے لیے محفل ملتوی کردی جائے تو مناسب ہو۔ بتھل کے پرانے شناسا لالا شانتی پرشاد نے دیگیں چڑھوادی تھیں اور دوپہر کو لنگر کا ساماں ہوگیا تھا۔ بتھل کے لیے چوکی سے ہٹنا ممکن نہیں رہا تھا۔ ایک جاتا نہیں کہ دوسرا آجاتا تھا۔ مجھے بھی اُن سبھوں نے مستقل گھیرے میں لے رکھا تھا، مجھ سے لپٹ لپٹ جاتے تھے۔ کوئی میرے ہاتھ چومتا، کوئی چھو چھو کے دیکھتا۔

شام کو اچانک بتھل نے کلکتے سے روانگی کا اعلان کردیا۔ سبھی نے بڑی منت کی۔ اِس ہجوم سے میرا بھی جی گھبرانے لگا تھا، مگر احتیاطاً ابھی چند دن بتھل کا کلکتے ہی میں رہنا بہتر تھا۔

سفر میں تو دباؤ بہت ہوتا ہے۔ بجھل نے طے کرلیا تھا، بہ ہر حال، وہ مزید ایک رات قیام کے لیے راضی ہوگیا۔ رات کو بھانڈوں نے اُچھل کود شروع کردی تھی، مشکل سے نکلے۔ میں نے بجھل کو مشورہ دیا تھا کہ ابھی کسی طرف نکلنے کے بجائے کچھ روز کے لیے فیض آباد چلے جائیں۔ جمرو اور زورا بھی ہمارے ساتھ جانے کو بہ ضد تھے، بجھل نہیں مانا۔ دوسرے دن صبح نسبتاً سکون تھا، پھر بھی نکلتے وقت بہت سے لوگ اڈّے پر جمع ہوگئے اور کبھی ہمارے ساتھ اسٹیشن تک آئے۔ ہم نے مرشدآباد آ کے دَم لیا، دو دن وہاں سرائے میں قیام کرکے وہ کرشنا نگر آ گیا، پھر دُرگا پور، بوگرا، کشتیا، پبنا، نصیر آباد، تواکھالی، رنگ پور، کھلنا، باری سال، جیسور، بہادر آباد، راج شاہی، چاٹگام، ڈھاکا، فرید پور، فینی، چالنا، کاکسس بازار اور میلا گھر سے ہوتے ہوئے ہم سلہٹ آ گئے۔ گوہاٹی، تن سکھیا، ڈبروگڑھ، بسل گری، لمبڈنگ، علی پورڈوار، بھوبھا نیشور، کوراپٹ، نارتھ لکھیم پور، شیلانگ، دارجلنگ، جگ دل پور، پھُل بانی، سمبل پور وغیرہ بستیوں میں مولوی محمد شفیق کے اسم کا وِرد کرتے ہوئے ہم واپس ڈھاکا پہنچ گئے۔

صبح کہیں، شام کہیں، ایک دن یہاں، دوسرا دن وہاں۔ کسی شہر میں دو دن، کبھی تین دن، جس وقت جہاں کی گاڑی مل جائے۔ درمیان میں کئی مرتبہ خراب موسموں نے ہمیں روکے رکھا اور آندھیوں، موسلادھار بارشوں نے راستے بند کردیے۔ جہاں گاڑی نہیں جاتی تھی، وہاں کشتیوں کے ذریعے، کبھی لاری میں اور کبھی گھوڑا گاڑی میں سوار ہو کے۔ ہاتھ گاڑی بھی اِن علاقوں میں بہت سی جگہوں پر مل جاتی ہے۔ جہاں سواری نہ ملتی، بجھل پیدل ہی نکل کھڑا ہوتا۔ یہ بستیاں ہمارے لیے اتنی نئی نہیں تھیں۔ ابا جان کی تلاش میں کئی جگہوں پر ہم پہلے بھی آ چکے تھے۔

میں نے ابتدا ہی میں بجھل کو منع کیا تھا کہ بنگال، آسام اور بہار، خصوصاً شہر گیا کے اردگرد مولوی صاحب مستقل، یا عارضی سکونت سے گریز کریں گے۔ یہاں تبت کے بدھ راہبوں کی کثرت سے آمدورفت رہتی ہے، اِس لیے کہ صوبۂ بہار میں واقع بدھ گیا، بدھ عبادت گزاروں اور زائروں کا مرکز ہے۔ بجھل نے میری بات نہیں مانی۔ اُس کے ذہن میں ہوگا کہ مولوی صاحب نے کورا کو برقع پہنا دیا ہے۔ کسی کو بھی شبہ نہیں ہوسکتا کہ اُن جیسی وضع قطع کے کسی شخص کے ہم راہ تبت کے جانگ قبیلے کی ایک نہایت مطلوب شہزادی بھی برقع میں رُوپوش ہوسکتی ہے، اور اب وقت بھی بہت گزر گیا ہے۔ جانگ قبیلے کے لوگوں نے شہزادی کی بازیابی کی اُمید ترک کردی ہوگی، اور اگر اُن کے نجومیوں نے اُن کی آس ابھی تک بندھائے رکھی ہے تو وہ بیش تر دُور دراز کے علاقوں میں کورا کو تلاش کر رہے ہوں گے۔ کورا تبت سے اِس قدر قریب کے علاقوں میں ہوسکتی ہے، یہ خوش گمانی اُنھیں کم سے کم ہونی چاہیے۔ ایک اَور وجہ سے بھی بجھل نے بہار، بنگال اور آسام کے سرحدی علاقے کھنگالنے کا عزم کیا تھا۔ یہاں مسلمانوں کی بڑی بڑی بستیاں ہیں۔ مسجدوں اور دینی تعلیم کے مدرسوں کی بہتات ہے۔ جامعۂ قاسمیہ مرادآباد اور دارالعلوم دیوبند میں دینی تعلیم کے لیے طالبانِ علم کی ایک کثیر تعداد اِن علاقوں سے جاتی ہے۔ ممکن ہے، کسی عزیز شاگرد، یا مرادآباد میں مولوی صاحب کے ساتھ درس و تدریس میں مصروف کسی دیرینہ رفیق کی موجودگی اُنھیں اِن دُور افتادہ علاقوں کی کسی محفوظ اور پُرسکون جگہ کھینچ لائی ہو۔ ایسی کسی جگہ اُن کی پذیرائی خوب ہوسکتی ہے۔ بے شک جامعۂ قاسمیہ اور دارالعلوم کے فارغ التحصیل متعدد لوگوں سے ہماری ملاقات ہوئی۔ خاصے لوگ مولوی صاحب کو پہچانتے بھی، لیکن مولوی صاحب نے ابھی تک اِس طرف کا رُخ نہیں کیا تھا۔ تبلیغی جماعتوں سے وابستہ لوگوں کو تو بہ ہر حال اِن علاقوں میں مولوی صاحب کی آمد کا علم ہونا چاہیے تھا۔

میں نے بعد میں بجھل سے کچھ کہنا سننا ہی بند کردیا تھا۔ میں تو بس کسی ہم زاد کے مانند، کسی سائے کی طرح اُس کے ہم رکاب رہا۔ ہم زاد کی بھی کوئی مرضی ہوتی ہے اور سایہ بھی اندھیرے میں بچھڑ جاتا ہے، مگر مجھے بھی اِس دشت نوردی کی عادت سی ہوگئی تھی۔ صبح اُٹھ کے کام پر نکل جانا، گلیوں، کوچوں، مسجدوں، مدرسوں میں 'مولوی صاحب، مولوی صاحب' کی صدائیں لگانا اور رات کو اپنی قیام گاہ واپس آ جانا۔ کسی جگہ مولوی صاحب کے مل جانے کا ایک امکان تو ہر وقت موجود تھا۔

شاید یہی آسرا مجھے بجھل کی اطاعت گزاری کے لیے مہمیز کرتا تھا۔ ظاہر ہے، مولوی صاحب ہندوستان سے باہر تو نہیں چلے گئے ہوں گے۔ نواب ثروت یار کے سانحے کی خبر سن کے وہ جس طرح حیدرآباد سے روانہ ہوئے تھے، اُنھیں بہت دُور کی کسی جگہ ہی چھپنا چاہیے تھا۔

کھلنا شہر میں بھی اڈّے سے متعلق ایک شخص نے بجھل کو پہچان لیا تھا۔ وہ رامو کے نام سے کلکتے میں مشہور تھا۔ کسی جرم میں پولیس کو مطلوب تھا، اِس لیے کلکتے سے فرار ہو کے کھلنا آ گیا اور اڈّا جما کے اُس نے اپنے اطراف بہت سے لوگ جمع کر لیے۔ بجھل کو کھلنا میں دیکھ کے وہ تو ریشۂ خطمی ہوگیا۔ بہت مشکل سے بجھل نے اُس سے جان چھڑائی۔ ڈھاکے میں بھی یہی ہوا۔ شابے اُستاد کی بجھل پر نظر پڑ گئی۔ شابے کا کلکتے آنا جانا رہتا تھا اور بجھل سے اُس کی پرانی واقفیت تھی۔ تھوڑا بہت مجھے بھی جانتا تھا۔ شابے کا اصل نام شہاب الدین تھا۔ پہلی بار تو کسی کو علم نہیں ہوسکا، لیکن دوسری بار ہمیں ڈھاکے آئے ہوئے تیسرا دن تھا کہ صدر گھاٹ کے بازار میں شابے اچانک سامنے آ گیا۔ ڈھاکے کے اڈّے پر اُس کا بہت اثر و رسوخ تھا اور ایک طرح سے وہ نائب کی حیثیت رکھتا تھا۔ وہ بجھل کے پاس اڈّے کے نگراں ملہاری کو لے آیا۔ ملہاری نے بجھل کے بہت تذکرے سنے تھے۔ وہ تو بڑی طرح مُصر ہوگیا اور اڈّے لے جائے بغیر باز نہ آیا۔ ملہاری جیسور کے ایک گانے والے خاندان سے تعلق رکھتا تھا اور راگ ملہار پر اُسے ملکہ حاصل تھا۔

جیسور کے کسی جاگیردار نواب نے اُس کی نوجوان بڑی بہن امینہ کو گاتے ہوئے کہیں سن لیا تھا۔ کہتے ہیں، اپنے چچازاد سے امینہ کی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ ریاضت کا سلسلہ جاری تھا۔ ایک روز وہ اپنے گوشہ نشیں، مگر سنگیت میں ید طولا رکھنے والے اُستاد کے ہاں راگ الاپ رہی تھی کہ جاگیردار بھی کسی غرض سے وہاں پہنچ گیا۔ امینہ پردے میں تھی، جاگیردار اُسے دیکھ نہیں سکا، مگر آوازِ حُسن کے اُس پر جی جان سے فریفتہ ہوگیا اور اُس نے اپنی حویلی میں امینہ کو مغنیہ کے طور پر ملازمت پیش کرنی چاہی، امینہ کے گھر والوں نے

انکار کردیا اور کہا کہ اُن کی عورتیں محض خاندانی ورثے کی حفاظت کے لیے سنگیت سیکھتی ہیں، اصلاً خانہ داری اُن کا شعار ہے۔ چند ہی دن میں امینہ کے نوجوان شوہر کا اچانک انتقال ہوگیا۔ موت کا سبب زہر خوری تھی۔ جاگیردار نے کچھ عرصے بعد پھر سلسلہ جنبانی کی اور اب کے شادی کا پیغام بھجوایا۔ دونوں میں کوئی نسبت نہیں تھی۔ جاگیردار کی پہلے سے کئی بیویاں تھیں۔ ہر طرف اُس کے رنگ محل کی داستانیں عام تھیں۔ امینہ کے والدین کو یقین تھا کہ جاگیردار ہی کی وجہ سے اُن کی بیٹی کو بیوگی کا صدمہ سہنا پڑا ہے، تاہم اُن کے پاس کوئی شہادت نہیں تھی۔ افلاس سب سے بڑی بدنصیبی ہے۔ شہادت ہوتی بھی تو اُن کی آواز کتنی دُور تک جاتی۔ کسی نے کہا ہے، مفلس آدمی، آدھا آدمی ہوتا ہے۔ اُنھوں نے بہ صد ادب جاگیردار سے معذرت کرلی اور اپنی قدیم بستی سے ہجرت کا فیصلہ کرلیا، لیکن ہجرت سے پہلے ہی ایک رات امینہ بستی سے غائب ہوگئی۔ والدین اپنے رشتے داروں کے ہم راہ جاگیردار کی بارگاہ میں دُہائی دینے پہنچے تو وہ صاف مُکر گیا اور اُلٹا اُن پر برافروختہ ہوا۔ اُس نے اُن ستم رسیدگاں پر زندگی کا میدان تنگ کردیا۔ امینہ کے والدین نے بہت دوڑ دھوپ کی۔ بڑے بڑے لوگوں کے پاس جا کے فریادیں کیں، مگر بے سُود۔ پھر ایک رات ہندو مسلم فساد کے بہانے اُن کی بستی میں آگ لگا دی گئی۔ ملہاری کا سارا خاندان آگ کی نذر ہوگیا۔ اتفاق سے ملہاری اُن دنوں موسیقی کی تربیت کے لیے کسی اُستاد کے پاس نواکھالی گیا ہوا تھا۔ وہ واپس

آیا تو کچھ بھی باقی نہیں رہا تھا۔

وہ دیکھ، بام کے اوپر دُھوئیں کے مرغولے
جلا تو خیر سے کم ہے، بجھا بہت کچھ ہے

ملہاری اُس وقت ایک نوخیز نوجوان تھا۔ اُس نے جاگیردار کے سوا وقفے وقفے سے اُس کے خاندان کا ایک ایک فرد چُن چُن کے ختم کر دیا اور غصّہ وغضب کے باوجود اِس مشاقی اور ہوش مندی سے کہ اُس پر کوئی آنچ نہ آئے۔ پھر بھی اُسے جیل ہوگئی۔ کوئی ثبوت نہ ملنے پر وہ جلد ہی چھوٹ گیا۔ شابے کہتا تھا کہ حویلی میں جاگیردار اکیلا رہ گیا تھا۔ سارے خدام خوف سے بھاگ گئے تھے۔ آخر میں جاگیردار پاگل ہوگیا، وہ سڑکوں پر نہایت شکستہ اور ابتر حالت میں پڑا ملتا، پھر ایک دن جانے کہاں چلا گیا اور دوبارہ کسی کو شہر میں دکھائی نہیں دیا۔ ملہاری کو بھی اُس کی بہن امینہ نہیں مل سکی۔

جیل سے واپس آ کے ملہاری مرکھنا بیل ہوگیا تھا۔ پھر وہ ڈھاکا چلا آیا اور یہاں کے لوگوں نے اُس کے لیے اڈّے کی چوکی خالی کر دی۔ وہی پرانی کہانی، لیکن بار بار دُہرائی جاتی ہے۔

ملہاری اَب بچپن سے اوپر کا ہو چکا تھا۔ قد اِتنا زیادہ نہیں تھا، کاٹھی کا مضبوط، ارادے کا پختہ، جسم میں بلا کی پُھرتی، ابھی تک شادی نہیں کی تھی۔ چہرے پر دُھندسی چھائی رہتی۔ سورج ڈوبتے ہی شراب میں ڈوب جاتا، سورج نکلنے سے پہلے راگوں کی ریاضت شروع کر دیتا۔ دن بھر اڈّے پر بیٹھا اڈّے کے معاملات نمٹاتا رہتا۔ اُس سے وابستہ بہت سی کہانیاں مشہور تھیں، لیکن شابے کے بہ قول، ملہاری نہ تردید کرتا تھا نہ تائید۔ یوں وہ ایک خوش خُلق، نرم آواز اور کم آمیز آدمی تھا۔ بڑی بڑی، بل کہ پھیلی پھیلی آنکھیں ہر وقت چڑھی رہتیں۔ لگتا تھا، کچھ سوچ رہا ہے۔ بہت کم اڈّے سے نکلتا تھا۔ ہمارے پاس خود چل کے آیا تھا۔ بچّھل سے انکار نہیں کیا گیا۔

آدمی کے پیدا ہوتے ہی اُس کی کہانی، ایک کہانی شروع ہوجاتی ہے۔ ہر شخص جانے کتنے تہ خانے لیے پھرتا ہے۔ سمندر کی تہ میں اُترنا آسان، آدمی کا دُرون کھوجنا بہت مشکل ہے۔ شابے کہتا تھا، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ سب کچھ غلط گمانیوں کا شاخسانہ ہے۔ جاگیردار یقیناً ایک آوارہ منش آدمی تھا اور راگ رنگ سے والہانہ شغف رکھتا تھا۔ اگر اُس نے ملازمت پیش کی تھی تو یہ کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ ضروری نہیں کہ اُسی نے امینہ کے شوہر کو راستے سے ہٹایا ہو۔ کوئی اور بھی ہوسکتا ہے۔ امینہ کے شوہر نے خود کوئی غلط سلط چیز نہ کھالی ہو۔ نوجوانی زندگی کی شرط نہیں ہے۔ موت ترتیب سے کب آتی ہے۔ کسی کے بھی نام قرعہ نکل آتا ہے۔ کوئی بھی نشانے پر آسکتا ہے۔ جاگیردار کی طرف سے شادی کا پیغام بھجوانا بھی کوئی مذموم اور سفّاکانہ اقدام نہیں تھا۔ یہ رشتہ تو ایک عُسرت زدہ خاندان کے لیے عزّت کا موجب ہونا چاہیے تھا، خصوصاً ایک بیوہ لڑکی کے لیے۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ ہوسکتا ہے، امینہ اپنی بستی کے، یا آس پاس کے کسی شخص سے دل چسپی رکھتی ہو اور اُسی شخص نے اُس کے شوہر کا پتھر اپنے راستے سے ہٹایا ہو اور امینہ کا ایما بھی جرم میں شامل رہا ہو اور ممکن ہے، بعد میں امینہ اُسی کے ساتھ فرار ہوگئی ہو۔ اُس کے والدین آہ و بکا کرتے ہوئے جاگیردار کی حویلی پہنچے تھے تو جاگیردار سخت مکدّر ہوا تھا اور جب اُنھوں نے اُسے اِدھر اُدھر رُسوا کرنا شروع کیا تو جاگیردار کا ردِّعمل اشتعال آمیز ہی ہونا چاہیے تھا۔ ہندو مسلم فسادات آئے دن ہوتے رہتے ہیں۔ کیا معلوم، اُس رات آگ لگنے کا سبب واقعی فساد ہو۔ جاگیردار نے امینہ کے لیے اشتیاق ظاہر کیا تھا اور چوں کہ اُس کے پاس بہت ساز و سامان، لاؤ لشکر، بہت اختیار و اقتدار تھا اور اُس کی سرمستیوں کے فسانے ارزاں تھے، اِس لیے کسی اور طرف دیکھا ہی نہیں گیا۔ نواکھالی سے واپس آ کے ملہاری کے سامنے جاگیردار کی حویلی ہی کا ایک راستہ تھا۔ بستی کے بچے کھچے لوگوں نے اُسی جانب اشارہ کیا تھا۔ خون میں حدّت بڑھ جائے تو سارے حواس متاثر ہوتے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں، بعد میں ملہاری کو اپنی ناپختہ فہمی کا احساس ہوگیا تھا۔ یہ صورت تو ملہاری کے لیے اَور عذاب ناک ہوگی، پھر اُسے کسی رات چین سے نہیں سونا چاہیے تھا۔

شابے ایک بسیار گو آدمی تھا۔ طرح طرح کی قیاس آرائیاں گوش گزار کرنے کے بعد کہنے لگا، ''لوگوں کا کام ہی افسانہ سازی و شوشہ طرازی ہے، مگر خود اُسے یقین ہے کہ ملہاری کا خاندان جاگیردار ہی کی ہوس ناکی و ستم رانی کا شکار

اور جاگیردار کا یہی انجام ہونا چاہیے تھا۔ بچّھل اور میں نے سنا کیے۔ ہم نے کوئی رائے ظاہر نہیں کی۔ لوگوں کا یہی اگر سچ ہے تو یہ کیسا عبرت ساماں سانحہ ہے۔ ناکردہ گناہی کی پاداش کو کہتے ہیں۔

ہم سرائے سے اڈّے آ گئے تھے۔ ملہاری اور اڈّے کے تمام لوگ ہماری خدمت کے لیے بے چین رہتے، مگر بچّھل نے وقت ضائع نہیں کیا۔ ڈھاکا ایک گنجان آباد شہر ہے۔ مسلمانوں کی اکثریت کی وجہ سے جگہ جگہ مسجدیں اور مدرسے قائم ہیں۔ شہر تو ہم نے پہلے ہی چھان لیا تھا، اَب گرد و نواح کی بستیاں رہ گئی تھیں۔ بچّھل کو اطمینان نہیں ہوتا تھا۔ شابے کی رہبری میں ایک ایک دن کے لیے ہم ڈھاکے سے دُور بھی جاتے رہے۔ یہاں بیش تر افراد ہندستانی سے ناواقف ہیں۔ بنگال سے باہر تجارت کرنے والے تاجر، نوابین، دوسرے صوبوں کے تعلیم یافتہ، سرکاری افسر اور علمائے دین وغیرہ ہندستانی خوب جانتے ہیں، لیکن اُن کی تعداد بہت کم ہے۔ اُن کے علاوہ لوگوں کو کلامِ پاک اور شرعی مسائل کے سبب سے عربی کی واجبی شُد بُد ضرور ہوتی ہے۔ بچّھل کو روانی سے بنگالی آتی تھی۔ میں نے کلکتا جیل میں سات سال گزارے تھے۔ مجھے بھی کوئی دقّت نہیں ہوتی تھی۔ بنگالی بہت بے قرار لوگ ہیں۔ شکوہ کرنا شاید اُن کی سرشت ہے۔ سارا بنگال دیکھنے سے تعلّق رکھتا ہے: جہاں مٹّی، وہاں سبزہ۔ بعض جگہوں پر تو ایسا لگتا تھا جیسے اونچی نیچی زمینوں پر، پہاڑیوں اور ٹیلوں پر سبز قالین بچھا دیا گیا ہو۔ لوگوں کا کہنا ہے، سبزہ بینائی کے لیے بہت اکسیر ہے اور اِس سے زندگی کا احساس اُجاگر ہوتا ہے، مگر جن کی آنکھیں ہی پراگندہ ہوں؟ ہمیں تو اپنے کام سے غرض تھی، یا یوں کہا جائے کہ فرصت ہی نہیں ملتی تھی۔ بس ایک دن کے لیے بچّھل نے سُندربَن کی سیر کی عیاشی کی تھی، یا پھر مَیں جتنے دن بستر پر پڑا رہا، یا کبھی موسم نے پابند کیے رکھا۔

مہینے میں ایک رات، چودھویں کی رات، اڈّے پر رقص و سرود کی محفل آراستہ ہوتی تھی۔ ہماری خاطر ملہاری ہر روز محفل کا اہتمام کرنا چاہتا تھا، بچّھل کی خواہش پر اُس نے احتیاط کی۔ ہمیں ڈھاکا آئے ہوئے پورا عشرہ گزر گیا تھا۔

''اینٹوں کی سپلائی کی ٹھیکا آپ کے بھائی کو، سیمنٹ کا بیٹے کو، سڑک کی تعمیر کا بھتیجے کو دیا گیا ہے۔ ترقیاتی منصوبے کا ہدف حاصل ہوگیا۔''

اطراف میں شاید ہی کوئی بستی رہ گئی ہو، جہاں ہم نہ جا سکے ہوں۔ آخر بچّھل نے ڈھاکے سے روانگی کا ارادہ کر لیا۔

اُس رات ملہاری اور شابے نے پُرتکلّف دعوت کا انتظام کیا۔ ڈھاکے کے چیدہ باورچیوں سے کھانا تیار کرایا گیا۔ ملہاری نے سرِشام ہی شراب نوشی کی ابتدا کر دی۔ کھانے کے بعد سازندوں اور ناچنے گانے والیوں کے لیے فرش ہم وار کر دیا گیا۔ اگربتیاں سلگ رہی تھیں۔ گلاب پاش سے گلاب کا عرق چھڑکا جاتا رہا۔ شابے کہتا تھا، ملہاری کے سامنے سُر سے اُتری ہوئی گانے والیاں ٹھیر ہی نہیں سکتیں۔ عام ناچنے گانے والیوں کو بلایا ہی نہیں جاتا۔ جنھیں تھوڑا بہت آتا ہے، ملہاری کا نام سن کے وہ مشکل سے تیار ہوتی ہیں اور جنھیں کچھ آتا ہے، دل چسپ بات یہ ہے کہ وہ بلاوے کی منتظر رہتی ہیں اور ملہاری کی محفل میں شرکت افتخار کا باعث سمجھتی ہیں۔ ملہاری کی تحسین اُن کے لیے سند کا درجہ رکھتی ہے۔ ملہاری کا حکم تھا کہ صورت شکل دیکھنے کے بجائے فن آشنا ہی مدعو کیے جائیں۔ اُس رات بھی جو دو لڑکیاں آئیں، وہ تیکھے نقش و نگار، سانولی رنگت، متناسب بدن اور مجموعی طور پر دل کش، لیکن عمر کی پختہ لڑکیاں تھیں۔ دونوں میں ایک ٹھیراو، بُردباری، وقار اور اعتماد تھا۔ دونوں سگی بہنیں معلوم ہوتی تھیں۔ لباس بھی سادہ پہن رکھا تھا اور بار سنگھار بھی اِتنا نہیں تھا۔ شابے کے کہنے کے مطابق پہلے بھی وہ بارہا اڈّے پر

محفل جما چکی تھیں اور ملہاری کی اُن پر خاص توجہ تھی۔ وہ بیش تر اُنھی کو بلاتا تھا۔ اُن کا بھی یہ رویہ تھا کہ پہلے سے کہیں بھی کیسا ہی حتمی وعدہ ہو، وہ ملہاری کے ہاں آنے کو ترجیح دیتی تھیں۔ شابے کا کہنا تھا کہ ایک یہی ہیں جنھیں نغمگی کے دوران زیر زبر کے فرق پر ملہاری ٹوک دیتا ہے اور یہ نہایت تپاک سے اصلاح قبول کرتی ہیں اور حتی الوسع اپنا سقم دُور کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ کئی بار ایسا بھی ہوا ہے کہ ملہاری بھری محفل سے اچانک اُٹھ گیا، یا اُس نے ہاتھ اُٹھا کے محفل برخاست کرنے کا حکم دے دیا۔ اِن دونوں لڑکیوں کو یہ عزت حاصل ہے کہ ملہاری اِن کی محفل میں آخر تک جما بیٹھا رہتا ہے، لیکن ملہاری نے محفل کے سوا اِنھیں کبھی طلب نہیں کیا ہے، اِنھیں کیا، کسی کو بھی طلب نہیں کیا۔ اُس نے اڈّے پر تیس سال کا عرصہ ایک عزلت نشیں اور مجرد شخص کے طور پر گزارا ہے۔

دونوں لڑکیوں نے پہلے ہاتھ جوڑ کے ملہاری کو تعظیم پیش کی۔ اُس کے پیر چھوئے، پھر گانا شروع کیا۔ واقعی اُن کے گلے میں رس تھا، تان خوب اُٹھاتی تھیں۔ راگوں پر ماہرانہ دست رس تھی اور گم ہو کے گاتی تھیں۔ ایک گاتی تو دوسری ناچتی تھی اور بہت سلیقے سے۔ اڈّے پر بیٹھے ہوئے لوگ جھوم رہے تھے اور پھڑک پھڑک اُٹھتے تھے۔ سبھی حسبِ توفیق پیسے لُٹاتے رہے، بجھل بھی کسی سے پیچھے نہیں رہا۔ ملہاری آنکھیں بند کیے، آنکھیں چڑھائے جھومتا رہا اور صرف ایک مرتبہ اُسے مُنہ بنانے اور دخل دینے کی ضرورت پیش آئی۔ اُس وقت وہ کسی اڈّے کا اُستاد نہیں، موسیقی کا کوئی پنڈت، کوئی گرو دیو لگ رہا تھا۔ اُجلے کپڑے، سر پر صافہ، کندھوں پر سبلک کی شال اور گلے میں مالا پڑی تھی۔ میں نے بہت سے اڈّوں اور بالا خانوں پر یہ محفلیں دیکھی ہیں، مگر آج کی بات ہی اَور تھی۔ اصل میں یہ مجرے سے کوئی مختلف محفل تھی۔ غالباً کسی کو بھی رقص اور موسیقی کے اِس ثقہ انداز سے گراں باری محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ دونوں لڑکیوں نے جیسے سب کو بے خود کر دیا تھا۔ آدمی بھی کیا صدف در صدف، تہ در تہ ہوتا ہے، ناچنے اور گانے کے دوران اُن کے جوہر کھل رہے تھے۔ اُن کے رقص میں ذرا بھی وحشت نہیں تھی اور اُن کی آواز جی چاہتا تھا کہ وقت

یہیں ٹھیر جائے اور جس کے پاس جو کچھ ہو، اُن پر نچھاور کر دے۔ مجھے چاندنی بانو یاد آ رہی تھی۔ کہا نہیں جا سکتا کہ ملہاری کی نظر میں اُس کا کیا مقام ہوتا! اُسے بھی تارا بیگم نے موسیقی کے بڑے بڑے اُستادوں سے تعلیم دلوائی تھی۔ میرا کوئی واسطہ تو نہیں تھا، لیکن اب تک جو کچھ دیکھا اور جاننے والوں سے جو کچھ سُنا تھا، میرا اندازہ ہے کہ چاندنی بانو کی محفل کے دوران بھی ملہاری سے یوں اُٹھا نہ جاتا۔ وہ بھی سرتاپا اثر تھی۔

دو بج رہے تھے، ملہاری نے سرگوشی میں بجھل سے پوچھا کہ محفل ختم کر دی جائے؟ بجھل نے درخواست کے لہجے میں فرمائش کی کہ کیا ہی اچھا ہو کہ وہ آج خود بھی کچھ سنائے۔ ہمیں معلوم ہو چکا تھا کہ ملہاری نے اڈّا سنبھالنے کے بعد کسی کے سامنے کچھ نہیں گایا ہے۔ وہ بند کمرے میں، یا چھت پر تنہا ریاض کرتا ہے اور دُور ہی دُور سے کسی کو اُس کے ستار بجانے، یا راگ الاپنے کی آواز سنائی دے جائے تو دے جائے۔ شروع میں لوگوں نے اُس سے بڑی منت کی تھی، لیکن وہ کبھی آمادہ نہیں ہوا، بل کہ اُس کی تیوری چڑھ جاتی تھی اور وہ مضطرب ہو جاتا تھا، پھر لوگوں نے کہنا سننا ہی بند کر دیا۔ شہر یا اطراف میں کسی سنگیت سمراٹ کی آمد کی خبر ملتی تو ملہاری وہاں ضرور جاتا اور اپنے آپ کو ظاہر کیے بغیر کسی گوشے میں بیٹھا خاموشی سے سنتا رہتا۔

بجھل کی فرمائش پر ملہاری کی حالت سیمابی ہو گئی، جیسے کسی سانپ نے ڈس لیا ہو، یا بچھو نے کاٹ لیا ہو۔ وہ عجب بے بسی، بے کسی کی کیفیت سے دوچار ہوا۔ بجھل کے بارے میں شابے نے کچھ کم نہیں بتایا ہو گا۔ اپنے مہمان کی خوش نودی بھی ملحوظ ہو گی۔ میرا خیال ہے، بجھل کو اُسے ایسی کسی آزمائش میں ڈالنا نہیں چاہیے تھا، یہ مہمانی کی وضع نہیں۔ بجھل کے منت کش لہجے پر مجھے حیرت ہوئی تھی۔ اُس پر مستزاد بجھل کا اصرار تھا۔ ملہاری نے ہاتھ جوڑ کے معذرت کرنی چاہی، لیکن بجھل کو جیسے ضد ہو گئی۔ اُس نے ملہاری کی معذرت اعتنا کے قابل نہیں سمجھی اور کہنے لگا کہ پھر ہمیں خلش رہے گی کہ ہمارے میزبان نے ہمارا مان نہیں رکھا۔ 'نہ پائے رفتن، نہ جائے ماندن' والی ملہاری کی حالت تھی۔ اِدھر شابے نے اُس کے پیر پکڑ لیے۔ اُدھر دونوں لڑکیاں اور سازندے ہاتھ باندھ کے کھڑے ہو گئے۔

گو اُنھوں نے زبان سے کچھ نہیں کہا، لیکن اِس خموشی سے بڑی فریاد کیا ہو سکتی تھی۔ ملہاری کے سیاہ چہرے پر خون چھلکنے لگا۔ اُس کا رنگ ہی بدل گیا۔ بجھل نے اُس سے کہا کہ فن تو افشا کے لیے ہوتا ہے، اخفا کے لیے نہیں اور یہ تو بخل ہے۔ یہ تو خود غرضی اور خود جبری ہے۔ فن تو دوسروں کے لیے ہوتا ہے، دوسروں کے شوق و اشتیاق سے اِسے نمو ملتی ہے۔ یہ دولت لُٹانے کے لیے ہوتی ہے اور دونوں ہاتھوں سے لُٹانے کے بعد بھی اِس میں کمی نہیں ہوتی۔ فن کو دُھوپ نہ دکھائی جائے تو یہ گھٹ جاتا ہے۔ بجھل نے بہت سی دل گداز اور دل سوز باتیں کیں۔ کچھ غلط نہیں تھا، مگر خدشہ تھا کہ کہیں ملہاری کو ضبط کا یارا نہ رہے۔ وہ بہ ہر حال اڈّے کا داوا ہے۔ اڈّے کے داوا کے لہجے میں تندی آتے ہوئے دیر کیا لگتی ہے۔ میری توقع کے برعکس ملہاری پر انکسار، انتشار اور اضطراب کا عالم طاری رہا۔ وہ کسمساتا اور بل کھاتا رہا اور آخر اُس نے سر جھکا لیا۔ اُس کے سپر ڈالنے پر ہر طرف سے تحسین و آفریں کی صدائیں بلند ہوئیں۔ دونوں لڑکیوں نے مسرت میں گھنگرو چھنکائے، طبلہ نواز نے دیوانہ وار طبلہ بجا کے اپنی خوشی کا اظہار کیا۔ ایک مرتبہ پھر گلاب کا عرق چھڑکا جانے لگا۔ لوگ ایک دوسرے پر گلاب کی پتیاں پھینکنے لگے اور واویلا مچ گیا۔ ملہاری بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ پھر اُس کے سر اُٹھانے پر ستار نواز، ہارمونیم بردار اور طبلہ نواز چوکی کے قریب آ گئے۔ ملہاری نے ستار نواز کو کوئی اشارہ کیا، اُس نے نہایت ادب سے ملہاری کے پیروں پر ستار رکھ دیا۔ سب کی نظریں ملہاری پر مرکوز ہو گئیں اور ہر جانب سکوت چھا گیا۔ 'تک تک دیدم، دم نہ کشیدم' والا مضمون صادق آتا تھا۔ دونوں لڑکیوں کے چہرے دمک رہے تھے۔ اشتیاق اور تجسس اُن کی آنکھوں سے ہویدا تھا۔

ملہاری نے آہستہ آہستہ ستار کے تار چھیڑے تو ایک ہنکار بلند ہوئی۔ تاروں کو منشا کے مطابق استوار کرنے میں ملہاری کو دیر لگ گئی۔ سبھی آنے والے لمحوں کی صورت گری کے منتظر تھے۔ کسی طرف سے کوئی آہٹ نہیں اُبھری کہ مبادا ملہاری کے ارتکاز میں خلل انداز ہو۔ دھیرے دھیرے ملہاری نے تار جھنجھوڑنے شروع کیے اور راگ پھوٹنے لگے۔ تھوڑی

دیر میں ایسا لگا جیسے ترنم کی مخمل پھریاں چھوٹنے لگی ہوں، موسیقی کے آلات میں بھی کیسا رس بھرا ہوتا ہے۔ نچوڑو تو رس ٹپکے، پر کشید کرنے والا بھی تو چاہیے۔ رس کی شیرینی اور نشے میں ہاتھ کی تاثیر کا بہت دخل ہے۔ تار چھیڑنے ہی سے ملہاری کی مشاقی کا اندازہ ہو گیا تھا، لیکن ایسی نغمگی، یہ فسوں گری غالباً ہر ایک کے گمان و اعتبار سے سوا تھی۔ لوگ کہتے ہیں کہ سارا کمال ہی نظم ترتیب، حُسنِ ترتیب میں نہاں ہے اور سارا کمال تناسب و توازن ہی کا ہے۔ کیا شاعری، کیا مصوری اور کیا موسیقی، سب کچھ تو یہ تو ترتیب و ترکیب کا کرشمہ ہے اور بنیادی چیز کسی فن کے مدارج و مراحل سے آگہی اور اُن پر قدرت کا حصول ہے۔ مدعا یہ ہے کہ ہر فن ایک مخصوص ترتیب اور ضوابط کے دائروں میں اسیر ہے۔ یہ دائرے گھٹتے بڑھتے، سکڑتے، پھیلتے رہتے ہیں، ختم نہیں ہوتے۔ ایک ترتیب کے بعد نئی ترتیب، ایک ہنر کے بعد دوسرا ہنر، جدت، اجتہاد، یعنی خلاقی و تخلیق آفرینی کی بات بھی ترتیب و ترکیب کے کسی نئے زاویے اور پہلو طرازی سے عبارت ہے، اور دائروں سے خارج کچھ نہیں ہے۔ تجزو یا دوسرے لفظوں میں انتہا پسندانہ اجتہاد بھی متعلقہ فن کے کسی روایتی پس منظر ہی میں ممکن ہے۔ خیال کی آمد ہر شخص پر ارزاں ہے، مگر ہر ایک کو ایک نظام، ایک سلیقۂ ہنر لازم ہے۔ موسیقی میں کسی نئے پہلو کی آمد، شاعری میں کسی نئے خیال کا الہام اور مصوری میں کسی نئے زاویے کا ورود متعلقہ فن سے وابستہ شخص ہی کو زیب دیتا ہے، کسی بڑھئی اور لوہار کو نہیں۔ یہی حال بڑھئی اور لوہار کے فنون کا ہے۔ شاعر اور موسیقار اور مصور چوب کاری اور آہن گری میں کسی نئے پن کا تصور کر سکتے ہیں اور بس!

مجھے اچھی طرح یاد تھا، گیا کے کالج میں میرے ایک بزرگ اُستاد کبھی کبھی اپنے موضوع سے ہٹ کے اِدھر اُدھر کی باتیں بھی ہمیں تعلیم کیا کرتے تھے۔ اُن کا کہنا تھا کہ شاعری، مصوری اور موسیقی دو اور دو کا حاصل جمع پانچ کرنے کی کوشش ہے۔ اُس وقت اُن کی بات پلّے نہیں پڑی تھی۔ اَب کچھ کچھ سمجھ میں آ رہا تھا کہ 'دو اور دو کا حاصل جمع پانچ' سے اُن کی کیا مراد تھی۔ جو بہ ظاہر ممکن نہ ہو، اُسے کر گزرنا، کوئی معرکہ سر کرنا، کسی نئی منزل، نئی جہت کا سراغ پانا اور کیمیا گری کرنا،

لکیروں، لفظوں، تاروں اور سُروں کی کسی نئی ترتیب سے کوئی اضافہ کرنا، اضافے کا مطلب پانچ نہیں ہوتا کہ حصار سے باہر کچھ نہیں۔ حاصل جمع چار کے خطوط اور زاویے بے شک مختلف ہوتے ہیں اور اِسے پانچ کے مترادف کہنا چاہیے۔ یہ حادثہ بھی کبھی کبھی سرزد ہوتا ہے کہ ثمربار درخت سے گزرتے ہوئے کسی راہ گیر کے دامن میں اچانک کوئی ثمر گر جائے۔ کسی پر اچانک کسی خیال کے وُرود، تگ و دَو کے بغیر کسی دفینے کے مل جانے کی ناگہانی شاذ و نادر ہی ممکن ہوتی ہے۔ استثنا پر کُلیے نہیں بنتے۔ فن میں کمال تو ایک مسلسل کوہ کنی، مستقل کاوِ ریاضت کا ثمر ہے۔

ملہاری کو ورثے میں موسیقی کی دولت حاصل ہوئی تھی۔ ورثہ دو بیٹے بیٹیوں میں مساوی تقسیم کیا جائے تو حاصل جمع مختلف کیوں ہوتا ہے اور جواب چار کیوں نہیں آتا؟ تین کیوں ہو جاتا ہے اور پانچ کیوں ہو جاتا ہے؟ یہ کیا شعبدہ ہے کہ ایک درجۂ کمال پر پہنچتا ہے، دوسرا صورت دیکھتا اور آئینے پر شک کرتا رہتا ہے۔ ایک ہی مکتب میں درس حاصل کرنے والوں میں کسی ایک کے امتیاز کا سبب ایک کی بے کلی، دوسرے کی بے حسی۔ ایک کی غرض مندی، دوسرے کی قناعت، ایک کا قرار، دوسرے کی بے قراری، ایک کا قیام، دوسرے کا سفر ہے اور دو بے قراروں میں امتیاز کا پیمانہ بھی یہی ہے۔ کون سرفروشی پر آمادہ رہا، کس نے کتنا خود کو نثار کر دیا۔

ملہاری نے چاقو پر خوب دست رس حاصل کی تھی۔ قریب تیس سال سے وہ اڈّے پر قائم تھا، لیکن یہ اُس کا بہروپ تھا۔ لگتا تھا، وہ تو بس ستار بجاتا رہا ہے اور ستار ہی سوچتا رہا ہے۔ جیسے وہ چپکے چپکے اپنا ورثہ بڑھاتا رہا ہے اور اُس نے کوئی دن، کوئی پہر، کوئی لمحہ نہیں گنوایا۔

سبھی گُنگ بیٹھے ملہاری کا جمال دیکھ رہے تھے، ملہاری کا اصل رُوپ۔ دونوں لڑکیوں پہ وجد کی کیفیت طاری تھی، آنکھوں میں ڈورے پڑے ہوئے، چہرے تمتمائے ہوئے، بدن میں اُن کے بار بار ہُوک سی اُٹھتی۔ ہر ایک کا یہی عالم تھا۔ ملہاری نے ستار خود سے جدا کیا تو لوگوں کو اِس ترنم آفریں سحر سے نکلنے میں لمحے گزر گئے۔ پھر یکایک عمارت میں

کان پڑی آواز سنائی دینا مشکل ہو گیا۔ بچھل نے ملہاری کے ہاتھ سینے سے لگا لیے۔ ہر شخص ملہاری کے پیر چھونے، اُسے سلام کرنے کے لیے چوکی کی طرف اُمڈ پڑا۔ اُنھیں جیسے آج ہی ملہاری کا عرفان ہوا تھا۔ شابے اور اڈّے کے دوسرے آدمیوں نے اُنھیں روکنے کی کوشش کی اور چیخ چیخ کے کہا کہ دوستو! ملہاری نے تو ابھی ستار نوازی کا مظاہرہ کیا ہے، راگ کہاں سنائے ہیں، یہ محفل کا اختتام نہیں ہے، یہ داد و ستائش قبل از وقت ہے۔ ذرا صبر کرو۔ بچھل کو بھی اُٹھنا پڑا۔ اُس نے ہاتھ بلند کر کے لوگوں کو صبر کی تلقین کرنے میں شابے کا ساتھ دیا۔ اُدھر ملہاری اپنے آپ سے بیگانہ سا بیٹھا تھا، کچھ گھبرایا گھبرایا، شرمندہ شرمندہ سا۔ داد سے بڑی لذّت کیا ہوتی ہے، خون سنسنانے لگتا ہے۔ اُس کے لیے یہ ایک نشاط انگیز واقعہ ہوگا۔ ستار نواز نے ستار اور طبلہ نواز نے طبلہ سنبھال کے مشق آزمائی شروع کی تو لوگوں کو احساس ہوا کہ ہاں، ملہاری کا اصل جوہر، اصل کرشمہ سازی تو ابھی رہی جاتی ہے۔ ملہاری نے بھی لوگوں کی وحشت خیز محبت دیکھ کے جلد ہی تان اُٹھائی اور اشاروں اشاروں میں سازندوں کو کچھ ہدایت دی۔

صبح کاذب میں اَب وقت کم ہی رہ گیا تھا، ملہاری نے اُسی نسبت سے راگ مالکونس کا آغاز کیا اور قصداً مختصر، ستار پہ اُس کی ساحری، صناعی اور کاری گری کی بات تھی تو آواز صاف خداوندی نعمت، کسی خداداد صلاحیت کا مظہر تھی۔ پہلی شرط تو آواز ہے اور آدمی کا نغمگی سے متصف ہونا ہے۔ شاعری کی اصطلاح میں اِسے 'موزوں طبعی' کہتے ہیں۔ دو اور دو کا حاصل جمع پانچ غالباً یہی معجز نمائی ہے۔ آواز بھی نشتر مثال ہوتی ہے، اور بہت کاری نشتر۔ سینے میں ترازو ہو جانے اور رگیں کاٹ دینے کی یہ خوبی تو نشتر میں بھی نہیں ہوتی۔ قدیم روایتی موسیقی کا ایسا نظارہ میں نے پہلے نہیں کیا تھا۔ ملہاری کی آواز میں ایسی کسک، خلش اور فریاد تھی، اِتنا کرب تھا کہ آدمی پر گریہ طاری ہو جائے اور وہ گریباں چاک کر دے۔ کہتے ہیں، آواز تو ایک خام چیز ہوتی ہے۔ ہیرے کی طرح اِسے تراشنا پڑتا ہے، مگر نہ ہر پتھر ہیرا بن سکتا ہے، نہ ہیرے جیسی آب و تاب کا متحمل ہو سکتا ہے! اور کہتے ہیں، آواز تو آدمی کا سراپا ہوتی ہے،

آدمی کا آئینہ۔ اندر کچھ کھٹکتا ہے تو بے قراری عیاں ہو جاتی ہے۔ اندر کچھ جلتا ہے تو آواز بھی جاں سوز ہو جاتی ہے۔ لوہا جلتا رہے، جلتا رہے، کُٹتا رہے، اِس ضربت و جراحت کے بعد ہی کوئی شمشیرِ بُرّاں ممکن ہوتی ہے۔

ملہاری کی صحبت میں اڈّے کے لوگوں کو بھی قدیم موسیقی کا اچھا ذوق ہو گیا تھا۔ بنگال کے لوگ یوں بھی موسیقی کے رسیا ہوتے ہیں۔ معلومات بھی اُنھیں خوب ہوتی چاہییں۔ بچھل نے تو طرح طرح کا وقت گزارا تھا۔ مجھے بھی راگ راگنیوں سے تھوڑی بہت آشنائی تھی۔ بمبئی میں ایک بار جولین میرے لیے کتابوں کا ڈھیر بازار سے اُٹھا لائی تھی۔ اُس میں ہندستان کی قدیم موسیقی سے متعلق بھی ایک کتاب شامل تھی۔ انگریزی میں تھی اور انگریز محقق ہی کی تالیف تھی۔ مجھے کچھ زیادہ پڑھنے کا موقع تو نہیں ملا، لیکن چند ابتدائی باب نظر سے گزرے تھے۔ کرشنا جی کے پاس بھی کتابوں کا بڑا ذخیرہ تھا۔ اُن کی عدم موجودی میں کبھی کبھی اُن کی کتابیں ٹٹولتا رہتا تھا، ہندستانی موسیقی کسی بڑے خزانے کے مانند ہے۔ ایک دَر کے بعد دوسرا دَر، اور ہر دَر میں ایک خزانہ، دفینے کے راستے، قواعد، اوقات اور آداب مقرر ہیں۔ پہلے اُنھیں از بر کیجیے اور دَر کھوجتے، دَر پار کرتے جائیے اور آنکھیں خیرہ کرتے رہیے۔ ذرا نگاہ چُوکی اور آدمی گُم ہوا۔ سارے خزانے تک پہنچنے کے لیے ایک عمر چاہیے اور کسی ذی نفس کے پاس اِتنی عمر نہیں ہوتی۔ جولین کی عطیہ کتاب سے مجھے معلوم ہُوا تھا کہ راگوں کے باقاعدہ اوقات مقرر ہیں... ویسے تو کوئی بھی راگ کسی بھی وقت گایا جا سکتا ہے، مگر اپنے معیّن وقت پر گایا جائے تو تاثر ہی کچھ اَور ہوتا ہے۔ ملہاری نے وقت دیکھتے ہوئے راگ مالکونس منتخب کیا تھا۔ مالکونس کے لیے رات کے دوسرے پہر کا وقت مقرر ہے۔ یہ بھیرویں ٹھاٹھ کی ایک شاخ ہے۔ منتخب سُروں کے الگ الگ نظام اور ضابطوں کی درجہ بندی کر دی گئی ہے۔ سیدھے سادے لفظوں میں راگ راگنیوں کے مختلف گروہ، یا خاندان وضع کر دیے گئے ہیں، اِن گروہوں اور خاندانوں کو 'ٹھاٹھ' کہا جاتا ہے۔ پرانے زمانے میں راگوں، راگنیوں کے بہت سے نظام، یا ضابطے یا گروہ رائج تھے، بل کہ اُن کا شاخ در شاخ سلسلہ بیٹے

بیٹیوں، دامادوں، بہوؤں، مؤنث، مذکر وغیرہ سے موسوم اور تعبیر کیا جاتا تھا۔ اِس موسیقی کے عالموں نے یہ شاخیں دس ٹھاٹھوں، یا دس حصّوں میں تقسیم کر دیں۔ ہر ٹھاٹھ کا سُروں کی مختلف ترتیب پر مشتمل اپنا ایک نظام اور تشخص ہے اور ہر ٹھاٹھ کی ذیلی شاخوں کا اپنا ایک نظم، اپنی ایک ترتیب ہے۔ مالکونس کو رات کے راگوں میں بہت فضیلت حاصل ہے۔ پانچ سُروں کا یہ راگ نہایت دل نشین اور دل نواز راگ ہے۔ راگوں سے متعلق ایک اَور دل چسپ بات بھی میں نے پڑھی تھی کہ ہر راگ کی ایک شبیہ قدیم موسیقاروں نے مصوّر کی ہے۔ مالکونس کو اُنھوں نے سفید رنگ کے ایک جوانِ رعنا سے تشبیہ دی ہے۔ دہکتی آنکھیں، چوڑی پیشانی، دراز قد، دست و بازو کا زور آور، شان و شوکت میں یکتا سے روزگار، ہاتھ میں زرنگار چھڑی، بدن پہ لاجوردی لباس سجائے اور موتیوں کی مالا زیبِ گلو کیے شہبازوں، شہسواروں کا ہم نشیں ہے۔

مالکونس پر ملہاری کو اِتنی قدرت تھی تو راگ ملہار پر اُس کی گرفت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ دونوں لڑکیوں کے بدن پارہ پارہ

تھے۔ پھر اُن سے برداشت نہیں ہوا، اُنھوں نے اُٹھ کے رقص شروع کردیا۔ ماحول ہی کچھ اَور ہوگیا۔ رقص راگوں کی مصوری ہے۔ رقص کی آمیزش سے راگ رنگین ہوجاتے ہیں اور جلد سمجھ میں آتے ہیں۔ ظاہر ہے، ملہاری کے بعد وہی دونوں محفل کے تمام لوگوں سے زیادہ موسیقی کا درک رکھتی تھیں۔ قدرِ جوہر شاہ داند... اُنھی کو ملہاری کے کمال، اُس کے فنّی اسرار، سب سے زیادہ منتقل ہونے چاہیے تھے، اور وہی اُس کی صحیح طور پر پذیرائی کرسکتی تھیں۔

سورج طلوع ہونے میں ابھی دیر تھی اور لوگوں کی شمولیت، اُن کے انہماک و استغراق کا یہ حال تھا کہ بس سانس رُک جائے۔ مگر صیاد خود اپنے دام کا اسیر ہونے لگا۔ پہلے تو ملہاری کی آنکھوں میں آگ سی بھڑکی پھر آنسو اُبلنے لگے اور آواز پر رعشہ سا طاری ہوگیا۔ اُس نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی، لیکن جانے کیا ہوا، کچھ بھولا بسرا یاد آگیا۔ کوئی کانٹا رگِ جاں میں اٹکا ہوا تھا، وہ زیر و زبر کرگیا۔ ملہاری بری طرح رونے لگا۔

سازندوں نے فوراً ساز بند کردیے۔ اِس سے پہلے کہ ملہاری غش کھا کے گر پڑتا، بچھل نے اُسے بازو میں تھام لیا۔ بچھل نے جیسے خاکستر میں پھونک ماردی تھی، یا تارِ نفس چھیڑ دیے تھے، اُس کے بازوؤں میں نڈھال ہوتے ہی ملہاری پھوٹ پھوٹ کے رونے لگا۔ اُس کی تو ہچکیاں بندھ گئیں۔ دونوں لڑکیوں نے دیوانہ وار چوکی پر آ کے ملہاری کے پیروں پر سر رکھ دیے، پھر ایک لڑکی پلّو سے پنکھا جھلنے لگی۔ کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ ہر شخص حیران و پریشاں ملہاری کو دیکھنے کے لیے چوکی پر چڑھا جا رہا تھا۔ شابے نے بُرا بھلا کہہ کے، گالیاں دے کے اُنھیں روکا اور کچھ دیر کے لیے پُرسکون ہوجانے کی التجائیں کرنے لگا۔ ملہاری کی آنکھیں چڑھ گئی تھیں۔ آنسوؤں کے ایک سیل کے بعد اُس نے ہاتھ پیر چھوڑ دیے اور خود کو بچھل کی آغوش کے سپرد کردیا۔ لوگوں کی بے چینی، اُن کی سرگوشیوں اور مشوروں کے شور سے گریز کے لیے یہی مناسب تھا کہ ملہاری کو فوراً کسی دوسری جگہ منتقل کردیا جائے۔ بچھل، میں، شابے اور اڈّے کے چند آدمی جیسے تیسے اُسے چوکی کے عقب میں ایک کمرے میں لے آئے اور چارپائی پر لٹا دیا۔ شابے نے دروازے پر کھڑے ہوئے لوگوں کا داخلہ بند کردیا۔

دونوں لڑکیوں کو بھی شابے نے روک دیا تھا، لیکن وہ اَڑ گئیں۔ بچھل کے اشارے پر شابے نے بادلِ ناخواستہ اُنھیں بھی اندر آنے کی اجازت دے دی۔ دونوں کی سراسیمگی میں بہت وارفتگی تھی۔ اضطراری انداز میں وہ ملہاری کی چارپائی پر بیٹھ گئیں۔ ہم پیشگی کے استحقاق کا اعتماد تھا، یا وفورِ پرستش اور بندگی کا جنون کہ ایک نے سرہانے بیٹھ کے ملہاری کا سر اپنے زانو پر رکھ لیا اور اُس کے ہاتھ مَلنے لگی۔ دوسری، پائنتی بیٹھ کے ملہاری کے پیر مسلنے لگی۔ بچھل نے ملہاری کے مُنہ پر پانی کے چھینٹے ڈالنے شروع کیے۔ اِسی اثنا میں اڈّے کے آدمی کہیں سے کوئی وید پکڑ لائے۔ وید کی دیکھ بھال اور دوا سے ملہاری کے چہرے کا کھنچاؤ کسی قدر کم ہوگیا۔ عرق میں یقیناً نشے کی کوئی دوا شامل تھی، جبھی ملہاری کی آنکھیں مچنے لگیں اور وہ رہے سہے ہوش سے بھی بیگانہ ہوگیا۔

وید کی ہدایت پر سب باہر چلے آئے۔ دونوں لڑکیاں، چمپا اور چندا وہیں رہنا چاہتی تھیں، لیکن وید نے ایک آدمی کے سوا کسی کو اندر ٹھیرنے کی اجازت نہیں دی۔ سو ملہاری کے ایک سِن رسیدہ معتمد کو نگہداری کی خدمت سونپی گئی اور کمرے کا دروازہ بند کردیا گیا۔

تھوڑی دیر میں اندھیرا ٹوٹنے لگا۔ کسی نے بھی وہاں سے جنبش نہیں کی۔ شابے اور بچھل نے بہت کہا تھا، لیکن چمپا اور چندا نے گھر واپس جانے سے انکار کردیا۔ وہ ایک کونے میں کھمبے سے کمر لگائے خاموش بیٹھی رہیں۔ اُن کی آنکھیں ڈوبی ہوئی تھیں۔ کھمبے کے سامنے ہی ملہاری کے کمرے کا دروازہ تھا۔ ملہاری کا حال دیکھنے شابے وقفے وقفے سے اندر جھانک کے واپس آتا تو وہ بے تاب ہوجاتیں۔ شابے اُنھیں مژدہ سناتا کہ ملہاری گہری نیند میں ہے اور گویا سب خیریت ہے، راوی چین لکھتا ہے۔ شابے کی بے نیازی اور اطمینان نے اُنھیں آسودہ نہیں کیا، وہ وہیں بیٹھی رہیں۔

دیکھتے دیکھتے اُجالا ہوگیا۔ کوئی آٹھ بجے اڈّے کے آدمیوں کو ناشتے کا خیال آیا اور بھاگ دوڑ ہونے لگی۔ ہماری وجہ سے وہ کچھ زیادہ فکرمند ہوئے۔ خاصی تعداد میں لوگ دھرنا دیے بیٹھے تھے،

تاہم گھنٹے بھر میں اُنھوں نے سب کے لیے ناشتے کا خاطر خواہ انتظام کردیا۔ پوری ترکاری سارے ہندستان کی مقبولِ عام غذا ہے۔ ساتھ میں دال اور چاول بھی تھے۔ بنگالیوں کو دال بھات نہ ملے تو بھوکے ہی رہیں۔ نو بجے وید نے دوبارہ حاضری دی۔ وہ اکیلا ہی ملہاری کے کمرے میں گیا اور آ کے بتایا کہ بہ ظاہر فکر کی کوئی بات نہیں، سرِدست ملہاری کو دوا سے زیادہ آرام کی ضرورت ہے۔ لوگوں نے وید کو گھیر لیا اور طرح طرح کے سوالات سے اُس کا ناطقہ بند کردیا۔ وید کے پاس کوئی شافی جواب نہیں تھا۔ کسی کے پاس بھی نہیں تھا اور شاید سب جانتے تھے، مگر محض اپنے وہم و قیاس کی تصدیق کے خواہش مند تھے۔

ہمیں بارہ بجے روانہ ہوجانا تھا۔ گیارہ بجے کے قریب ملہاری کی نگرانی پر متعین آدمی گھبرایا ہوا باہر آیا اور اُس نے بتایا کہ ملہاری کی آنکھ کھل گئی ہے اور وہ شدید قسم کے تشنج اور اختلاجی حالت میں ہے۔ سبھی پریشان ہوگئے۔ اِس سے پہلے کہ کوئی اندر جاتا، چمپا اور چندا دروازے کی طرف لپکیں۔ اُنھوں نے کسی کو مداخلت کا موقع ہی نہیں دیا، سیدھی کمرے میں داخل ہوگئیں۔ اِدھر بھی سب اندر جانے کے لیے کمربستہ ہوگئے تھے، مگر یہ ممکن نہیں تھا۔ بچھل کے ساتھ میرے اور شابے کے سوا کسی کو اندر جانے کی اجازت نہیں دی گئی۔

ملہاری چارپائی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اُس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور چہرے سے وحشت برس رہی تھی۔ بوڑھا خادم اُس کا کندھا پکڑ کے دوائی کا ایک جرعہ لینے کے لیے اصرار کررہا تھا۔ چمپا اور چندا چارپائی سے کچھ دُور ایک جانب ہاتھ باندھے کھڑی کپکپا رہی تھیں۔ ہمیں دیکھ کے وہ چپ ہوگئیں۔ ملہاری بھی حواس باختہ سا ہوگیا اور اُس نے کئی بار سر جھٹکا۔ پہلے ندامت، پھر یاس کا اُس پر غلبہ ہوا۔ بچھل نے اُس کے سرہانے بیٹھ کے اُس کی کمر تھپکتے ہوئے نرم لہجے میں پوچھا، ”کیسے ہو مہاراج؟“

کشمکش و پیچ سے دوچار ملہاری بے چارگی کی ایک نظر بچھل پر ڈال کے رہ گیا،

”وید بولتا ہے، تھوڑے آرام سے سارا ٹھکانے پر آجائے گا۔“ بچھل نے بدبداتے ہوئے کہا۔

”کہا تھا کہ میرے سلیپر مت پہننا...“

”میں، میں ٹھیک ہوں۔“ ملہاری نے گھٹی ہوئی آواز میں باور کرانے کی کوشش کی اور ہڑبڑا کے پوچھا، ”کیا وقت ہوا ہے؟“

شابے نے بہ عجلت اُسے وقت بتایا۔

”اُستاد کو جانا تھا۔“ وہ ہکلاتے ہوئے بولا۔

”اپنے کو جلدی نہیں ہے۔“ بچھل نے بے پروائی سے کہا۔

”پر میں، میں...“ وہ اُٹھنے لگا تھا کہ بچھل نے اُسے اُٹھنے نہیں دیا۔ اُس نے مزاحمت جاری رکھی، اپنا سینہ تانتے اور بازو پھیلانے کی مشق کی اور جلد ہی اُسے اندازہ ہوگیا کہ ابھی اُسے اِس مستعدی کی استطاعت نہیں ہے، سو اُس نے زِچ ہو کے سر جھکا لیا، لیکن دوسرے ہی لمحے اُس کے جسم میں تلاطم برپا ہوا۔ اُسے اپنی دائیں جانب ہاتھ باندھے، مجسّموں کی طرح ایستادہ چمپا اور چندا کی موجودی نے منتشر کردیا۔ ”باہر بھی سبھی اِدھری بیٹھے ہیں، تمھارے درشن کو۔“ بچھل نے زیرِ لبی سے کہا۔

یہ سُن کے ملہاری کے چہرے پر بل پڑ گئے، ”میں، میں باہر جاتا ہوں۔“ اُس نے بچّوں کی طرح ضد کی اور چارپائی سے اُٹھنے کی کوشش کا اِعادہ کیا۔

”نہیں مہاراج! ابھی ٹھیک نہیں ہے۔“ بچھل نے اُس کا زانو دباتے ہوئے کہا، ”گاڑی نہیں چھوٹ رہی کسی کی، رسائی سے جانا۔“

تیس سال کے معمول میں یہ بے ضابطگی ملہاری کے لیے مغائرت اور ناگواری، بے زاری اور سبکی کا باعث ہونی چاہیے تھی اور ہوش و حواس کی بہ حالی تک اِنھی متضاد کیفیتوں سے نبرد آزمائی لازم تھی۔ فی الحال سکون و سکوت کا جبر ہی اُس کے لیے ایک بہ تر نسخہ تھا۔ بچھل نے بھی اشاروں میں

اُسے یہی تلقین کی۔ ملہاری نے دوا پلانے کے لیے منتظر اپنے بوڑھے نگراں کے ہاتھ سے سفوف کی پڑیا جھپٹ لی اور حلق میں لوٹ کے مُنہ بنایا۔ اُس نے ایک ہی گھونٹ میں سارا پانی اُنڈیل کے کٹورا فرش پر پھینک دیا۔ کچھ دیر خاموشی کا حبس رہا۔ پھر جھّل نے اُس کی تالیفِ قلب کے لیے آہستگی سے کہا،

"رات جو ہم نے چمتکار دیکھا، ویسا کبھی دیکھا سنا نہیں تھا۔"

ملہاری نے ایک گہری سانس لی۔ شانے اُچکائے، اُس کے ہونٹ پھیل گئے۔ جواب میں کچھ کہہ نہ سکا، اِدھر اُدھر دیدے گھمانے لگا اور اُس کی بھٹکتی ہوئی نگاہیں چمپا اور چندا پر آ کے جم گئیں۔ "تم گھر جاؤ، تم کیوں، کیوں..."

"یہ اَب کدھری جائیں گی؟" جھّل نے تیکھے لہجے میں کہا، "کوئی ٹھکانا ہی نہیں چھوڑا مہاد یو نے اِن کے لیے۔"

چمپا اور چندا نے بھی سن لیا تھا۔ اُنھیں حوصلہ ہوا اور اُنھوں نے جھٹ ملہاری کے پانو پکڑ لیے، "ہم کو اپنے چرنوں میں جگہ دو مہاراج!" بڑی لڑکی چندا نے جرأت مندانہ عاجزی سے کہا۔

ملہاری نے پیر سکیڑ لیے اور منت بنا کے بولا، "جاؤ جاؤ، گھر جاؤ، اَب کوئی تماشا نہیں ہے یہاں۔"

"تماشا تو، لگتا ہے، اَب شروع ہوگا ملہاری بابو!"

ملہاری کو جھّل کا مفہوم اَخذ کرنے کی بے کلی ہونی چاہیے تھی۔ وہ چونک پڑا۔ میں نے بھی سمجھنے کی کوشش کی، لیکن جھّل کا لہجہ رمزیت سے آلودہ تو چہرہ عاری تھا۔ ایسی ناگہاں فقرے بازیاں سینے کی تندی میں اکسیر ہوتی ہیں۔ میں نے اپنی آسانی کے لیے جھّل کے فرمودے کو تفننِ طبع پر محمول کیا، ملہاری نے بھی۔

"آپ بھی اُستاد، اب جاؤ، ہماری وجہ سے اپنا وقت برباد مت کرو۔" ملہاری نے آزردگی سے کہا، "ہم ٹھیک ہیں بالکل۔"

"ہاں، اب ٹھیک ہی ہونے کا ٹائم آیا ہے، پر اپنا کام ابھی باقی ہے۔ پورا کر کے نہیں جائیں گے تو کاشا پڑا رہے گا۔"

"ابھی رہ گیا ہے کوئی کام!" ملہاری نے مضطربانہ سادگی سے پوچھا۔

اُسے جواب دینے کے بجائے جھّل نے شابے کو ہدایت کی کہ وہ ملہاری کے لیے مُنہ ہاتھ دھونے، لباس کی تبدیلی اور ہلکے قسم کے ناشتے وغیرہ کا بندوبست کرے۔ اُس نے چمپا اور چندا کو کمرے سے نکل جانے کا حکم دیا اور خود بھی اُٹھ گیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اڈّے کا نگراں نہ ملہاری ہے اور نہ شابے کو کوئی اختیار حاصل ہے۔ جھّل نے اڈّے کی کمان سنبھال لی ہے۔ دروازے سے نکلتے ہوئے اُس نے مڑ کے ملہاری کو مخاطب کیا، "پہلے ذرا سُر میں آؤ مہاراج! پھر تسلّی سے بچہ کریں گے۔" چند لمحے ٹھیر کے اُس نے ملہاری کو مشورہ دیا، "باہر آنے کو جی نہ کرے تو ابھی اِدھری آرام کرو۔"

ملہاری ہکا بکا اُس کے احکام سنتا رہا۔ بوڑھے نگراں کے سوا سبھی باہر چلے آئے۔ دھوپ تیز ہوگئی تھی۔ فرش پر اَب بھی کہیں کہیں دریاں بچھی ہوئی تھیں اور چارپائیوں پر بھی لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ چمپا اور چندا اپنی پرانی جگہ پر آ کے جم گئیں۔ کچھ دیر لوگوں کے درمیان بیٹھ کے جھّل نے ملہاری کے بارے میں اُنھیں مطمئن کیا۔ پھر چمپا اور چندا کے پاس جا کے اُنھیں اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ اوپر کی منزل کے جس کمرے میں ہم ٹھیرے ہوئے تھے، جھّل نے اُس طرف کا رُخ کیا تھا۔ اُس نے مجھ سے کچھ نہیں کہا تھا۔ میں نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی اور ایک کونے میں بیٹھا دری کے دھاگے اُدھیڑتا رہا۔ چمپا اور چندا کے ساتھ وہ جلد ہی نیچے آ گیا۔ مجھے بے چینی ہونے لگی تھی۔ یقیناً جھّل کی یہ تن دہی بے سبب نہیں ہوگی، لیکن مجھے کچھ سجھائی نہیں دیا۔

لوگ تتر بتر ہونے لگے تھے۔ اُن کی تعداد میں بھی کمی ہوگئی تھی کہ ملہاری کی طرف سے اَب اُنھیں ایسی فکر نہیں رہی تھی، دوپہر کے کھانے پر البتہ بہت سے لوگ شریک تھے۔ غالباً اُنھیں ملہاری کی موجودگی کی توقع تھی، اِس لیے وہ وقت پر واپس آ گئے۔ ملہاری کو نہ دیکھ کے اُنھیں مایوسی ہوئی۔ معلوم نہیں، وہ اب تک کیوں باہر نہیں نکلا تھا۔ اُسے تو بڑی بے تابی ہو رہی تھی۔ ابھی خیر اِتنا وقت نہیں گزرا تھا، لیکن زیادہ دیر تک اُس کی پردہ پوشی سے لوگوں کو منضبط رکھنے کی دشواری پیش آ سکتی تھی۔ شابے اَب تک اُنھیں تھپکتا رہا تھا۔ کھانے کے دوران بھی اُس نے زیرکی سے اُنھیں قابو میں رکھا، کسی قدر رازدارانہ انداز میں اُس نے لوگوں سے کہا کہ ملہاری تو بہت ضد کر رہا تھا، اُسے

روک دیا گیا ہے۔ اچھا ہے، کچھ وقت یک سُوئی اور دل جمعی کا اُسے اَور مل جائے۔ وہ ہشاش بشاش حالت میں ہم لوگوں کے درمیان آئے۔ وید کی بھی یہی ہدایت ہے، ملہاری نے ویسے بھی کبھی نہ کوئی چھٹی کی ہے، نہ آرام کیا ہے۔ کیا اُسے اِس خلوت کا حق نہیں ہے۔ کیا وہ لوہے کا بنا ہوا ہے؟

عصر کا وقت ہو رہا تھا۔ دھوپ ابھی باقی تھی کہ مجھے ساتھ لے کے جھّل نے ملہاری کے کمرے کی طرف قدم بڑھائے۔ چمپا اور چندا بھی ہماری پیروی میں اندر جانے کے لیے اُٹھ کھڑی ہوئی تھیں، جھّل نے اُنھیں منع کر دیا۔ اُس وقت کمرے میں کوئی اَور نہیں تھا۔ نیم دراز ملہاری گاؤ تکیے سے کمر ٹکائے جانے کہاں کھویا ہوا تھا، ہماری آمد پر سیدھا ہو گیا۔ اُس نے لباس تبدیل کر لیا تھا، بال کڑھے ہوئے تھے۔ خاصا اُجلا ستھرا دکھائی دے رہا تھا۔ جھّل نے دروازے ہی سے صدا لگائی، "کیسے بدلے بدلے لگتے ہو مہاراج!"

ملہاری نے سر جھٹکا، آنکھیں بھینچ لیں اور ہاتھ جوڑ کے شکایتی لہجے میں بولا، "ہم کو مہاراج کیوں بولتے ہو اُستاد؟"

"کچھ کم بولتے ہیں کیا؟"

"جو پہلے بولتے تھے، وہی..." ملہاری نے گھٹ کے کہا۔

"پٹی بھی تو تم ہی نے کھولی ہے۔"

"اَب جانے دو اُستاد!" وہ اُلجھ کے بولا۔

"کیسے، کیسے جانے دیں۔"

"بھول جاؤ سارا۔"

"تم نے بھلا دیا سارا؟" جھّل نے تنک کے کہا۔

"ہاں۔" ملہاری کی آواز ڈوب گئی۔ "ہم نے تو بنتی کی تھی۔ تم ہی نے زور دیا تھا۔ ہم تو... ہم تو..."

"جانتے ہیں، تم نے بڑا مان رکھا اپنا، پر آگا پیچھا دیکھ کے ہی ہم نے تکلیف دی تھی۔ تم کو اچھا نہیں لگا تو ہم کو معاف دیو۔"

ملہاری چپ بیٹھا اپنے ہاتھ مسلتا رہا۔

"برا نہ مانو تو تھوڑی زبان کھولیں۔" کچھ توقف کے بعد جھّل نے دھیمے لہجے میں کہا۔

ملہاری نے سر گھما کے اُسے متجسس نظروں سے دیکھا۔

"اَب باہر کیسے جاؤ گے؟"

ملہاری کی پیشانی تنگ ہوگئی، گردن بھی اکڑ گئی۔

"اڈّے کا دادا پتھر کی آنکھیں رکھتا ہے۔" جھّل نے نکیلی آواز میں کہا، "ہم بولتے ہیں، اَب نہیں چلا پاؤ گے تم۔ بہت

مشغول کرلیا تم نے اپنے آپ سے اور ان حرام خوروں سے۔"

"کیا، کیا بولتے ہو تم..." ملہاری اُکھڑ گیا۔

"اب اپنے کو مکتی دیو بھیّا، بہت کاٹ لیا بن باس، یہ تو ڈ گنتے سے اوپر ہو گیا۔"

ملہاری کا ہیجان نمایاں تھا۔ اُس کی بھویں پھڑک رہی تھیں۔

"اپنی جگہ پر جاؤ مہاراج" بٹھل نے تندی سے کہا، "اپنا بھی گھاٹا کیا تم نے، دوسروں کا بھی۔"

ملہاری کو منتشر ہونا چاہیے تھا۔ یہ سب کچھ میری توقع سے بھی بعید تھا۔ اُس کا چہرہ تمتمانے لگا، نتھنے پھول گئے، لیکن وہ خاموش رہا۔ بٹھل کا مدعا، اُس کی غرض سمجھے بغیر اس ناروائی پر بڑہی مناسب نہیں تھی۔ مناسب، نامناسب کا شعور ہوش مندی کی دلیل ہے۔ اِس سے مراد ہے کہ آدمی بالکل پتھر نہیں بن گیا ہے۔

"یہ تو نہیں چاہیے تھا، جو سیّت کے رکھا تم نے، وہ تو تمھارے تک رہا۔ ایسا نہیں ہوتا ملہاری بابو! ایسا کر کے تم نے اپنے آپ کو شانت رکھا؟ سینے پر ہاتھ رکھ کے بولو۔" بٹھل نے اُس سے پوچھا۔

ملہاری سے کوئی جواب بن نہیں پڑا۔ اُس کے ہونٹ دھڑک رہے تھے۔

بٹھل نے اُس سے کہا کہ اگر اُس نے سماعت کا سلسلہ بند نہیں کر دیا ہے اور حوصلہ دراز کرنے پر قادر ہے تو کچھ کہا جائے۔ کب تک وہ کھنڈروں پر کھڑا گزرے ہوئے کا نوحہ پڑھتا رہے گا؟ بیتا ہوا لوٹتا نہیں ہے۔ کھنڈر تو کھنڈر ہی رہتے ہیں، اور کھنڈر، اور کھنڈر... بے بسی، بے چارگی، خس و خاشاک، گرد و غبار، گریہ اور سکوت، کھنڈروں کے پاس اِس کے سوا دینے کے لیے کچھ نہیں ہوتا۔ یہ ملبہ ہٹائے بغیر زندگی نمو نہیں پاتی اور زندگی کی طلب نہیں ہے تو آدمی خود کو کھنڈروں کا جزو کیوں نہیں بنا دیتا۔ یہ جاں گزاری تو ہمہ وقت اُس کے اختیار میں ہے، یہ دوئی تو خود کو دھوکا دینے کے مترادف ہے کہ ایک طرف آدمی کھنڈروں کا تمنائی ہے، یا کھنڈروں سے آس لگائے ہوئے ہے، دوسری طرف زندگی کا خوگر ہے۔ بے شک جانے والوں کے نقش کبھی رگِ جاں میں پیوست ہو جاتے ہیں، مگر زندگی تو ٹھیرتی نہیں۔ کسی نے کسی کو وقت سے پہلے ختم کر دیا تو اُس قاتل، اُس جفا پیشہ نے کیا ختم کیے جانے والے شخص کی زندگی غصب کر لی، غبن کر لی؟

ملہاری کے ساتھ بہت ستم ہوا اور ہر چند اس میں ملہاری کا کوئی قصور، اُس کی کوئی کوتاہی نہیں تھی، لیکن کیا موقع پر ملہاری کی موجودی اُس کے متعلقین کے لیے بقائے دوام کی ضامن ہوتی؟ راستی کا یہی طور ہے کہ اُسے نوشتے کا المیہ، جان کے بکھرا ہوا سمیٹنا چاہیے تھا۔ یہی آدمی کا امکان ہے، ہر آدمی کا ایک ظرف، ایک پیمانہ ہوتا ہے۔ اُس کا سینہ چھلنی ہوتا ہے۔ اُس کی آنکھیں جلتی ہیں، زخم رستے ہیں، دل روتا ہے، جسم میں آگ لگتی ہے اور روح مجروح ہوتی ہے۔ پھر اس کا مداوا کیا ہو کہ وہ اپنے آپ کو نوچنا کھسوٹنا شروع کر دے۔ جو بھی سامنے آئے، اُسے اپنی آگ میں لپیٹ لے، ساری دنیا کو آگ دکھا دے، یا وہ مرہم کی جستجو کرے۔ پانی کی، پھولوں کی جستجو کرے۔ جواب میں ملہاری نے بھی بہت آگ لگائی تھی۔ بعد کو کسی نے اُس کا مذاق اُڑایا کہ اُس کا ہدف ہی ٹھیک نہیں تھا۔ یہ مذاق پہلے سے بڑا آزار، پہلے سے بڑا ستم تھا۔ پھر اُسے پاگل ہو جانا چاہیے تھا، یا کوئی خنجر سینے کے پار کر لینا چاہیے تھا۔ یہ آشفتگی ممکن نہ ہو سکی تو اُس آسمان گزیدہ کو چربی بڑھانے کی فکر کرنی چاہیے تھی۔ اُس نے کس جرم کی پاداش میں خود کو اس زندان کے سپرد کر دیا۔ اُس کی اگر کوئی خطا تھی تو اُس کے پاس اِس سے آسان سزائیں بھی تھیں، اور وہ کب تک یہ زندان بھگتتا رہے گا۔ کیا اِس طرح اُس کی سیری ہو گئی ہے، یا تلافی ہو گئی ہے اور اَب اُس کا کوئی اِدّعا نہیں رہا ہے۔ اِس زنداں کا کوئی راستہ، کوئی اختتام بھی ہے؟

بٹھل بنگالی میں اُس سے مخاطب تھا۔ ملہاری بت بنا سنتا رہا۔ کئی بار مجھے ایسا لگا، جیسے بٹھل ملہاری سے نہیں، مجھ سے ہم کلام ہے، مگر میری بدظنی کا یہ کوئی محل نہیں تھا۔ یہ میرا اپنا نشیب تھا۔ بٹھل کا مخاطب تو وہ شخص بھی تھا جو وہاں موجود نہیں تھا اور وہ سبھی جو اڈّے پر موجود تھے اور جو نہیں تھے۔

اُس نے نرم لہجے میں ملہاری سے کہا کہ ہم آج ہی اپنا سفر جاری رکھ سکتے تھے۔ ملہاری کے علم میں ہے کہ ہم نے ٹکٹ بھی منگوا لیے تھے۔ ٹھیرے ہوئے پانی میں کنکر پھینک کے

لطف و لذت اخذ کرنے کا وقت نہیں اب ہمارا، اور ہم نے زمانے بھر کا ٹھیکا نہیں لیا ہے، لیکن کچھ ایسا نظر آیا کہ یہ سکوت، سکون نہیں ہے۔ یہ تو سراب ہے۔ تہِ آب تو بہت تلاطم ہے اور ہم یوں کھیل تماشا دیکھ کے آگے چلے گئے تو سانس گھٹتی رہے گی۔ بتھل نے کہا کہ رات اُس نے ملہاری سے اس لیے اصرار کیا تھا کہ کوئی روزن تو کھلے، ہمیں احساس ہے کہ یہ مداخلت بارِ خاطر ہوسکتی ہے، اور ہمیں اس دخل اندازی کا استحقاق بھی نہیں ہے۔ نہ ملہاری سے ہمارے تلخ و شیریں کا کوئی پس منظر ہے۔ ادھر اپنے مسائل و معاملات بھی کچھ کم نہیں ہیں، مگر کوئی تناسب دگرگوں ہے تو قائم ہوجائے۔ تناسب ہی خیر ہے اور تناسب ہی زندگی ہے۔ ملہاری کی نظر میں بتھل کو کوئی اعتبار حاصل ہے تو اُسے بہ قدرِ امکاں حوصلہ کرنا چاہیے ورنہ ہم تو مسافر ہیں، صبح نہیں تو شام کو چلے جائیں گے۔

کمرے میں شابے کے اچانک وارد ہونے پر بتھل رُک گیا۔ ملہاری بت بنا بیٹھا رہا۔ بتھل نے شابے کو ہدایت کی کہ وہ کچھ دیر کے لیے ابھی باہر ٹھیرا رہے اور کسی کو اندر آنے کی اجازت نہ دے۔ شابے کو کسی قدر تامّل ہوا تھا۔ اُس نے ملہاری کی طرف دیکھا اور سر ہلاتا ہوا باہر چلا گیا۔

بتھل نے کٹورے سے پانی پیا اور آستین سے ہونٹ خشک کرکے کہا، "دونوں مستانیاں باہر تمھارے لیے دھونی رمائے بیٹھی ہیں۔ بولتی ہیں، وہ تو سارے میں بھٹکتی رہیں۔ سامنے دریا بہتا ہے۔ یہ تو اُن کو دکھائی نہیں دیا۔ بولتی ہیں، اب وہ اور کدھر جائیں گی؟"

"کون، کون؟" ملہاری ہڑبڑا کے بولا۔

"وہی تمھاری چمپا اور چندا دیویاں۔ کوٹھے پر ضرور نوٹنکی کرتی ہیں پر مٹکا پن، نین بازی اُن کو نہیں آتی۔ لگتا ہے، کوٹھے پر تو وہ ابھاگن وقت گزاری کو بیٹھتی ہیں۔ ہم کتنا بولیں، تم کو اُن سے ہم سے زیادہ جان کاری ہے۔ جانے کیا کیا بکتی ہیں۔ اب اُن کی کھوج ختم ہوئی، کنارہ مل گیا، اڑی ہوئی ہیں، دونوں واپس کوٹھے پر نہیں جائیں گی اور مہاراج کی سیوا میں، اُن کے چرنوں میں ساری عمریا کاٹ دیں گی۔"

"کیوں؟ کیوں؟" ملہاری کی زبان اٹکنے لگی۔

"کچھ تم بھی اپنے من سے پوچھو۔ یہی تو ہم بولتے ہیں، اُن کو ساتھ لے کے یہاں سے جاؤ۔ اب بہت ہوگیا۔ بہت درپن سے آنکھ مچولی کرلی تم نے! ہم نے تمھارے ہاتھ میں چاقو نہیں دیکھا، سنا ہے، اچھی پکڑ ہے، پر ہم کو معلوم ہے، اچھا نہیں لگتا ہوگا۔"

"لیکن یہ کیا، کیا..." ملہاری بوکھلا کے بولا۔

"تمھارے من سے اُلٹ تو نہیں بولتے۔ رات تم کو بھی دیکھا تھا، اُن کو بھی۔ تم نے اُن کو کبھی پاس آنے نہیں دیا، پر دُور بھی کتنا رکھا۔ ذرا بھیتر جھانک کے دیکھو، بار بار اُٹھی کو کیوں بلاتے ہو؟"

"وہ تو اس لیے... اس لیے کہ وہ دوسروں سے اچھا جانتی ہیں۔" ملہاری نے خفقانی انداز میں وضاحت کی، "اُن کو گُن ہے اُستاد، اس لیے..."

"تال میل کی بات بھی تو ہے ملہاری بابو۔ دونوں مورتیاں ہیں، وہ جو بولتے ہیں ایک کو اُٹھاؤ، دوسرے کو بٹھاؤ، جی نہیں لگتا اُن میں؟" بتھل نے بیڑی سلگالی اور کش لے کے بولا، "اُن کو ریت پر جاؤ۔ ہم نے رات تم کو غلط نہیں بولا تھا۔ یہ دھن تو لُٹانے کے لیے ہوتا ہے، پٹلیا میں باندھ کے رکھنے کا نہیں۔ ایک باری کوٹھری سے باہر نکل کے دیکھو۔ اڈے کی چوکی تو سسری بڑی ہرجائی ہوتی ہے۔ دیکھنا! اُدھری آنکھوں پر بٹھائیں گے سجن کو۔ باہر بھی بُرا نہیں ہے، اور اچھا نہ لگے تو لوٹنے کا راستہ بند نہیں ہوجائے گا، چاقو جیب ہی میں دھرے رکھنا۔"

ملہاری کا جسم پھڑک رہا تھا۔ اُس کی اُنگلیاں کانپ رہی تھیں۔

بتھل نے جانے کیوں یہ صراحت ضروری سمجھی کہ اُسے اڈے پاڑے سے کوئی دل چسپی نہیں ہے، نہ ملہاری کے اڈے پر اپنی پسند کے آدمی کو لانے کی۔ اڈاگیری کے لیے اُسے سیدھا راستہ معلوم ہے کہ وہ ہمیشہ چاقو پاس رکھتا ہے۔ اُسے ملہاری سے واسطہ ہے۔ پچاس برس کی عمر میں بھی ملہاری کسی زور آور، شہ زور سے کم نہیں۔ ابھی ایک زندگی سامنے پڑی ہے اور کسی سرد و گرم چشیدہ کے بہ قول، عمر تو ارادے سے مشروط ہوتی ہے۔ ارادہ تو دیوانگی کی عمر میں بھی مجہول ہوسکتا ہے۔

دونوں لڑکیاں جھجکتی، شردھا، اشتیاق اور آرزو سے لب ریز ہیں۔ کچھ حاصل کرنے اور کسی منزل پر پہنچنے کی تمنا میں وہ سب کچھ ترک کر دینے، کچھ کر گزرنے کے در پے ہیں۔ دھوپ میں ابھی اُن کے رخساروں کا رنگ اور دمکتا ہے۔ ابھی اُن کی قامتیں کمان کی طرح کھنچی ہوئی ہیں اور اُن پر ہر لباس زیبا ہوتا ہے۔ اُن کے ہونٹوں کا شہد خشک نہیں ہوا اور آنکھوں کا مقناطیس ماند نہیں پڑا ہے۔ اُن کی سانسوں سے خوش بُو جدا نہیں ہوئی۔ ابھی اُن کی خود آرائی و خود پیرائی کے دن ہیں۔ خال خال ہی بالاخانے والیاں، نرت اور بھاؤ کا ایسا شعور رکھتی ہیں۔ اُنھیں حرص و ہوس ہوتی تو دست رس سے دل فروز اور دل خواہ چیزیں اِتنی دُور نہیں رہتیں۔ دُکان تو وہ پہلے ہی سجائے ہوئے ہیں۔

بجھل نے بیڑی بجھانے کے لیے وقفہ کیا۔ میرا جی چاہا کہ میں بھی ملہاری سے کچھ کہوں، اُسے باور کراؤں کہ یہ وہی متاعِ ہنر ہے جسے صحرا نشیں، خاک بسر ملہاری نے تمام اندھیروں کے باوجود سینے میں روشن رکھا ہے۔ ملہاری کو اپنی خوش بختی پر ناز کرنا چاہیے کہ جہتِ تمام اور خرابیِ بسیار کے بعد ایسے طرح دار، ناز بردار اُس کے طلب گار ہیں۔ بے شک وہ اُس کی ریاضت کا نہایت شیریں ثمر ہیں اور گزرے ہوئے دنوں کے قہر و جبر کا بہ ترین مداوا ہیں، ایسے ہم نوا، ہم نفس، دل ساز و دل آرام چارہ گر کسے میسّر آتے ہیں۔ یہ سب کچھ تو کسی گم گشتہ خواب کی تعبیر کے مانند ہے۔ اِس میں کچھ مبالغہ نہیں۔ ملہاری ذرا تصوّر کرے، ایک ایسا گھر جہاں در و دیوار نغمہ بار رہتے ہوں، جہاں مکینوں کو بس ایک دُھن، ایک ہی لگن ہو کہ کسی طور وہ کوئی جادو، کوئی ایسا کمال، ایسی انتہا کر دکھائیں کہ مثال بنے۔ ملہاری کے لیے اِس سے دل خوش کُن ساعتیں کیا ہوں گی کہ ہر وقت چمپا اور چندا ایسے خوش اندام، خوش کلام رفیق اُس پر سایہ کیے ہوں۔ راگ الاپتے، بدن لہکاتے سراپا، آنکھوں میں چراغ جلائے، پھولوں کے تشت بازوؤں پر اُٹھائے، ہمہ دم اِقرار، ہمہ جاں بندگی؛ اُدھر دروازے کے پار مشتاقانِ دید، سپاس گزاروں کا ہجوم، سائلانِ شوق۔ یہ مرتبہ تو دیوتاؤں کو سزاوار ہوتا ہے۔ اور یہ جو فن کی بات ہے، اِس کی کہانی تو کہیں ختم نہیں ہوتی۔ جتنے فنون ہیں، اُنھیں کسی مہم کی طرح سر کرنا پڑتا ہے۔ پہاڑوں کی چوٹیاں زیر ہو جاتی ہیں، سمندر کی گہرائیاں رسا ہو جاتی ہیں۔ یہ شیشہ و ریشم کی طرح نازک، احساس و وجدان، کیف و خیال والے فنون کا سفر تمام نہیں ہوتا۔ جتنے قریب جاؤ، کنارے اور پھیل جاتے ہیں، پاتال اور گہری ہو جاتی ہے، چوٹیاں اور بلند ہو جاتی ہیں۔ شمشیر زن، شہسوار، غوطہ خور اور کوہ پیما مہم سے کام یاب و ناکام واپس آ جاتے ہیں، لیکن یہ نغمہ کار، خیال پرداز، یہ صورت گر! کمالِ فن تو اِن کے لیے سراب کی طرح ہے، تعاقب ہے کہ جاری رہتا ہے، سو ہر دم ایک اشتیاق، ایک اضطراب، ایک آزمائش، ایک جیسے لوگ، ایک جیسی نسبتیں، ایک ہی عزم، چمپا اور چندا کی ہم رکابی میں ملہاری کے سفر کی منزلیں کتنی آسان، منزلوں کا تعاقب کیا رواں دواں ہو سکتا ہے۔

بجھل نے مجھے کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ کہنے لگا، رات ہی اُس نے طے کر لیا تھا کہ ملہاری کو اڈّے سے چلے جانے کا مشورہ دے گا۔ چمپا اور چندا تو بعد کو سامنے آئیں اور ملہاری کے اڈّے سے نکل جانے کا امکان تو اُن کے سان و گمان میں نہیں تھا۔ وہ تو یہیں کسی کونے، کسی کوٹھڑی میں رہنے کو مُصر تھیں اور کہتی تھیں کہ وہ تو مہاراج سے کچھ حاصل کرنا، اُن کی خدمت کرنا چاہتی ہیں۔ وہ مہاراج پر بوجھ نہیں بنیں گی۔ اُن کے پاس ابھی اِتنا کچھ ہے کہ عزّت سے دو وقت گزر بسر کر سکیں۔ مہاراج کا گیان ہو جانے کے بعد اُنھوں نے بالاخانے سے مستقلاً نجات کا فیصلہ کیا ہے۔ بجھل نے ملہاری سے کہا، گو اِتنا آسان نہیں، لیکن ملہاری کے اختیار میں ہے کہ وہ اُنھیں دھتکار دے کے، اڈّے کے آدمیوں سے کہہ کے یہاں سے نکال دے۔ وہ کیا کر سکتی ہیں! اُن کی وحشت دیکھ کے ایک خوش گوار خیال بجھل کے ذہن میں تجویز یہ ہوا کہ اُن کے ساتھ ملہاری اپنی ذات کی تکمیل کر سکتا ہے۔ پھر وہ اِتنا بکھرا نہیں رہے گا۔ بجھل نے اُن دونوں کو اچھی طرح کھوڑا اور ٹٹولا ہے کہ وہ ارادے کی کتنی پختہ اور شوق کی کتنی صادق ہیں۔

بجھل نے کم و بیش وہی کچھ دُہرایا جو میں نہیں کہہ سکا تھا، اُس نے ملہاری سے پوچھا، اور اِدھر کیا حال ہے؟ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ چندا اور چمپا کا نظارہ ملہاری کی بینائی کے لیے ٹھنڈک کا سبب بنتا ہے، اور کیا یہ درست ہے کہ اُن کے اوجھل ہو جانے کے بعد ملہاری کی آنکھیں اُن سے بیگانہ ہو جاتی ہیں؟ پھر کون سی دیوار حارج ہے؟ پھر کیا اُسے اڈّے کی فکر دامن گیر ہے، یا اڈّے کے ساتھیوں کی کہ اُن میں سے بہت سوں کی رفاقت میں اُس نے نصف سے زیادہ عمر گزاری ہے، مگر ملہاری کی ترجیحات میں کبھی اڈّا گیری نہیں رہی ہے۔ وہ اِتنی مدّت اڈّے پر رہتے ہوئے اڈّے پر رہا بھی کہاں ہے۔ اُس نے اڈّے کا حق ہی کتنا ادا کیا ہے۔ اُسے تو اپنا اثاثہ اِس قدر عزیز تھا کہ دونوں وقت خلوت کی جستجو کرتا تھا۔ اُسے تو مشقِ سخن کی فکر لگی رہتی تھی۔ کسی دن اُس نے ناغہ نہیں کیا، کسی موسم میں، بل کہ یوں کہا جا سکتا ہے کہ وہ اڈّے کی آڑ میں اپنا ورثہ پرورش کرتا، اپنا سرمایہ بڑھاتا رہا ہے۔ اَب اِتنا کچھ سمیٹ لینے اور بڑی حد تک مطمئن ہو جانے کے بعد اڈّے پر اُس کے برقرار رہنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ اُسے اَب ساکلوں میں یہ دولت تقسیم کرنی چاہیے۔ یہی اُس کے آبا کا وتیرہ رہا ہے، اور جیسا کہ رات بجھل نے کہا تھا، ملہاری خاطر جمع رکھے، اُس کی آسودگی میں اِس داد و دہش کے بعد کوئی فرق نہیں آئے گا۔

کہتے ہیں، بہت سے لوگوں کو اپنی ترجیحات کی پوری آگہی ہوتی ہے، مگر عمل نہیں کر پاتے، کچھ اپنی کوتاہی، کچھ بیرونی دباو کے سبب سے۔ آدمی ترجیحات طے کر لیا کرے تو بہت سے دُکھ آدھے رہ جائیں، اور ترجیحات طے کرنے سے مراد اُن پر عمل کی تقدیم بھی ہے۔ اَب آگے کسی عمل میں ملہاری کے لیے پورے سُکھ، یا تلافیوں کی کوئی صورت ممکن ہے تو پیش قدمی میں کیا امر مانع ہے۔ اڈّے پر جمے رہنے کے اصرار کے یہی معنی ہو سکتے ہیں کہ ملہاری کی ترجیحات بدل گئی ہیں۔ با ہر اُسے خیر کی اُمید نہیں۔ انسانوں پر سے اُس کا اعتبار اُٹھ چکا ہے، یا وہ سب کچھ اپنی ذات میں مقید رکھنا چاہتا ہے۔ کسی کو شریک کرنا، کسی کو کچھ دینا نہیں چاہتا۔ وہ اذیّت پسند ہو چکا ہے، یا اُسے اڈّے پر ملنے والے آدھے سُکھ سے وچھن جانے کا اندیشہ ہے۔ اُسے اپنے چلے جانے کے بعد اڈّے کا شیرازہ منتشر ہو جانے کا کوئی گمان ہے تو وہ یہ خام خیالی ذہن سے نکال دے، اور فرض کرے، اگر ابھی بجھل چاقو کھول کے اڈّے کی دعوے داری کے لیے کھڑا ہو جائے! کوئی چاقو بردار اَب تک ملہاری کے سامنے یوں صف آرا نہیں ہوا کہ ملہاری سا بے غرض آدمی اُنھیں اور کہاں مل سکتا تھا۔ یہ بے نیازی، نیک نفسی دِلوں میں مروّت کے احساس بیدار کرتی ہے۔ ملہاری اُن کے لیے کبھی کوئی مسئلہ ہی نہیں بنا۔ ممکن ہے، اُنھیں اُس پر ترس آتا ہو اور وہ اُسے اُس کی تشنہ کامیوں کی رعایت دیتے رہے ہوں، اُنھیں خدشہ ہو کہ چاقو میں زبردستی سے ملہاری جاں بر نہ رہ سکے گا، یا بالکل جنگلی ہو جائے گا، زخمی درندے کی طرح۔

بجھل نے بھاری آواز میں کہا، سارے طولِ کلام اور تاویل و تکرار کا خلاصہ اِتنا ہے کہ ملہاری جیسے خلّاق اور ہنر مند کا انجام اڈّے کی چوکی نہیں ہونا چاہیے۔ باہر نکلنے کے بعد ہی ملہاری کو اندازہ ہو سکتا ہے کہ کون سی جگہ، کون سی مسند اُس کے لیے موزوں ہے۔ اُس کی صدا پہ والہانہ کتنے لوگ اُس کی جانب کھنچتے ہیں۔ شیدائیت، محبوبیت کا یہ لطف اُس نے کہاں چکھا ہے۔

ملہاری کی پیشانی پسینے سے تر ہو گئی تھی۔ بجھل کے چپ ہو جانے پر گہری خاموشی ہو گئی۔ چند لمحوں بعد بجھل نے مجھے اُٹھنے کا اشارہ کیا اور ملہاری سے کہا کہ اُسے کچھ اور نہیں کہنا۔

ملہاری کے چہرے، دست و بازو کے اضطرار سے اُس کی

سرگشتگی ظاہر تھی۔ بجھل کے اُٹھ جانے پر جیسے اُسے ہوش آیا اور وہ گڑبڑا کے بولا، "بیٹھو، ابھی بیٹھو اُستاد، کچھ دیر کے لیے۔"

"اپنے پاس بولنے کو اب کچھ بھی نہیں ہے، اپنا کام ختم ہوا۔" بجھل کے لہجے سے بے اعتنائی جھلک رہی تھی۔

"تم جو بولتے ہو یہ اِتنا... اِتنا، یہ کس طرح، کس طرح..." ملہاری کی زبان اُس کے مدعا کا ساتھ نہیں دے پارہی تھی۔

"سمجھتے ہیں۔" بجھل نے ہاتھ اُٹھا کر ہنکار بھری۔ "پر باقی کام تمھارا نہیں ہے۔"

بجھل نے کہا کہ ملہاری کا کام محض ارادے کی استواری ہے۔ سب جانتے ہیں کہ اِتنے عرصے سے اڈّے پر بیٹھ کے اُسے اِس آرائش کی ضرورت ہی نہیں پڑی ہے۔ لیکن یہی کچھ تو اُسے تلقین کیا جارہا ہے کہ وہ خود ایک امیر و کبیر شخص ہے۔ دولت صرف سونے چاندی، زر و جواہر کی نہیں ہوتی۔ بہت سی دولتیں تو آدمی کے اندر ہوتی ہیں، حسنِ تدبیر، خوبیِ فکر، تن درستی، محنت اور علم و ہنر کی دولتیں۔ سکّے اِنھی کا بدل ہوتے ہیں۔ ملہاری نے عزلت گزینی میں جو کچھ جمع کیا ہے، وہی اُس کا سرمایہ ہے۔ اُس نے یہ ہنڈی ابھی بھنائی کب ہے۔ اِس کی مالیت سکّوں میں اِس قدر نہیں، دیگر شکلوں میں بیش از بیش ہے۔ عقیدت اور احترام کا بھی تو کوئی مول ہوتا ہے۔ سونے چاندی، محل دو محلے کی دولت تبھی نظر نواز ہوتی ہے جب اپنے بَل پر حاصل کی جائے۔ یہ ترکے کی دولت تو سڑک پر پڑی ہوئی زمرّد و یاقوت کی ڈھیری کے مانند ہے جو کسی کے ہاتھ لگ جائے۔ یہ تو طلب کی ہوئی اور نہ طلب کی ہوئی خیرات کے مانند ہے اور اہل و نااہل فرزندوں میں تقسیم ہوجاتی ہے۔ اہل فرزندوں کو اِس کی طلب نہیں ہونی چاہیے۔ عالم باپ کے علم و فضل کا ترکہ بیٹے کو کیوں منتقل نہیں ہوتا۔ اپنے باپ کے نقشِ قدم کے اتباع ہی سے بڑھئی کا بیٹا بڑھئی ہوتا ہے۔ ترکہ صرف سونے چاندی، ساز و سامان اور سکّوں ہی کا کیوں ہوتا ہے، چھوتے والی چیزوں کا۔ ملہاری نے کبھی اِس دولت کی آرزو ہی نہیں کی ہے، ورنہ کوئی کمی نہ ہوتی۔

ملہاری کا تردّد بے جا نہیں تھا۔ تین دہائیوں کی تنہائی کاٹنے کے بعد اُسے بستیوں اور گھروں کی سمت سے خوف آنا چاہیے تھا۔ بجھل کو اِسی لیے اِتنا وقت صرف کرنا پڑا۔

سورج چھپ چکا تھا۔ اڈّے کے بہت سے لوگ اُس وقت بھی موجود تھے۔ شابے وقفے وقفے سے انھیں مطمئن کرتا رہا تھا، لیکن لوگوں کی بے چینی بڑھتی جارہی تھی۔ صبح سے شام ہوگئی تھی۔ ملہاری باہر نہیں نکلا تھا۔ مغرب کے بعد جب اندھیرا مسلط ہوچکا تھا، ملہاری آہستہ قدموں کمرے سے باہر آیا۔ اُسے دیکھ کے سبھی نے نعرے بلند کیے اور دیوانہ وار اُس کی پذیرائی کی۔ راستے میں ملہاری کی نظر تھم سے ٹِک لگائے، ہاتھ باندھے کھڑی ہوئی چمپا اور چندا پر گئی۔ وہ ایک لمحے کے لیے ٹھٹکا تھا، پھر سر جھکائے بڑھتا ہوا چوکی تک آگیا۔ بجھل نے چوکی سے اُٹھ کے اُسے جگہ دی۔ ملہاری ناتواں سا دکھائی دے رہا تھا۔ گم سم چوکی کے وسط میں بیٹھ گیا۔ چائے تیار تھی۔ شابے نے اعلان کیا کہ اُس نے رات کے کھانے کا انتظام کیا ہوا ہے، سب یہیں کھانا کھائیں گے۔ چائے کے بعد لوگ اپنی اپنی جگہ نسبتاً سکون سے بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے کہ بجھل چوکی پر کھڑا ہوا اور اُس نے دھمکتی آواز میں کہا کہ کچھ دیر کے لیے خاموشی ہوجائے تو وہ کچھ کہنا چاہتا ہے۔ لوگوں کو اِس طرزِ تخاطب پر حیرانی ہوئی اور بے قرار سرگوشیوں کی بھِن بھِناہٹ کے بعد آخر سکوت ہوگیا، تب بجھل نے اُن سے کہا کہ وہ اڈّے کے لیے جلد سے جلد نئے دادا کا انتخاب کرلیں۔

سبھی اُلٹ پلٹ سے گئے۔ سبھوں پر جیسے بجلی ٹوٹ پڑے ہوں۔ وہ ایک دوسرے کی صورت دیکھنے لگے۔ بجھل نے کہا، "اچھا ہوگا کہ ملہاری اُستاد کے سامنے ہی کوئی آگے آکے چوکی سنبھال لے۔"

لوگوں کو بجھل کی ذہنی حالت پر شبہ ہوا، یا اُنھوں نے اِسے مذاق پر محمول کیا۔ پہلے سنّاٹا سا طاری ہوا پھر بھانت بھانت کی آوازوں کا شور گونجنے لگا۔ اُن کی نگاہیں کبھی بجھل پر منڈلاتی تھیں، کبھی ملہاری پر۔ سرنگوں ملہاری ساکت بیٹھا رہا۔ شابے نے پہل کی اور اپنے لہجے کی برہمی ذور نہ کر سکا۔ "کیا؟ کیا بولتے ہو اُستاد؟" بجھل نے پھر، ہاتھ بلند کر کے اُنھیں متحمل اور منضبط رہنے کی تاکید کی۔ "ملہاری اُستاد اِدھری سے جارہا ہے۔" بجھل نے گونجتی ہوئی آواز میں کہا، "اُس کو یہ کام بہت پیچھے کرنے کا تھا، پر ٹھیک ہے، سمجھو، ٹائم نہیں آیا تھا۔"

"لیکن کیا... کیا ہوگیا اُستاد؟" شابے چیخ کر بولا۔

"تھوڑا نیچے سُر میں آکے بول۔" بجھل نے ناراضی سے کہا، "رات سارا دھار دیکھ کے بھی بولتا ہے، کیا ہوگیا!"

"پر اُستاد، ایسا کیا، ایسا کیا...؟" شابے سر جھٹک کے بولا،

"وہ تو ٹھیک ہے، اپنے کو اِتنا نہیں معلوم تھا، پر یہ کیا...؟" شابے کی آواز حلق میں پھنس گئی۔ بجھل نے اُسے مزید کچھ کہنے سے روک دیا، "اب تو ٹیپ لیا ہے آنکھ کے پورے! اور اب بھی پلّے نہیں پڑا تو اپنی بات ذرا دھیان سے سن! اور تم بھی..." بجھل نے ترشی سے کہا۔

لگتا تھا، ہر ایک کے لیے یہ خبر کسی حادثے سے کم نہیں، حیرانی، کبیدگی، پراگندگی، ہر ایک انتشار سے دوچار نظر آیا۔ بجھل نے بھی انھیں اِس ہیجان کی مہلت دی اور لمحوں تک چپ کھڑا رہا۔ سب کی مضطرب نظریں اُسے ہدف بنائے ہوئے تھیں۔ جلد ہی اُنھیں احساس ہوا کہ ابھی بجھل کی وضاحت باقی ہے اور یہ اُسی طور ممکن ہے کہ وہ اُسے تاویل و تشریح کا موقع دیں، چناں چہ ہر طرف سنسناتی خاموشی چھا گئی۔

بجھل نے لمبی چوڑی تمہید نہیں باندھی، سپاٹ لہجے میں کہا، "ایک باری ہی کان کھول کے سن لو، اپنے کو دُسرا نہیں آتا۔" اِسے آموختہ کہنا چاہیے۔ بجھل نے سیدھے سادے لفظوں میں وہی کچھ کہا جو سہ پہر ملہاری کے سینہ نشیں کر چکا تھا۔ اُس نے چمپا اور چندا کا ذکر نہیں کیا اور کہا کہ اڈّے کے لوگوں کو ملہاری سے کوئی ربطِ خاطر ہے تو کسی چون و چرا کے بغیر اُسے تمام تر عزت سے وداع کریں۔

سب دم بہ خود سنتے رہے۔ بجھل کا بیان نہ اِتنا مختصر تھا، نہ ایسا مبہم، لیکن ناگہانی کا نقش دیر سے مرتسم ہوتا ہے۔ بجھل کے چپ ہوجانے کے بعد جیسے اُس کی بازگشت جاری رہی۔ تعجب، یقین، بے یقینی کی کیفیت اور غالباً ملہاری کے بعد آنے والے دنوں کے ابہام نے انھیں گھیرے رکھا۔ ملہاری اُن کی عادت بن چکا تھا اور اُس کے سوا شاید اُنھوں نے کبھی اڈّے کی چوکی کا تصور نہیں کیا تھا۔ بجھل نے اُن سے یہاں تک کہا تھا کہ ایک نہ ایک دن تو ملہاری کو اُن سے جدا ہونا ہی ہے۔ ملہاری تو اب اپنی بچھڑی ہوئی منزل کی طرف جا رہا ہے۔ وہ تو اپنے پیروں پر قائم، اُمید اور عزم سے معمور ملہاری کو رخصت کر رہے ہیں، یہ کوئی سانحہ نہیں۔ اِس پر تو سب کو مسرت کا اظہار کرنا چاہیے۔

بجھل نے اچھی طرح جتا دیا تھا کہ کسی بحث و تمحیص کی گنجائش نہیں ہے، اب وہ ملہاری کا باب تمام سمجھیں اور آئندہ کی فکر کریں۔ کچھ دیر کی کش مکش کے بعد بائیں جانب کے ایک گوشے میں بے چینی دکھائی دی۔ لوگوں نے ٹہوکے دے کے ایک ادھیڑ تنومند شخص کو اُٹھا دیا۔ اُس نے جھجکتے ہوئے کہا کہ ملہاری کو کہیں جانے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ یہیں اڈّے پر رہے۔ اُس کے مشاغل میں ہم پہلے ہی بہت کم حارج رہے ہیں، آئندہ اور احتیاط کی جائے گی۔ وہ یہیں راگ دربار جمائے۔ اِس طرح نہ ملہاری اُن سے دُور رہے گا، نہ وہ اُس سے۔ ہم اِسے یقین دِلاتے ہیں کہ ملہاری کی مرضی بہ ہر حال مقدّم ہوگی۔ وہ نہیں چاہے گا تو اُسے اڈّے کے معاملات میں نہیں اُلجھایا جائے گا، اور یوں جتنا ہو سکا، وہ سب اُس کی خدمت ہی کریں گے۔

بجھل نے اُسے بات پوری کرنے نہیں دی، "بیٹھا رہ! اونچا سنتا ہے کیا؟" بجھل نے اُسے جھڑک دیا، "کیسا بولتا ہے رے... یہ اڈّا ہے، اِدھری ایک طرف راگ دربار جمے گا، دوسری طرف چاقو، بلم، پتے، دارو، سر پھٹول کا دھندا چلے گا؟"

اُس شخص نے جرأت کی اور کہا کہ ایسا ہے تو عمارت کا نصف حصہ الگ کر کے بالکلیہ ملہاری کے تصرّف میں دے دیا جائے۔ یہ کم پڑے تو پوری عمارت اُس کے لیے وقف کی جاسکتی ہے۔ پڑوس میں کہیں اڈّے کی نئی جگہ بنائی جاسکتی ہے۔ ملہاری ہماری نظروں کے سامنے رہے گا اور اِس کی موجودی سب کے لیے تقویت کا باعث ہوگی۔

"ہاں، رکھنا ملہاری اُستاد کو چاقو چھاپ۔" بجھل ترخ کے بولا، "اِدھری باندھ کے ہی رکھنا، عمر پٹا لکھوایا ہے اِس نے؟ بس، آگے کچھ نہیں۔" بجھل نے حتمی لہجے میں کہا کہ

وہ پہلے ہی اُن سے کہہ چکا تھا کہ انھیں فیصلہ سنایا جا رہا ہے۔ اُن سے مشورت نہیں کی جا رہی، اتنی صراحت بھی دیرینہ رفاقت کی پاس داری میں کی جا رہی ہے۔ ملہاری کو کوئی بھی فیصلہ کرنے کا اختیار ہے۔ بجھل نے یہ کہہ کے سارا قصہ ہی ختم کرنا چاہا کہ بہتر ہے، اب اِس سلسلے میں کوئی بات نہ کی جائے۔ اپنی سہولت دیکھ کے ملہاری کل، یا پرسوں کسی وقت یہاں سے چلا جائے گا۔

''نہیں استاد!'' پیچھے کی طرف بیٹھے ہوئے ایک نوجوان شخص نے تلخی سے کہا، ''تمھاری بات اپنی جگہ ٹھیک ہے، پر ہم کو ملہاری اُستاد سے سننا ہے۔''

اِتنی دیر میں پہلی بار ملہاری نے بے تابانہ سر اُٹھایا۔ اُدھر شابے نے نوجوان کو بٹھانے کے لیے بہت ہاتھ چلائے۔ ایک ثانیے کے لیے بجھل کی پیشانی شکنوں سے آلودہ ہوئی تھی، تاہم اُس کی آواز تھمی ہوئی تھی۔ اُس نے نوجوان سے کہا، ''اِدھری ملہاری اور شابے اُستاد کے بلاوے پر آئے ہیں۔ تجھ کو تھوڑی چھوٹ ہے۔''

''پر ہم کوئی غلط تو نہیں بولتے۔ ملہاری اُستاد ایسا گپ چپ کیوں بیٹھا ہوا ہے۔'' نوجوان کے لہجے میں گرمی بھی تھی، تمسخر بھی۔

اِس سے پہلے کہ بجھل کوئی جواب دیتا، ''ہا، ہا، ہُشت، ہُشت!'' ملہاری نے جنونی انداز میں نوجوان کو خاموش رہنے اور بیٹھ جانے کے اشارے کیے۔ شابے یک دم چوکی سے کود کے لوگوں کو پھلانگتا ہوا نوجوان کے سر پہ پہنچ گیا اور اُس کے بازو پکڑ کے بُری طرح دھتکارنے لگا۔ نوجوان پہلے بے قابو ہوا تھا، لیکن شابے اور آس پاس کے لوگوں کی مداخلت پر سرد پڑ گیا۔
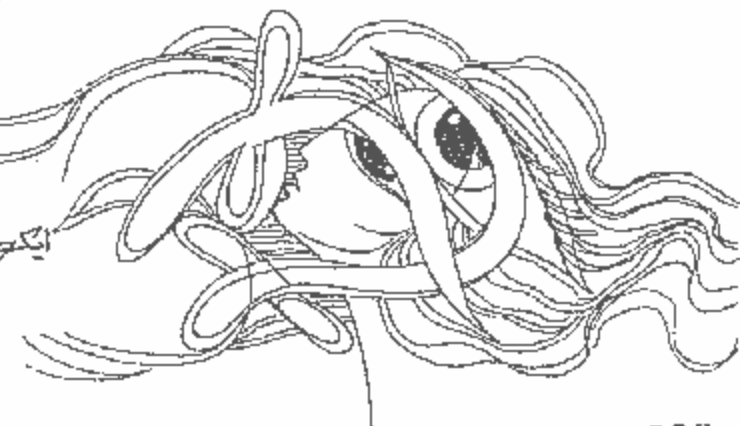
چوکی پر واپس آ کر شابے ہاتھ جوڑ کے بجھل کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ جواب میں بجھل نے آنکھیں میچ لیں۔ ملہاری بھی پشیمانی کے اظہار میں کھسک کے بجھل کے اور قریب آ گیا۔

اچھا ہوا جو بات جلد ہی رفع دفع ہو گئی، ورنہ کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ کتنی آگے جاتی۔

بجھل چوکی پر کھڑا رہا۔ پھر کسی جانب سے کوئی آواز نہیں اُٹھی۔ لوگوں کے چہرے تمتما رہے تھے، اُن کی آنکھیں دہک رہی تھیں، لگتا تھا، ہر شخص آنے والے لمحے کا بے کلی سے منتظر، یا آنے والے لمحے سے مطمئن نہیں ہے۔

''چوکی کا اب اپنے ہی کو مالک جانو۔'' کچھ توقف کے بعد یکایک بجھل نے سرد آواز میں کہا، ''ملہاری اُستاد نے اِسی ٹائم سے چوکی چھوڑ دی ہے۔ کسی کے گلے میں اٹکتا ہے تو چاقو نکال کے آگے آ جائے۔''

ملہاری بیٹھے بیٹھے اُچھل پڑا۔ بجھل کے قریب ہاتھ باندھے کھڑا شابے بھی لڑکھڑا گیا۔ چوکی پر موجود، آمنے سامنے اور دائیں بائیں بیٹھے ہوئے لوگوں کے لیے یہ ایک دوسری اُفتاد تھی۔ ملہاری کے اڈّا ترک کر دینے کی حیرت سے وہ سنبھل نہ پائے تھے کہ بجھل کی طرف سے اِس منادی اور حکم نامے نے اُنھیں اور بے اوسان کیا۔ سبھی کی نگاہیں ملہاری اور شابے سے سوال کناں تھیں، مگر خود اُن دونوں کا حال مختلف نہیں تھا۔

''ایک اُستاد کے جانے پر دوسرا آ جاتا ہے۔'' بجھل نے پتھریلی آواز میں کہا، ''دوسرا یا تو بل پہ آتا ہے، یا سب کی مرضی سے۔ ہمارے لیے تمھاری مرضی نہ ہو تو تل کر کے دیکھ لو، ایک دو، چار پانچ، جتنے بھی ہوں۔'' ۞

پولیس کی نگرانی میں اُنھیں اسٹیشن لایا گیا اور جب تک گاڑی چل نہ پڑی، پولیس اُن کے آس پاس منڈلاتی رہی۔ عیادت کے لیے صحیح اہتمام اسپتال آتے آتے میدا کے اچانک غائب ہو جانے کا عذر بنجل نے بڑا کر اور تسلیم کرلیا تھا اور چپ رہا تھا، لیکن اب روانگی کے وقت بھی میدا کی غیر حاضری، دو دن سے اڈّے جانے کے بجائے اسپتال میں قیام، آئی جی کی طرف سے گل دستہ، سڑکوں کا سناٹا، جگہ جگہ پولیس کا گشت، یہ سارے مظاہر بنجل کے لیے تشویش کا باعث ہونے چاہییے تھے۔ زورا، جامو اور بابر کو اِس کا احساس تھا، مگر گاڑی کے حرکت میں آ جانے کے بعد ہی اُنھوں نے زبان کھولی اور بنجل کی بیماری اور بے خبری کے دوران پیش آنے والے سانحوں سے آگاہ کیا تو بنجل بہت حیران ہوا، پشیمان اور آزردہ بھی۔ اُس نے بابر کو بانہوں میں بھینچ لیا۔

کلکتے کے اڈّے کا قیام نہایت مختصر تھا، دو راتیں، ایک دن۔ زورا اور جامو کو کلکتے چھوڑ کے بابر اور بنجل مشرقی اور مغربی بنگال کی مختلف بستیوں کی خاک چھانتے ہوئے ڈھاکے پہنچ گئے، اور کسی جگہ شہر کے اڈّے کے ایک آدمی سے اُن کا آمنا سامنا ہو گیا۔ وہ شابے تھا، بنجل کا شناسا۔ شابے ضد کر کے اُنھیں اڈّے پر لے آیا۔ یہاں ملہاری نامی ایک شخص عرصے سے چوکی پر بیٹھا ہوا تھا۔ بنیادی طور پر ساز و آہنگ سے اُس کا واسطہ تھا۔ مشہور تھا کہ کسی زمیں دار نے اُس کی بہن کا رشتہ مانگا تھا، انکار پر ایسا مشتعل ہوا کہ ملہاری کا گھر برباد کر دیا۔ موسیقی کی تعلیم کے سلسلے میں ملہاری کسی دوسری جگہ تھا۔ گانو واپس آ کے اُس نے زمیں دار اور اُس کے خاندان کے ایک ایک فرد کو ختم کر دیا اور ڈھاکے آ کے اڈّے کی چوکی پر قبضہ کرلیا۔ اُس کے معمولات عجیب تھے۔ عموماً گم سم اور گوشہ نشیں رہتا، بند کمرے میں گھنٹوں ریاض کرتا رہتا۔ بنجل کی خاطر داری میں اُس نے کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی۔ بنجل کے لیے مجرے کی محفل برپا کی۔ ملہاری کی محفل میں نرت بھاو سے ناواقف کوئی ایسا ویسا داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ اُس رات اپنے فن میں طاق، بالا خانے سے متعلق دو لڑکیاں بزم آرائی کے لیے وہاں آ گئیں۔ دونوں ملہاری کی عقیدت مند تھیں اور اُس رات بنجل کے شدید اصرار پر ملہاری کو بادلِ نخواستہ اپنی قسم توڑنی پڑی۔ پہلے اُس نے ستار پر اپنی غیر معمولی مشّاقی کا مظاہرہ کیا، پھر راگ مالکونس اور ملہار میں اپنی آواز کا سحر پھونکا۔ اُس کا یہ روپ پہلے کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ سبھی گنگ ہو گئے۔ جانے کیوں، گاتے گاتے وہ پھوٹ پھوٹ کے رونے لگا اور اُس پر غشی طاری ہو گئی۔ دوسرے دن کہیں اُس کے ہوش و حواس بحال ہوئے۔ ملہاری کی صحت یابی کے لیے متوحش دونوں لڑکیاں اڈّے پر موجود تھیں۔ اِس موقع پر بنجل کے اِس اعلان سے سبھی زیر و زبر ہو گئے کہ ملہاری اڈّا ترک کر رہا ہے۔ خود ملہاری کو بھی اِس اعلان پر بڑی حیرت ہوئی۔ بنجل نے اُسے تلقین کی کہ اڈّا اُس کا مقام نہیں، وہ خود کو فریب میں رکھے ہوئے ہے۔ قدرت نے اُسے ہنر کی بے پناہ دولت سے نوازا ہے۔ فن تو اظہار کے لیے ہوتا ہے۔ بہت دیر ہو گئی ہے، لیکن اب بھی کچھ نہیں گیا۔ ملہاری راگ رنگ کی اپنی دنیا میں واپس جائے، وہ یہاں بیٹھا کیا کر رہا ہے۔ بنجل نے پھر اڈّے کے لوگوں سے کہا کہ وہ اپنے لیے کوئی نیا اُستاد منتخب کر لیں یا پھر خود کوئی آگے آ کے چوکی سنبھال لے۔ ہر کوئی جز بز ہوا اور کوئی نہیں اُٹھا۔ ایک نوجوان کسی قدر بھڑکا تھا، لیکن اُسے خاموش کر دیا گیا۔ نتیجتاً بنجل کو کہنا پڑا کہ کسی کے آگے نہ آنے کی صورت میں پھر اُسی کو اڈّے کا مختار سمجھا جائے، اور اگر کوئی اِس فیصلے سے متفق نہیں، تو چاقو کھول کے سامنے آ جائے۔

پہلے سرگوشیاں گونجیں، پھر ہر طرف آگ سی لگ گئی۔ لگتا تھا، سب چاقو نکال کے بنجل پر حملہ آور ہو جائیں گے۔ میرے ہاتھ بے اختیار جیب کی طرف گئے۔ چاقو جیب ہی میں تھا، لیکن ابھی اُسے نکالنا قبل از وقت تھا۔ چوکی پر اور نیچے فرش اور چارپائیوں پر بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے کوئی نہیں اُٹھا۔ غم، غصّے اور حیرانی سے بھری غرّاہٹوں جیسی اُن کی صدائیں بلند

ہوتی رہیں۔ ایک آدمی کے کھڑے ہو جانے پر اِدھر اُدھر دو آدمی اور کھڑے ہو گئے۔ تینوں نے ایک دوسرے کو موقع نہیں دیا۔ وہ بہ یک وقت دہاڑنے لگے تھے، مگر وسط میں ایستادہ ایک بلند قامت کی آواز اُن پر غالب آ گئی۔ اُس نے براہِ راست ملہاری کو مخاطب کرنے کی کوشش کی اور کہنے لگا کہ یہ سب کچھ کیا ہے۔ ملہاری کی موجودی میں یہ کیسا مذاق ہو رہا ہے۔ ملہاری چپ کیوں بیٹھا ہے۔ کیا واقعی اُستاد بنجل ہی اب اڈّے کا مختار ہے۔ اب وہ مہمان نہیں رہا ہے، وغیرہ۔

شور کی وجہ سے اُس کی آواز چوکی پر کچھ سنی گئی، کچھ نہیں۔ شابے حیران پریشان کھڑا تھا۔ ملہاری بھی بہت درہم برہم نظر آ رہا تھا۔ سبھی تتر بتر سا ہو گیا تھا۔ وہ نوجوان، جس نے کچھ دیر پہلے بنجل کی دخل اندازی پر اعتراض کیا تھا، پھر دیوانہ ہوا۔ اُس کے پاس بیٹھے ہوئے ساتھیوں نے اُسے روکے رکھا، لیکن نوجوان کی وحشت اُن کی روک تھام سے فزوں ہوئی۔

ابھی کچھ اتنی دیر نہیں ہوئی تھی کہ بنجل نے ہاتھ اُٹھایا اور گرجتی ہوئی آواز میں اُن سے پوچھا، ''کوئی نہیں ہے کیا؟''

''یہ کیا، کیا بولتے ہو اُستاد؟'' ایک عمر رسیدہ نے اُٹھ کے ہذیانی انداز میں کہا، ''یہ کیسا اندھیر ہے۔ ایسا کہاں ہوتا ہے۔''

''پھر کیسا ہوتا ہے بابا؟'' بنجل تحمل سے بولا، ''تم تو پرانے چاول ہو۔ ہم کیا اُلٹا بول رہے ہیں۔ ملہاری اب اڈّے کی چوکی پہ بادشاہ نہیں رہا ہے۔'' بنجل نے اُس سے سوال کیا کہ ملہاری کی دست برداری کی صورت میں کوئی تو اڈّے کی چوکی سنبھالے گا۔ چوکی پر ملہاری کی موجودی میں بھی کوئی چاقو کھول کے اڈّے کا دعوا کر سکتا تھا۔ بنجل نے لوگوں کی جانب مُنہ کر کے پوچھا کہ اُس سے زیادہ کوئی اہل آدمی ہے تو سامنے آنے میں کیا قباحت ہے۔ چوکی کی اہلیت کی کسوٹی تو زور ہے۔ کیا اڈّے کے لوگ اِس ریت سے ناواقف ہیں۔ کوئی اور مرحلہ ہو تو اُس کے علم میں اضافہ کیا جائے۔

اِس دوران نوجوان نے اپنے ساتھیوں پر قابو پا لیا تھا، یا اُس کے ساتھی شدید مزاحمت سے تنگ آ چکے تھے۔ نوجوان چاقو اُچھال کے چیختے ہوئے بولا، ''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے مائی باپ! فیصلہ چاقو کے بل ہی پر ہوگا۔ یہاں سب نامرد ہو گئے ہیں تو ہم ابھی موجود ہیں، ہم موجود ہیں۔'' اُس کا روئے سخن واضح طور پر شابے کی جانب تھا۔

''دیکھو، نکلا نا ابھی ایک رُستم کا جنا!'' بنجل نے بگڑے تیور سے کہا، ''زیادہ بات نہیں اُستاد، اِتنا ہی بول کہ بعد کو شیشہ بھی نہ ڈھونڈھ جائے۔''

نوجوان نے اشتعال میں ترکی بہ ترکی جواب دیا کہ بنجل کو یہ مشورہ خود کو دینا چاہیے۔

''بس ایک ہی؟'' بنجل نے نوجوان کو درگزر کر کے چاروں طرف نظریں گھماتے ہوئے اونچی آواز میں پوچھا۔

''ڈگڈگی منگوائیں کیا؟'' نوجوان کا اعتماد دیدنی تھا۔ بے سبب بھی نہیں ہوگا وہ بار بار چاقو اُچھال کے گرفت میں لیتا رہا۔ اچھی مشّاقی تھی اُسے۔

''بیٹھ جا رامو، بیٹھ جا'' شابے نے آخر زبان کھولی۔ ''اُستاد بنجل کو نہیں جانتا رے تو! ہوش سے زبان چلا۔ قسم سے، بہت خواری ہوگی۔''

''تم اب بیچ میں مت بولو اُستاد۔ یہ خواری کیا کم ہے کہ یہاں سب نے چوڑیاں پہن رکھی ہیں۔'' نوجوان رامو نے طیش میں کہا۔

''کسی نے چوڑیاں نہیں پہنی ہیں۔ اڈّے پہ یہی ہوتا ہے، تیرا دماغ خراب ہو گیا ہے رامو!'' شابے نے اُسے باز رکھنے کی کوشش جاری رکھی، ''تجھ کو بولتے ہیں آخری بار، ابھی وقت ہے۔''

''اپنے اُستاد کو بول کہ چاقو نکال لے۔'' رامو گرج کے بولا۔ اُس کا جسم پھڑک رہا تھا۔

بنجل فوراً چوکی سے اُتر گیا۔ شابے نے بہ عجلت کود کے اُسے جا لیا اور پانو پکڑ لیے۔ ''جانے دو اُستاد، گرم خون ہے، جان سے جائے گا سالا، معاف کر دو، اِسے معاف کر دو اُستاد! مر جائے گا بے موت سؤر کا بچہ۔''

''نہیں رے!'' بنجل نے شابے کا بازو پکڑ کے اُٹھایا، ''اپنا چاقو اِتنا فالتو نہیں ہے۔''

شابے پھر رامو کی طرف لپکا۔ رامو نے اُسے دھکا دے کے خود سے دور کیا تو شابے اُسے بری طرح گالیاں بکنے لگا اور بنجل سے بولا، ''ٹھیک ہے اُستاد، اِس کتے کے پلّے کو بھی

بتاؤ۔ ایسے یہ نہیں مانے گا۔ سالا بالکل پاگل ہو گیا ہے۔"

بجھل کے اشارے پر لوگ دُور دُور ہونے لگے۔ اس اثنا میں ملہاری بھی چوکی سے اُتر گیا۔ وہ رامو کے پاس پہنچنا چاہتا تھا۔ رامو نے بھی اُسے اپنی طرف بڑھتا ہوا دیکھ لیا تھا۔ وہ اُدھر پلٹ گیا اور چیخ کے بولا، "ہٹ جاؤ ملہاری اُستاد! بہت ہو گیا۔ تم اَب اڈّے کے اُستاد نہیں ہو۔ اڈّے کا تاج اَب تمھارے اِس گدھ کی اولاد اُستاد بجھل کے سر پہ ہے۔ تم اندر جا کے تاتھیا تا تک دِھنا دِھن کرو۔"

لوگوں نے پیچھے ہٹتے ہٹتے دائرہ بنا دیا تھا۔ راموا چھلانگ لگاتا ہوا دائرے میں آ گیا۔ بجھل پہلے ہی پہنچ چکا تھا۔ اُس نے ابھی تک چاقو نہیں نکالا تھا۔ راموا سے للکار رہا تھا۔ ملہاری نے بھی دائرہ پھلانگ لیا اور بجھل کے سامنے دیوار بن کے کھڑا ہو گیا، "بس بس اُستاد! اِس کو جانے دو۔ یہ نادان ہے۔"

"پھر اِس کو چوکی پہ بٹھا دیں؟" بجھل نے تنک کے کہا، "تمھاری مرضی ہو تو...!"

بجھل نے یقیناً ملہاری کو اشارہ کیا تھا کہ وہ سر ہلاتا اور بڑبڑاتا ہوا دائرے سے باہر چلا گیا۔

دونوں آمنے سامنے کھڑے ہو گئے۔ بجھل نے جیب سے چاقو نکال کے آہستگی سے کھولا۔ "ہاں رے! شروع کریں؟" اُس نے دِھیمے لہجے میں رامو سے پوچھا۔ جواب دینے کے بجائے رامو نے اُچھل کے بجھل کو چاقو سے پھکی دی۔ میں بھی اُن دونوں کے قریب ہو گیا تھا اور میں نے اپنا چاقو جیب سے نکال کے ہاتھ میں دبا رکھا تھا۔

رامو میں خوب پھرتی تھی اور اُس وقت تو، بہ طورِ خاص، اُس کی بوٹی بوٹی تھرک رہی تھی۔ آنکھیں شعلہ بنی ہوئی تھیں۔ جس طرح آنکھوں سے مراد بینائی نہیں ہے، بینائی سے مراد بھی بینا ہونا نہیں ہے۔ اِتنے لوگوں کے سمجھانے، روکنے پر رامو کو کچھ تو غور کرنا چاہیے تھا، مگر وہ تو بالکل وحشی ہو چکا تھا۔ مجھے ایک ہی فکر تھی کہ وہ اپنے اندھے پن میں کوئی بھی اوچھی حرکت کر سکتا ہے۔

بجھل کو بس دیر لگانی نہیں چاہیے تھی۔ اُس نے پیچھے ہٹ کے رامو کو پہل کرنے کی دعوت دی اور پیچھے ہٹتے ہٹتے اُس نے کسی قدر ترڈد کا اظہار کیا اور اُس کا چاقو ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل کرتے ہوئے زمین پر گر گیا۔ رامو کے لیے اِس سے سنہرا موقع اور کیا ہو سکتا تھا۔ بجھل نے بہ ظاہر اضطراب کے عالم میں زمین سے چاقو اُٹھانا چاہا تھا کہ رامو بے تحاشا اُس کی طرف جھپٹا۔ اُسے کچھ خیال نہیں تھا کہ بجھل تو شست باندھے ہوئے ہے۔ اُس نے دانستہ چاقو گرایا ہے اور چاقو اُٹھانے میں سُستی بھی دانستہ ہے۔ چاقو اُٹھانے کے لیے جھکنا ایک فریب تھا۔ بجھل کا ارادہ ہی کچھ اَور تھا۔ اُدھر سے رامو بڑھا، بجھل کی نظریں اِدھر اُس کی بائیں ٹانگ سے بندھی ہوئی تھیں۔ دونوں کے درمیان گز بھر سے کم فاصلہ رہ گیا ہوگا کہ بجھل نے جھٹ دایاں ہاتھ بڑھایا اور پنجہ ڈال کے رامو کی بائیں ٹانگ جکڑ لی۔ پنجہ ڈالنے اور اپنی جگہ سے حرکت کرنے کے عمل میں لمحے بھر کا فرق نہیں تھا۔ جس تیزی سے بجھل نے جھکے جھکے اپنی دائیں جانب جست لگائی، وہ منظر دیکھنے کے لائق تھا۔

رامو توازن کھو بیٹھا، ترچھا ہو کے زمین پر گرا۔ دونوں ٹانگیں چر گئیں۔ دائرہ اِتنا بڑا نہیں تھا کہ بجھل اُس کی ٹانگ جکڑے جکڑے سیدھ میں دُور جا سکتا ہے۔ رامو گیا، کوئی بھی ہوش و حواس قائم نہ رکھ پاتا۔ دائیں کان کی جانب رامو کا سر فرش سے ٹکرایا تھا۔ فرش بھی ایسا ہموار نہیں تھا۔ اُس نے چاقو جلد ہی چھوڑ دیا ہوتا تو اپنے جسم اور حالی پر توجہ دینے کی مہلت مل جاتی۔ ہاتھ میں دبائے رکھنے سے چاقو کی نوک اُس کی پسلی کے قریب کہیں پیوست ہونی چاہیے تھی۔ بجھل نے بائیں ٹانگ اِس لیے منتخب کی تھی کہ رامو کا چاقو اُس کے دائیں ہاتھ میں تھا۔

بجھل نے دائرے کا ایک چکر بھی مکمل نہیں کیا اور دھکیل کے رامو کو پرے کر دیا۔ اِس جھٹکے کے بعد رامو کو تخمینہ کر لینا چاہیے تھا۔ وہ سمجھ ہی نہ سکا کہ بجھل نے عمداً اُس کی ٹانگ سے ہاتھ اُٹھایا ہے، ورنہ اُس کی کھال اُدھڑ جاتی، چہرہ بگڑ جاتا، جانے کتنی ہڈیوں کے جوڑ کُھل جاتے۔ کسی نے کہا ہے کہ ہر شخص ایک گھوڑے پر سوار ہے، دماغ کے گھوڑے پر۔ یہ گھوڑا زور کرتا رہتا ہے اور کبھی یہ آدمی پر سوار ہو جاتا ہے۔ سو ہر وقت لگام پر گرفت مضبوط رکھنی چاہیے۔ رامو کے ہاتھ سے لگام چھوٹ گئی تھی۔ وہ دوبارہ اُٹھ کھڑا ہوا، چاقو تان لیا۔ بجھل کی بھی یہی خواہش تھی۔ اِسی لیے اُس نے رامو کو درمیان میں چھوڑ دیا تھا۔ غالباً اِتنے پر اڈّے کے لوگوں کی سیری نہ ہوتی۔ وہ اِسے ایک آزمودہ کار کی شعبدے بازی پر محمول کرتے۔ یہ بازو کا زور، چاقو میں مشاقی کا کرشمہ نہیں تھا، حالاں کہ کسی کڑیل جوان کی ٹانگ ایک ہاتھ سے جکڑے اُسے دائرے کے نصف حصّے میں گھماتے رہنے کی شرط ہی زور تھی۔ ایک لمحے کی تاخیر میں رامو بجھل کے سر پر پہنچ جاتا۔ اُس کے ہاتھ میں کُھلا چاقو تھا اور بجھل خود کو نہایت نازک صورتِ حال سے دوچار کیے ہوئے تھا۔ چاقو اُٹھانے کے لیے اُس کا جسم جھکا ہوا تھا۔ یہ ایک باقاعدہ داؤ تھا اور خود کو تشت میں رکھ کے مقابل کی خدمت میں پیش کرنے کے مرادف، یا آ بیل، مجھے مار کی مثل کے مطابق تھا۔ مکمل یقین کے بغیر کوئی بھی ایسی جرأت نہیں کر سکتا۔

بجھل نے دوسری مرتبہ بھی پہل نہیں کی۔ فرش سے اپنا چاقو اُٹھا کے خاموش کھڑا رہا۔ رامو کے کسی دردمند نے اُسے یہیں تک اکتفا کرنے اور ہزیمت قبول کر لینے کی تلقین کی تھی، لیکن رامو نے شاید سنا نہیں، ایسی حالت میں سنائی دکھائی کہاں دیتا ہے۔ بجھل نے دو ایک قدم آگے بڑھ کے دائرے میں اپنے پیچھے گنجائش بنائی۔ رامو نے اُس کے قریب آ کے پھر چاقو اُس کی طرف جھپٹایا۔ دوسری بار اُس کا یہ اعتماد بلا کی خوش فہمی، یا بلا کی خود دماغی کے باعث ہی ممکن تھا۔ یہ ایک عام، مگر بہت اہم داؤ ہے۔ مقابل آمنے سامنے ایک دوسرے پر چاقو سے وار کرنے کے لیے پر تولیں اور جھکائی دے کے، پینترے بدل کے، کبھی آگے جا کے، کبھی پیچھے ہٹ کے کلائی پر پنجہ ڈالنے کی جُستجو کرتے رہیں۔ اِس دوران مقابل کی توجہ ہٹانے کے لیے پیروں سے پیروں پر اور خالی ہاتھ سے جسم پر ضرب لگانے کے مواقع بھی ضائع نہیں کیے جاتے۔ نفسی دباؤ، کسی کم زوری سے فائدہ اُٹھانے، غصّہ دلانے، نگاہیں گھما کے مقابل کو مختلف تاثر دیتے رہنے کے حربے بھی بہت سُودمند ہوتے ہیں، لیکن اصل بات تو زور ہے اور مہارت ہے اور تجربہ ہے اور ہوش برقرار رکھنا ہے۔

بجھل نے تیزی سے پینترا بدل کے خود کو بچایا، شاید دس بار، گیارہ بار، پھر یہ چشم زدن کی خبر گئی تھی کہ گیارھویں، بارھویں مرتبہ پینترا بدلنے کے بجائے رامو کی کلائی اُس کے پنجے میں تھی۔ آخری بار، کلائی پر پنجہ ڈالنے سے لحظہ بھر پہلے بجھل نے اپنا چاقو گرا دیا تھا۔ رامو کا چونک پڑنا فطری تھا۔ بجھل اِسی منتشر لمحے کی ٹوہ میں تھا۔ کلائی کا ہاتھ میں آنا تھا کہ بجھل نے اُچھل کے دوسرے ہاتھ سے اُس کی پسلی پر ضرب لگائی۔ رامو کی ہول ناک چیخ بلند ہوئی۔ بجھل کے ہاتھ میں کلائی آ جانے پر جوڑ چیخ جانا لازم تھا۔ پسلی پر ضرب مستزاد تھی۔ رامو فرش پر قدم جمائے نہ رکھ سکا اور گر پڑا۔ تکلیف سے وہ دُوہرا ہو گیا اور تڑپنے لگا۔

بجھل نے اپنا چاقو اُٹھا کے دائرے سے باہر آنے کے لیے
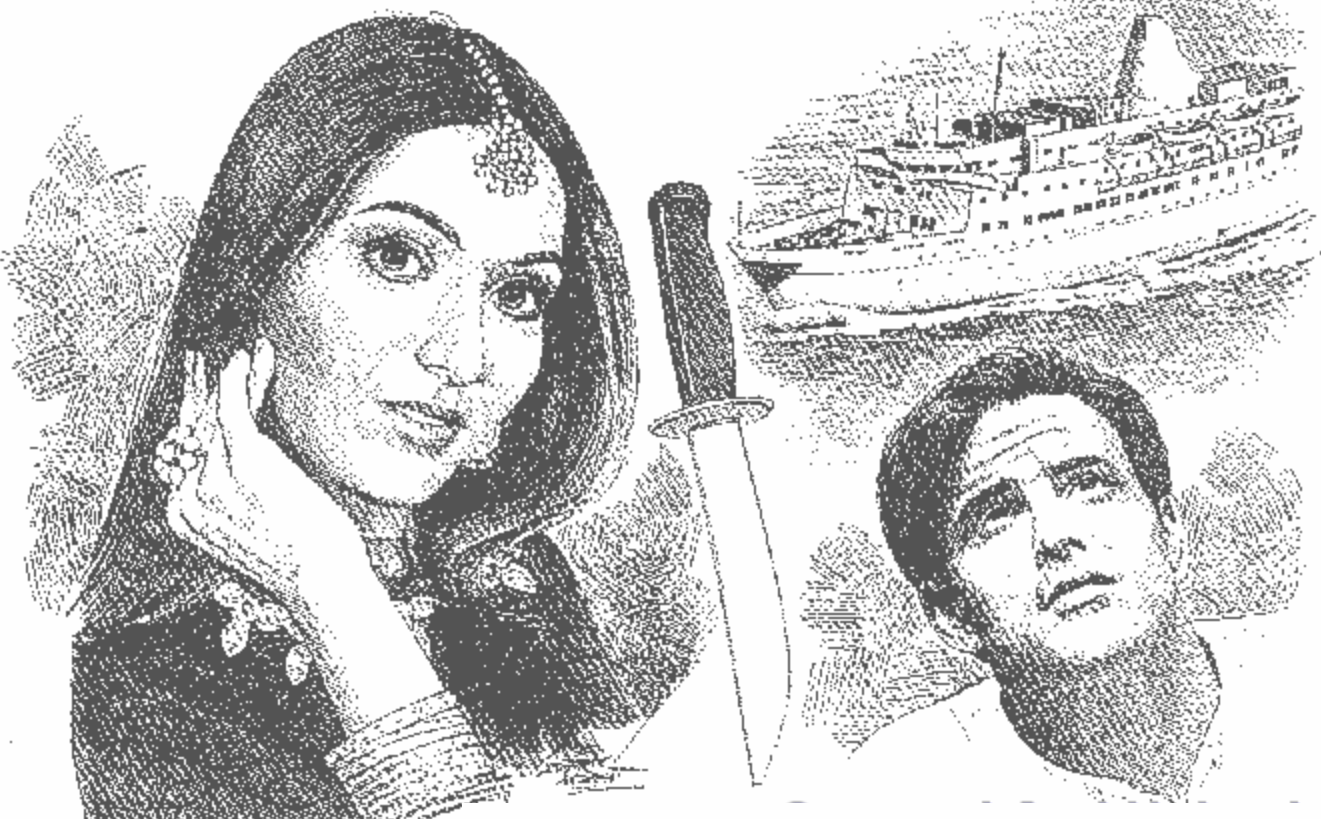
قدم بڑھائے تھے کہ شابے نے اُس کے پانو پکڑ لیے۔ ملہاری بھی تیزی سے اندر آ کے گلے لگ گیا۔ پھر تو ہر طرف سے لوگوں نے بجھل کو گھیر لیا اور نعروں جیسی صدائیں عمارت میں گونجنے لگیں۔

بجھل نے چوکی پر جا کے اُنھیں روکنے کی کوشش کی اور کہا کہ یہ کوئی معرکہ نہیں تھا اور اِس قدر تحسین و آفریں کا کوئی جواز نہیں ہے، لیکن لوگ نہیں مانے۔ پہلی مرتبہ اُنھیں نظر کے فریب کا گمان تھا، دوسری مرتبہ تو اعادۂ فریب ممکن نہ تھا۔ سبھی گواہ تھے کہ بجھل نے راموسے کیا خسروانہ سلوک کیا ہے۔ اُس نے عین وقت پر اپنا چاقو گرا دیا تھا اور راموکے چاقو پر قبضہ کرنے، اُسے کوئی زک پہنچانے، جسم کا کوئی حصہ کھول دینے سے پہلوتہی کی تھی۔ اب اُنھیں یقین آ گیا ہوگا کہ پہلی مرتبہ بھی بجھل نے راموکو اُس کی ناپختہ کاری کی رعایت دی تھی۔ ملہاری اور شابے کی منتوں کی وجہ بھی اب اُن کی سمجھ میں آ جانی چاہیے تھی۔

چند منٹ میں سارا معاملہ نمٹ گیا۔ اِسے فیصلہ نہیں کہنا چاہیے۔ سامنے کوئی مقابل ہوتا تو فیصلے کی بات درست ہوتی۔

شابے کے اشارے پر کھانے کا اہتمام ہونے لگا۔

کھانے کے بعد گزرے ہوئے لمحوں پر چہ میگوئیوں کا سلسلہ ایک حد تک کم ہو گیا تھا۔ پہلے ملہاری کے رخصت ہو جانے کا کوئی غبار اور فشار تھا تو اَب یہ تر مقدا دل مل جانے کی آسودگی اُن کے چہروں سے عیاں تھی۔ سودے میں زیاں کے اندیشے اِتنے نہیں رہے تھے۔ راموکھانے میں شریک نہیں تھا۔ میں نہیں دیکھ سکا، لیکن کسی نے مجھے بتایا تھا کہ لوگ اُسی وقت اُسے اُٹھا کے کسی کمرے میں لے گئے تھے۔ چمپا اور چندا اپنے سازندوں کے ساتھ ابھی تک موجود تھیں۔ کل ساری رات اور آج کے پورے دن اُنھوں نے ایک پل کے لیے آرام نہیں کیا تھا۔ ملہاری بھی اَب بہت پُرسکون نظر آ رہا تھا، یہ خوش دلی، دُھند چھٹ جانے اور کسی نتیجے پر پہنچ جانے کی غماز تھی۔ قہوے کا دَور چلتا رہا اور کسی منتا نے نے صدا لگائی کہ چندا اور چمپا موجود ہیں، کیوں نہ کچھ دیر کے لیے اُن سے گھنگھرو باندھنے کے لیے کہا جائے۔ ملہاری نے سنی اَن سنی کر دی۔ کسی اَور نے بھی تائید نہیں کی۔ اڈّے کا موسم دن میں بار بار بدلتا رہا تھا۔ سبھی تھکے ہوئے تھے اور لگ رہا تھا کہ جلد ہی محفل برخاست ہو جائے گی۔

رات ہو گئی، لوگ وہیں جمے ہوئے تھے۔ بجھل حقہ گُنگ کر رہا تھا۔ آج کی شب کسی اَور مرحلے کی آزمائش شاید کسی کے وہم وخیال میں نہ تھی۔ بجھل نے حقے کی نَے مُنہ سے ہٹائی اور چوکی پر دوبارہ کھڑا ہوا تو سبھی بے چین ہو گئے۔ بجھل نے تنی ہوئی آواز میں اُن سے پوچھا کہ اب اُن کی کیا مرضی ہے؟

سب کے لیے یہ سوال حیران کُن تھا۔ وہ اُس کی شکل دیکھا کیے۔ بجھل نے وضاحت کی کہ فرض کیا جائے، ملہاری کے بعد بجھل بھی اڈّے پر قائم رہنا نہیں چاہتا تو اُن کے پاس اُس کی جگہ کون سا آدمی ہے؟

سب گونگے ہو گئے۔ بجھل نے اُن سے کہا کہ اڈّے پر مستقل قیام سے اُسے کوئی دل چسپی پہلے تھی نہ اَب ہے۔ اُسے تو دُور جانا ہے۔ وہ تو آج ہی چلا جاتا، ملہاری کی حالت دیکھ کے ٹھیر گیا۔ ملہاری خود کو کھو چکا تھا، اُس کی بازیابی، اُسے اپنے آپ سے آگاہ کرانے کے علاوہ بجھل کو احساس ہوا کہ ملہاری کے بعد لوگوں کو چوکی پر کسی نئے نگراں کے تقرر میں دشواری پیش آ سکتی ہے اور بہت افراتفری ہو سکتی ہے۔ اڈّے کے لوگوں نے تیس سال سے کوئی تبدیلی نہیں دیکھی ہے۔ وہ ملہاری کے عادی ہو چکے ہیں، لیکن چوکی پر لوگ آتے جاتے رہتے ہیں۔ یہی کچھ بجھل اُنھیں جتلانا چاہتا تھا اور یہی کچھ سوچ کے اُس نے اڈّے کی کمان سنبھالنے کا اعلان کیا تھا۔ راموتو خواہ مخواہ آڑے آ گیا اور اُس نے ایک طرح بجھل کا کام آسان کر دیا۔ رامونے خود کو ضرر پہنچا کے کچھ حاصل ہی کیا اور بالواسطہ لوگوں کو بھولا ہوا سبق یاد دلایا ہے۔ ملہاری کا ارادہ برقرار ہے، وہ جا رہا ہے۔ بجھل کا قیام بھی ملہاری کے رخصت ہونے تک ہے۔ اِس وقت اڈّے سے وابستہ تقریباً سبھی لوگ حاضر ہیں۔ ہو سکے تو راموکو بھی بلا لیا جائے تاکہ چوکی کے نئے مختار کے مشورے میں وہ بھی شامل رہے۔ جیسا کہ پہلے اُنھیں صلاح دی گئی تھی، اچھا ہوگا، ملہاری کی موجودی میں کوئی فیصلہ کر لیا جائے، ورنہ ملہاری اور بجھل کو تو ایک دو دن میں یہاں سے چلے جانا ہے۔

بجھل اپنی جگہ بیٹھ کے حقہ گڑگڑانے لگا۔ اِتنی دیر میں شابے اندر سے راموکو بلا لایا۔ اُس کی حالت نہایت خستہ تھی۔

ٹھیک سے زمین پر قدم بھی نہیں رکھے جا رہے تھے۔ شابے اُسے چوکی پر لے آیا۔ رامونے چوکی پر آتے ہی بجھل کے پیروں پہ سر رکھ دیا۔ بجھل نے اُس کی کمر پر تھپکی دی، پیروں سے اُس کا سر اُٹھایا اور بازو سے دبوچ لیا۔ ”اڈّے پر رہنا ہے تو برف چبانے کی عادت ڈال۔“ اُس نے نرم لہجے میں راموسے کہا اور اُسے پاس ہی بٹھائے رکھا اور چپکے چپکے جانے کیا رموز منکشف کرتا رہا۔

ملہاری کے بازو میں بیٹھے ایک معمر شخص کے اچانک اُٹھ کھڑے ہونے پر سب اُس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ”میں نے ملہاری اُستاد سے بات کی ہے۔“ اُس کی آواز پر عمر غالب نہیں آئی تھی۔ کہنے لگا کہ اڈّے کے لوگوں کو اختیار ہے کہ وہ کل پر چوکی کے نئے مالک کا فیصلہ کر لیں، یا کسی ایک کو متفقہ طور پر منتخب کر لیں۔ واضح رہے کہ اب اُستاد اور اُس کا ساتھی یار، دونوں میں سے کوئی بھی چاقو کھول کے سامنے نہیں آئے گا۔ اڈّے کے پُرانے لوگوں ہی کے درمیان زور ہوگا۔ اِس یقین دہانی کے بعد بھی کوئی زور کے لیے آمادہ نہیں ہے تو ملہاری کی تائید سے شابے کا نام تجویز کیا جاتا ہے۔ اڈّے کے لوگوں کی نظر میں شابے سے معتبر کوئی اَور شخص ہے تو، بوڑھے آدمی نے کہا کہ وہ اور ملہاری اُستاد شابے کی نام زدگی پر اصرار نہیں کریں گے۔

سب کسی اشارے کے منتظر تھے۔ سبھوں کو جیسے زبان مل گئی تھی۔ لمحوں سکوت رہا، پھر اُنھوں نے بے طرح شابے کے حق میں نعرے لگانے شروع کر دیے۔ راموکی آواز نہیں نکل رہی تھی، لیکن ہاتھ اُٹھا اُٹھا کے اُس نے پورے جوش و خروش کا اظہار کیا۔

چمپا اور چندا کو بجھل نے اُسی رات واپس کر دیا تھا کہ بالاخانے جا کے وہ اپنا بکھرا ہوا ساز و سامان سمیٹیں۔ پرسوں ملہاری اُن کے حوالے کر دیا جائے گا، یا وہ ملہاری کے سپرد کر دی جائیں گی۔ یہ سن کے اُن پر شادی مرگ کی کیفیت طاری ہوئی، دونوں کے آنسو نکل آئے۔

دوسرے دن اڈّے پر بہت چہل پہل رہی۔ سارے دن بجھل لوگوں کے درمیان گھرا رہا۔ ہر شخص اُس کی قربت کا خواہش مند تھا، اور معلوم ہوتا تھا کہ بجھل عرصے سے اڈّے کی مسند پر فروکش ہے، میرے وہاں رہنے نہ رہنے سے کوئی اثر نہیں پڑتا تھا۔ میری حیثیت تو محض ایک تماشائی کی تھی، سو دوپہر کے کھانے کے بعد اڈّے کے ایک آدمی کے ساتھ میں تو باہر نکل گیا۔ سنّو مجھے مختلف جگہوں پر گھماتا رہا۔ مولوی بازار، امام گنج، چوک بازار اور نوابوں کے علاقے اسلام پور، چپیت تلی، قلعۂ لال باغ ہوتے ہوئے وہ مجھے صدر گھاٹ کے علاقے میں لے آیا۔ بابو بازار سے کشتی میں بیٹھ کے ہم بوڑھی گنگا کے اُس پار زنجیرا کے علاقے میں آ گئے۔ زنجیرا اور پوری شور، کچے پکے مکانوں کی یہ بستیاں دیہات کا منظر بھی پیش کرتی ہیں، شہر کا بھی۔ بجھل کے ساتھ بہت سی جگہیں پہلے کی دیکھی ہوئی تھیں۔ چوک بازار کی شاہی مسجد، لال باغ کی مسجد، قلعے والی مسجد بڑے کٹرے اور چھوٹے کٹرے کے مدرسوں میں بجھل اور میں اچھی طرح گھوم بھی چکے تھے۔

سڑکوں کے چکر کاٹتے ہوئے پہلے میری نظریں ہر طرف بھٹکتی رہتی تھیں، کہیں راہ گیروں کے درمیان مولوی صاحب نظر نہ آ جائیں۔ ظاہر ہے، وہ بستیوں ہی میں رہتے ہیں۔ گھر سے کسی وقت تو وہ باہر نکلتے ہوں گے۔ مولوی صاحب سے مشابہ کوئی شخص دکھائی دے جاتا تو دل بری طرح دھڑکنے لگتا۔ ہاتھ پانو اکڑ جاتے۔ اب ایسا کچھ نہیں ہوتا تھا۔ اَب مجھے نہ کسی پر مولوی صاحب کا شائبہ ہوتا تھا، نہ میری نظریں راہ گیروں پر منڈلایا کرتی تھیں۔ کچھ نصیب کی بھی بات ہوتی ہے۔ لوگوں کو بے طلب بھی مل جایا کرتا ہے۔

بہت عرصے بعد اُس روز نرائن گنج کے بازار میں ناگہاں ایک شخص کے سامنے آ جانے پر میرا وہی حال ہوا، آنکھوں میں اندھیرا اُتر آیا، پانو منجمد ہو گئے۔ وہ مولوی صاحب کی مکمل تصویر تھا، مگر اُن مولوی صاحب کی، جن کے نقوش میرے رگ و ریشے میں پیوست تھے۔ اب گیارہ سال سے اُوپر ہو چکے تھے۔ مولوی صاحب میں تو بہت تبدیلیاں ہو چکی ہوں گی۔ میری حیرت پر اُس شخص نے مجھے گھور کے دیکھا۔ میں بھی سٹ پٹایا، وہ بھی گڑبڑا گیا، بل کہ برگشتہ ہوا۔ وہ تو سنّو کے اُدھڑے ہوئے چہرے کی شکنیں دیکھ کے اُس نے آ گے

چلے جانے میں عافیت سمجھی۔ کچھ دیر کے لیے اُس نے میرے حواس گم کر دیے تھے۔ مجھے تو پسینا آ گیا تھا۔ میرا رُواں رُواں جسم میں چبھتا رہا۔ اگر واقعی قسمت کبھی یاوری کرے اور مولوی صاحب اچانک کسی چوراہے، کسی موڑ پر نظر آ جائیں تو جانے میرا کیا عالم ہو، میری تو سانس رُک جائے گی۔ بنجھل بھی اِسی آسرے میں بازاروں اور گنجان آباد علاقوں کا سفر پیدل ہی طے کرنے کو ترجیح دیا کرتا تھا کہ مولوی صاحب یوں بھی تو کہیں مل سکتے ہیں، مگر آدمی کی آنکھیں تو دو ہی ہوتی ہیں، صرف سامنے کا دیکھ سکتی ہیں، اور نظر کی حد بھی کس قدر ہے۔

نرائن گنج میں پرانی چیزوں کی دُکان پر ایک گُل دان کی نفاست اور دل کشی نے مجھے روک لیا۔ عجیب صنّاعی تھی۔ رنگ برنگے پتھروں کے ٹکڑے جوڑ کے اُسے بنایا گیا تھا۔ بہت سجل اور ہلکا پھلکا تھا، شیشے ایسا نازک۔ موم بتی اندر روشن کر دو تو پتھر جگمگانے لگیں۔ پتھر سیپی کی طرح تراشے گئے تھے اور پتر جیسے کر دیے گئے تھے۔ مجھے فوراً رما کا خیال آیا۔ اُسے ایسی چیزوں کا بہت شوق ہے۔ دُکان دار بڑا گھاگ آدمی تھا، قیمت بہت بتائی۔ گُل دان مجھے اچھا لگا تھا، میں نے خرید لیا۔

اڈّے واپسی تک رات ہو گئی تھی۔ وہاں تو کسی تقریب کا سماں تھا۔ روشنیاں، پکوان، لوگوں کا ہجوم، اڈّے پر ملہاری کی یہ آخری رات تھی۔ رات گئے تک کھانے پینے کا شغل رہا۔ گو کسی قسم کی محفل آرائی کا اہتمام نہیں کیا گیا تھا، لیکن تین بجے تک لوگ جمے بیٹھے رہے۔ ملہاری اور بنجھل کے اُٹھ جانے ہی پر سب منتشر ہوئے۔

اگلے روز صبح کوئی دس بجے جامنی رنگ کی ساڑھیوں میں ملبوس چمپا اور چندا اڈّے پر آ گئی تھیں، اِس سادگی میں بڑی آرائش تھی۔ کلائیوں میں موتیا کے گجرے اور کانچ کی چوڑیاں، کانوں میں طلائی بالیاں، گلے میں چمپاکلی، جُوڑے میں بھی پھول گُندھے ہوئے تھے۔ اُن کے ساتھ دو سازندے بھی تھے اور کئی صندوق سامان الگ تھا۔ اُنھوں نے بنجھل سے درخواست کی، اگر ملہاری کو اعتراض نہ ہو تو یہ دونوں سازندے بھی بالا خانے کی زندگی ترک کر کے اُن کے ساتھ جانا چاہتے ہیں۔ دونوں ایک زمانے سے اُن کے ساتھ ہیں، اپنے اپنے فن کے ماہر ہیں۔ ملہاری بھی اُن کا قائل ہے۔ دونوں اپنی خو میں نیاز [مند] وفا پیشہ ہیں۔ نہ اُنھیں معاوضے کی خواہش ہے، نہ اُن [کا] آگے پیچھے کوئی ہے۔ اصل میں بالا خانے ہی پر وہ پلے بڑھے، وہیں اُن کی تربیت ہوئی، اُستادوں سے فن سیکھا اور مہارت حاصل کی ہے۔ اُن کی حیثیت خدمت گاری رہے گی۔ سنگت کے لیے ملہاری کو بھی اُن کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ چمپا اور چندا کا لہجہ التجا آمیز تھا، مگر بنجھل کے پاس جواب دینے کے لیے اِس کے سوا کچھ نہیں تھا کہ وہ ملہاری سے بات کر کے دیکھتا ہے۔

آخر شب چوکی سے اُٹھ کے ہم نے اپنے کمرے کا رُخ کیا تو ملہاری بھی پیچھے چلا آیا۔ وہ بہت گھبرایا گھبرایا سا لگ رہا تھا۔ آنے والا وقت اُس کے لیے جتنا افسانوی تھا، اُتنا ہی بے یقینی کا بھی۔ ملہاری کے دل میں ایک کھٹک تھی۔ ہیجان میں لفظ ٹھیک نہیں بن پڑ رہے ہوں گے کہ اب تک چپ رہا تھا، کہنے لگا کہ چمپا اور چندا دونوں ہی ساتھ کیوں جانا چاہتی ہیں، لازماً کسی ایک کو ایثار کرنا پڑے گا۔ دوسری کی حیثیت پھر کیا ہوگی؟ بنجھل نے اُسے بتایا کہ کل صبح اُس نے تخلیے میں اُن سے بات کی ہے۔ وہ بھی اُن کی یک جائی و یک جانی پر حیران ہوا تھا۔ پھر اُسے تسلّی ہو گئی کہ ہاں، یہ بھی تو ممکن ہے، نام مختلف، چہرے مختلف، لیکن دو مختلف آدمی ایک دوسرے کے جزوِ لازم، لازم و ملزوم بھی تو ہو سکتے ہیں، ایک وجود کے دو حصے، اُن کے کہنے کے مطابق اُنھوں نے خود کو کبھی ایک دوسرے سے جدا نہیں سمجھا ہے اور آئندہ بھی جدائی کا تصور اُن کے لیے محال ہے۔ وہ تو ملہاری کی داسیاں بن کے رہنا چاہتی ہیں۔ دونوں کی طلب ایک، مطلوب ایک ہے۔ اُن کی آرزو ہے کہ ملہاری بھی اُن میں کوئی امتیاز نہ کرے۔ اُن میں کوئی ایک ملہاری کو زیادہ مرغوب ہے تو اطمینان رکھے، دوسری کو کوئی شکایت نہ ہوگی۔ اُن کے بہ قول، دوسری یہی غنیمت جانے گی کہ ملہاری کی چھاؤں میں اُسے امان ملی ہوئی ہے اور اُس کے وجود کا دوسرا حصّہ تو شاد آباد ہے، اور دوسری کے لیے ملہاری اپنے ہنر کی خیرات میں بخیلی تو نہیں کرے گا۔ بنجھل کی زبانی یہ احوال سن کے ملہاری دیر تک تذبذب میں پڑا رہا۔ بنجھل نے اُس کی دل جُوئی کے لیے کہا کہ اُسے یقین ہے، چمپا اور چندا اُس پر کبھی بوجھ نہیں بنیں گی۔

ملہاری تو اُن کی یگانگت کی داد دے۔ یہ تو اُس کے لیے ایک دل چسپ اور دل خوش کُن تجربہ ہو سکتا ہے۔ اور کیا ملہاری کے لیے اُن کا انتخاب آسان ہوگا۔ دونوں ایک دوسرے کا پرتو ہیں۔ کیا کسی مورت کی پوجا کا استحقاق ایک ہی پجاری کو ہے؟ یہ تکون تو بہت جاں فزا ہو سکتی ہے اور باقی کا سارا اختیار تو ملہاری کو ہے۔ اُن کا تو کوئی مطالبہ ہی نہیں ہے۔ پرستش کاروں کو کوئی مطالبہ کہاں زیب دیتا ہے۔

دوپہر کے کھانے پر بہت اہتمام تھا۔ لوگوں کی تعداد بھی بہت زیادہ تھی۔ محلّے والے، تاجر اور دُور دراز سے آئے ہوئے لوگ، اڈوں سے وابستہ لوگ بھی شریک تھے۔ ہر کسی نے اپنی توفیق کے بہ قدر تحائف پیش کیے۔ ملبوسات، شیرینی اور پھولوں کی کثرت تھی۔ اڈّے کے لوگوں نے بتھل کے توسط سے پانچ ہزار روپے کی مشترکہ نذر ملہاری کی جناب میں گزاری تھی۔ علاقے کے تاجروں نے تھیلیوں میں زرِ نقد پیش کیا تھا۔ ملہاری کو پھولوں سے لاد دیا گیا۔ رخصت کے وقت ہر ایک اُس سے گلے مل کے اشک بار ہوا جاتا تھا۔ دُولھا بھی رخصت ہو رہا تھا، دُلہنیں بھی وداع ہو رہی تھیں۔ اِسے ملہاری کی برات ہی کہنا چاہیے۔ تاشے باجے کی کسر رہ گئی تھی، گھوڑا نہیں تھا، اور ڈولی نہیں تھی۔

دیر آید درست آید۔ رات مَیں نے دیکھا تھا، جب ملہاری نے چمپا اور چندا کی یک جہتی پر تجسّس اور تشویش کا اظہار کیا تو اندیشہ و وہم کے باوجود اُس کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔ آنکھیں چھلک چھلک جاتی تھیں اور بات کرتے کرتے وہ کھو جاتا تھا۔

اڈّے کے تقریباً سبھی لوگ اُسے اسٹیشن چھوڑنے گئے۔ تانگوں اور ہاتھ گاڑیوں کا ایک طویل جلوس تھا۔ اُس کے جانے کے بعد اڈّے پر ویسی ویرانی چھا گئی جو لڑکی کی وداعی پر گھر کی دیواروں، دریچوں پر اُمڈ آتی ہے۔ مَیں اور بتھل جلوس کے ساتھ تو نہیں گئے تھے۔ جاتے وقت ملہاری متعدد بار مجھ سے اور بتھل سے گلے ملا تھا۔ ہم نے اُسے گلی کے موڑ پر رخصت کیا اور بتھل نے بند مٹھی سے ایک ہیرا اُس کے حوالے کیا۔ اِن پتھروں کا بھی کیا طلسم ہے۔ حیدرآباد کا واقعہ چشم دید تھا۔ یہ بھی کوئی نادر ہیرا تھا۔ ملہاری کی پلکیں پھڑپھڑانے لگیں۔ تاہم اُس نے ہیرا واپس کرنا چاہا اور کہا کہ بتھل کے احسانات پہلے ہی کیا کم ہیں۔ زیادہ بات کرنے کا وقت نہیں تھا۔ بتھل نے ملہاری کی ہتھیلی سے ہیرا اُٹھا کے اُس کے کُرتے کی بغلی جیب میں ڈال دیا اور جیسے کسی بچّے کو ہدایت کی جاتی ہے، بتھل نے تاکید کی، ”ٹائم پڑنے پہ بھنا لینا، پتھر ہی ہے سُسرا، پر ٹھوک بجا کے، تین چار کو دِکھا کے۔ اور اچھا ہوگا، نان تمہرا تین بانٹ جا، نرت بھاو کے سارے ہتھیار اوزار ایک سے ایک بڑھیا پاس رکھنا۔“ بتھل نے جانے کتنے روپے بھی اُس کی جیب میں ڈالے تھے، معذرت کی کہ وہ سفر کے آخری مرحلے میں ہے۔ نقدی زیادہ بچی نہیں ہے، لیکن ملہاری کو جب بھی اور جتنی بھی ضرورت ہو، کلکتے کے اڈّے پر اُستاد جامو کو خط لکھ دے، منی آرڈر پہنچ جائے گا۔ آخر میں بتھل نے اُس کا کندھا تھپ تھپاتے ہوئے کہا کہ شروع میں ملہاری کو اُلجھنیں پیش آ سکتی ہیں، مالی رُکاوٹوں کا امکان نہیں ہے۔ شروع کے دنوں کے لیے اُس کے پاس معقول پیسے ہیں، بعد کو درخت خود پھل دینے لگے گا۔ بہ صورتِ دیگر، ملہاری کوئی تکلف نہ کرے۔

میرے پاس کرشنا جی کی عطیہ رقم کی چیک بُک سامان میں محفوظ تھی، لیکن مجھے اِس فیاضی کا موقع نہیں ملا۔ گلی میں شور مچا ہوا تھا۔ ملہاری بھیگی آنکھوں سے بہ عجلت تانگے میں بیٹھ گیا۔

”جاؤ مہاراج! مُرلی بجاؤ، ماکھن کھاؤ۔“ بتھل نے بُدبُداتے ہوئے کہا۔ گلی سے پیدل ہجوم اور تمام گاڑیاں گزر گئیں، تب ہم نے بھی اڈّے کا رُخ کیا۔

ملہاری جیسور میں اپنی آبائی بستی کی طرف کوچ کر چکا تھا۔ اُسے پہنچا کے شابے اور اڈّے کے آدمی منہ اندھیرے واپس آئے تو ہم تیار تھے۔ بتھل نے بہت منع کیا، لیکن ایک اژدحام اسٹیمر پر ہمیں رخصت کرنے کے لیے ساتھ آیا۔ بارک پور اور کشتیا میں ٹھیرتے ہوئے، چوتھے روز دن کے گیارہ بجے ہم کلکتے پہنچ گئے۔

اڈّے پر سبھی موجود تھے، اُستاد جامو، بھرو، زورا اور بہت سے نئے پرانے آدمی۔

گزشتہ مرتبہ بہت عرصے بعد ہم ایک دن دو راتوں کے لیے یہاں آئے تھے اور آنا نہ آنا کوئی حیثیت نہیں رکھتا تھا، کو کسی کا

انتظار نہیں تھی اور کوئی ڈھائی بجے کے قریب ہم اڈّے پہنچ پائے تھے۔ صبح ابھی پوری طرح بیدار نہیں ہوئی تھی کہ خبر پھیلتی گئی اور بتھل کو دیکھنے کے لیے اڈّے پر ہجوم اُمڈنے لگا۔ کہرام سا مچ گیا ہو جیسے۔ پٹنے کے اسپتال سے رخصت ہو کے بتھل سیدھا کلکتے آیا تھا۔ ڈاکٹر نے آرام کی کوئی خاص ہدایت نہیں کی تھی، لیکن آرام تو بہ تر ہوتا۔ بتھل سے زیادہ مجھے اُس کی فکر تھی، وہ دن قیامت تھے جب وہ بے خبر اسپتال کے بستر پر پڑا ہوا تھا، اور میں ڈاکٹروں کی منّت کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اپنے عزیز کی دگرگوں حالت سے تیمار دار پر جو گزرتی ہے، وہ مریض، یا کوئی دوسرا کیا جان سکتا ہے۔ بارش کی وجہ سے گاڑی خاصی تاخیر سے کلکتے پہنچی تھی۔ بتھل بھی اڈّے پر ہجوم کی یلغار سے اُکتا گیا تھا کہ اُس نے جلد سے جلد کلکتے سے نکل جانے کا ارادہ کر لیا تھا۔

اب تین مہینے سے اوپر ہو چکے تھے، بل کہ سوا تین، کہ ہم کلکتے واپس آئے تھے۔ شام کے ٹھیک ساڑھے چار بجے گاڑی یہاں پہنچی تھی۔ دن کا اُجالا سونا پڑ رہا تھا۔ اسٹیشن سے اڈّے تک کے راستے میں بہت سے لوگوں کی نظروں میں ہم آ چکے تھے، اور وہی ہوا، جس کا تجربہ ہمیں پچھلی دفعہ تین ماہ پہلے ہو چکا تھا، کچھ دیر بعد اڈّے کی طرف لوگ ٹوٹنے لگے۔ اندھیرا گہرا ہو جانے تک بڑی تعداد میں لوگ اڈّے پر جمع ہو چکے تھے۔ ہمیں ذرا دیر سانس لینے اور کھل کر بیٹھنے کا بھی موقع نہیں ملا۔ تازہ دم ہو کے اور نئے کپڑے پہن کے بتھل چوکی پر آ بیٹھا۔ فرش پر سفید بُراق چاندنیاں بچھا دی گئی تھیں اور بتھل کے لیے حقّہ تیار کر دیا گیا تھا۔ میں نے بھی لباس تبدیل کر لیا تھا۔ اِتنے لوگوں کی والہانہ پذیرائی میں سفر کی تھکن محسوس نہیں ہو رہی تھی اور تھکن یوں بھی کیوں ہوتی۔ سفر تو ہمارا معمول تھا، پیشے کی طرح زندگی کا لازمہ۔

کلکتّہ بھی ہمارا ایک گھر تھا۔ یہاں آ کے گھر لوٹ آنے کی راحت کا احساس ہوتا تھا۔ چوکی پر بیٹھا بتھل ایسا لگ رہا تھا جیسے کبھی کہیں گیا ہی نہ ہو۔ تیجا اُس کے پیر دبا رہا تھا۔ ہر ایک کو نثار ہو جانے، ہم پر فدا ہو جانے کی بے قراری تھی۔ بیش تر وہی لوگ تھے، وہی ایک دوسرے کے مزاج آشنا۔ ہرچرن، پٹن، گوبندا، سورج، کھجرو، ہریالا، جینی اور بدرو مجھے گھیرے ہوئے تھے۔ سارے تو مجھ سے چپک ہی گیا تھا۔ اُن سب کا بس نہیں چلتا تھا کہ مجھے کندھوں پر اُٹھا لیں، یا پلکوں پر بٹھا لیں۔ گزشتہ مرتبہ ہمارا یہاں آنا ہوا تھا تو نصیب میاں اجمیر گئے ہوئے تھے۔ اب میری بلائیں لیتے نہیں تھکتے تھے۔

ریت کے مطابق دیگیں چڑھوا دی گئی تھیں، اور ابھی نو نہیں بجے تھے کہ کھانا تیار ہو چکا تھا۔ اِس دوران زنانوں کی متعدد ٹولیاں آتی، ٹھٹھول کرتی، شور مچاتی رہیں۔ لوگ اُنھیں چھیڑتے، اُن پر سکّے لُٹاتے رہے۔ زنانوں کے لیے الگ ایک گوشے میں کھانے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ اڈّے پر جو موجود تھے، اُن کے علاوہ جو بھی آتا گیا، کھانے میں شریک ہوتا رہا۔ کتنی ہی تعداد میں لوگ آ جائیں۔ شاید کبھی ایسا ہوا ہو کہ کھانا کم پڑ گیا ہو۔ کچھ بچ ہی جاتا تھا، اور لوگ پتیلی، تانبے اور مٹی کے برتنوں میں گھر

لے جاتے تھے۔ مٹھائی کے ٹوکروں اور دونوں کا بھی انبار لگ گیا
تھا۔ پھولوں کی پتّیاں چاندنی پر بکھر جاتی تھیں۔ مخمل کے آس
پاس بیٹھے لوگ اُنھیں چُن چُن کر چاندنی کی روشنی برقرار رکھنے کی
کوشش کرتے رہے، لیکن پتّیوں کا رنگ چھوٹ چھوٹ جاتا
تھا۔ گیارہ بجے تک کھانے کا سلسلہ چلتا رہا اور گھنٹے بھر سے
زیادہ نہیں لگا کہ اڈّے کے اندر اور باہر کی ہر جگہ صاف کر دی
گئی۔ ایسے موقعوں پر کھانے کے بعد عموماً رقص و سرود کی محفل
برپا ہو جاتی تھی؛ کبھی زنانوں کی، کبھی بازار سے کوئی طائفہ
آ کے رنگ جمانے لگتا۔ یقیناً مخمل کی منشا نہیں ہوگی کہ زنانے
لوٹا دیے گئے، اور بازار سے بھی کسی کو طلب نہیں کیا گیا۔

رفتہ رفتہ بھیڑ کم ہوتی گئی اور اڈّے کا سکون واپس آتا گیا۔
جامو، جمرو، زورا اور اڈّے کے تقریباً سبھی لوگ آنے
والوں سے سلام دُعا کرتے، اُنھیں منتظم رکھتے، اُن کے لیے
کھانے پینے کے انتظام میں ایسے مصروف رہے تھے کہ ڈھنگ
سے بات کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ مجھے سیورین
کے بارے میں معلوم کرنے کی بے چینی تھی۔ امکان یہی تھا
کہ سیورین ضد پر اَڑی رہی ہوگی۔ نرمی و نازکی اور بات ہے،
عزم کی پختگی اور۔ سفر کے دوران مخمل کے ٹوکنے پر میں نے کئی خط
فیض آباد لکھے تھے۔ ہمارا کوئی مستقل پتا تو ہوتا نہیں تھا، آج یہاں،
کل وہاں، اِس لیے کسی جواب کی توقع بھی نہیں کی جاتی تھی۔
شروع کے خط میں، میں نے مخمل کی جانب سے زرّیں کو
سیورین کا خیال رکھنے کی سفارش کی تھی، حالاں کہ اِس کی کوئی
ضرورت نہیں تھی۔ جامو اور زورا کے ساتھ سیورین کا وہاں
پہنچ جانا ہی کافی تھا۔ پھر بھی ایک سینہ کلی سی تھی۔ سیورین کو
حویلی جا کے کوئی پچھتاوا تو نہیں ہوا۔ وہاں زیادہ تر عورتیں ہیں۔
مردوں کے بیچ میں کام کرنے والی عورتوں کا تیور کچھ جدا ہو جاتا
ہے۔ ہو سکتا ہے، سیورین کو حویلی کا روایتی قسم کا ماحول موافق نہ
آیا ہو۔ میں نے تو بہت منع کیا تھا؛ اُس نے دلیلیں دے کر مجھے
خاموش کر دیا۔ ماں، باپ کے ختم ہو جانے کے بعد وہ اکیلی بھی
بہت رہ گئی تھی، اور وہ کتنا ہی مردوں کے درمیان کام کرتی رہی ہو،
بہ ہر حال، وہ ایک لڑکی ہے۔ اُس میں ایثار، تحمل، معاملہ فہمی اور
خوش اطواری کی بہت سی خوبیاں حویلی کے مکینوں جیسی ہیں۔ وہ

ایک تعلیم یافتہ، سلیقہ شعار اور دوسروں کو اپنی جانب کھینچنے والی
لڑکی ہے۔ ممکن ہے، پٹنے سے ہمارے چلے جانے کے بعد اُس نے
اپنے ارادے پر نظرِ ثانی کی ہو۔ مجھے حیرت تھی کہ مختصر مدت،
محض چند دنوں کے ساتھ میں اُس نے خود کو ہم دو را فتادہ اجنبیوں
کے سپرد کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ لگتا تھا، جیسے وہ ہمارا انتظار
کر رہی تھی۔ ظاہر ہے، میں کیا، اُس کے سامنے مخمل ہی ہوگا
جو کسی سائبان، کسی ستون کے مانند ہے۔ اُس کے پاس
جتنا سایہ اور گداز ہے، مجھ میں تو اُس کا عشرِ عشیر بھی نہیں۔ میں تو
سیورین سے اُلجھتا ہی رہا تھا۔

بارہ بجے تک ہجوم اڈّے کے آدمیوں تک رہ گیا تھا۔ زورا
میرے ہاتھ لگ گیا۔ میں نے سیورین کا ذکر چھیڑا تو وہ اُچھل پڑا۔
"قسم سے راجا بھائی! ابھی کیا بولے، کیسا پاگل چھوکری ہے۔
ابھی اکھتا پندرہ دن نہیں ہوا کہ اُس کا تار آ پڑا، لکھتا تھا، ٹھیک
پانچ دن بعد سوموار کو اُدھری پٹنا اسٹیشن پے وہ اپنے کو تیار رہے گا۔"
زورا نے بتایا کہ احتیاطاً جامو نے جوابی تار سے سیورین کو
مطلع کر دیا کہ اُسے تار مل گیا ہے۔ پنجاب میل سے دونوں
مقررہ دن روانہ ہو گئے۔ پٹنا اسٹیشن پر ڈبے سے اُتر کے
اُنھوں نے سیدھے اوّل درجے کی انتظار گاہ کا رُخ کیا۔
اُنھیں اندر جانا نہیں پڑا۔ سیورین انتظار گاہ کے دروازے پر
کھڑی اُن کی منتظر تھی۔ وہ بہت گھبرائی ہوئی تھی۔ اُنھیں دیکھ کے
اُس کا عجب حال ہوا، مضطربانہ جامو اور زورا سے چمٹ گئی۔
اُس کی بوڑھی آنٹی بھی اُسے وداع کرنے آئی تھی۔ جامو نے
سیورین کے لیے اوّل درجے کا ٹکٹ کلکتے ہی سے خرید لیا تھا
کہ پٹنا اسٹیشن پر کوئی پریشانی نہ ہو، اور سیورین کو اُن سے الگ
زنانہ ڈبے میں سفر نہ کرنا پڑے۔ بوڑھی آنٹی سیورین کو
رخصت کرتے وقت بلکنے لگی اور اُس کی سلامتی کے لیے دُعا کیا
کرتی رہی، جیسے کوئی بیٹی کو گھر سے وداع کرتا ہے۔ آنٹی نے
جامو اور زورا سے فریاد کی کہ وہ اپنی عزیز ترین بچی اُن کے
حوالے کر رہی ہے۔ سیورین بہت نازک، دل کی بڑی اُجلی ہے۔
پٹنا اسٹیشن پر گاڑی زیادہ دیر نہیں ٹھیری۔ سیورین اپنے ساتھ
بھرا ہوا ٹفن لائی تھی۔ راستے بھر اُس کی آنکھیں دمکتی رہیں، اور
فیض آباد اسٹیشن پر آ کے جامو نے اُسے زورا کے ساتھ الگ

...ے میں بٹھا دیا۔ جامو فیض آباد کے اڈّے کا استاد تھا
...کا بچہ بچہ اُس سے واقف تھا۔ ساری میں ملبوس سیورین نے
...پیٹ لی تھی، لیکن ایک عورت کے ساتھ حویلی کی طرف جانے
...کہانیاں تراش لی جاتیں۔ زورا بھی دو ایک بار فیض آباد آ چکا تھا
اور کئی دن قیام کر چکا تھا، مگر اڈّے کے آدمیوں کے سوا اُسے کتنے
...یاد رکھ پائے ہوں گے۔ زورا پہلے حویلی میں داخل ہوا۔ کچھ
...بعد اپنے اڈّے کا ایک چکر لگا کے جامو بھی حویلی چلا آیا۔
زورا کو زبان کھولنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ زرّیں
کے دل میں تو ایک دریا رواں رہتا ہے۔ زورا کہہ رہا تھا کہ
زرّیں نے بڑھ کر سیورین کو اپنے بازوؤں کی پناہ میں لے لیا۔
زہرہ، چھوٹی اور بڑی سلمیٰ، غیساں، خانم، فروزاں، یاسمن،
ہر ایک نے سیورین کو کسی اجنبی جگہ کا احساس ہونے نہیں دیا۔
انھوں نے اُس سے وہی سلوک کیا جو اُن کا خاصہ تھا، اور جو وہ
ایک دوسرے سے روا رکھتی تھیں۔ سیورین، سامان میں اپنے
...زیورات کا بکسا بھی ساتھ لائی تھی۔ اُس کے پاس کچھ
...تھی۔ وہ سب کچھ اُس نے زرّیں کی تحویل میں دے دیا۔
جامو اور زورا ہفتے بھر فیض آباد میں ٹھیرے رہے۔ یہ
اطمینان کر کے کہ سیورین کو کوئی اُلجھن پیش نہیں آ رہی ہے،
انھوں نے کلکتے واپسی کا قصد کیا، لیکن جامو پھر بھی متردد تھا۔
...بھر گزرا ہوگا کہ اُس نے زورا اور جمرو کو فیض آباد روانہ
کر دیا، اور دونوں نے تین چار دن ہی وہاں قیام کیا۔ سیورین
اس دوران حویلی کا حصہ بن چکی تھی۔ اُنھیں اُس کے چہرے پر
...یا تکدر کی ذرا سی رمق نظر آتی تو جامو کی ہدایت تھی، اُسے فوراً
واپس لے جائیں۔ سیورین نے ڈاکٹر رائے کے مشورے پر
اسپتال کی ملازمت ترک کرنے کے بجائے طویل رخصت کی
اجازت لی تھی۔ درخواست میں اُس نے کلکتے میں اپنے کسی
...رشتے دار کے ہاں جانے اور مزید تعلیم حاصل کرنے کا
...لکھا تھا۔ زورا بتا رہا تھا کہ زرّیں، خانم اور فروزاں کی ہمشیری پر
...سیورین کو ڈاکٹری کی تعلیم کا شوق ہوا ہے۔ اپنی اسناد، اسپتال کے
...کے تصدیق نامے اُس کے پاس موجود ہیں۔ اِس سلسلے میں
لکھنؤ، یا شاید دلّی جانا پڑے۔ منیر علی کے بیٹے اور بھتیجے نے
...کالج میں داخلے اور دیگر معاملات سے نمٹنے کے لیے اُسے
ہر طرح کی اعانت کا یقین دلایا ہے۔

فیض آباد میں جمرو اور زورا دن بھر بیشتر حویلی میں رہتے،
رات کو اڈّے واپس آ جاتے تھے۔ وہ تین دن اُنھوں نے
شہزادوں کی طرح حویلی میں بسر کیے۔ ہر کوئی اُن کی خاطر تواضع کی
جستجو میں رہتا تھا۔ زرّیں نے وہاں کچھ ایسا ماحول بنایا ہے کہ
ہر کوئی وہاں سرگرم اور مصروف نظر آتا ہے۔ پچھواڑے کے باغ
میں وہ شام کو بیڈمنٹن کھیلتی ہیں، دن بھر دوسرے کھیل، مطالعہ:
رسالے، کتابیں، اخبار، کھانوں کے تجربے اور مقابلے، موسیقی
پکوان، زورا اور جمرو کا وہاں سے آنے کو دل ہی نہیں چاہتا تھا۔
زورا پھر میرے ساتھ ہی رہا اور دیر رات تک حسرت و اشتیاق
سے حویلی کے قصے، کہانیاں سناتا رہا۔ یہ سارا احوال سن کے میرے
سینے پر چھائی دھند چھٹ سی گئی تھی۔ اس سے مراد تھی کہ سیورین کو

واقعی کسی پناہ کی ضرورت تھی۔ وہ محرومی کے کسی شدید احساس میں جکڑی ہوئی تھی۔ چہرے آدمی کے درونِ خانہ تلاطم کی عکاسی کسی قدر کر پاتے ہیں۔ کچھ اندازہ نہیں ہو پاتا کہ سامنے نظر آنے والا آدمی کیسے فشار، کتنی آندھیوں سے دوچار ہے۔ حویلی میں سیدورین کا ماجرا سن کر میرا جی بھی اُمڈتا تھا کہ دو ایک روز کے لیے فیض آباد جا کے اپنی آنکھوں سے اُس کی طمانیت اور شادابی دیکھوں۔ فیض آباد اِتنا دور بھی نہیں تھا، میں جا کے ہفتے عشرے میں واپس بھی آ سکتا تھا۔

صبح نو بجے آنکھ کھل پائی، وہ بھی سارنے کے جگانے پر۔ دس بجے تک باہر نکلنا ہوسکا۔ جھل چوکی پر موجود تھا اور ناشتے پر میرا انتظار ہو رہا تھا۔ لوگوں کی تعداد بہت کم تھی، لیکن جیسے جیسے دھوپ چڑھتی اور اُترتی گئی، لوگ بڑھتے رہے۔ رات کو تو پھر گزشتہ کل جیسا اِزدحام ہوگیا۔

کسی لمحے نصیب میاں سے میں نے یوں ہی ازراہِ لطف اُن کے خاص پانوں کا ذکر کیا تھا۔ وہ تو بگل ہوگئے۔ رات کو ہجوم کے درمیان سے ہم تین چار کا ایک ساتھ اُٹھنا سب کی نظروں میں آ جاتا۔ نصیب میاں نے موقع دیکھ کر مجھے اشارہ کیا، میں نے پاس بیٹھے جمرو اور زورا کو۔ ایک ایک کر کے ہم چاروں باہر نکل آئے۔ گلی میں موجود سارنے بھی ہمارے ساتھ ہوگیا۔ نصیب میاں ہمیں سوناگاچھی کے علاقے میں لے آئے۔ وہاں شب بیداری کا وہی عالم تھا، سارا شہر جیسے بازار میں سمٹ آیا ہو، دن پھر طلوع ہوگیا ہو، ہنڈول، رنگ، روشنی اور ساز۔ نصیب میاں بازار کے نشیب و فراز کے پارکھ تھے۔ کون سا نیا طائفہ آیا ہوا ہے اور کس بالاخانے کا سکہ رائج الوقت ہے، کس کے گلے میں نرس وتی بیٹھی اور کس کے بدن میں پارا آمیخت ہے، رنگ روپ میں کون شہاب، کون گلاب، کون سرتاپا شباب ہے، کس کے سُرمگیں چہرے میں کیسی قیامت ہے، کس کی ادائیں ترازو ہو جاتی ہیں، اور کس کے شیدائیوں کا شمار نہیں۔ ایک تو نصیب میاں کی شیریں سخنی پہلے ہی کیا کم تھی، اب ترنگ کچھ اور فزوں ہوگئی تھی۔

رات کی ایک خوبی یہ ضرور ہے کہ بے شمار عیب چھپا لیتی ہے۔ عمارتوں، چیزوں اور چہروں کے عیب۔ ہم کسی کوٹھے پر نہیں گئے۔ چھنّن صاحب کی پان کی دُکان ہماری منزل تھی، مگر اب وہ پہلی والی دُکان نہیں تھی۔ اُس سے کوئی فرلانگ بھر کی دُوری پر چھنّن صاحب نے ایک کشادہ دُکان لے لی تھی۔ سجاوٹ میں بڑی نفاست تھی۔ خود چھنّن صاحب کا تکلف بھی کچھ فزوں لگتا تھا۔ اُجلا لباس، ہاتھوں پر دستانے، کتھے چُونے کا ایک داغ بھی لباس پر نہیں تھا۔ کتھے چُونے والے پان کے برتن چمک رہے تھے۔ پان لگانے والی ڈنڈیاں کٹیا میں کتھے چُونے کی مقدار کے بہ قدر ہی بنی ہوئی تھیں۔ چھنّن صاحب پان پر کتھا لگا کر ہر بار ڈنڈی قریب رکھے پانی سے بھرے گلاس میں ڈال دیتے تھے۔ چناں چہ ڈنڈی پر کتھے کے پرت جم پاتے تھے، نہ چُونے کی آمیزش ہو پاتی تھی۔ نصیب میاں اور چھنّن صاحب کی چونچیں دیکھنے سے تعلق ہوتی تھیں۔ دونوں کا سامنا ہو جائے تو کتابوں کے کردار زندہ ہو جائیں۔ پان کا تو ایک بہانہ تھا۔ میں تو یہی کچھ دیکھنے آیا تھا۔ دونوں میں مرصع فقروں کا مچیٹا ہوتا رہا اور ایک سے ایک فقرے چست کیے جاتے رہے۔ چھنّن صاحب نے کم سن بنگالی خدمت گار کو جانے کس لمحے اشارہ کیا تھا کہ وہ جھٹ سے قریب کی کسی دُکان سے تازہ رس گُلّے لے آیا۔ نصیب میاں پلکیں پٹ پٹا کے پوچھا، "ہائیں! یہ کیا تکلف ہے بندہ نواز؟"

"تکلف کیسا۔" چھنّن صاحب نے کھنکتی آواز میں کہا۔

"دیکھ نہیں رہے جناب! اتنے عرصے بعد اپنے چھوٹے صاحب نیازمند کے خارزار پہ قدم رنجہ ہوئے ہیں۔ آنکھیں ترستی تھیں، ماشاء اللہ وہی بانک پن، وہی چھب ڈھب، اِس بازار میں شہزادے کو زیادہ دیر نہ گھمایئے گا نصیب میاں۔"

"کیوں! کیا تیر چل جائیں گے؟" نصیب میاں چہک کے بولے۔

"گرہ لگانا تو کوئی آپ سے سیکھے۔" چھنّن صاحب نے بل کھا کے کہا، "ارے صاحب! ابھی ایک گھڑی تو بازار کے شباب کی ہوتی ہے۔ صاحبِ عالم دو چار گلیوں سے گزر گئے تو ذرا سوچیے، کوئی اِن کا نظارہ کرے کہ اُن...."

"بس بس چھنّن صاحب..." میں نے اُن کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔

چھنّن صاحب نے تشتری اُٹھا کے میرے سامنے کر دی۔

"لیجیے، شیرینی تو نوش فرمایئے۔"

نصیب میاں پہلے سے تاک لگائے ہوئے تھے۔ مجھ سے پہلے اُنھوں نے تشتری سے مٹھائی کا دانہ اُچک لیا اور اُنگلیوں میں گھماتے ہوئے شوخی سے بولے، "میٹھے بھی ہیں؟"

چھنّن صاحب نے نظر بھر کے اُن کی طرف دیکھا اور ایک ثانیے کے تأمل کے بعد بولے، "آپ سے زیادہ نہیں میاں؟"

جمرو تو مچل مچل گیا۔ زورا کے پلّے کچھ نہیں پڑ رہا تھا، لیکن وہ بھی دیدے پھاڑے چھنّن صاحب اور نصیب میاں کے تُرشے ہوئے لفظ سُنتا رہا۔ میرے خیریت پوچھنے پر چھنّن صاحب کے چہرے پر دُھواں سا چھا گیا، سینے پر ہاتھ رکھ کے سرد آہ بھری اور کہنے لگے، "کیا پوچھتے ہو بھیا، نہ ہاتھ باگ پر ہے، نہ پا ہے رکاب میں۔"

"آپ پر یہ بیزاری اچھی نہیں لگتی۔" میں نے اُنھیں اُکسانے کے لیے کہا، "آپ کی زندہ دلی اور بذلہ سنجی کے واقعات تو دُور دُور مشہور ہیں۔"

"فسانے کہو میاں۔"

"طبیعت تو ٹھیک ہے، کاروبار کیسا چل رہا ہے؟"

"بس کاروبار ہی کاروبار ہے۔"

"کیوں، ایسی کیا بات ہے؟" میں نے بے چینی ظاہر کی۔

وہ ٹھنک کے بولے، "نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری! راہ لگ اپنی۔" مجھے دوسرا مصرع یاد تھا۔ میں نے کہا، "یہی تو پوچھتے ہیں، بیزاری کا کوئی سبب تو ہوگا۔"

"اے میاں!" چھنّن صاحب کی آواز پر یاسیت غالب آ گئی، "کیا عرض کریں، کس کس چیز کا ماتم کریں۔ یہ نامرادِ شکم ساتھ نہ جُڑا ہوتا تو کب کے اپنے ویرانے میں جا لوٹے ہوتے۔ یہاں تو بس اسی نابکار کی سیری ہوتی ہے۔ یہ چشم و گوش، یہ سینہ و دل کہاں لے جائیں بھیا! یہاں تو سبھی کچھ بدلا جا رہا ہے۔ پہناوے، ذائقے، گفتار، رفتار، اور رفتار ہی رفتار ہے، جسے دیکھو، سرپٹ بھاگا چلا جا رہا ہے۔ یہ تو کوئی اور جگہ ہے۔ ہم یہاں تو نہیں آئے تھے۔ اپنی زبان ہی اب یہاں کوئی نہیں سمجھتا۔ اب تو ہم پان فروش، محض 'پنواڑی' ہیں۔ پان بیچتے ہیں، پہلے دل والے آتے تھے، دل بیچتے تھے۔ اب تو پان بیچتے ہیں۔ نصیب میاں ایسے تین چار طرح داروں سے کچھ آس بندھی رہتی ہے، اور خاکم بہ دہن..." چھنّن صاحب کی طبعی شگفتگی لوٹ آئی، کہنے لگے، "... یہ بھی بھلا کتنے دن کے ہیں۔"
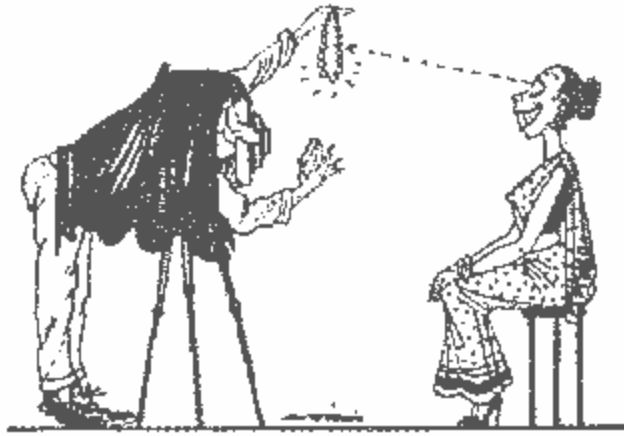
"ارے واہ۔" نصیب میاں نے تیورا کے کہا، "دن گن رہے ہیں ہمارے پیارے صاحب۔"

"سچ بولتے ہیں۔" چھنّن صاحب چہک کے بولے، "یوں اپنی بھی آپ کو لگ جائے۔ ہزار برس سلامت رہو، اور وہ جو مرزا نوشہ نے کہا ہے..."

"اب باتوں میں اُڑاتے ہو۔" نصیب میاں نے مصنوعی ناگواری سے کہا، "ارے یہ تین چار بھی نہ رہے تو کندھا بھی کیا غیروں سے دلواؤ گے۔ ہمیں تو کچھ ایسا نظر آتا ہے کہ دُکان کی لوٹ پلٹ کی ترکیب بھی اکارت گئی۔ نوبہار گُل بہاری بی نے پھر کسی آزمائش میں ڈالا ہے جو بے سر و پائی ہانکتے ہو۔"

"ہَے ہَے، ذری کچھ تو لحاظ مروّت کرو نصیب میاں!" چھنّن صاحب نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کے لجاجت سے کہا، "سب کے سامنے رُسوا کرتے ہو۔ تم پر بھی یاں کے پانی نے اثر کر دکھایا۔"

چھنّن صاحب نے حسبِ روایت عطر کی پھریری پیش کی۔ سب کے گلوں میں ہار ڈالے۔ بخّھل کو یاد کرتے رہے، ''ہائے، سنا ہے اپنے اُستاد بادشاہ بھی آ گئے ہیں۔ جب سے سنا ہے، باریابی کے لیے رسّیاں تڑا رہا ہوں۔ کہنا، صبح سلامی کے لیے نیاز مند حاضری دے گا۔'' انھوں نے بخّھل کے لیے گلوریوں کا ایک پُڑا ہمارے ساتھ کر دیا۔

چھنّن صاحب سے رُخصت لے کے ہم آگے چلے آئے۔ اُن کے بارے میں تھوڑا بہت مجھے معلوم تھا لیکن اِتنی جزئیات سے نہیں، جتنا نصیب میاں نے اُس وقت بتایا اور سب کو حیران کیا۔ نصیب میاں کے کہنے کے مطابق چھنّن صاحب کا تعلق بدایوں کے ایک چھوٹے موٹے زمیں دار خاندان سے تھا۔ شروع ہی سے مزاج میں ایک سرمستی تھی۔ لکھنؤ آنا جانا کثرت سے رہتا تھا۔ وہاں کسی طوائف زادی سے آشنائی ہوگئی۔ نام تو اُس کا کچھ اور تھا، شرفن کی عرفیت سے مشہور تھی، چھنّن صاحب اُس کی چوکھٹ سے ایسے بندھے کہ دنیا و مافیہا کا ہوش نہ رہا۔ پھر اُسی پرانی کہانی کی تکرار، ساری زمینیں لد گئیں۔ کہتے ہیں، شرفن اُن کے ساتھ جانے کے لیے تیار تھی، لیکن اُس کی ماں، یا ماما کہ وعدے سے پھر گئی اور چھنّن صاحب سے پیچھا چُھڑوانے کے لیے راتوں رات لکھنؤ سے غائب ہوگئی۔ چھنّن صاحب جگہ جگہ شرفن کو ڈھونڈتے رہے اور آخر انھوں نے اُسے کلکتے میں جا لیا، مگر اُن کے پاس جانِ ناتواں اور قلبِ سوزاں کے سوا کچھ نہیں بچا تھا۔ بالا خانے کے دروازوں کا قفل سونے چاندی کی کنجیوں سے کُھلتا ہے۔ سنا ہے، شرفن نے کسی ذریعے سے رُپے بھجوا کے درماندہ چھنّن صاحب کی مدد کرنی چاہی اور قاصد سے کہا کہ جا کے اُن سے منّت کرے، اچھا ہے کہ سب کچھ بھول جائیں۔ وہ بس کوئی خواب تھا۔ ہر خواب کی تعبیر نہیں ملتی۔ اِسی میں اُن کی بہتری ہے، شرفن کی بھی، مگر کوئی خواب ہوتا تو بھول جانا بھی آسان تھا۔ بھول جانا آدمی کے بس میں ہوا کرتا تو اِتنی کہانیاں کیسے تخلیق ہوتیں۔ چھنّن صاحب نے رقم واپس کر دی اور یہی بہت جانا کہ اُن کا نقش تو شرفن کے نہاں خانے میں تابندہ ہے۔ جواب میں قاصد سے کہا کہ یہی انجام نوشتہ ہے تو پھر دم بھی تمھارے آستانے پر نکلنا چاہیے۔ کوئی کام ہنر آتا نہیں تھا۔ کسی دُور افتادہ رشتے دار نے سلوک کیا، یا آبا و اجداد کی وراثت میں کچھ باقی رہ گیا تھا کہ شرفن کے بالا خانے کے عین مقابل دُکان لے کے پان فروشی شروع کر دی، اس طرح کم از کم ہر وقت شرفن کے دیدار کا تو اہتمام تھا۔

اب بیس سال سے اُوپر ہو رہے ہیں۔ درمیان میں شرفن کی ماں کا انتقال ہو گیا۔ چھنّن صاحب کا خیال تھا کہ اِس پتّھر کے ہٹ جانے پر اُن کی کشتی بھی کنارے پر لگ جائے گی، لیکن شرفن بالا خانے کے شب و روز سے مانوس ہو چکی تھی، یا یوں کہا جائے کہ اُس کے دل میں بالا خانے سے باہر کی زندگی کا کوئی خوف بیٹھ گیا تھا۔ خود اُس کی عمر بھی ڈھل چکی تھی، وہ اپنی جہاں دیدہ ماں کی پیروی کرنے لگی۔ نئی لڑکیوں کی خریداری، اُنھیں رقص و موسیقی کی تعلیم سے آراستہ کرنے اور بار سنگھار، ناز و ادا کے گُر سکھانے کا کام۔ چھنّن صاحب انتظار کرتے رہے۔ گذشتہ دنوں شرفن، پُرانے بالا خانے کی شکستہ عمارت ترک کر کے نئی کشادہ جگہ منتقل ہوگئی۔ چھنّن صاحب کی صبح تو شرفن کے دیدار سے طلوع ہوتی تھی اور رات کو اُس کا چہرہ دیکھ کے وہ حجرے کا رُخ کرتے تھے۔ شرفن اُن کی دکان پر آتی ہے۔ بس صبح و شام اور دن میں کسی وقت بھی شرفن بالکونی پر نمودار ہوتی ہے، چھنّن صاحب کو تسلیمات کرتی ہے، چھنّن صاحب سینے پر ہاتھ رکھ کے سرِ خم کرتے ہیں۔ روز اُن کی طرف سے ایک گُل دستہ قاصد لے جاتا ہے اور شرفن کے ہاں کوئی بہتر قسم کی چیز پکی ہو تو بالا خانے سے آ جاتی ہے۔ کلکتے آ کے شرفن کی ماں نے اُس کا لقب نوبہار رکھ دیا تھا۔ سوناگاچھی کے مشہور بالا خانوں میں ایک نوبہار کا بالا خانہ بھی تھا۔ بدایوں سے ہجرت کرنے کے بعد چھنّن صاحب کا کبھی اپنے شہر سے کوئی واسطہ نہیں رہا۔ کہیں آتے جاتے نہیں، بس دُکان سے حجرے تک۔ حجرے میں رات کا آخری اور دن کا ابتدائی پہر گزر جاتا ہے۔ باقی پہر تو شرفن اُن کے سامنے رہتی ہے، اُن کے قریب، گلی کے اُس پار شرفن اب ایک مال دار نائکہ ہے۔ معلوم نہیں، شرفن کی آسودگی مال و زر کی ہے، یا واقعی وہ بہت آسودہ ہے، مگر شاید مال و زر سے بڑی کوئی آسودگی اور کوئی طاقت نہیں ہوتی۔

میرا جی چاہا تھا، نصیب میاں سے کہوں کہ وہ کچھ دیر کے لیے شرفن یا نوبہار کے بالا خانے پر لے چلیں، لیکن جانے کیوں میں خاموش رہا، غالباً چھنّن صاحب کی وجہ سے۔ نصیب میاں ہمیں مختلف گلیوں میں گھماتے رہے۔ سوناگاچھی میں کوئی جشن برپا تھا، جیسے آج کی رات، آخری رات ہو۔ ہجوم اور بڑھ گیا تھا۔ گھنگھروؤں، سازوں اور گانوں کی آوازیں ہر سُو گونج رہی تھیں۔

اُس طرف کریمن بیگم کا بالا خانہ بھی تھا۔ نصیب میاں نے بتایا کہ کریمن بیگم ابھی تک کلکتے واپس نہیں آئی ہے۔ وعدے کے مطابق جس رات کانتے شہ پارہ کے سودے کا بیعانہ لے کے بالا خانے پر گیا تھا، کریمن بیگم شہ پارہ کو لے کے فرار ہو چکی تھی۔ دوسرے روز ہم جیت کے سفر پر روانہ ہو گئے اور ہمارے جانے کے تیسرے روز شہ پارہ خود اڈّے پر آ گئی تھی۔ بنارس اسٹیشن پڑتے میں کریمن بیگم کی آنکھ لگی تھی کہ شہ پارہ کو بھاگنے کا موقع مل گیا اور کانتے اُسے بمبئی میں جولین کے پاس چھوڑ آیا۔ کریمن بیگم کی عہد شکنی پر کانتے بہت طیش میں تھا۔ کہتا تھا، ایک بار اُس کا پتا چل جائے، مگر آدمی کو اپنی خبر نہیں ہوتی، خود اُس کے پاس کتنا وقت ہے، کانتے ہی نہیں رہا۔ کلکتا نہیں تو کریمن بیگم نے کسی اور شہر کا رُخ کر لیا ہوگا۔ ایک شہ پارہ کا ہیرا ہی راستے میں کھو گیا تھا، باقی سارا کچھ تو اُس کی تحویل میں تھا۔ کلکتے سے چلتے وقت زیور، نقدی کی ڈھیریاں ہوں گی اُس کے پاس۔ کہیں بھی جا کے اُس نے پھر دکان کھول لی ہوگی۔ اب کوئی اور شہ پارہ ہوگی۔ کسی جگہ نہ سوداگروں کی کمی ہے نہ سودے کی، نہ بازار کی، اور ہنر تو کریمن بیگم کو پہلے ہی خوب آتا تھا۔

چھنّن صاحب کی عطیہ، بارہ مسالوں اور چاندی کے ورق سے مرصّع گلوریوں کا لطف اُٹھاتے گلیوں گلیوں گھومتے ہوئے ہم ایک گلی میں آئے تو چلتے چلتے ایک جگہ نصیب میاں ٹھٹک کے رُک گئے اور مجھے ٹہوکا مارتے ہوئے رازدارانہ لہجے میں بولے، ''وہ سامنے کاشی بائی کے بالا خانے کی دہلیز کے ساتھ جو آدمی بیٹھا ہوا ہے، اُسے دیکھتے ہو میاں؟''

میری نظریں سامنے کی جانب گئیں۔ کچھ فاصلے پر بالا خانے کی فرشی منزل کے پہلو میں بڑے سے چبوترے پر ایک سن رسیدہ، مجہول قسم کا شخص اپنے آپ میں گُم بیٹھا تھا۔

''کون ہے یہ؟'' میں نے چونک کے پوچھا۔

نصیب میاں آنکھیں چڑھا کے اور شانے اُچکا کے بولے، ''خدا ہی بہتر جانتا ہے، کہانیاں بہت مشہور ہیں، ساری کہانیاں...''

تن و توش کا متوازن، نکلتا ہوا قد، چہرے کا بڑا حصہ لمبی کھچڑی داڑھی سے چھپا ہوا، رنگت سانولی، سر کے بال دراز اور بکھرے ہوئے، بازو پوش بنیان اور لنگی میں ملبوس۔ عمر ساٹھ سے کچھ اُوپر ہی ہوگی۔ عمارت کی اُوپری منزل کا چھجا خاصا آگے کو نکلا ہوا تھا اور سائبان کا کام دیتا تھا۔ پرالی بچھے

چبوترے پر ایک جانب دو چار صاف ستھرے برتن رکھے ہوئے تھے، اور کوئی چیز اُس کے پاس نہیں تھی۔

نصیب میاں نے بتایا کہ کسی کو نہیں معلوم، کہاں سے آیا ہے، اور کیوں۔ کوئی تین ماہ سے اس نے یہاں ڈیرا جمایا ہوا ہے۔ صبح مُنہ اندھیرے نکل جاتا ہے اور بنگلی کنارے میلوں پیدل چلتا ہوا واپس آ کے یہاں بیٹھ جاتا ہے۔ صرف کچی سبزیاں کھاتا ہے، اور وہ بھی فقط دوپہر کو۔ رات کو دودھ کا کٹورا پیتا ہے۔ آدھی رات تک بازار جاگتا رہتا ہے۔ ہر طرف سے اُمڈنے والے، گھنگھروؤں، سازوں اور من چلے راہ گیروں کے شور کے باوجود اپنے خاص وقت پر چادر تان کے غافل ہو جاتا ہے۔

کامنی بائی نے ایک صبح بالاخانے کے چبوترے پر اُسے بیٹھا دیکھا تو پہلے تو بڑی کبیدہ ہوئی، پھر شاید وہم و گماں نے آ گھیرا، خاموش رہی اور گھر سے کھانے کا تھال بھیجا۔ تھال واپس کر دیا گیا اور صرف اتنا پیغام قاصد کے ذریعے ملا کہ دودھ اور کچی سبزیاں مرغوب ہیں۔ کامنی بائی نے گاجر مولی، ٹماٹر، کچی کھائی جانے والی طرح طرح کی سبزیاں بھجوائیں۔ اِن میں سے چند دانے روک کے باقی واپس کر دیا گیا۔ ابتدا میں راہ گیروں نے کوئی جنونی، سودائی اور بہروپیا سمجھ کے چھیڑ چھاڑ شروع کی تھی، بعض سرمستوں نے فقروں کی بھی یورش کی اور قریب جا کے حال احوال جاننے کی جستجو بھی، پتھر کنکر بھی اُچھالے۔ یہ شخص بت بنا بیٹھا رہا۔ کسی سے کوئی تعرض نہیں کیا۔ راہ گیر پھر خود ہی باز آ گئے۔ کہتے ہیں، کسی وقت سر اُٹھا کے ناگواری سے دیکھتا تھا کہ لوگ نظروں کی تاب نہ لا سکے۔ اُس کے بعد وہی ہوا، لوگ فریادیں کرنے اور نذریں گزارنے لگے۔ کوئی شہادت نہیں کہ اِس نے کبھی روپیا پیسا قبول کیا ہو۔ یہ اُنھیں پھینک دیتا ہے اور ہاتھ جھٹک کے دھتکار دیتا ہے، جیسے رُپے پیسے نہ ہوں، ٹھیکرے ہوں۔

لوگ دُہائیاں دیتے ہیں تو سر جھکائے سنتا رہتا ہے، کوئی بہت زیادہ تکرار کرتا ہے تو سر اُٹھاتا ہے۔ اِس کی شعلہ بار آنکھیں دیکھ کے فریادی کی زبان ٹھٹھر جاتی ہے۔ کبھی کسی کی منت زاری پر یہ ہاتھ اُٹھا کے اُسے روک دیتا ہے، اور کچھ نہیں بولتا۔ منت گزار اِسے کوئی تائیدی اشارہ سمجھ کے مطمئن ہو جاتا ہے اور خاموشی سے لوٹ جاتا ہے۔

پولیس بھی پہلے پہل کامنی بائی کے چبوترے پر اِس کے مستقل قیام سے مضطرب ہو گئی تھی۔ وہ اِسے وہاں سے ہٹانا اور مزاحمت کی صورت میں ساتھ لے جانا چاہتی تھی، لیکن کامنی بائی آڑے آ گئی۔ کامنی بائی نے نچلی منزل کا ایک کمرا اُس کے لیے مختص کرنے کی پیش کش کی تھی، لیکن یہ آمادہ نہیں ہوا۔ لوگوں کو تعجب ہے کہ اُس نے بازار کی یہ جگہ ہی کیوں منتخب کی۔ بہ ہر حال، لوگ اِسے اب پاگل نہیں سمجھتے۔ قیاس آرائیوں کے زاویے بدل گئے ہیں کہ ضرور یہ کوئی مجرم ہے اور مفرور ہے، پولیس کا مخبر ہے، یا کسی خطرناک ارادے سے یہاں دھرنا دیے ہوئے ہے، اِسے یہاں آنے والے کسی مطلوب کی تلاش ہے، کوئی برگزیدہ بندہ ہے، جانے کیا کیا... پولیس اور چند عیب جُو قسم کے لوگوں نے اِس کا تعاقب کرنے اور اصل حقیقت جاننے کا بہت جتن کیا، کسی کو کوئی سراغ نہ مل پایا۔ بنگلی کنارے دُور تک چہل قدمی، اور واپسی سے قبل ایک خاص مقام پر غسل، اِس کا معمول ہے، اِس کے سوا کچھ نہیں، نہ مندر نہ مسجد، نہ گردوارا، نہ گرجا۔ وہ صرف کامنی کے قاصد سے مختصر کلام کرتا ہے اور ہندوستانی بولتا ہے۔ اِس کا مطلب ہے، بنگالے سے تعلق نہیں۔

مجھے حیرت تھی، نصیب میاں کو اِس شخص کے بارے میں اتنی تفصیل اَزبر تھی۔ مجھے تو یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ اتنا کچھ سن کے اُسے قریب سے دیکھنے کا اشتیاق ہوا۔ چند قدم کا فاصلہ طے کر کے ہم اُس کے پاس پہنچ گئے۔ اُس کا سر جھکا ہوا تھا۔ نصیب میاں نے اپنے مخصوص لپکتے اور لہکتے انداز میں اُسے سلام کیا۔ جواب میں اُس نے سر ہلایا ضرور۔

''اپنے ساتھ ہمارے پیارے، جان سے عزیز میاں ہیں۔ دیواریں ہٹائیے، راستے صاف کرنے کی کوئی تدبیر کرو۔ زمانہ ہو گیا، مراد بر نہیں آئی، آخر کب تک...''

اُس شخص نے جھٹکے سے سر اُٹھایا اور لمحوں تک ہمیں گھورتا رہا۔ یکا یک اُس کے جسم میں ارتعاش سا رُونما ہوا۔ وہ بے قرار نظر آنے لگا، اور چبوترے سے اُٹھ کر ہمارے سامنے آ گیا۔ نصیب میاں کا سراپا بل کھا گیا۔ سارنگے، جمرہ اور زورا کے جسم بھی اکڑ گئے۔ میں بھی خاصا متجسس تھا۔ اُس کا رُخ میری

جانب تھا، مجھ سے ایک قدم کی دُوری پر آ کے وہ ٹھہر گیا۔ میں ساکت و جامد کھڑا رہا۔ واقعی اُس کی آنکھیں بڑی گہری تھیں، چہرے پر وحشت چھائی ہوئی تھی۔ میں نے بھی اپنی آنکھیں اُس پر مرکوز رکھیں۔ نہ اُس نے پلکیں جھپکیں، نہ میں نے۔ وہ مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھتا رہا، حیرت، اضطراب، یاسیت اور حسرت آمیز نظروں سے۔ اُس نے اپنا ہاتھ بڑھایا تو بے اختیار میرے ہاتھ کو بھی جنبش ہوئی۔ جانے اُسے کیا ہوا، میرا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں پہلے دبایا، پھر سینے سے لگا لیا، آنکھوں سے مَس کیا، اور پپڑی جمے خشک ہونٹوں سے بوسہ دیا۔ میں نے اپنا ہاتھ کھینچنا چاہا، مگر اُس کی گرفت مضبوط تھی۔ میں نے بھی مزاحمت نہیں کی۔ نصیب میاں اُس سے کچھ اور کہنا چاہتے تھے مگر اُس کا بلند ہاتھ دیکھ کے خاموش رہے۔ اُنھی کے اشارے پر ہم پھر وہاں نہیں ٹھہرے، لیکن مجھے ایسا لگتا رہا، جیسے اُس کی آنکھیں میرا پیچھا کر رہی ہوں۔ مجھ پر پہلی بار منکشف ہوا، نصیب میاں بھی کچھ کم خوش عقیدہ نہیں ہیں، شاید جاتی عمر میں آدمی کی کچھ ایسی کیفیت ہو جاتی ہے۔ لمحوں تک خاموشی رہی۔ کچھ دُور آ کے نصیب میاں پوچھنے لگے، ''کیوں میاں! آپ نے دیکھا؟''

میں نے سر ہلانے پر اکتفا کی۔

''کچھ جی کو لگی بات؟''

''ہاں۔'' میں نے دبی آواز میں کہا، ''خوب آدمی ہے۔''

''آپ 'خوب' کہہ رہے ہیں۔''

''اور کیا کہوں؟''

''آپ نے غور نہیں کیا۔ وہ صرف آپ کی طرف بڑھا تھا، اور اُس کی کیا حالت ہوئی تھی۔ میں نے نہیں سنا، جب سے وہ یہاں آیا ہے، ایسا کبھی ہوا ہو۔''

''شاید اِس لیے کہ میں ہی کچھ طلب گار... حاجت مند نظر آتا تھا۔''

''گویا اُس نے پہچان لیا میاں... صرف آپ کو... آپ ہی کو کیوں۔ حاجت مند تو ہم سبھی ہیں، ہم میں ہر ایک...''

''آپ کیا باور کرانا چاہتے ہیں نصیب میاں؟'' میں نے پژمردگی سے کہا۔

''میاں! ہم تو، جیسا کہ ہم نے اُس سے التجا کی تھی، ہم تو

''دیکھو! یہ دو پنکھے ایئر کنڈیشنر کے ساتھ مفت ملے ہیں۔''

وہی چاہتے ہیں۔ ایسے لوگ جہاں ملیں، جب بھی ملیں، ہم تو اپنے شہزادے کے لیے دُہائی دیتے رہیں گے۔ کیا معلوم، کس کی سفارش، کس کے کلام میں زور ہو۔ ہم سے آپ کا دُکھ نہیں دیکھا جاتا... قسم اللہ پاک کی۔''

''آپ کی محبت ہے، نصیب میاں!'' میری آواز بکھرنے لگی تھی، ''سفر میں ایسے لوگ ملتے رہتے ہیں، طرح طرح کے روپ میں، مگر بس... اب تک جو ہوتا رہا ہے، وہ تو آپ جانتے ہی ہیں۔ اب تو، سچ پوچھیے تو اعتبار ہی اُٹھ گیا ہے۔''

''نا میاں، نا۔'' نصیب میاں نے مجھے پہلو سے دبوچ لیا۔ ''مایوسی نہیں، بالکل نہیں۔ جی تھوڑا مت کیجیے۔ آپ نے سنا ہوگا، دیر ہے، اندھیر نہیں اُس کے ہاں۔''

''مایوسی نہیں نصیب میاں... ایسا ہوتا تو گھر میں کیوں نہ بیٹھ جاتے۔ میں تو سفر میں جگہ جگہ ملنے والے ایسے لوگوں کے بارے میں کہہ رہا تھا۔''

''جہاں بھی ممکن ہو۔ جس رُخ، جس گلی کوچے میں۔'' نصیب میاں حسرتی آواز میں بولے، ''جتن تو اپنی طرف سے کرنے ہی پڑتے ہیں، اور کرتے رہنا چاہیے۔ مجھے تو اُس شخص میں کچھ عجیب صفات نظر آتی ہیں۔ آپ نے دیکھا! اُس نے ہاتھ اُٹھا کے مجھے روک دیا تھا۔ لوگوں کا کہنا ہے، ایسا کم کم ہوا ہے۔ یہ اچھا شگون ہے۔ بس سمجھو، کچھ بہتر ہونے والا ہے، خدا کرے ایسا ہی ہو۔''

میں نے بھی بارہا اپنی ناکامی کو ستاروں اور سیاروں کی گردش پر محمول کیا ہے، لیکن اصل میں تو یہ محض اتفاقات کی کرشمہ کاری ہے۔ اِن کا بھی ایسا تسلسل ہوتا ہے کہ آدمی دیکھتا

رہ جاتا ہے۔ ہم تو کئی بار اپنی منزل تک پہنچ چکے تھے، جیسلمیر میں، حیدرآباد، مرادآباد اور نگر یا سادات میں... بس چند دن آگے پیچھے... اور اِن اتفاقات کی نوبت ہی کیوں آتی، اگر مولوی صاحب کے ہاں گرہ نہ پڑی ہوتی۔ کوئی شخص چھپے رہنے اور سامنے نہ آنے پر مُصر ہو، کسی کے سائے سے بھاگتا ہو، کسی نے کسی کے بارے میں کوئی رائے قائم کرلی ہو، تو وہ طلب گار، وہ ناہنجار کتنا اور کہاں تک جائے۔ کون سی کھوہ میں، کتنے دریا اور پہاڑ عبور کرے۔ کتنے گلی کوچوں کی خاک چھانے۔ بس یہی ہوگا، ہم تو نصیب میاں کے بہ قول، اپنے جتن کر ہی رہے ہیں۔ کسی دن بھاگتے بھاگتے یا تو مولوی صاحب بس پا ہوجائیں گے، یا جیسا وہ چاہتے ہیں، ہمی سپر ڈال دیں گے۔ یہی مولوی صاحب کی نا نہی ہے۔ وہ نہیں جانتے، یہ کوئی ضد نہیں، یہ تو کسی کی متاعِ جاں کی بات ہے، اُس کی روح کی۔ اُس کی سانس تو کسی آس سے بندھی ہے۔ نصیب میاں کی آزردگی کا خیال تھا۔ میں نے دبے لہجے میں کہا، ''اِس شخص کی ہیئت کذائی ظاہر کررہی تھی کہ وہ خود بڑا حاجت مند ہے۔''

''بے شک، بے شک، مگر سنا ہے میاں! اپنی دُعاؤں میں اتنا نہیں، جتنا دوسروں کی دُعاؤں میں اثر ہوتا ہے، پھر صورت دوسری ہوجاتی ہے۔''

میں خاموش رہا۔

''مجھے تو لگتا ہے بھیّا صاحب، اب منزل سے آپ کی آنکھ مچولی والی بات شاید نہ ہو۔ جانے کیوں، دل کہتا ہے، اِس بار مراد بَر آئے ہی آئے۔''

''ہاں، نصیب میاں!'' میں نے اُن کی دل جوئی کے لیے نرمی سے کہا، ''ہر بار ہم کسی اُمید ہی میں گھر سے باہر قدم نکالتے ہیں... اور جب تک بن پڑا، جہاں تک بس میں ہوا...''

''بس میاں!'' نصیب میاں نے مجھے روک دیا۔ ''حوصلہ بلند رکھیے۔ اب آپ دیکھیے گا۔''

نصیب میاں کی خوش اُمیدی کی زور اور جمرو نے بھی شدت سے تائید کی۔

میں نے اُن سے جرح نہیں کی کہ اِس سے حاصل بھی کیا تھا۔ سبھی دُعا کرتے ہیں، ایک نہیں، بہت سے، بہت معصوم اور پاک باز لوگ۔ قبولیت کی کوئی گھڑی ہوتی ہے تو معلوم نہیں، وہ کیوں نہیں آتی۔''

ہم ایک اور گلی میں مڑ گئے، اور نصیب میاں نے غالباً میرا اور اپنا غبار دُور کرنے کے لیے کچھ فاصلے پر واقع ایک عمارت کی طرف اُنگلی اُٹھائی۔ ''پہلے اِس گلی میں آنا ہوا ہے شہزادے؟'' اُنھوں نے چہچہاتی آواز میں پوچھا۔

''کچھ یاد نہیں، یہاں تو سبھی گلیاں ایک جیسی ہیں۔'' میں نے کہا، ''کیوں، کیا کوئی خاص بات؟''

''ارے میاں، کیا پوچھیے۔ یہاں تو بہار آئی ہوئی ہے۔ اِس گلی کے تو اِن دنوں سارے شہر میں چرچے ہیں۔''

نصیب میاں نے بتایا کہ سامنے والی نسبتاً اُونچی عمارت کا بالاخانہ گلاب بانو کا ہے۔ مجھے یاد آیا، تین مہینے پہلے ہمارے کلکتے آنے پر گلاب بانو کی دعوت آئی تھی کہ ہوسکے تو آج بھی بالاخانے آنے کی زحمت کرے، یا پھر اُس کے طائفے کو اڈّے پر حاضر ہونے کی اجازت دی جائے۔ جامو نے منع کر دیا تھا۔ بھی تازہ تازہ اسپتال سے اُٹھ کے آیا تھا۔ رات کو اڈّے پر محفل آرائی ہوتی یا بھی بالاخانے جاتا، دونوں باتیں اُس وقت نامناسب تھیں۔

نصیب میاں کے قدم بالاخانے کی جانب اُٹھ چکے تھے۔ ''سنتے ہیں، کوئی آفتِ جاں، گلاب بانو کے جال میں پھنس گئی ہے۔ اتفاق سے اِدھر آنا نہ ہوسکا۔ آج آپ کے ساتھ کیوں نہ جلوہ کرلیا جائے۔'' نصیب میاں نے لہک کے کہا۔

گلی میں سب سے ممتاز یہی عمارت تھی، رنگ روغن سے آراستہ، روایتی بالکونی پر سرسراتے ریشمی پردے، پردوں اور جھروکوں کے پیچھے سوئی سوئی سی روشنی۔ زینہ صاف ستھرا اور چوڑا تھا۔ زینہ عبور کرکے ہم ڈیوڑھی جیسے ایک مختصر کمرے میں داخل ہوئے۔ کمرا کیا تھا، کسی شیش محل سے چرایا ہوا حصہ۔ چھت اور دیواروں پر رنگ برنگے شیشوں کے ٹکڑے جڑے ہوئے تھے، چھت پر لٹکے فانوس کی روشنی سے سارا کمرا جھلمل کررہا تھا۔ فرش پر بچھے دبیز قالین پر عمر خیام کی کوئی رباعی منقش تھی، کوئی نازنیں، ماہ جبیں، صراحی سے خم لنڈھانے پر آمادہ، اور دونوں ہاتھ پھیلائے ایک بارِیش تشنہ لب سائل کی وارفتگی۔ اردگرد گدّے دار کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ یہاں سے طرب گاہ میں جانے کے لیے ایک لمبے چوڑے دروازے کی دیوار حائل تھی۔ دروازے پر نفاست سے پھول پتّیاں تراشی گئی تھیں۔ مزیّن دُکان میں رکھی چیزوں کی وقعت سوا ہوجاتی ہے۔

عموماً محفل کے وقت دروازے پر پردے پڑے ہوتے ہیں۔ دروازہ بند تھا اور اُس کے پہلو میں چھریرے جسم کا ایک پختہ عمر شخص اسٹول پر بیٹھا نگرانی کررہا تھا۔ دروازہ بند ہونے کے باوجود اندر برپا محفل کے نغمہ و ساز کی گونج بیرونی کمرے میں چھنک رہی، دھمک رہی تھی۔ سارسے نے عرصے تک بازار کے علاقے میں تعینات رہا تھا۔ نگہبان اُسے پہچان گیا اور سٹپٹاتا ہوا اسٹول سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ لمحے بھر کے لیے اُس کا جسم اکڑ سا گیا تھا، پھر اُس نے خفیف مسکراہٹ سے سب کو سلام کیا اور جھجکتے ہوئے بتایا کہ اندر کچھ خاص لوگوں کے لیے محفل جمی ہوئی ہے، اور آج رات گویا اُنھی کے لیے مخصوص ہے۔ گلاب بانو کی ہدایت ہے کہ آنے والے معززین سے معذرت کرلی جائے۔

''اندر جاکے گلاب بانو سے عرض کرو کہ کون آیا ہے۔ اپنے استاد بھی کے لاڈلے میاں آئے ہیں۔ بس ذری تی نشست ہوپائے شاید۔'' نصیب میاں نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔

''ہیں کون لاٹ صاب؟'' سارسے نے ناگواری سے پوچھا۔

''کچھ پتا نہیں آقا، مگر کوئی بڑے نواب رئیس، راجے مہاراجے لوگ ہی ہوں گے۔'' نگہبان نے مؤدبانہ جواب دیا۔

''کیا نام ہے تمھارا؟'' سارسے نے بگڑے منہ سے پوچھا۔

''خوب، سارسے بھائی!'' نگہبان شکایتی لہجے میں بولا، ''نام ہی بھول گئے خادم کا۔ اُچھو ہوں جناب! آپ کا پرانا خدمت گار، نمک خوار۔''

سارسے نے ترشی سے اُس کا نام دُہرایا۔ ''تم کو بڑے صاحب نے کیا بولا۔ اندر جاکے اُس گلاب بانو کو بتلاؤ۔''

اُچھو کا جسم بل کھانے لگا۔ اُس نے سارسے سے معافی چاہی اور بولا، ''کیا بتاؤں، بی بی نے سختی سے منع کیا ہے۔''

''کون بی بی... کون؟ کیں؟'' سارسے برگشتہ ہونے لگا، ''یہ تو سسری کھلی دُکان ہے۔''

''کیا بول سکتا ہوں سارسے بھائی! خادم تو...''

سارسے آگے آکے اُچھو کے سینہ بہ سینہ ہوگیا، اور جھڑکتی آواز میں بولا، ''اونچا سنتے ہو کیا، تم کو جیسا بولا ہے، ویسا ہی کرو، یا پھر ہم... ہم دروازہ توڑ دیں۔''

''نہیں نہیں سارسے بھائی!'' اُچھو بری طرح گڑبڑا گیا، ''آپ فرماتے ہیں تو جاکے...''

سارسے نے کشمکش، بل کہ اذیت سے دوچار اُچھو کو مزید کہنے نہیں دیا اور اُنگلی اُٹھا کے اندر جانے کا اشارہ کیا، اُچھو نے پھر کوئی تاویل و حجت نہیں کی، کمرے کے ایک اور مختصر بغلی دروازے سے لپکتا جھپکتا اندر چلا گیا، میں نے سارسے کو واپسی کا مشورہ دیا تھا۔ نصیب میاں بھی مکدّر نظر آرہے تھے۔ سارسے راضی نہیں ہوا، کہنے لگا کہ گلاب بانو بہت ہوا میں اُڑ رہی ہے۔ آج اِس طرح یہاں سے چلے گئے تو اُس کا دماغ اور پھر جائے گا۔ سارسے کو اڈّے کا بھرم عزیز ہونا چاہیے تھا۔ میں چپ ہوگیا۔ اُچھو جلد ہی لوٹ آیا۔ وہ اکیلا

نہیں تھا۔ اُس کے چند قدم پیچھے زرق برق لباس پہنے، زیورات سے لدی پھندی، ہار سنگھار کیے جو متناسب قامت اور بدن کی اُدھیڑ عورت نمودار ہوئی، وہ گلاب بانو ہی ہو سکتی تھی۔ کبھی اپنے وقت کی خوش جمال عورت ہوگی، بڑی گھبرائی ہوئی تھی، مگر ہمارے رُوبہ رُو آ کے سنبھل گئی اور دیدے نچاتے ہوئے بولی،

"اخّاہ، بندی یہ کیا دیکھ رہی ہے، کیسے کیسے لوگ آئے ہیں۔ یقیناً راستہ بھول گئے ہوں گے، مگر وہ... اُس کا انداز اضطراری ہوگیا۔ اپنے بادشاہ سلامت نظر نہیں آ رہے، بتھل دا، خدا اُن کی عمر دراز کرے۔ سنا ہے، کلکتے کی پھر یاد ستائی ہے۔"

"ہاں گلاب بانو! شکر ہے، اُستاد اپنے ٹھکانے پر آ چکے ہیں، نصیب میاں نے چہکتی آواز میں کہا، "ابھی بہت سے مشتاقانِ دید میں گھرے ہوئے تھے، ایک خلقت جمع تھی واں، ہم بھی، یوں سمجھیے، چپکے سے نکل آئے۔ شہر میں دھوم تو بس آپ کی عشرت گاہ کی مچی ہوئی ہے۔ سوچا، ذرا ہم بھی تو کچھ دیدہ و دل گرما ئیں۔ اپنے لاڈلے میاں کو اشارہ کیا اور چل پڑے۔"

"ارے، یہ لاڈلے میاں ہیں۔" وہ پلکیں جھپکاتے ہوئے بولی، "اِن کی تو کیا داستانیں سنی ہیں۔ خدا جانتا ہے، دیکھنے کا اشتیاق تھا۔ ماشاء اللہ، چشم بد دور، جیسا سنا تھا، یہ تو واقعی کسی راج محل سے اُٹھ کے آئے ہیں۔" گلاب بانو نے سر خم کر کے مجھے مخاطب کیا، "آداب۔"

میں نے بھی گردن ہلا دی۔

"ایک ذرا بھنک مل جاتی کہ آپ لوگ یہاں کا رُخ کیا چاہتے ہیں تو بندی کچھ اہتمام کر لیتی۔ اب کیا عرض کروں، اُدھر آگرے کے قرب و جوار میں کسی رجواڑے کے معززین کی فرمائش تھی کہ آج رات صرف اُن کے لیے وقف کر دی جائے، بندی کی تو اسی نیاز مندی و دل داری میں کٹ گئی ہے، ساری زندگی صاحبانِ شوق کے اشاروں کی منتظر، اُن کی خوش نودی کی جستجو میں..."

"آہاہا، خدا کی قسم کیا کلام ہے!" نصیب میاں پھڑک کے بولے، "اگلے زمانوں کا سارا سنا اَن سنا آئینہ ہو جاتا ہے۔ آپ کو دیکھ کے تو گلاب بانو! ایسا لگتا ہے کہ وقت کی آپ پر خاص مہربانی رہی ہے۔ آپ کے لیے تو وقت اپنی رفتار ہی بھول گیا ہے۔ آپ سے کنارہ کیے گزر رہا ہے۔ خدا نظرِ بد سے بچائے، جب جلوہ کرو، وہی تیور، تمکنت، دل رُبائی اور شیریں کلامی۔ اللہ اللہ، کیسا ریشم اور پھولوں میں رکھا ہے آپ نے خود کو۔"

"کیا نصیب میاں، آپ بھی..." گلاب بانو کا سراپا موج موج ہوگیا۔ "اپنا احوال تو آدمی خود ہی بہتر جانتا ہے۔ اب کیا رکھا ہے، بدن کے قفس سے سارے پرندے اُڑ گئے، لُٹ گئی بہار... وہ کیا کہا ہے، خدا سے سخن نے،

اب جانِ جسمِ خاک سے تنگ آ گئی بہت..."

"واہ گلاب بانو! کیا بھولا بسرا شعر یاد دلایا، دوسرا مصرع ذہن میں بھٹک رہا ہے... اور کیا خوب ہے۔"

"دوسرا نہ پوچھیے۔ بہت اداس کر دیتا ہے۔"

"ہے کیا؟ بتایئے۔" نصیب میاں مشتاقانہ انداز میں بولے، "ایمان سے سر میں گھوم رہا ہے۔"

"کب تک اِس ایک ٹوکری مٹی کو ڈھوئیے۔" گلاب بانو نے یاسیت سے شعر مکمل کیا۔

نصیب میاں سر جھٹکنے لگے۔ "غزل کے شعر میں مٹی، ٹوکری، ڈھونا... یہ میر صاحب جیسے صاحبِ کمال ہی کا حصہ ہے۔ اپنا بس چلتا تو..." نصیب میاں نے مشکل سے زبان کو لگام دی۔

نصیب میاں کچھ کہنا چاہتے تھے کہ سارنگے نے تلخ لہجے میں دخل دیا۔ "اپنے لیے کیا بولتی ہو گلاب بانو؟"

"کیا مطلب سارنگے بھیا۔" گلاب بانو نے پٹ پٹاتی آواز میں پوچھا۔

"سارنگے میاں! آج گلاب بانو واقعی کچھ مجبور معلوم ہوتی ہیں۔" نصیب میاں نے جھجکتے ہوئے لقمہ دیا۔

"کیوں گلاب بانو؟" سارنگے کا لہجہ کسی رُو رعایت سے عاری تھا۔ "اپنے کو صاف صاف بولو۔"

"بندی نے سارا کچھ عرض کر دیا ہے۔" گلاب بانو نے اٹکتی زبان سے کہا۔

"مطلب، ہم لوگ چلتے بنیں۔"

"توبہ، توبہ، کیا کہہ رہے ہیں آپ سارنگے بھائی۔" یہ آپ کا گھر ہے۔ کبھی ایسا ہوا ہے؟ بتھل دا کی طرف سے، اُن سے واسطہ رکھنے والا کوئی ادنا سے ادنا اِدھر آیا ہو، دن ہو، یا رات،

اور آپ سے دروازہ بند ملا ہو۔"

"پھر آج کیا ہے؟" سارنگے بپھر کے بولا، "آج تو بند ہے۔"

"آج بھی نہیں، آپ اِسی گھر میں ہیں۔ ایک نامراد کمرا نہیں، تو یہ سارا گھر آپ کے لیے کھلا ہے۔ گلاب بانو کی لجاجت میں وحشت شامل ہوگئی تھی، کہنے لگی، "آپ نے پوری بات کہاں سنی، بندی نے عرض کیا، آمد کی ایک ذرا خبر مل جاتی تو اِن موئے اجنبیوں سے کوئی غرض رکھتی، نہ وعدہ کرتی۔ پرسوں رات ہی کی بات ہے کہ اِنھوں نے پہلی بار محفل میں قدم رکھا تھا۔ یہاں اَور بھی گل رُخ کے شیدائی تمنائی موجود تھے، بڑے بڑے صاحب حیثیت اور صاحب دل۔ اصرار ہوا کہ اب کی آئیں تو محفل اُنھی کے لیے مخصوص ہو۔ اُس رات ایسی داد و دہش کی، جو سنا ہے، راجے مہاراجوں ہی کا شیوہ ہوتا ہے۔ بندی زیر بار تھی، اور سچ پوچھیے تو حیران پریشان بھی۔ اللہ جنت نصیب کرے، نرالی آپا کہتی تھیں، ایسی بخشش و عطا کرنے والوں سے ایک ذرا احتیاط ہی دور اندیشی ہے، مگر کوئی کیا کر سکتا ہے، کس کا ہاتھ روکا جا سکتا ہے کہ بس، یہ اپنی بساط سے زیادہ ہے۔ نذر قبول کرنے والے کی بھی تو ایک بساط ہوتی ہے۔ گل رُخ تو جب سے آئی ہے، قیامت ہی آ گئی ہے۔ ہر وقت دھڑکا لگا رہتا ہے، کس دم کیا تماشا ہو جائے۔ ایک دو ہوں تو سنبھال لیا جائے۔ یہاں تو شمار قطار ہی نہیں۔ حُسن تو چار دن کی چاندنی ہے، اور صرف ایک ہی بار چھٹکتی ہے۔ حُسن کی چاندنی کو کم بخت ایک ہی مہینا ملتا ہے، دوسرا، تیسرا نہیں؛ اور اِن چار دنوں کی رکھوالی کے لیے کیا کیا جتن کرنے پڑتے ہیں، کیا بتاؤں! اُنھیں جلدی بھجوا دیتی ہوں۔ اِن گھیوں میں سب سے پہلے اِسی بالا خانے پر رات ہوتی ہے۔ گل رُخ کی باگیں الگ کھینچے رکھتی ہوں۔ آخر نو عمر ہے۔ اب دیکھیے، یہ آگرے والے بلاے ناگہانی کی طرح وارد ہوگئے..."

"اُوں ہُوں، عطاے ناگہانی کہو بانو!" نصیب میاں طرح دے کے بولے۔

گلاب بانو فقرہ شناس تھی، برملا نصیب میاں کی تائید کی، "ٹھیک ہی کہتے ہیں آپ۔ سخاوت کی ایسی ارزانی کہ لب کشائی کی گنجائش ہی نہیں رہنے دی۔ بندی نے وعدہ کر لیا کہ جیسا منشا ہے، تعمیل کی کوشش کرے گی۔ ایسے طلب گار کب کب آتے ہیں۔ زرجواڑوں کے پنچھی معلوم ہوتے ہیں، اور زمانے کی بدلتی ہوا نے اِن پر بھی اثر کیا ہے۔ راج محلوں میں حکم چلانے والے اِن نوابوں، رئیسوں کو، وہ کیا کہتے ہیں، فیکٹریاں، کارخانے لگانے کا سودا سمایا ہے۔ بتا رہے تھے کہ شہر کے قریب ہی کسی جگہ کارخانے لگا رہے ہیں، کپڑے کے، جوٹ کے، جانے کیا کیا۔ پھر تو یہیں ٹھکانا ہو جائے گا۔ خُو بُو تو وہی شاہانہ مستانہ ہے۔ آتے جاتے اور بلاتے رہیں گے۔"

سارنگے نے ہاتھ اُٹھا کے گلاب بانو کو روک دیا۔ "اِتنی گھما پھیری کی ضرورت نہیں، اپنے کو بولو، ہم چلے جائیں پھر؟"

"کون بدبخت کہتا ہے، آپ یوں چلے جائیں۔ کس کی مجال ہے جو جھُل دا کے ہاں سے آنے والوں سے یہ سرتابی کر سکے۔" گلاب بانو کا لہجہ شکوہ کناں ہوگیا۔ "سنیے! بندی نے ساری عرض گزار دی ہے۔ یہ گھر ایسا مختصر نہیں۔ آپ کی دل جوئی کے لیے دوسری بیٹھک کھلواتی ہوں۔ ایک گل رُخ نہیں، گلاب بانو کے پاس اَور بھی پھُل جھڑیاں، مہتابیاں ہیں۔ کوئی کسر نہیں رہنے دی جائے گی۔ سازندے البتہ سرِدست گل رُخ کے ساتھ ہیں، ورنہ وہ بندوبست بھی ہو جاتا؛ اور یہ تو صرف ایک رات کی بات ہے، بندی نے تو خود ہی پچھلی مرتبہ جھُل دا کی آمد پر حاضری کی درخواست کی تھی۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔" گلاب بانو کی مرصّع تاویل و تکرار سے سارنگے جز بز ہونے لگا تھا، مُنہ بنا کے بولا، "اپنے کو اچھا نہیں لگ رہا، صاف بولے دیتے ہیں۔"

"بندی کو کب اچھا لگ رہا ہے۔" گلاب بانو شکستگی سے بولی۔

"اپنے ساتھ لاڈلے بھائی ہیں... اور لاڈلے بھائی کون؟ اُستاد جھُل! سمجھیں؟"

"لاڈلے میاں سَر آنکھوں پر۔ ایک گل رُخ کیا، اِن پہ دس گل رُخ قربان۔ بس ایک رات کی معافی کی دُہائی ہے۔ کل گل رُخ اِن کی خدمت میں حاضر ہو جائے گی؛ یہاں، یا جہاں یہ چاہیں۔"

سارنگے نے میر سے پیچھے کھڑے جمرو اور زورا کی طرف بے چینی سے دیکھا۔ اڈّے کے آدمیوں کا وتیرہ ہے کہ اُن کا کوئی معتبر ساتھی کسی معاملے میں بڑھ کے کلام کر رہا ہو تو عموماً

وہ مداخلت نہیں کرتے۔

"گل رُخ کی بات کون کرتا ہے گلاب بانو!" تیزی سے آگے آکے جمرو درشتی سے بولا، "تم سے کسی کا نام لیا، کسی گل رُخ ول رُخ کا؟ اپنے سے زیادہ چیڑ چیڑ مت کرو۔ ہم کو اُسی جگہ جانا ہے، جدھر تمھارے وہ بھٹنیا کے نواب، رئیس لوگ بیٹھے ہیں۔ اُن کو جا کے بولو، کون لوگ آئے ہیں... اور اب کچھ آگے کو زبان مت چلانا... اور اُن حرام کے جنوں کا تم کو اتنا دھیان ہے تو ہم لوٹ جاتے ہیں، پر..."

"نہیں نہیں، یہ کیسے ہوسکتا ہے۔" گلاب بانو سراسیمہ ہوگئی۔

"پھر دیر مت کرو، دروازہ کھلواؤ۔"

گلاب بانو کے چہرے کی لالی پھیکی پڑ گئی۔ اُس کا چہرہ ہی بدل گیا تھا، لرزتے ہونٹوں سے کچھ کہنا چاہتی تھی، چپ رہی اور چند لمحوں کے سکوت آمیز تذبذب کے بعد اُس نے اچھو کو اشارہ کیا۔

اندر وسیع و عریض کمرے میں تو منظر ہی دوسرا تھا۔ یہ تو کچھ اور ہی جگہ تھی، کسی نواب، یا راجا کا شبستان، ہال مانند کمرے میں چہار اطراف دیواروں سے ایک ڈیڑھ گز آگے چھوٹی چھوٹی محرابیں، دیواروں میں جا بجا بنے طاقوں پر روشن شمعیں اور محرابوں پہ لٹکے رنگ برنگے پردوں سے چھنتی، چھلکتی روشنیاں، کمرے کے وسط میں ایک بڑا فانوس جگمگا رہا تھا، منقش ستونوں سے لگے ہوئے لکڑی کے آرائشی سامان پر تازہ گل دستے۔ سارا کمرا خوش بوؤں میں بسا ہوا۔ ایک جانب بسنتی لباس میں سازندوں کا ٹولا۔ دو اطراف قالین، بیچ کے فرش پر غالباً لکڑی کی باریک پرت بچھی ہوئی تھی کہ گھنگھروؤں کی جھنک اور رقص کے دوران پیروں کی دھمک قالین کی دبازت سے متاثر نہ ہو۔

دروازے کے دائیں طرف کریاں کڑھے ہوئے سلکی کُرتوں اور سفید پاجاموں میں تین بدمست آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ اُن کی وضع قطع سے ظاہر تھا کہ دھوپ سے کنارہ رہا ہے۔ چہرے دمک رہے تھے۔ پختہ عمر کے ایک کم قامت شخص کے جسم پر چربی کی تہیں چڑھی ہوئی تھیں۔ دوسرا بھی لگ بھگ اُسی کی عمر کا تھا، قد میں کچھ نکلتا ہوا اور نسبتاً کم فربہ، تیسرے کی عمر چھتیس سال کے قریب ہوگی۔ جسم توانا تھا، لیکن قدرے اُبھرے ہوئے پیٹ نے غیر متوازن کر دیا تھا۔ اُن کی سلکی شالیں پیروں پر گری ہوئی تھیں۔ تینوں کی رنگت کم و بیش گندمی تھی۔ آٹھواں رنگ دولت کا ہوتا ہے، جو اُن کی اصل رنگت پر غالب تھا۔ اُن کی نشست کے پاس ایک گوشے میں شفاف شیشے کی میز پر صراحیاں اور جام رکھے ہوئے تھے۔

تینوں کے پہلو میں نیم عریاں لڑکیاں تھیں، اور وہ اُنھیں تقریباً دبوچے ہوئے تھے۔ اُن کے سامنے لکڑی کے فرش پر تین دل کش نوخیز لڑکیاں رقص کناں تھیں، دو پیچھے، ایک آگے۔ آگے والی لڑکی تو بہ قول شخصے، چاند کا ٹکڑا تھی، جیسے سونے کی بنی ہو۔ مجرے کی محفلوں میں ایسا لباس میں نے پہلی بار دیکھا تھا۔ ہلکے ریشمی کپڑے میں اُس کا بدن چھپائے نہ چھپ رہا تھا۔ اُس کے عقب میں دونوں لڑکیوں کا بھی کچھ یہی حال تھا۔ سامنے والی لڑکی یقیناً گل رُخ تھی؛ کَسا ہوا، کھنچا ہوا بدن؛ نقش و نگار سے بنی تُلی! کمر برائے نام؛ نخوت کی علامت، پھولے ہوئے نتھنے۔ کسی نے کہا ہے کہ حسن و جمال پر ناز و ادا مستزاد ہے۔ عشوہ و غمزے کے بغیر حسن شاید نامکمل رہتا ہے۔ اُس کا بدن خم خم تھا، گھنی سیاہ پلکوں کے درمیان بڑی بڑی مسکراتی آنکھیں، پارا بھرا، لچکتا، بل کھاتا سراپا۔

دروازہ عبور کر کے ہم جیسے ہی کمرے میں داخل ہوئے تو سارا کچھ ٹھہر سا گیا۔ ساز بھی لمحے بھر کے لیے منجمد ہوگئے۔ بائیں طرف کی نشست پر ابھی ہم بیٹھے ہی تھے کہ گلاب بانو کے اشارے پر سازندوں نے پھر ساز بجانے شروع کر دیے۔ لڑکیوں کے رقص میں بھی پہلے سے کہیں زیادہ تیزی آگئی۔ گلاب بانو اپنے تینوں 'خاص مہمانوں' یا 'ممدوحین' کے پاس سر جوڑ کے بیٹھ گئی تھی۔ ہماری ناگہاں آمد پر اُن تینوں کی آنکھیں پھیل گئی تھیں اور چہروں پر خون سمٹ آیا تھا۔ گلاب بانو نے مؤدبانہ، ملتجیانہ انداز میں نوجوان سے کچھ سرگوشیاں کیں۔ نوجوان کے دونوں ساتھی بھی گلاب بانو کی صراحتیں سننے کے لیے قریب ہوگئے اور پہلو میں دبکی لڑکیوں پر اُن کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ سازندوں نے گلاب بانو کو اُن سے ہم کلام دیکھ کے ساز

بیمے کر دیے تھے۔ اُن تینوں صاحبانِ زر کے اطوار سے عیاں تھا کہ خاصی دیر سے وہ خم لنڈھاتے رہے ہیں۔ ہاتھ پیر اُن کے تابع نہیں رہے تھے۔ شراب دماغ کی نفی کرتی ہے، جو بہت اُلجھاتا، تھکا دیتا اور من مانیاں کرتا رہتا ہے۔ گلاب بانو نے ضرور ہمارے بارے میں اُنھیں بتانا چاہا تھا، سُن کے نوجوان نے مشتعل نظروں سے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ وہ بھی برہم تھے۔ گلاب بانو کی گزارش اُنھوں نے سنی اَن سنی کر دی اور کسی تامل کے بغیر ہمیں محفل سے نکل جانے کا حکم دیا۔ گلاب بانو ہاتھ جوڑ کے بنتی کرتی رہی۔ وہ خاصی حواس باختہ لگ رہی تھی۔ ایسے کسی تجربے سے پہلے کب واسطہ پڑا ہوگا۔ رقص کرتی لڑکیاں بھی رقص کرنا بھول گئی تھیں، تیز قسم کا کوئی پوربی گیت گاتی گل رُخ کی آواز بھی بھٹکنے لگی تھی۔

اِس دوران کئی مرتبہ گلاب بانو نے بے چارگی سے ہم پر نظر کی۔ ہم بہ ظاہر مطمئن، بہ باطن مضطرب سارا تماشا دیکھ رہے تھے۔ گلاب بانو کی مسلسل التجا پر اُدھیڑ شخص اَوسان کھو بیٹھا۔ طیش میں آکے اُس نے جام فرش پر پھینک دیا۔ شراب کے چھینٹے اُن تینوں اور گلاب بانو کے کپڑوں اور چہروں پر جا بکھرے، جا چھنکے تھے۔ جام چوں کہ قالین پر پھینکا گیا تھا، اِس لیے کرچیاں دُور تک نہ جا سکیں، گلاب بانو نے دوبارہ اپنے قریب بیٹھے نوجوان کے پیر چھوئے اور دست بستہ تحمل کی درخواست کی۔ اُس کی منتوں کا اُلٹا اثر ہوا، وہ تو وحشی ہوگیا۔ اُلٹے ہاتھ سے اُس نے گلاب بانو کے منھ پر طمانچہ رسید کر دیا۔

ہم میں سے پھر کسی سے ہاتھ پاؤں توڑے بیٹھے رہا نہ جاسکا۔ جمرو اور سارے نے یک لخت اپنی جگہ سے اُٹھ پڑے اور نوجوان کی طرف لپکے۔ اُنھیں بڑھتا دیکھ کے نوجوان نے کمال پھرتی سے کُرتے کے نیچے پیٹی میں اُڑسا ہوا تمنچا نکال لیا۔ گلاب بانو واویلا کرتی ہوئی درمیان میں آگئی تھی، نوجوان نے حقارت سے اُسے ایک طرف جھٹک دیا۔ اُس کے دوسرے ہاتھ میں اُٹھے تمنچے کا رُخ اپنی جانب اُمڈتے ہوئے جمرو اور سارے کی طرف تھا۔ کرنے کے باوجود گلاب بانو فوراً کھڑی ہوگئی تھی۔ نوجوان اور اُس کے معمر ساتھی بری طرح مشتعل تھے اور ایک طرح نوجوان کو مہمیز کر رہے تھے۔ میرا ماتھا ٹھنکا اور اندازہ

کرنے میں کوئی دیر نہیں لگی کہ چند لمحوں میں کیا سے کیا ہوسکتا ہے۔ نوجوان نے تمنچے کی زد پر اور گالیوں کے درمیان ہمیں فی الفور دفع ہو جانے کا حکم دیا۔ سارے نے، جمرو اور زورا کے ہاتھ جیبوں میں چلے گئے تھے۔ میں نے جھپٹ کے اُن دونوں کو پیچھے سے جا لیا اور بہ وقت دائیں بائیں کرنے کی کوشش کی۔ اِدھر ہاتھ اُٹھا کے میں نے مفاہمانہ لہجے میں نوجوان سے کہا، "ہم جاتے ہیں... جا رہے ہیں۔"

میری زبان سے یہ سُن کے جمرو اور سارے نے کو ششدر ہونا چاہیے تھا۔ اُن کے گلے میں بانہیں جکڑ کے میں نے اُن سے پرے ہو جانے کی عاجزی کی کہ کم از کم میری خاطر وہ میری بات مان لیں۔ وہ آپے میں نہیں تھے، اور اُنھیں روکنا بہت مشکل ہو رہا تھا۔ اُن کے پیر پکڑنے کے لیے میرے ہاتھ پنڈلیوں تک گئے تھے کہ زِچ سے ہو کے وہ فرش پر پیر پٹخنے لگے۔ اُس وقت نصیب میاں نے بھی میرا ساتھ دیا۔ زورا کا جسم بھی پھڑک رہا تھا۔ نصیب میاں نے اُسے قابو میں کیا۔

دوسری جانب گلاب بانو دہائیاں دے رہی تھی۔ لڑکیاں وہاں سے بھاگ چکی تھیں۔ جمرو اور سارے کو دھکیلتا، دھکے دیتا ہوا نوجوان کے سامنے سے ہٹانے میں، بہ ہر حال، میں کام یاب ہوگیا۔ وہ پلٹ پلٹ کے نوجوان اور اُس کے ساتھیوں کو خوں بار نگاہوں سے دیکھتے اور مغلظات بکتے باہر نکل گئے۔ ہم نے جیسے تیسے، اُلٹے سیدھے قدموں سیڑھیاں طے کیں اور نیچے گلی میں آگئے۔

جمرو، زورا اور سارے پر سناٹا سا چھایا ہوا تھا۔ کچھ دُور قدم سے قدم ملا کے وہ میرے ساتھ چلتے رہے۔ کسی نے زبان

نہیں کھولی۔ ہم جلد ہی بازار کے علاقے سے نکل آئے۔

اُن کی برہمی بالکل بجا تھی، اور مجھے اپنی ڈوں آتنی پر کوئی ندامت نہیں تھی۔ اُن کے لیے نوجوان اور اُس کے ساتھیوں پر حاوی ہوجانا کچھ دشوار نہیں تھا۔ گلاب بانو کے زردار مدوحین کی آنکھیں پوری طرح کھلی ہوئی تھیں، لیکن دماغ پوری طرح حاضر نہیں تھے۔ نوجوان کے ہاتھ میں تمنچا تھا، اور وہ اپنے بس میں دکھائی نہیں دیتا تھا۔ شراب سے تیز مال و زر کا نشہ ہوتا ہے۔ جمرو اور سارنے کے پاس چاقو تھے جو اُنھوں نے بروقت باہر نکال لیے تھے۔ وہ اپنے بل اور اڈے سے تعلق کے زعم سے آسودہ تھے۔ دوسرے ہی لمحے کچھ بھی ممکن تھا۔ ہم میں سے کوئی تمنچے کی زد پر آجاتا، یا اُن میں سے کوئی جمرو اور سارنے کے چاقوؤں کی۔ پھر وہی اذیتیں، وہی معمول؛ پولیس، بازار بھر میں ہنگامہ، گلاب بانو کے جُبن، شہر میں رُسوائیاں، طرح طرح کے قصے، کہانیوں، افواہوں کا ایک سلسلہ، اور ایک کے بعد دوسرا خون، دوسرا، تیسرا... جانے کتنے عرصے تک بے دست و پائی، معطلی۔

جمرو، زورا اور سارنے اتنا کچھ نہیں جانتے تھے۔ جتنا کچھ میں دیکھ چکا اور آزما چکا تھا۔ بے شک اُنھیں اڈے کے آدمیوں کی مُستعدی، دُور دُور تک جیتی اُستاد بجّھل کے اڈے کی ہیبت پر زُک آنے کا خیال مضطرب کیے ہوگا۔ اُنھوں نے مطلق نہیں سوچا کہ یوں بجّھل کے اڈے سے متعلق آدمیوں کی برداشت اور ہوش مندی کا پہلو بھی تو نہاں ہے۔ آج کے بعد کل بھی تو آتی ہے۔ آج کی پس پائی ہمیشہ کے لیے نہیں ہے۔ پرورش سے غصہ کچھ پینا ہوجاتا ہے۔ میرے جسم و جاں میں بھی اُن سے کچھ کم آگ نہیں لگی تھی۔ لیکن کہتے ہیں، غصے میں نظرِ ثانی کا جبر، یا زہر مفید رہتا ہے۔ برداشت اور ہوش مندی کی بھی اپنی ایک ساکھ ہوتی ہے، وحشت اور غضب سے زیادہ مؤثر۔

بازار کے سرے پر رات بھر کھلے ایک چائے خانے میں لے جا کے میں نے اُنھیں یہی کچھ، یہی عواقب و نتائج باور کرانے کے اپنے طور پر جتن کیے۔ صاف ظاہر تھا کہ میری حجتوں سے وہ متفق نہیں ہو پائے۔ اُن کی خاموشی محض مروّت ہے، میرا اِتنا نہیں تو اُستاد بجّھل کے عزیز از جاں کا لحاظ۔

ہم اڈے واپس آگئے۔ رات اِتنی زیادہ نہیں ہوئی تھی۔ اڈے پر کسی حد تک چہل پہل تھی۔ بجّھل چوکی سے اُٹھ چکا تھا۔ جامو اڈے کے لوگوں کے درمیان گھرا کسی معاملے میں اُلجھا ہوا تھا۔ اُن سب کو نظرانداز کرتا ہوا اپنے کمرے میں آ کے میں بستر پر دراز ہوگیا۔ جمرو، سارنے اور زورا کی مغائرت سے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے مجھ سے واقعی کوئی کوتاہی ہوگئی ہے۔ خود کو قائل کرتے کرتے کسی وقت آنکھ لگ گئی۔ یہ خوابیدگی بھی کسی اطمینان سے ممکن ہوئی ہوگی۔ جمرو، زورا اور سارنے کو نیند نہیں آئی ہوگی۔

صبح جلدی آنکھ کھل گئی تھی، لیکن اُٹھنے کو جی نہیں چاہا، بستر میں پڑا کروٹیں بدلتا رہا۔ اڈے کے کسی آدمی کی دستک پر آخر مجھے اُٹھنا پڑا۔ دس بج چکے تھے۔ چوکی پر اچھے خاصے لوگ بجّھل کا محاصرہ کیے ہوئے تھے۔ سارنے، جمرو اور زورا بھی وہاں موجود تھے، چپ چپ اور بجھے بجھے سے۔ میں نے مسکرا کے اُن کی طرف دیکھا تو جواب میں اُنھوں نے بھی وضع نبھائی۔ بجّھل کے پرانے شناسا کسی بڑے دُکان دار کی طرف سے ناشتے کا اہتمام کیا گیا تھا، پوری، کچوری، پراٹھے، ترکاری، قیمہ، انڈے، مکھن، ملائی، چائے، ڈبل روٹی وغیرہ۔ اِدھر سے اُدھر خوانوں کا انبار لگا ہوا تھا۔

جمرو اور سارنے سے کوئی بات کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ ناشتا کرتے ہی بجّھل مجھے ساتھ لے کے اڈے سے نکل گیا اور ایک مرتبہ پھر ہم اُس مسجد اور متصل مدرسے میں پہنچ گئے، جہاں میں متعدد بار سر پھوڑ چکا تھا۔ ایک دفعہ تو میں اور بجّھل مولوی صاحب کے چھوڑے ہوئے سامان کی تلاشی میں بھی کام یاب ہوگئے تھے۔ بجّھل نے ملحق بازار اور کولوٹولا اسٹریٹ کی دکانوں پر بھی معلوم کیا، خصوصاً مراد آبادی برتنوں کی دکانوں پر۔ اب شہر کے نواحی علاقوں میں جانے کی کوئی تک نہیں تھی۔ نواحی علاقے میں ٹھکانا کرنے کے بعد شہر میں اپنے جاننے والوں کے پاس ایک بار تو مولوی صاحب کو ضرور پھیرا لگانا چاہیے تھا۔ میں تو معمول کے مطابق کسی بچے کے مانند اُنگلی پکڑے بجّھل کے ساتھ چلتا رہا۔ اُس کی طرح میرا ذہن بھی اِس بعید ترین گمان سے ناآلودہ نہیں تھا کہ نواب ثروت کے

سانحے کے بعد بدحواسی میں مولوی صاحب کسی طرف بھی مُنہ اُٹھا سکتے ہیں، کہیں نہ کہیں تو اُنھیں سر چھپانا ہی ہے۔ کلکتے میں اُن کی موجودگی کا ویسے کوئی امکان نہیں تھا، مگر ہو سکتا ہے، دماغ میں کچھ سما گیا ہو کہ یہاں اُن کی واپسی اور قیام کی توقع میرے لیے خارج از تصور ہوگی۔ کبھی چراغ تلے کی جگہ زیادہ محفوظ ہوتی ہے۔ کلکتہ سب سے بڑا شہر ہے، بھیڑ میں گم ہوجانے کے امکانات یہاں زیادہ ہیں۔ سارا علاقہ اُن کا دیکھا بھالا ہے۔ شناساؤں کی بھی کثرت ہے۔ ہو سکتا ہے، آپ کے اِس طرف آنے کی اُنھوں نے جرأت کر لی ہو۔ اور کچھ نہیں ہوا، کسی کو مولوی صاحب کی خبر نہیں تھی۔ اندھیرا تو کبھی سمندر سے بڑا، سمندر سے گہرا ہوتا ہے۔ ہمیں اندھیروں میں ہاتھ پاؤں مارتے رہنے کی عادت ہوگئی۔ اپنے معمول کا فریضہ انجام دے کے سہ پہر تک ہم اڈے لوٹ آئے۔

چار بج رہے ہوں گے، دھوپ بوڑھی ہو چکی تھی۔ ہم ابھی اڈے پہنچے تھے کہ تیجا نے چوکی پر آ کے بجّھل کے کان میں سرگوشی کی۔

”اپنا اوم کار، بڑ چھڑ...“ بجّھل نے حقے کی مُنال ہونٹوں سے ہٹا کے تعجب سے پوچھا۔ ”اب تک وردی ڈالے ہوئے ہے کیا؟ چھٹی نہیں ہوئی اُس کی؟“

”کب کی اُستاد، اب وردی میں نا ہیں، چار آدمی اور بھی ساتھ ہیں۔“ تیجا نے مستعدی سے جواب دیا۔ ”گھوڑا گاڑی میں آئے ہیں۔“

”پورا پولیسیا ہے۔“ بجّھل نے حقے کا کش بھرتے ہوئے کہا۔ ”ساری عمر یا ڈنڈا گھماتا رہا ہے، پولیس کا ڈنڈا تو جادو کا ہوتا ہے۔“

بجّھل سے اجازت لے کے تیجا فوراً باہر چلا گیا اور قریباً ایک منٹ میں لوٹ آیا۔ اُس کے ساتھ سب سے آگے دراز قامت، سانولی رنگت، گیروے کُرتے، سفید پاجامے اور کھادی کے کوٹ میں ملبوس عمر رسیدہ شخص کا میں چہرہ آشنا تھا۔ وہ کلکتہ پولیس میں کسی بڑے عہدے پر فائز تھا۔ جسم کچھ بھاری ہوگیا تھا اور سفید مونچھیں بھی کچھ اور دراز اور گھنی ہوگئی تھیں، اور کوئی شکاری معلوم ہوتا تھا۔ دوسرے لمحے میری آنکھیں خیرہ ہوگئیں۔ اوم کار کے عقب میں جو چار آدمی دروازے سے داخل ہوتے نظر آئے، اُن میں تین وہی مستانے تھے، جنھوں نے گزشتہ رات گلاب بانو کے بالا خانے پر ہم سے بدسلوکی کی تھی۔ میری طرح جمرو، سارنے اور زورا کا حال بھی دِگر ہوا۔ اُن تینوں کے ہم راہ اُنھی جیسی چھب ڈھب، بڑی عمر کا ایک بُردبار شخص بھی تھا۔ چاروں کے چہرے تمتما رہے تھے۔ وہ عام، مگر اُجلا لباس پہنے ہوئے تھے اور خاصے چوکنے، گھبرائے ہوئے لگ رہے تھے۔ چاروں نے چوکی پر آ کے بجّھل کو نمسکار کیا۔ اوم کار کو دیکھ کے بجّھل اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔ دونوں بغل گیر ہوگئے اور دیر تک ایک دوسرے کو گُدگداتے رہے۔ اوم کار کی زبانی معلوم ہوا کہ سال بھر پہلے وہ ملازمت سے سبک دوش ہوا ہے
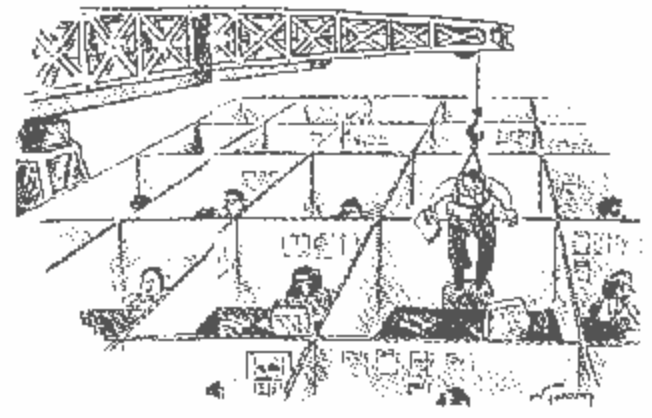
اوراب اپنے کاروبار اور زمینوں کی دیکھ بھال کر رہا ہے۔ ساتھ آنے والے چاروں اشخاص کا تعارف کرانے میں اُس نے بڑی عجلت کی۔ جُھل کو بتایا کہ اُن سے اُس کے دیرینہ مراسم ہیں۔ عرصے پہلے آگرے میں ملازمت کے دوران جو تعلق قائم ہوا تھا، وہ آج تک قائم ہے اور دوستی میں بدل چکا ہے، اوراب اُسی کے ایما پر اُس کے صاحبِ حیثیت اور صاحبِ دل دوستوں نے کلکتے میں کارخانے لگانے کا اہتمام کیا ہے۔

میں، زورا، جمرو اور سارنے جُھل کے قریب ہی بیٹھے تھے۔ مجھے اوم کار کی آمد کے مقصد کا کچھ کچھ اندازہ ہو چلا تھا، لیکن میرا قیاس غلط بھی ہو سکتا تھا۔ اوم کار پولیس کا آدمی تھا۔ مدعا زبان پر لانے میں بھی اُس نے دیر نہیں کی۔ زبان تو سارے انسانی اوصاف میں سب سے ممتاز ہوتی ہے۔ اُسے بات کرنے کا ہنر بھی آتا تھا۔ گذشتہ رات گلاب بانو کے بالا خانے پر پیش آنے والے واقعے کی سنگینی کو اُس نے خوش اسلوبی سے بدمزگی اور تلخی سے تعبیر کر دیا، کہنے لگا کہ اُس کے مربی سیر سپاٹے، ایک ذرا وقت گزاری کے لیے گلاب بانو کے بالا خانے چلے گئے تھے۔ گلاب بانو نے اِن سے خلوت کا وعدہ کیا تھا۔ وعدے کے مطابق اُس نے دروازہ بند کر دیا تھا اور دربان کو نگرانی کی ہدایت کر دی تھی۔ یہ لوگ اِس اعتماد میں تھے کہ محفل اِنھی کی ہے، اِنھی کے لیے مخصوص؛ سو وہاں تھوڑا بہت شغل بھی جاری تھا کہ اِس دوران اڈّے کے آدمی وارد ہو گئے۔ اُمید کے خلاف اچانک اجنبی آدمیوں کو داخل ہوتا دیکھ کے اِن سے تھوڑی نادانی سرزد ہو گئی۔ گو گلاب بانو نے اِنھیں آنے والوں کے بارے میں بتانے کی کوشش کی تھی، لیکن صاف بات ہے، اِنھیں یہ رخنہ اندازی اچھی نہیں لگی۔ عالم ہی اُس وقت سب کا دوسرا تھا، نہیں سمجھے کہ سامنے کون لوگ ہیں۔ تمنچے، چاقو نکل آئے، لیکن اڈّے کے آدمیوں نے کمال کیا، بہت تحمل اور تدبّر کیا، اور بات ٹل گئی۔

اوم کار نے کہا کہ اُسے کچھ علم نہیں تھا۔ صبح گلاب بانو اُس کے پاس فریاد کرتی آئی تھی، کیوں کہ گلاب بانو کو معلوم تھا کہ کلکتے میں یہ معززین اوم کار کے مہمان ہیں، اور اُس کے ایک بنگلے، مہمان خانے میں اِن کا قیام ہے۔ کچھ غلطی گلاب بانو کی بھی تھی کہ خلوت کا وعدہ کرتے وقت اُس نے کسی اہم شخص کی آمد پیشِ نظر کیوں نہ رکھی۔ کوئی بھی سرکاری افسر منہ اُٹھائے وہاں کا رُخ کر سکتا تھا۔ اوم کار کہنے لگا کہ اُسے ساری رُوداد معلوم ہوئی تو اُس نے یہی مناسب سمجھا کہ جُھل اُستاد کے پاس اپنے معزز و محترم دوستوں کی سفارش کرے۔

جُھل بھی لاعلم تھا۔ زورا، سارنے اور جمرو نے شاید کسی کو نہیں بتایا تھا کہ رات ہم سب کہاں گئے تھے اور کیا اَن ہونی ہو چکی تھی۔ ہم میں سے کسی کے بجائے جُھل نے نصیب میاں کو آواز دی۔ نصیب میاں پاس ہی بیٹھے تھے۔ دو قدم کا فاصلہ طے کر کے جُھل کے رُوبرو ہو گئے، اور اُنھوں نے صورتِ حال کا تخمینہ لگا کے دبے لہجے، بل کہ رفتِ گذشت کے انداز میں سارا ماجرا سنایا اور زیادہ تمہید نہیں باندھی۔ جُھل نے خاموشی سے سنا اور سر ہلانے لگا۔ "ٹھیک ہے اوم کار جی، صاحب بہادر! اِن لوگ نے اپن کو کچھ نہیں بولا تھا۔" اُس نے بھاری آواز میں کہا، "آپ ساتھ آئے ہو تو ہم کیا بولیں۔ اپنے لوگوں کو کھینچے رکھیں گے۔ یہی چاہتے ہو نا آپ؟"

"بس یہی اُستاد! ہم کو پتا تھا، ہم جُھل اُستاد کے پاس جا رہے ہیں۔" اوم کار ترنّتی آواز میں بولا اور اپنے مہمانوں سے مخاطب ہو کے کہنے لگا، "دیکھا آپ لوگوں نے، ہم کیا کہے تھے، کس آدمی کے پاس جا رہے ہیں۔ آخر کو اپنا پرانا ناتا ہے۔"

اُن چاروں نے ہاتھ جوڑ کے پھر جُھل کو نمسکار کیا اور سب سے معمر آدمی نے واسکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کے وزنی لفافہ نکالا اور جُھل کے آگے رکھ دیا۔

"یہ کیا ہے؟" جُھل نے تُرشی سے پوچھا۔

"اِسے رکھ لو اُستاد۔ اِن کی خوشی یہی ہے۔" اوم کار راز دارانہ انداز میں بولا۔

"آپ ساتھ آئے ہو، اپنے لیے اِتنا بہت ہے۔" جُھل نے کسمسا کے کہا، "اُٹھا لو اِسے صاحب، اور جا کے کسی مندر پہ چڑھا دو۔ ایک آدھ کی بلی ہوتے سے رہ گئی۔ اپنے کو پتا ہے، کس کے کارن۔"

"ٹھیک کہتے ہو اُستاد! بس بھگوان کی کرپا ہوئی۔" اوم کار نے ہاتھ پھیلا کے فسردگی سے اعتراف کیا اور لفافہ جُھل کے پیروں کی جانب کھسکاتے ہوئے بولا، "پر اِسے... اِسے تو اب سویکار ہی کر لو۔"

"نا نا، زیادہ مت بولو اوم کار جی!" جُھل نے اکھڑی ہوئی آواز میں کہا، "اب آپ جاؤ۔"

معمر شخص نے اوم کار کے اشارے پر ہچکچاتے ہوئے لفافہ اُٹھا لیا۔

وہ سارے جلد ہی چلے گئے۔

اُن کے جانے کے بعد جُھل نے ہم سے کوئی باز پُرس نہیں کی۔ وہ حقّے کے کش لیتا گُم سُم بیٹھا رہا۔ اِس اثنا میں توقع کے مطابق میرے نزدیک موجود جمرو، سارنے اور زورا کچھ اور پاس آ گئے، اور زورا نے میرے ہاتھ پر جسم کا سارا زور ڈال دیا۔ کچھ یہی حال جمرو اور سارنے کا تھا۔ اُنھوں نے میرے دونوں بازو جکڑ لیے، زبان سے کچھ نہیں کہا، لیکن آنکھیں بھی تو کلام کرتی ہیں اور کبھی کبھی تو زیادہ فصاحت اور بلاغت سے۔ لفظ تو لہجے کے محتاج ہوتے ہیں۔ آنکھیں تو بجائے خود لہجہ ہوتی ہیں۔

سورج واپسی کی جلدی میں تھا۔ اوم کار اور اُس کے دوستوں کو گئے گھنٹا، پون گھنٹا گزرا ہو گا کہ سونا گاچھی کے مکھیا اور اُس کے دو حواریوں کے ساتھ گلاب بانو اڈّے پر آن وارد ہوئی۔ واجبی بناؤ سنگھار کیے، نہایت سادہ لباس میں، چوڑی دار پاجامہ، لمبا کرتا، دوپٹے سے سر ڈھکا اور چادر میں بدن لپٹا ہوا۔ مٹھائی اور پھولوں کے ٹوکرے ساتھ لائی تھی۔ گذشتہ رات کی رُوداد سنانا چاہتی تھی کہ جُھل نے اُسے روک دیا اور صرف اتنا کہا، "کوٹھا ہی رہنے دو تو ٹھیک ہے۔"

گلاب بانو کے بدن میں جھرجھری سی آئی، سر جھکائے لجاجت سے بولی، "یہی ہو گا اُستاد، بندی کو رات کا سبق یاد ہے، آگے کوئی شکایت نہیں ہو گی۔"
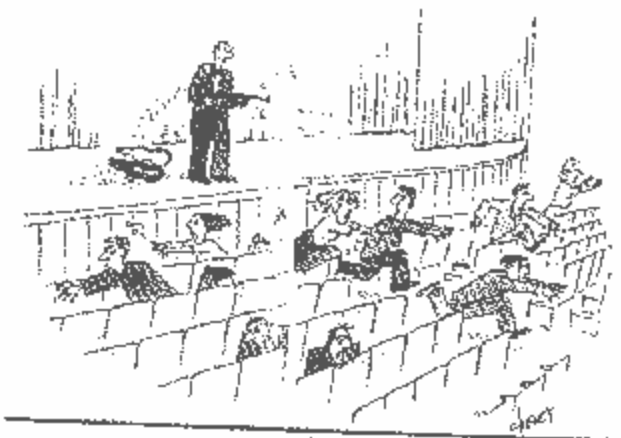
وہ اُٹھ گئی، چلتے چلتے اُس کی نظر مجھ پر پڑی اور آ کے میرے عین سامنے بیٹھ گئی۔ اُس نے مخصوص انداز میں مجھے تسلیم کی، اور اِدھر اُدھر اضطراری طور پر دیکھتے ہوئے آہستگی سے بولی، "بندی کو آپ کا انتظار رہے گا۔"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

اُس کی آواز اور دھیمی ہو گئی، کتراتے ہوئے لہجے میں جھجکتے ہوئے بولی، "جب آپ اشارہ کریں گے، گُل رُخ خدمت میں پیش ہو جائے گی۔"

میں نے آنکھیں میچ لیں۔

گلاب بانو پھر وہاں نہیں ٹھیری۔

مسلسل پانچ دن تک ہم آس پاس کی بستیوں میں جاتے رہے، روز سورج غروب ہوتے وقت اڈّے پر ہماری واپسی ہوتی تھی اور اُس وقت ایک اژدحام جُھل کا منتظر ہوتا تھا، دُکان دار، علاقے کے خاص آدمی، پرانی جان پہچان کے لوگ، مختلف اڈّوں کے اُستاد، کئی کارخانے داروں کی طرف سے نذریں آئی تھیں۔ پولیس کے کئی آدمی بھی سادہ لباس میں جُھل سے ملنے آئے تھے۔ لوگوں کی بے اندازہ آمد کی ایک وجہ یہ تھی کہ شام سے رات گئے تک صرف جُھل چوکی پر بیٹھتا تھا او[ر] اُس نے ساتویں دن اپنی واپسی کا اعلان کر دیا تھا۔ اِدھر اُدھر اڈّے کے بہت سے معاملات اُس کی آمد کی وجہ سے رُکے ہوئے تھے۔ علاقے کے بعض لوگ اپنے ذاتی مسائل، مناقشے، تقضیے لے کے اُس کے پاس آنے لگے تھے۔ جُھل کو ساری رُوداد سُنی مخالف لوگوں کی طلبی، اُن سے جرح کرنی اور فیصلہ سنانے

ناروا کام بھی کرنا پڑتا تھا۔ اِن میں چند خاندانوں کے طلاق کے معاملات تھے اور کام چوری، کاہلی، گھر کا خرچ ادا نہ کرنے، مار پیٹ، گالم گلوچ، کسی کی جگہ پر ناجائز قبضے کرنے کے چھوٹے موٹے واقعات بھی شامل تھے۔ اِن لوگوں سے بٹھل کے پرانے مراسم تھے۔ شادی بیاہ میں بٹھل کی مرضی کو دخل رہا تھا۔ علاقے کے لوگوں میں ایسی شناسائی کے لیے جامو کو ابھی بہت زمانہ چاہیے تھا۔ بھتّے کی تقسیم، علاقوں کی حدود کا تعین اور پولیس سے باہمی طور پر نمٹنے کے مشوروں میں باقی وقت نکل جاتا۔ تین دن سے یہی ہو رہا تھا۔ شام کو اڈّے پر آ کے بٹھل کو ایک پل کے لیے فرصت نہیں ملتی تھی۔ جامو اور اڈّے کے بہت سے آدمیوں کے کہنے پر بٹھل نے دو دن کا اضافہ اور کر دیا تھا۔ عمارت میں سب کے لیے کھانا تیار ہوتا رہا، لیکن کسی رات محفل نہیں جمی۔ بٹھل نے جامو کو سختی سے منع کر دیا تھا۔

پانچویں دن صبح ہی صبح مولوی صاحب کی تلاش کے بجائے بٹھل نے جیل خانے جانے کا عزم کیا۔ جامو، سارسے ٹے، زورا اور جمرو کے علاوہ میں بھی ساتھ ہو گیا۔ پہلے میرا ارادہ نہیں تھا، پھر میں نے خود کو تلقین کی، اڈّے کے آدمیوں کو جیل خانے سے یہ مغائرت زیب نہیں دیتی۔ بڈّا وکیل بھی ہمارے ہم راہ تھا۔ اڈّے کے لوگ چھوٹی بڑی مدت کے لیے ہمیشہ جیل میں رہتے ہیں۔ اِتنے عرصے بعد جیل کی حدود میں قدم رکھتے ہوئے دل گھبرانے لگا تھا۔ سب کچھ وہی تھا، وہی در و بام، وہی جالے اور دیواروں پر داغ دھبّے اور بوسیدگی۔ جیل میں وقت یوں بھی رینگتے ہوئے گزرتا ہے۔ یہاں میں نے سات سال کے قریب عرصہ گزارا تھا، ایک ایک دن گن گن کے۔ عملے کے بہت سے لوگ بدل چکے تھے، لیکن نچلے درجے کے بیش تر ملازم اپنی جگہوں پر تعینات تھے۔ وہ مجھے پہچان گئے اور مجھ سے لپٹ گئے۔ اِن میں جیلر صاحب کا پرانا خدمت گار رام داس بھی تھا، وہ تو رونے لگا۔ اُس کی کمر کچھ اور جھک گئی تھی۔ جن ملازموں نے ساری زندگی جیل کی چار دیواری میں قیدیوں کی نگرانی کرتے گزاری تھی، اُن میں اور قیدیوں میں کتنا فرق ہے۔ رام داس کی پوری زندگی بھی یہیں گزر گئی تھی۔ پُرانے جیلر کے بعد نیا جیلر آ جاتا تھا، رام داس وہیں قائم تھا۔ خاک روب اور سنتری وغیرہ جانے کب سے جیل کی دیواروں کے اندر مستقل ملازموں کے لیے مخصوص مکانات میں مقیم تھے۔ قیدی بدل جاتے تھے، یہ لوگ یہیں رہتے تھے۔ جیل کے اِن ملازموں کو قیدیوں کے ساتھ رہتے ہوئے یقیناً اُنسیت ہو جاتی ہوگی، تو پھر قیدیوں کی رہائی پر بچھڑ جانے کا دُکھ بھی اُنھیں ہونا چاہیے۔ جیل کے اِن مستقل کارندوں کی حیثیت تو در و دیوار جیسی ہے۔ لوگ آتے، کچھ وقت گزارتے اور اپنے راستوں پر چلے جاتے۔ یہاں عمر قید کے لوگ بھی موجود تھے، مگر اُن کی اسیری کی بھی ایک مدت ہوتی ہے، بچھڑ جانا اُنھیں بھی ہوتا ہے۔ یہ کیسا عجیب ہے کہ ایسی رہائی کسی کے لیے خوشی، کسی کے لیے دُکھ کا باعث ہے۔

سب کو ایک ساتھ دیکھنا ممکن نہیں تھا۔ بٹھل نے بڈّے وکیل کو خاص خاص نام بتائے تھے، صرف اُنھی سے ملاقات ہو سکتی تھی۔ ہمیں اندر جانے کی اجازت نہیں مل سکی۔ ملاقاتیوں کے حصّے میں یکے بعد دیگرے لوگ آتے رہے اور بٹھل کو دیکھ کے نعرے لگاتے، اُچھلتے کودتے رہے۔ بٹھل کو ہر ایک کے جیل جانے کا پس منظر معلوم تھا۔ وہ اُن کی کوتاہیوں کی نشان دہی کرتا اور تسلّی تشفّی دیتا رہا کہ اُن کے پیچھے اُن کے گھروں کی خبر گیری کی جا رہی ہے اور بڈّا وکیل اُن کی ضمانتیں، یا سزائیں کم کرانے کی کوششیں کر رہا ہے۔ سب کی زبان پر ایک ہی سوال تھا کہ بٹھل آخر کب مستقل طور پر اڈّے کی چوکی سنبھال رہا ہے۔ بٹھل نے کوئی حتمی جواب نہیں دیا۔ سب سے یہی کہا کہ دیکھو، ابھی وقت نہیں آیا ہے، ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

[اُن] طرف سے لوٹتے میں جیلر صاحب کا مکان تھا۔ [وہ]یں سونیا رہتی تھی۔ رام داس کو یاد تھا کہ جیلر صاحب کی [بیگم نے] میں نے سونیا کو پڑھانا شروع کیا تھا۔ سونیا کے انجام کا [رام د]اس کو کچھ معلوم نہیں تھا۔ میں نے بھی اُسے نہیں بتایا، اپنے [آنسو]، آنکھوں میں چھپائے رکھے۔ بے ضرورت سچ نہیں بولنا [چاہ]یے۔ سونیا رام داس کا بہت خیال رکھتی تھی۔ اُسے 'چاچا' [کہ]تی تھی۔ رام داس سچ جان لیتا تو وہیں ڈھیر ہو جاتا۔ کاش، اُس دن ایک گاڑی کی تاخیر ہو جاتی، ہم دوسری گاڑی بھی [چ]ھوڑ سکتے تھے۔ یوں نہ سونیا ملتی، نہ وہ سب کچھ پیش آتا جو سینے میں [پیو]ست ہو چکا تھا۔ جب بھی اُس کا خیال آتا، دل ڈوبنے، دل [ڈ]ولنے لگتا۔ جیلر صاحب کا مکان دیکھ کے بھی میرا یہی حال [ہ]وا۔ میں نے بہت اُس طرف دیکھنے سے اجتناب کرنا چاہا، [لی]کن میری نگاہیں بے اختیار اُسی جانب اُٹھتی تھیں۔

بٹھل نے نچلے درجے کے ہر کارندے کو کچھ نہ کچھ نقدی [دی]۔ دوپہر کو ہم وہاں سے چلے آئے، جیل خانے سے اور [اُ]س مرضی سے۔

اُسی شام بٹھل نے آنے والے دن اپنی روانگی کا اعلان کر دیا۔ آخری رات اڈّے پر بہت بھیڑ تھی۔ اُس رات بھَلّن صاحب بھی دکان بند کر کے گلوریوں کے پُڑوں، پھولوں کی ٹوکریوں اور مٹھائی کے دونوں سے لدے پھندے اڈّے پر آئے اور اُنھوں نے بٹھل کی گردن موتیا اور گلاب کے ہاروں سے ڈھانپ دی۔ چھنّن صاحب اور نصیب میاں نے کچھ دیر کے لیے محفل زعفران زار بنا دی تھی۔ سارے لوگ اور مچل رہے تھے کہ ایک بار پھر بازار کی طرف چلیں، لیکن رات گزرتا گیا اور رات ہو گئی۔ بازار کا وقت ہی نکل گیا۔

میرا اندازہ تھا، بل کہ مجھے یقین تھا کہ کلکتے سے بٹھل سیدھا فیض آباد کا رُخ کرے گا۔ فیض آباد سے ہمیں روانہ ہوئے ساڑھے تین مہینے سے اوپر ہو رہے تھے۔ وہاں اب فروزاں بھی تھی۔ اُسے حویلی میں جا بسے کم و بیش اِتنی مدت ہو چکی ہے۔ اُن کے لیے بھی، ہمیں فیض آباد کا ایک پھیرا لگانا چاہیے تھا۔ اُن سب کو دیکھنے کو میرا جی بھی بہت چاہ رہا تھا۔ حویلی کی طرف سے بٹھل اِتنا بے غم، بے فکر تھا، جیسے وہاں کبھی کسی پیچیدگی کا امکان ہی نہیں ہے، شاید زرّیں کی وجہ سے بھی کو یقین تھا کہ جہاں زرّیں موجود ہوگی، وہاں کوئی اُلجھن ہی نہ پیدا ہوگی، لیکن خود زرّیں تو بہت گراں بار ہو سکتی ہے۔ میں نے بٹھل سے بات کرنی چاہی، پھر یہ سوچ کے رہ گیا کہ زرّیں کا خیال تو اُسے مجھ سے زیادہ ہونا چاہیے۔ اُسے کوئی فکر نہیں تو مجھے کاہے کی حلا ہیلی پڑی ہے۔ میری طرح اُس کا دماغ بہکتا بھی نہیں ہے، میں نے چپ سادھے رکھی۔

بٹھل نے زورا اور جمرو سے کہا تھا کہ وہ چاہیں تو فیض آباد یا بمبئی چلے جائیں، لیکن دونوں نے ہمارے ساتھ چلنے کو ترجیح دی۔

دوسرے دن صبح ہمیں رخصت کرنے کے لیے سارا اڈّا ہی ہاوڑا اسٹیشن پر سمٹ آیا تھا۔ اُنھوں نے اتنی چیزیں ساتھ کر دیں کہ ڈبے میں رکھنا اور سنبھالنا دشوار ہو گیا۔ جمرو اور زورا نے اگلے اسٹیشن پر بہت سی چیزیں لوگوں میں بانٹ دیں۔ ہم دوبارہ لکھنؤ کی طرف جا رہے تھے۔ کئی دن لکھنؤ کے اطراف، گورکھ پور، اعظم گڑھ، بہرائچ، بستی، گونڈا، ایٹا، اٹاوہ، فتح گڑھ، بدایوں، فرخ آباد، ہردوئی کے شہروں میں گھومتے رہے اور سیتاپور، فتح پور، بارہ بنکی اور سلطان پور ہوتے ہوئے کان پور آ گئے۔ اِن بستیوں سے کہیں بھی فیض آباد کا فاصلہ سَو، سوا سَو میل سے زیادہ نہیں تھا، لیکن بٹھل کا جیسے فیض آباد سے کوئی سروکار ہی نہیں رہا تھا، کان پور سے اُس نے سیدھے دلّی آ کے دَم لیا۔

کلکتے سے دلّی پہنچتے پہنچتے پچیس دن لگ گئے تھے، دلّی میں مولوی صاحب کی موجودگی ممکن نہیں تھی، اِس لیے کہ سَو میل دُور

مراد آباد میں اُن کے ہم شہروں کو ضرور سُن گُن مل جاتی۔
دلّی کے اطراف گنجان شہر آباد ہیں۔ ہم نے وہاں ایک پہر بھی
ضائع نہیں کیا اور روہتک، حصار، سرسا، بھٹنڈا، کرنال،
پانی پت، سونی پت اور پٹیالے کا قصد کیا۔ ان شہروں سے واپس
دلّی آ کے گڑگانو، فرید آباد، متھرا، علی گڑھ، آگرہ، بھرت پور،
جے پور، سوائی مادھو پور، ٹونک، کوٹا، میواڑ، چتوڑ گڑھ، اودے
پور، جلور، اجمیر، ناگور، جودھ پور اور باڑمیر کے علاقے سے
گزرتے ہوئے میر پور خاص آ گئے۔ ظاہر ہے، ہمارا کام شہر
کے تاریخی مقامات اور تفریح گاہیں دیکھنا نہیں تھا۔ شہر میں
داخل ہوتے ہی مسلمان آبادیوں میں جا کے گھروں، دُکانوں،
مسجدوں اور مدرسوں میں اپنا سبق دُہرانا اور ہر جگہ ایک ہی
جواب سننا تھا۔ اِس تکرار سے اب ایسی تکلیف نہیں ہوتی تھی۔
عادت بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ آبادی کی نسبت سے بعض شہروں
میں ایک دن، بعض میں دو دن لگ جاتے۔ اگلی منزل کے لیے
شام کو سواری مل جاتی تو ٹھیک، ورنہ وہیں بسیرا کر لیتے۔ رات کو
کسی بستی میں فراغت ہوتی اور نوٹنکی لگی ہوتی، یا سرکس ہو رہا
ہوتا تو دو تین گھنٹے یوں گزر جاتے۔ صبح سے شام تک گھوڑا گاڑی،
لاری، ریل گاڑی، یا بس پیدل چلتے رہنا۔ کبھی سرائے، کبھی
ہوٹل، جہاں جیسی جگہ مل جائے، جس وقت جیسا کھانا مل
جائے۔ میر پور خاص سے حیدر آباد (سندھ) پہنچے تو اسٹیشن کی
سیڑھیوں پر ایک بچے کو بچاتے ہوئے زورا کا پیر رپٹ گیا۔
ہڈی بھی چٹخ گئی تھی۔ باقی ہم تینوں کے پیروں میں بھی بیڑی
پڑ گئی۔ تین دن تک زورا کا علاج ہوتا رہا، چوتھے دن بھی وہ سفر
کرنے کے قابل نہیں تھا۔ جمرو کو اُس کی نگرانی پر چھوڑ کے
میں اور بھگل شہر ٹھٹا اور سُجاول ہوتے ہوئے کراچی چلے
آئے۔ بمبئی کی طرح کراچی بھی ساحلی شہر ہے۔ بمبئی سے بہت
ملتا جلتا، لیکن یہاں اُتنی بھیڑ نہیں تھی۔ مسلمانوں کی ایک
کثیر آبادی تھی۔ ہمیں دو دن ٹھیرنا پڑا۔ مسلمان آبادیوں میں
شاید ہی کوئی جگہ رہ گئی ہو جہاں ہم نہ جا سکے ہوں۔ چار دن کے
غیاب کے بعد ہم واپس حیدر آباد آئے تو زورا کے پیر کی
تکلیف بڑی حد تک کم ہو گئی تھی، چلنے پھرنے لگا تھا۔ احتیاطاً
دو ایک دن کے آرام کی اور ضرورت تھی۔ اِن دو دنوں میں

میں اور بھگل ہالا، ٹنڈو آدم اور نواب شاہ ہو آئے۔ بھگل کا
ارادہ اب حیدر آباد سے کوٹکا شہر جانے کا تھا۔ اُن دنوں امرت
سر سے آئی ہوئی گانے بجانے اور کھیل تماشا کرنے والوں کی
ایک ٹولی کی بڑی دُھوم تھی۔ واقعی کچھ غلط نہیں تھا۔ انھیں ہنسانا
رُلانا خوب آتا تھا۔ وقت کا کچھ احساس ہی نہیں ہوا۔ اُس رات
نوٹنکی دیکھ کے واپس آتے ہوئے جمرو نے دبی زبان میں بھگل
سے کہا، ”اُستاد! ایک بات بولیں۔“
”کیا ہے رے۔“ بھگل نے ہڑک کے پوچھا۔
”کچھ اور مت سمجھنا اُستاد، ماں قسم۔“ جمرو نے جلدی سے
کہا، ”اور صرف اپنی طرف سے بولتا ہوں۔“
”پھوٹ بھی تو مُنہ سے۔“ بھگل بگڑ کے بولا۔
”بولتے ہیں، اِدھر سے بمبئی بہت نزدیک ہے اور سید عارف
ہے۔ چار پانچ روز اُدھر اپنا چہرہ دکھا کے اور اُن لوگ کا دیکھ کر پھر
لوٹ جائیں تو کیسا...“ جمرو نے معذرت آمیز لہجے میں کہا۔
جمرو بالکل ٹھیک کہہ رہا تھا۔ کلکتے سے چلے ہوئے ہمیں تقریباً
مہینے کے قریب ہو رہے تھے۔ میرا خیال تھا، بھگل کا دماغ
گھوم سکتا ہے، وہ بھڑک کے جمرو سے کہہ سکتا ہے کہ اسے ایسی
فکر ہے تو خود چلا جائے۔ بھگل کے سکوت پر مجھے حیرت ہوئی،
حالاں کہ نہ زورا نے تائید کی تھی نہ میں نے۔ میں نے تو طے
کر لیا تھا کہ اِس سلسلے سے میں بھگل سے کبھی کوئی بات ہی نہیں
کروں گا۔ وہ رات ہم نے سرائے میں گزار دی۔ دوسرے دن صبح
کوٹکا جانے کے لیے حیدر آباد شہر سے جُڑے ہوئے کوٹری جنکشن
کے بجائے سیدھے حیدر آباد اسٹیشن کا رُخ کیا اور کراچی آ گئے۔
چوتھے دن ہمیں بحری جہاز میں جگہ مل گئی۔
بنگال میں کئی بار ہم اسٹیمر میں بیٹھ چکے تھے، لیکن یہ
پورا جہاز تھا۔ یہاں سے وہاں تک پھیلا ہوا، کسی محلّے کی طرح،
جس طرف چاہو، گھومو پھرو۔ ہم نے زیادہ پیسے دے کے
کیبن میں جگہ محفوظ کرانی چاہی تھی، مگر گورے مسافروں کی
تعداد زیادہ تھی۔ جہاز راں کمپنی بھی ولایتی تھی، پہلے گوروں کو
ترجیح دی جاتی تھی۔ ہمیں عرشے کے ٹکٹ ملے۔ عرشے کا
مطلب ہے، جہاز کا سائبان اور صحن۔ اچھا ہی ہوا جو کیبن کا
ٹکٹ نہ مل سکا، عرشے کا لطف کچھ اور تھا۔ جہاں جی چاہے،

سب رنگ

اُترو۔ یہاں سرگرمی زیادہ تھی، طرح طرح کے مسافر، بیش تر
ہندستانی۔ گورے مسافر تمام کے تمام کیبنوں میں مقیم تھے۔
جہاز انگلستان سے آ رہا تھا، اِس لیے سارے کیبن بھرے
ہوئے تھے۔ ٹکٹ والے نے ہمیں بتایا تھا کہ خالی کیبنوں کی
کثرت ہو، تبھی ہندستانی لوگوں کو ٹکٹ کی فراہمی پر غور کیا جاتا
ہے۔ گورے مسافر عرشے پر آ کے بھی ہندستانی مسافروں
سے الگ تھلگ ہی رہتے تھے۔ عرشے کے مسافروں کے لیے
چائے خانہ بھی الگ تھا۔ کیبن کے مسافروں کے لیے مخصوص
چائے خانے میں شراب کا بھی اہتمام تھا۔ ٹھیک ایک بجے دوپہر
جہاز نے بندرگاہ سے حرکت کی۔ چال میں میانہ روی تھی،
ٹھمک ٹھمک۔ خاصی دُور آنے کے بعد بھی رفتار میں کوئی ایسا
فرق نہیں آیا۔ زورا کے پیر میں ہلکی سی لنگ باقی تھی، لیکن جیسے
کوئی کھلونا ہاتھ لگ جائے۔ شروع شروع میں وہ عرشے پر
دوڑتا رہا۔ جمرو بھی اُس کے ساتھ اِدھر اُدھر قلانچیں بھرتا رہا۔
تھوڑی دیر میں ہم لوگ جہاز سے مانوس ہو گئے تھے۔ اِس سے
دل چسپ سفر شاید کوئی اور نہیں ہوتا، جیسے ہنڈولے میں بیٹھے
مسلسل کوئی جھولا جھلاتا ہو۔ سمندری لہروں کا بھی کیا زور
ہے، اتنا بڑا جہاز ڈگمگا دیتی ہیں۔
شام ہوتے ہوتے گورے مسافر آگے پیچھے سیڑھیوں سے
اُتر کے عرشے کی طرف آنے لگے۔ اُن کے چہروں پر آگ
سی جل رہی تھی، بھبھوکا چہرے، سب کے سب اِتنے تر و تازہ جیسے
آج ہی پیدا ہوئے ہوں۔ عورتیں بھی اُن کے ساتھ تھیں،
رنگ برنگے لباس سے آراستہ۔ عرشے کے ہندستانی مسافر
گوروں کو بڑھتا دیکھ کے اپنی اپنی جگہوں پر سمٹتے گئے۔ وہ
دُزدیدہ نگاہوں سے مختصر لباس میں چمکتی دمکتی، اپنے آپ سے
بے پروا عورتیں دیکھتے تھے۔ گوری عورتیں اُن پر ایک اچٹتی سی
کراہتی نظر ڈال کے سامنے سے گزر جاتی تھیں۔ گورے ہم سے
یوں بھی الگ دکھائی دیتے تھے۔ نسل کا تو فرق تھا ہی، مخلوق بھی
کوئی اور معلوم ہوتے تھے۔ اُن کی چال میں ایک تمکنت،
تیوروں میں بڑی شان و شوکت تھی۔ اُن کی مجموعی وضع قطع میں
بُردباری تھی، محتاط انداز میں ہنستے تھے۔ عورتیں فرش پر پھونک
پھونک کے قدم رکھتی تھیں۔ نگاہوں میں تجسس تھا اور تجسس میں

سب رنگ

* * * * * * * *

متانت تھی۔ گوروں کے بچے بالکل ہوبہو، چینی گُڈے گڑیا کی
مثال ہوتے ہیں۔ جی چاہتا ہے، گود میں بھر کے خوب پیار کرو،
گالوں کی چٹکیاں بھرتے رہو۔ اُوپر، اپنے اپنے کیبنوں سے
نیچے آ کے کچھ گورے چائے خانے کی طرف چلے جاتے تو کچھ
جہاز کے سرے والے عرشے کی جانب بڑھ جاتے اور جنگلے سے

ٹیک لگائے لمبی لمبی سانسیں کھینچ کے تازہ دمی کی مشق کرتے رہتے۔ اِدھر سورج ڈوب رہا تھا۔ سمندر میں یہ منظر نہایت سحر انگیز ہوتا ہے۔ مغرب کی جانب اُفق میں شفق کی سُرخی پھیلتی گئی۔ لگتا تھا، سورج رفتہ رفتہ سمندر میں اتر رہا ہے، اور یہ آگ اور خون اُس کی وِداعی کا ماتم ہے۔ مغرب میں دُور کہیں آسمان جل اُٹھا تھا۔ جب تک سُرخی پر سیاہی غالب نہ آ گئی، گورے وہیں کھڑے غروبِ آفتاب کا نظارہ کرتے رہے۔ ہر چند غروب اور زوال سے انھیں کوئی نسبت نہیں تھی۔ اُنھوں نے داستانیں ہی پڑھی ہوں گی۔ کہتے ہیں، کم یابی و نایابی اشتیاق فزوں کرتی ہے۔ گوروں کے چلے جانے کے بعد عرشے کے کنارے والا حصہ خالی ہو گیا اور دُور دُور کھڑے ہندستانی مسافروں نے پھر وہاں تسلط جما لیا، مگر اب اندھیرے کے سوا وہاں کیا رکھا تھا۔

ساری روشنیاں جلا دی گئی تھیں اور چاروں طرف سے تاریکی میں گھرا ہوا جہاز اُس وقت روشنی کا جزیرہ بن گیا تھا۔ روشنیاں اُبلتی کوندتی لہروں پر منتشر ہوتیں تو بجھتے جلتے ستاروں کا گمان ہوتا۔ نچلے عرشے پر ایک معقول جگہ لتا کے میں، زورا اور جمرو چہل قدمی کرتے جہاز کے عقبی حصے کی طرف چلے آئے۔ پاس ہی گوروں کا چائے خانہ، یا عشرت کدہ تھا۔ شیشے، رنگ اور روشنی نے گڈمڈ ہو کے وہ جگہ طلسماتی سی کر دی تھی، خواب کا سا کوئی احساس۔ باہر سے نظر آ رہا تھا کہ زندگی وہاں بیٹھے ہوئے لوگوں کی اسیر ہے۔ دُنیا میں اُنھیں کوئی غم نہیں ہے اور خدا اُن سے بہت خوش ہے۔ اندر سبھی چہک رہے، چہک رہے تھے، شگفتہ اور شاداں۔ میں نے کہیں پڑھا، یا سنا تھا کہ گورے رات کا بہت اہتمام کرتے ہیں، گورے کیا، تقریباً سبھی دولت مند۔ وقت بھی تو خریدا جاتا ہے۔ جن کے پاس دولت ہوتی ہے، وہ اِسے خرید لیتے ہیں۔ وقت خریدنے سے مراد راحت افزا، نشاط انگیز ساعتوں کی خریداری ہے۔ بے شک، اِس طرح وقت بڑھایا نہیں جا سکتا۔ یہ میعاد کی جنس، یا بکاؤ مال نہیں ہے۔ ورنہ آدمی ساری دولت لُٹا کے بس اِسے خریدنے کی جُستجو کرتا، اپنا وقت سَو برس سے بڑھا کے دو سَو برس کر لیتا، تین سَو برس، ہزار برس۔ جتنی دولت آ گئے ڈالو، اُتنے ہی ماہ و سال بڑھا لو، مگر وقت عدد اور پیمائش میں نہیں مل پاتا تو

قدر میں ضرور مل جاتا ہے، کیفیت میں ضرور مل جاتا ہے۔ ترنّج وقت کی خزاں میں پھول، حبس میں دریچے، تاریکی میں چراغ! خریدنے کا مطلب بھی وقت میں اضافہ ہے۔ نامہرباں وقت کو مہرباں کرنے، دل چسپ اور دل کشا وقت کا انتخاب تو آدمی کے بس میں ہے۔ یہ کارِ مسیحائی اور کرشمہ کاری بہت کچھ دولت کے پاس ہے۔ جو لوگ چراغاں کر کے، نفیریاں بجا کے اور بام و در سجا کے اشتہا انگیز غذاؤں اور معطر صحبتوں کی دعوت دیتے ہیں، وہ اصل میں وقت بیچتے ہیں۔ وہ گرہیں کھولنے، حبس دُور کرنے کا کاروبار کرتے ہیں۔ جگہ جگہ یہ دکانیں کھلی ہوئی ہیں۔ شرط صرف دولت ہے اور طلب ہے۔ بے شک رسد بھی مشروط ہے کہ صحرا میں سونے کے آدمی کی طلب بھی ریت ہے اور آدمی ہی صحرا ہو تو سب بے کار ہے، لیکن دولت سے چند ایک سرکشاں، آشفتگاں کی نہیں تو بے شمار تشنہ لباں، نا آسودگاں کی سیری ہو جاتی ہے۔ کیفیت کی زندگی، کمیت کی زندگی کا حساب کتاب کیا جائے تو دولت مند بیش تر اپنے منشا کی اور الغرض بڑی زندگی گزارتا ہے۔

سامنے کے چائے خانے میں گورے باہر کی دُنیا سے بے خبر ایک دوسرے میں گم تھے۔ کاؤنٹر کے گرد بیٹھے بدست جام پر جام لُنڈھا رہے تھے۔ میزوں پر بھی پیالے چھلک رہے تھے۔ موسیقی کی ہلکی ہلکی تانیں باہر تک آ رہی تھیں۔ وسط کی کھلی جگہ پر مرد عورتیں بانہوں میں بانہیں ڈالے رقص کر رہے تھے۔ ایک جانب کونے میں دیوار پر آویزاں ہدف پر چھوٹے چھوٹے تیر پھینکنے کا مقابلہ جاری تھا۔ جوئے کی گول میز کے اطراف بھی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ ریستوراں کے کسی کمرے میں گوروں کے محبوب مشغلوں، بلیرڈ، ٹیبل ٹینس، برج وغیرہ کا اہتمام بھی ہونا چاہیے۔ سارا ماحول خیال آفریں تھا۔ جھروکوں اور شیشوں کے اُس پار ہندستانی مسافر حیرت سے یہ انجمن آرائی دیکھتے تھے۔ میرے لیے یہ سب کچھ نیا نہیں تھا۔ کرشنا جی کے ساتھ بمبئی کے کلب میں مجھے اِن مناظر کا تجربہ ہو چکا تھا، پھر رَما کے ساتھ بھی...

جمرو پھر کہنے لگا، "تھوڑی دیر کے لیے اندر چلتے ہیں لاڈلے!"

"شاید نہیں جا سکتے۔" میں نے نرمی سے کہا۔

"کیوں، کیوں نہیں جا سکتے؟"

"یہ ہمارے لیے نہیں ہے۔"

"وہ کیوں نہیں ہے؟" وہ ... بولا۔

"وہ بس نہیں ہے۔" میں نے ناگواری سے کہا۔

"باہر لکھا ہوا ہے؟"

"لکھا ہوا تو شاید کہیں نہیں ہے۔" میں نے اِدھر اُدھر تاکتے ہوئے کہا، "لیکن صاف نظر آ رہا ہے، وہاں ہم جیسا بھی کوئی نہیں ہے اور، اور ہم اندر جا کے کریں گے بھی کیا۔ اُن کے درمیان خود کو اجنبی لگیں گے۔ اگر دروازے پر دربان نے روک دیا تو بکر کری الگ ہو گی۔"

"کیوں روکے گا حرام کا۔ سارا کھیل دمڑی کا ہے۔ اپنی جیب میں بہت پیسے ہیں، قسم سے۔" جمرو جیب تھپ تھپاتے ہوئے بولا۔

"ہمارے کپڑے! اُن کے ہاں لباس کا بڑا خیال رکھا جاتا ہے۔ وقت اور موقع کا الگ الگ لباس ہوتا ہے۔"

"پر اُدھر سب کون سے ایک کپڑوں میں ہیں۔" جمرو تڑاخ کے بولا، "ہمارے بھی کپڑے گھٹیا اور گندے نہیں ہیں، ہمارے ابھی تو بدلے ہیں۔"

"لیکن اُن جیسے بھی نہیں ہیں۔"

"ابھی ایک بار ٹرائی مار کے دیکھتے ہیں، کیا جاتا ہے راجا بابا؟" زورا نے جمرو کو اور مہمیز کیا، "اُودر اپنا ہندستانی بیرا بھی تو ہے۔ گھومتا پھیرتا ہے کیسا کٹھ پتلی کا مافک، اور بیڈا بچہ والا ابھی ایک دم کالا ہے۔ سالا ابھی مدراسی ہے کہ بنگالی۔"

"وہ خدمت گار ہیں، وہاں کے ملازم۔" میں نے اُنھیں سمجھانے کی کوشش کی۔

"چل کے دیکھتے ہیں لاڈلے!" جمرو بے پروائی سے بولا، "وہ دروازے پہ کھڑا تھانے دار زیادہ سے زیادہ کیا کرے گا۔ روک دے گا نا؟"

"ہاں، لیکن یہ اچھا تو نہیں ہو گا۔"

"نیچے پانی میں تو نہیں پھینک دے گا۔"

"اوہو، تم سمجھتے کیوں نہیں۔" میں نے چڑ کے کہا، "وہ لوگ ہماری سنگت پسند نہیں کرتے۔"

"تو ہندستانی بیرے کیوں رکھتے ہیں اور اِدھر اتنی دُور کالوں کے دیس میں آ کے کُنڈلی مارے کیوں بیٹھے ہوئے ہیں۔"

"یہ اُنھی سے جا کے پوچھو۔"

"نہیں نہیں، کیا اُلٹا بولتا ہوں۔"

"میں نے تم سے کہا تھا کہ پلیا پر گاڑی آہستہ چلانا..."

اُن سے بحث تکرار فضول تھی۔ کچھ ماحول کا اثر تھا، مستی میں آئے ہوئے تھے۔ میں نے بیزاری سے کہا، "ٹھیک ہے، حسرت نکال لو۔"

میرا خیال تھا، وہ باز آ جائیں گے، مگر مجھے ٹھیلتے ہوئے وہ چائے خانے کی جانب بڑھ گئے۔ چند قدم بعد ہی اندر جانے کا راستہ تھا۔ بند دروازے پر سکھ دربان منڈلا رہا تھا۔

"تم ابھی سردار سے تھوڑا گٹ پٹ کرنے کا ہے راجا دادا! سمجھے گا، آدھا فرنگی ہے۔ کالا تو تم بالکل بھی نہیں ہے۔" زورا نے سرگوشی میں کہا۔

مجھے ہنسی آ گئی، "اور اِس پر نہیں مانا تو چاقو کی جھلکی دکھائیں گے۔ تمنچا بھی ہے اپنے پاس۔"

زورا بل کھا گیا۔

وہی ہوا، ہمیں بڑھتا دیکھ کے سکھ دربان دیوار بن کے حائل ہو گیا۔ اُس نے تحکمانہ انداز میں پوچھا کہ ہم کہاں جاتے ہیں۔

"دکھائی نہیں پڑتا کیا۔" زورا کھردری آواز میں بولا، "اپن تم کو اچھا لگتا ہے۔ مُفتی میں نہیں جا رہا۔ مال خرچ کرے گا، ابھی ایدر کدری لکھا وا ہے اپن کو روکنے کا؟"

سکھ دربان زورا کے لہجے سے متاثر ہوا اور کسی قدر رسائی

سے اُس نے بتایا کہ جہاز کے کپتان کے حکم کے مطابق جب تک گورے چائے خانے میں بیٹھے ہوں تو ہندستانیوں کو، چاہے وہ کیبن کے مسافر ہوں، اندر جانے نہ دیا جائے۔

جمرو اور زورا کا ارادہ اُس سے حجت کرنے کا تھا، لیکن سردار معاملہ فہم آدمی تھا۔ اُن دونوں کے تیور بھانپ کے بے بسی کا اظہار کرنے لگا۔ جمرو اور زورا کے پاس اَب یہی رہ گیا تھا کہ وہ سردار کی گردن پہ دو چار ہتڑ لگائیں، یا چاقو بھونک دیں۔ اُنھوں نے سردار کے ہاتھ پر رُپے رُپے کے دو سکے رکھے اور لوٹ پڑے۔ سردار نے حیرت سے اُنھیں دیکھا، سَٹ پٹا کے سلام کیا اور رُپے جیب میں رکھ کے بولا کہ وہ مجبور ہے۔ اُس کا بس چلے تو... وہ ہاتھ جوڑ کے منت کرنے لگا۔

جمرو اور زورا سر جھکائے وہاں سے چلے آئے۔ اُن کی دل جوئی کے لیے میں اُنھیں عرشے کے مسافروں کے لیے مخصوص چائے خانے میں لے آیا۔ یہاں بہت شور تھا۔ سامنے کاؤنٹر پر کشتیوں میں رات کا کھانا لے جانے والوں کی قطار لگی ہوئی تھی۔ ایک طرف چائے، اُس سے ملحق شراب کا کاؤنٹر تھا۔ مشکل سے ایک کونے میں لوگوں کے اُٹھ جانے پر ہمیں جگہ ملی۔ جمرو اور زورا اپنے برابر والی میز پر ہندستانی مسافروں کے درمیان ایک گورے مسافر کو دیکھ کے اُچھل پڑے، "لاؤڈ ے! یہ بندر اِدھر کیوں بیٹھا ہے۔" جمرو پلکیں پٹ پٹا کے بولا۔

"آہستہ بولو۔ بہت سے گوروں کو ہماری زبان آتی ہے۔" میں نے چبے ہوئے لفظوں میں کہا۔

"پر یہ اِدھر کیوں بیٹھا ہے؟"

"اُس کی مرضی ہے۔"

جمرو اور زورا نے مجھ سے نہیں پوچھا کہ دونوں جگہ اُنھی کی مرضی کیوں ہے، اُن کی نظریں گورے کو حصار میں لیے ہوئے تھیں۔ گورے اِس طرح عام ہندستانیوں سے گھلتے ملتے جو نہیں تھے۔ وہ ایک پختہ عمر شخص تھا۔ وجیہ، چاق چوبند، خوش اطوار، چوڑی پیشانی، سر کے آدھے بال اُڑے ہوئے، خش خشی داڑھی، بھرے بھرے گال، گہری چمکیلی آنکھیں، درمیانہ قد، نہ اِتنا فربہ، نہ ایسا دُبلا۔ ہندستانی مسافروں سے وہ ٹھہر ٹھہر کے، ایک ایک لفظ پر زور دے کے اپنا مفہوم واضح کرنے کی تگ و دو کر رہا تھا۔

اُس کے مخاطبوں کی انگریزی واجبی تھی۔ مدراسی معلوم ہوتے تھے، تمل زبان آتی ہوگی۔ کچھ جھجک بھی رہے تھے، جو کچھ کہتے کر دیس یس، نو نو کر رہے تھے۔ بے قرار انگریز اُن سے ہندستان کی بابت معلوم کرنا چاہتا تھا۔ لوگ اپنی بساط کے مطابق جواب دے رہے تھے۔ وہ اُن کے جواب اخذ کرنے کی کوشش کرتا اور بار بار سر ہلاتا تھا۔ شور کی وجہ سے اُن کی آواز صاف سنائی نہیں دے رہی تھی، حالاں کہ بالکل برابر والی میز تھی۔ گورے کا انداز اپنے ہم وطنوں سے قطعی مختلف تھا۔ بے ساختہ، مشتاقانہ، تصنع سے مبرا۔

"کیا بولتا ہے چقندر کی اولاد؟" جمرو نے بھنچی ہوئی آواز میں پوچھا۔

میں نے آنکھیں میچ کے اُسے روکا۔ "ذرا سننے دو۔"

"اپنے کو کچھ کھسکا واپیائی دیتا ہے۔"

میں نے اشارے میں تردید کی۔ "بالکل نہیں۔"

"پھر کیا آٹے دال کا بھاؤ پوچھتا ہے۔ سالا بے مطلب تو اِدھر نہیں بیٹھ سکتا۔"

"کوئی سیاح ہے، شاید سیر کو آیا ہے۔"

"سیر کو!" جمرو تمسخر سے بولا، "اِدھر کیا ملے گا جوتی والے کو، ناٹ کھاٹ، کھپریل، اُپلے..."

"صرف یہی تو نہیں، یہاں تاج محل، لال قلعہ، اجنتا، ایلورا، ٹیکسلا، موئن جو دڑو، ہمالہ، دریا، جنگل، شکار، جانے کیا کیا۔ بہت سی چیزوں میں اُن کے لیے کشش ہے۔ ہندستان تو اِن کے لیے جادو نگری، بل کہ کسی سمندر کی طرح ہے۔"

اِس اثنا میں گورے نے ہماری دل چسپی محسوس کر لی تھی۔ اُس نے "ہیلو" کہہ کے اور ہاتھ اُٹھا کے مجھے سلام کیا۔ میں نے بھی مسکرا کے جواب دیا۔ ہماری میز پر ایک کرسی خالی تھی۔ گورے نے اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے لوگوں سے معذرت کی اور بہ عجلت ہماری طرف چلا آیا۔ "اگر میں مخل نہ ہوں تو کچھ دیر کے لیے آپ کے پاس بیٹھ سکتا ہوں؟" اُس نے کرسی کا ہتھا پکڑتے ہوئے انگریزی میں پوچھا۔

"ضرور، ضرور۔" میں نے بھی انگریزی میں جواب دیا اور اُٹھ کے اُس کے لیے خالی کرسی پیچھے کر دی۔

اُس نے شکریہ ادا کیا اور ہاتھ بڑھا کے بولا، "میرا نام رابرٹ تھامپسن ہے۔"

اُس کے مصافحے میں بڑی گرم جوشی تھی۔ میں نے بھی اپنا نام بتایا۔

اُس نے زورا اور جمرو سے ہاتھ ملایا اور کرسی پہ بیٹھ گیا۔ رسمی فقروں کے بعد اُس نے شائستگی سے کہا، "ہندستان کا یہ میرا پہلا دورہ ہے۔"

"مگر آپ کو تو اچھی ہندستانی آتی ہے۔"

"اوہ!" وہ ہنس کے بولا، "ایسی بھی کہاں، یہاں آنے کے لیے تھوڑی شُد بُد حاصل کی تھی۔ میرا خیال ہے، کچھ بھی نہ کر سکا، اور ہندستان میں صرف ہندستانی ہی تو نہیں بولی جاتی۔"

"یقیناً، یہاں تو کہیں کہیں پڑوسی شہر میں بھی زبان بدل جاتی ہے۔" میں نے اُس کی تائید کرتے ہوئے پوچھا، "کیا آپ سیاحت کے لیے آئے ہیں؟"

"ہاں، ایک طرح سیاحت بھی کہ میں اِس دورے کا عرصے سے آرزومند تھا۔ بہت سن رکھا تھا آپ کے اِس طلسم کدے کے بارے میں۔"

میرا جی چاہا، کہوں، 'اب ہمارا کہاں۔' لیکن میں چُپ رہا۔

وہ کہنے لگا، "اب کہیں جا کے موقع ملا۔ سیاحت کے علاوہ اصل میں مَیں حکومتِ برطانیہ کی ہدایت پر ہندستان کے سیاسی اور سماجی رُجحانات کے مطالعے کی غرض سے آیا ہوں۔ یہاں اِن دنوں سیاسی بے چینی شدید ہے۔ انقلابی تحریکیں زور پکڑ رہی ہیں۔ شہر وسعت پا رہے ہیں اور صدیوں کا منجمد وہمی معاشرہ نئے صنعتی عہد میں داخل ہو رہا ہے۔ چناں چہ سماجی تغیرات لازم ہیں۔ عموماً تبدیلیاں ابتدا میں اجنبیت اور مغایرت سے دوچار ہوتی ہیں۔ اِن سے مانوس ہوتے ہوتے دیر لگتی ہے۔ حکومتِ برطانیہ کو عظیم ہندستان میں اپنی ذمے داریوں کا احساس ہے۔ مجھے کچھ اُنھی مسائل، اسباب و علل کی تحقیق، یا یوں کہیے کہ تیزی سے بدلتی ہوئی اِس ساری صورتِ حال پر ایک تجزیاتی مقالہ تیار کرنا ہے۔ آپ سمجھ سکتے ہیں، میرا کام جتنا پیچیدہ ہے، اُتنا اہم بھی ہے۔ شاید مجھے سارے ہندستان کا دورہ کرنا پڑے۔ یہ برِّصغیر تو بجائے خود ایک دُنیا ہے۔"

"ہاں، کہتے تو یہی ہیں، لیکن یہاں رہنے والوں کو کیا اندازہ ہو سکتا ہے۔ یہ تو دوسرے، سمندر پار سے آنے والے ہی جان سکتے ہیں۔" میں نے متانت سے کہا، "واقعی آپ کا کام آسان نہیں۔ ہندستان بے شمار تہذیبوں، زبانوں اور رجحانات کا مرکب ہے۔"

"کام تو میں نے انگلستان ہی میں شروع کر دیا تھا، جتنی کتابیں، مخطوطے اور دستاویزیں ممکن ہیں، جمع کر لی تھیں۔ سچ تو یہ ہے، جیسے جیسے مطالعہ کرتا گیا، انہماک جنون کی حد تک بڑھ گیا۔ ذاتی طور پہ یہ سفر میرے لیے ایک مُہم کی حیثیت رکھتا ہے۔ جہاز پر سوار ہوتے ہی میں نے ہندستانی مسافر تلاش کرنے شروع کر دیے تھے۔ اتفاق ہے کہ مجھے مطلوب آدمی نہ مل سکے۔ جہاز شرقِ اوسط کے کئی ساحلوں پر لنگر انداز ہوا اور ہر جگہ سے ہندستانی مسافر سوار ہوئے۔ گو اُن کی تعداد اِتنی زیادہ نہیں تھی، تاہم تقریباً سبھی سے رابطہ کیا اور خاطر خواہ نتائج نہ مل سکے۔ اب ہندستان کے دروازے کراچی سے سفر شروع کرنے والے مسافر ہی مکمل ہندستانی نظر آئے ہیں، اور

میری خوش قسمتی ہے کہ آپ سے جلد ہی ملاقات ہوگئی۔ یہ کتنی اچھی بات ہے کہ آپ جیسا ہم زباں مل گیا۔"

"میں کیا جانتا ہوں۔ میں تو انگریزی میں اتنی مُدبُد بھی نہیں رکھتا، جتنا آپ ہندستانی سے واقف ہیں۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"کیا میں اِسے مشرقی انکسار پر محمول کروں۔"

"سنا ہے، ہر انگریز غیر انگریز کو اپنی زبان بولتے ہوئے یہی کہتا ہے۔"

اُس نے قہقہہ لگایا، "آپ کے سلسلے میں ایسا نہیں ہے۔"

اُس نے تپاک سے پوچھا، "آپ نے یہ زبان کہاں سے سیکھی؟"

"بس ایسے ہی اسکول کالج میں۔"

"میں آپ کو بتانا بھول گیا، میرا تعلق بھی باقاعدہ کیمبرج یونیورسٹی سے تھا۔ اب میں وزٹنگ پروفیسر ہوں۔ عمرانیات اور سیاسیات میرے موضوعات ہیں۔"

"پھر تو آپ سے مل کے بڑی خوشی ہوئی۔" میں نے اُس سے دوبارہ ہاتھ ملایا۔

"لیکن یقیناً مجھے آپ سے زیادہ..."

میں نے زورا اور جمرو کا تعارف اپنے عزیزوں کی حیثیت سے کرایا اور انھیں پروفیسر ہوبرٹ تھامپسن کے بارے میں مختصراً آگاہ کر دینا ضروری سمجھا کہ وہ کوئی بے احتیاطی نہ کر پائیں۔ ہماری گفت گو کے دوران دونوں گونگے بہرے بن جاتے تھے، لیکن پروفیسر ایک خوش خُلق اور حساس آدمی تھا۔ اُس نے بیچ بیچ میں اپنی شکستہ ہندستانی بول کے انھیں اُکتانے نہیں دیا، شامل رکھا۔

زورا نے مجھے ٹوکا کہ میں پروفیسر سے پوچھوں، وہ عام گوروں سے اِتنا مختلف کیوں ہے۔ مجھے مناسب معلوم نہیں ہوا، سو میں نے اجتناب کیا لیکن پروفیسر کچھ کچھ زورا کا مقصود سمجھ گیا تھا۔ وہ مجھ سے وضاحت کے لیے اِصرار کرنے لگا۔ میں نے اُسے زورا کی بے کلی کی وجہ بتائی تو کھلکھلا پڑا اور کہنے لگا کہ وہ کبھی سرکاری ملازمت میں نہیں رہا ہے۔

تعلیم سے فراغت پا کے وہ لیکچرر ہوگیا۔ اس کے بعد بس کتاب اور طالب علم ہی سے واسطہ رہا۔ یہی کچھ تو جاننے کے لیے اُسے بھیجا گیا ہے کہ انگریزوں کی کون سی ناانصافی، کج روی، کون سے رویّوں نے ہندستان کے طول و عرض میں برگشتگی کو ہوا دی ہے۔

میں نے پروفیسر کے جواب کی ترجمانی کی تو پہلی بار جمرو اور زورا کے چہروں کی خشونت دُور ہوئی۔ جمرو کہنے لگا کہ وہ تو سمجھتا تھا، سارے گورے لاٹ صاحب اور صاحب بہادر ہی ہوتے ہیں، کمشنر، ڈپٹی کمشنر، کلکٹر...

میں نے پروفیسر کو بتایا تو بہت محظوظ ہوا۔ چائے آ گئی تھی۔ ساتھ میں پیسٹری اور بسکٹ وغیرہ بھی تھے۔ چائے خانے میں نفری بڑھ جانے سے شور زیادہ ہوگیا تھا، بات کرنے کی دشواری ہو رہی تھی۔ سگرٹ، بیڑی کا دُھواں ہر طرف پھیلا ہوا تھا اور جن لوگوں نے شراب پی لی تھی، انھیں اپنی آوازوں پر اختیار نہیں رہا تھا۔ ہندستانیوں کو یوں بھی اُونچی آواز میں بولنے اور غیر ضروری باتیں کرنے کی عادت ہوتی ہے۔ ہم نے صرف چائے پی۔ پروفیسر نے کچھ کھانے سے پرہیز کیا اور تاویل کی کہ وہ یہاں کی آب و ہوا سے جسمی مطابقت تک کھانے پینے کی چیزوں میں احتیاط کرنا چاہتا ہے۔ اِتنی دیر میں ہمارے مابین اجنبیت کا تکدّر خاصا چھٹ چکا تھا۔ یکا یک پروفیسر کو جانے کیا سوجھی، اُس نے پوچھا کہ ہم نے ابھی رات کا کھانا تو نہیں کھایا ہوگا۔ میرے سچ بولنے پر اُس نے نہایت ادب اور اشتیاق سے ہمیں آج رات ساتھ کھانا کھانے کی دعوت دی۔ میں نے عذر کیا کہ ابھی ایسی بھوک نہیں ہے۔ اُدھر ہمارا ایک ساتھی عرشے پر آرام کر رہا ہے۔ شاید اُسی کے ساتھ کچھ دیر بعد کھانے کا مرحلہ طے ہو۔ غالباً میرے انکار میں زور نہیں تھا۔ پروفیسر درپے ہوگیا کہ کوئی بات نہیں، ٹھیک ہے، پھر وہیں چلتے ہیں، وہاں وہ بخشل سے خود درخواست کرے گا کہ بخشل بھی ہم سب کے ساتھ ہو۔ میرے تکلّف اور معذرت سے وہ مایوس نہیں ہوا، کہنے لگا، "جناب! کھانا تو ایک بہانہ ہے۔ دوسرے چائے خانے میں نسبتاً سکون ہے۔ وہاں اچھا وقت گزرے گا۔ مجھے، جمرو اور زورا کو جلد سو جانے کی عادت نہ ہو تو ازراہِ نوازش غیریت نہ برتی جائے۔"

میرا خیال تھا، جمرو اور زورا میری تائید کریں گے۔ وہ فوراً آمادہ ہوگئے، بل کہ جمرو نے صلاح دی کہ وہ کھانے کی کشتی بخشل کو پہنچا کے اور اُسے بتا کے ابھی واپس آتا ہے۔ ہم کچھ دیر اُن کا انتظار کریں۔ جمرو اور زورا دونوں ہی چلے گئے اور جلد واپس آگئے۔ بخشل نے کھانے پر آرام کو ترجیح دی تھی۔ زورا اور جمرو کے آجانے پر پروفیسر اُٹھ گیا۔

چند لمحوں میں ہم دوبارہ سکھ دربان کے سامنے پہنچ گئے تھے۔ دربان نے چمکتی آنکھوں سے ہمیں دیکھا کیا۔ پروفیسر نے دروازے پر اُس کی موجودگی کو کوئی اہمیت نہ دی۔ سکھ دربان کے سلام پر ہاتھ لہراتے ہوئے اُس نے ہمارے لیے دروازہ کھولا، چائے خانے میں ہم تینوں کے اندر داخل ہونے کے بعد ہی وہ اندر آیا۔

شبستاں ایسی ہی کسی جگہ کو کہتے ہوں گے۔ اُس کا احوال دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ باہر سے، شیشوں اور جھروکوں کے اُس پار تو عُشرِ عشیر بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ یہاں تو نظارہ ہی کچھ اور تھا۔ لگتا ہی نہیں تھا کہ ہم کسی جہاز پر سوار ہیں۔ کوئی منزل نہ مسافر، کل آئے نہ آئے، بس یہی ایک ساعت زندگی کا حاصل ہو۔ چائے خانے کی آرائش و زیبائش شاہانہ تھی اور وہ طرح رقص کرتے لوگوں کی آب و تاب مستزاد۔ خوش بُو، موسیقی اور ٹھنڈک نے ہمارا استقبال کیا۔ سب کی نگاہیں ہم بدنسلوں کی طرف مرکوز ہوگئی تھیں، لیکن پروفیسر ایک معزز و محترم شخص تھا۔ سب نے سر جھکا کے اُسے تعظیم دی اور رسماً سہی، ہمارے لیے بھی ہاتھ اُٹھائے اور ہونٹوں پر مسکراہٹ سجائی۔ پروفیسر ہمیں ایک پُرسکون گوشے میں لے آیا۔ جمرو اور زورا بے زبان سے ہوگئے تھے۔ پھیلے ہوئے دیدوں سے وسط کی خالی جگہ پر رقصاں جوڑے دیکھتے رہے۔ پروفیسر ہماری خاطر مدارات کے لیے بہت بے تاب تھا۔ خدمت گار جلد، یا بہ دیر خود ہمارے پاس آتا، لیکن پروفیسر کو ذرا سی تاخیر گوارا نہ تھی۔ جب تک کاؤنٹر پر جا کے خدمت گار کو اپنی میز پر بھیجنے کی ہدایت نہ کر دی، اُسے چین نہ آیا۔ واپس آ کے اُس نے لہکتی آواز میں کہا، "آپ کھل کے بیٹھیے، میری گزارش ہے کہ کوئی تکلّف نہ کیجیے۔"

"تکلّف تو آپ کر رہے ہیں جناب!" میں نے کہا، "آپ ہندستان آئے ہیں، آپ کو ہمارا مہمان ہونا چاہیے۔"

"میں نے ابھی ہندستان کی سرزمین پر قدم کہاں رکھا ہے۔ آپ سے وعدہ، کبھی بلائیں گے تو ضرور آئیں گے۔ بمبئی ہی میں قیام ہے آپ کا؟"

"جی ہاں۔" میں نے جلدی سے کہا۔

"اور، اور کیا مشغلہ ہے؟"

میں اُسے کیا بتاتا۔ میں نے سانس بھر کے کہا، "اِن دنوں تو سفر میں گزر رہی ہے۔"

"کاروباری سلسلے میں؟"

میری آواز ٹمٹما گئی، "ہاں یوں ہی کہہ لیجیے۔"

اچھا ہوا کہ اُس نے کاروبار کی نوعیت کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا۔ اِس اثنا میں معمر ہندستانی خدمت گار بھی آ کے مخلل انداز ہوگیا تھا۔ پروفیسر نے جھجکتے ہوئے ہم تینوں سے پوچھا کہ کیا ہم شراب پینا پسند کریں گے۔ جمرو اور زورا نے میری طرف دیکھا اور انکار کر دیا۔ پروفیسر نے خدمت گار کو سنترے کا رس لانے کا حکم دیا اور کھانے کے کارڈ کا بہ غور مطالعہ کرنے لگا۔ "کھانے میں کیا لیجیے گا؟"

"کچھ بھی، مگر سؤر نہیں۔"

"مجھے معلوم ہے۔" اُس نے سینے پر ہاتھ رکھ کے کہا، "اتفاق ہے، میں بھی نہیں کھاتا، بل کہ سرخ گوشت ہی سے رغبت کچھ کم ہے۔" البتہ سفید، یعنی سمندری گوشت شوق سے کھاتا ہوں۔ کیا خیال ہے، وہی منگوائیں۔"

"بہ تر ہے، سمندر میں ہیں، اس کا حق بھی ادا ہو جائے گا۔ ہمارے ہاں ایک کہاوت ہے: جیسا دیس، ویسا بھیس۔ مگر ہم چاروں کے لیے ہونا چاہیے۔"

دوسرے لمحے اُس کی سمجھ میں آیا اور وہ شوخی سے بولا، "مگر

انصاف بھی شرط ہے۔''

''ہاں، ہاں۔''

وہ ہنسنے لگا۔ اُس نے طعام نامے پر نشانات لگائے۔

''میں نے خیال رکھا ہے۔ اطمینان رکھیں۔ غذا کا ضایع اچھا نہیں لگتا، کچھ ندامت سی ہوتی ہے۔''

''ہندُستانیوں کو تو دُکھ بھی ہوتا ہے۔''

''اوہ!'' وہ پہلو بدل کے بولا، ''ہماری آپ کی اچھی نبھے گی۔''

''حالاں کہ مابین ایسی نسبتیں نہیں ہیں۔'' میں نے تیکھے لہجے میں کہا۔

وہ چونک پڑا اور ایک ثانیے کے لیے اُس کا چہرہ تمتما گیا، ''میں یہی، یہی جاننے کے لیے آیا ہوں۔ نسبتیں کہاں کھو گئیں۔ کیا آپ کے سر پہ سینگ اور میرے عقب میں دُم لگی ہوئی ہے۔''

''کاش کہ ایسا ہوتا! تو امتیاز تو طے ہو جاتا۔''

''ہاں۔'' وہ کھوسا گیا۔ ''آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ اِس بات میں خاصا کرب ہے۔''

''میرا مقصد دل آزاری نہیں۔''

''میں جانتا ہوں۔'' وہ تیزی سے بولا، ''لیکن جیسا کہ میں نے پہلے ہی وضاحت کی ہے، مجھے اَوروں کے پیمانے سے مت دیکھیے۔''

''تو پھر یہاں کیوں بیٹھے ہوتے۔ یہ تو علاقۂ غیر ہے۔''

''میں آپ سے بہت کچھ اخذ کرنا چاہتا ہوں۔'' اُس کے لہجے میں بے کلی تھی، عاجزی بھی۔

''آپ کو شاید مایوسی ہو۔ میں تو کچھ بھی نہیں جانتا، اور یہ انکسار نہیں، واقعہ ہے۔ یوں کہیے کہ مجھے اِدھر اُدھر دیکھنے کی فرصت ہی نہیں ملی۔ جو کچھ جان سکا ہوں، وہ غیر اختیاری ہے۔ کھلی آنکھوں سے اِدھر اُدھر نظر پڑ ہی جاتی ہے۔ بس اسی قدر آتا ہے۔ آپ ایک عالم و فاضل شخص ہیں۔ جہاز سے اُتر کے یقیناً آپ کو اپنے مطلب کے بہت سے لوگ مل جائیں گے۔ شاید میں بھی اِس کام میں کچھ اعانت کر سکوں۔''

''مجھے شبہ ہے، آپ ایسے لوگوں سے آسانی سے ملاقات ہو سکے۔ میرے سامنے ہونے پر مخاطب کو احتیاط مانع ہوگی، ہونی چاہیے۔ شاید میں اِس ذمّے داری کے لیے موزوں نہیں جو مجھے سونپی گئی ہے۔ انھیں فریقین میں سے کسی کا انتخاب کرنے کے بجائے باہر کے آدمی کو اِس فریضے پر مامور کرنا چاہیے تھا۔ حیرت ہے، انھوں نے اِس نزاکت پر غور نہیں کیا۔''

''ہو سکتا ہے، باہر کے آدمی کے ساختہ آئینے میں اُنھیں شکلیں بھیانک نظر آنے کا خوف ہو۔'' میں نے بے ساختہ کہا۔

خدمت گار پھر مخل ہو گیا تھا۔ ایک نے رس لاکے رکھا، دوسرے نے پلیٹیں سجائیں۔ پروفیسر لمحوں تک چپ رہا اور رس کا گلاس خالی کرتا رہا۔ موسیقی کی آواز کبھی ایک دم تیز ہو جاتی، کبھی مدّھم پڑ جاتی تھی۔ لوگ مسلسل ناچ رہے تھے اور کسی کو کسی سے سروکار ہی نہ تھا۔ مجھے اِس عرصے میں خود کو اُستوار کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ میں نے طے کیا کہ پروفیسر سے کسی پیچیدہ معاملے پر بات ہی نہیں کرنی چاہیے۔ اِس سے حاصل بھی کیا ہے۔ میں کیا اضافہ کر سکوں گا۔ مبادا میرے مُنھ سے کوئی بے محل بات نکل جائے اور فضول میں یہ خوش بسری، خوش وقتی منتشر کر دے۔ یہ ہر حال، پروفیسر ایک فریق ہے اور ایک زیرک آدمی۔ زیرکی آدمی کی دولت ہے تو کبھی اُسے بہکا بھی دیتی، اُلجھا بھی دیتی ہے۔ کثرت ہر چیز کی بُری ہوتی ہے۔

خدمت گار نے پروفیسر کے حکم کی تعمیل میں عجلت کی، جلدی جلدی کھانا میز پر لگا دیا۔ کہتے ہیں، ہندو کھانے کی جگہ، مسلمان کھانے کی قسم اور انگریز کھانے کے آداب کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ مجھے ٹھیک طرح یاد نہیں رہا۔ کبھی بچپن میں سنا تھا۔ فرانسیسیوں کی بھی کچھ اسی طرح کی شہرت ہے۔ غالباً اُن کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ کھانے کے وقت کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ کب، کہاں، کیسے اور کیا کی ترتیب سے یہ دل چسپ قول کہیں سنا تھا۔ پروفیسر نے ایک انبار منگوا لیا تھا۔ ساری میز بھر گئی۔ کیکڑے کا سوپ، کچی اور اُبلی ہوئی سبزیوں کا سلاد، سلاخوں والے بسکٹ، ڈبل روٹی، مکھن، لیموں کا پانی، مچھلی کی کئی قسمیں، جھینگے۔ ڈونگوں میں کھانے ایسی نفاست سے رکھے گئے تھے کہ لگتا تھا، تراشے گئے ہوں۔ اُنھیں چھوتے، چھیڑتے ہوئے جراحت کا احساس ہوتا تھا، کہیں میلے نہ ہو جائیں، ٹوٹ اور بکھر نہ جائیں۔

''مجھے افسوس ہے، اِس جگہ ہندستانی کھانے نہیں ملتے۔''

پروفیسر نے مصنوعی خجالت سے کہا۔ یہ مصنوعی خجالت بھی آداب کا حصّہ ہے۔

مجھے کہنا چاہیے تھا کہ ملتے بھی تو ہندستان کی کتنی نمائندگی کرتے۔ میں نے یوں ہی کہہ دیا، "مگر کھانے تو ملتے ہیں۔"

"ہاں" اور ایسے بُرے بھی نہیں۔"

"وہ تو یقینی ہے، کچھ کھانے والوں کا حسنِ ذوق بھی کام دکھاتا ہے۔" میں نے آہستہ سے کہا۔

"حسنِ ذوق تو ہندستانیوں کا بھی خوب ہے۔ لندن میں متعدد ہندستانی ہوٹل ہیں۔ میں وہاں جاتا رہتا ہوں۔ کیا لذیذ کھانے تیار کرتے ہیں ہندستانی۔ اِس منصب پر اپنی تعیناتی کے بعد تو میں نے معمول بنا لیا تھا۔ مجھے تو بہت سے کھانوں کے نام بھی آ گئے تھے۔ بریانی، یخنی پلاؤ، کباب اور وہ، وہ میٹ بال...کیا کہتے ہیں اُس کو؟" وہ اُلجھ کے بولا۔

"کوفتے تو نہیں۔"

"جی، جی ہاں وہی۔" وہ اُچھل کے بولا، "اور ہاں، ماش کی دال کا تو جواب ہی نہیں۔ مرغِ مسلّم، تندوری مرغ اور شیرینی میں زردہ، شاہی ٹکڑے وغیرہ بے شمار قسمیں، بے شمار نام۔"

"پھر تو ہندستان آپ کے لیے نیا نہیں ہوگا۔ آپ اپنے آبا و اجداد کے مانند پوری طرح مسلح ہو کے آئے ہیں۔" میں نے خود کو روکا، بس میری زبان سے نکل گیا اور بہت پچھتاوا ہوا۔

لقمہ لیتے لیتے پروفیسر کا ہاتھ بھی رُک گیا تھا۔ اُس نے مضطربانہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ یہ قدرت ہر کس و ناکس میں نہیں ہوتی کہ ایک آن میں اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ چھا گئی، "آپ ٹھیر کیوں گئے؟"

"مجھے اپنے لہجے میں آلودگی کا گمان ہوا۔"

"کیا خوب!"

"آپ کو یقیناً اچھا نہیں لگا ہوگا۔"

"صرف ایک پل کے لیے، اور میں اِسے جہالت پر محمول کرتا ہوں۔" اُس کی آواز میں کوئی بناوٹ نہیں تھی۔

میں نے خاموشی مناسب سمجھی اور کچھ تامّل کے بعد موضوع بدلنے کے لیے زورا اور جمرو سے پوچھا کہ وہ کیسا محسوس کر رہے ہیں۔

"کیا بات ہے لاؤ لے! قسم سے اِدھر تو ہر کوئی ملکہ بادشاہ ہے، جارج بادشاہ، ملکہ وکٹوریا۔" جمرو چہک کے بولا۔

پروفیسر نے بھی سن لیا تھا، اُس نے تجسس سے اپنی ٹوٹی پھوٹی ہندستانی میں پوچھا، "یہ بادشاہ ملکہ لوگ کا کیا بولتا ہے۔"

"کچھ نہیں، بس ایسے ہی۔" میں نے ٹالنا چاہا پھر پروفیسر کو مسکراتے ہوئے بتایا تو اُس نے بہت لطف لیا۔

"بادشاہ اور ملکہ بھی آدمی ہوتے ہیں۔"

"ہاں، مگر ہر آدمی بادشاہ اور ملکہ نہیں ہوتا، ہو نہیں سکتا۔"

اُس نے سر ہلا کے تائید کی اور مزاحاً بولا، "اگر سبھی بادشاہ اور ملکہ ہو جائیں تو یہ دنیا کیسی ہو جائے۔"

"پھر کوئی بھی بادشاہ اور ملکہ نہ رہے۔"

"ہاں، ہاں، واقعی واقعی۔" وہ اضطراری انداز میں بولا اور اُس کا چہرہ کھل اُٹھا۔

پروفیسر کے سامنے تشریح کی ضرورت نہیں تھی کہ بادشاہ تو محکوموں سے ہوتا ہے۔ بادشاہت کے لیے لازم ہے کہ محکوم موجود ہوں۔ میں نے کہا، "آپ نے کبھی سوچا کہ بادشاہ کی سب سے بڑی خوبی شاہی خاندان سے اُس کی نسبت ہے۔ میرے ایک اُستاد کہتے تھے، سنار کا بیٹا سنار، لوہار کا لوہار، عالم کا عالم اور نان بائی کا نان بائی نہیں ہوتا۔ وہ کہتے تھے۔ ہر شخص جاہل پیدا ہوتا ہے، مگر بادشاہ کی فضیلت بادشاہ کے خاندان میں پیدائش ہے۔ صرف بادشاہ کا بیٹا بادشاہ ہوتا ہے۔"

"بہت سے بادشاہ شاہی خاندان سے نسبت کے بغیر بادشاہ بن گئے ہیں۔" پروفیسر نے شگفتگی سے تردید کی، "اپنی قوتِ بازو سے، یا سازشوں سے۔"

"شاذونادر ہی۔ وہ استثنا کے ذیل میں آتے ہیں۔ مگر بادشاہ بن جانے کے بعد اُن کے ہاں بھی یہ سلسلہ جاری ہو جاتا ہے۔ تاج اُن کے فرزندانِ دل بند کے سروں پہ سجایا جاتا ہے۔ تاج خاندان میں گردش کرتا رہتا ہے۔ قوتِ بازو والے، سازشوں سے تخت پر متمکن ہونے والے بادشاہوں کی بھی تو یہی آرزو ہوتی ہے۔"

مہذب آدمی کا جو طور ہوتا ہے، کسی طالبِ علم کی طرح پروفیسر سنجیدگی سے سنتا رہا اور کہنے لگا، "ہاں، یہ سچ ہے۔ آپ کے بیان میں کلام کی گنجائش نہیں، ہے تو جزوی۔ کیسا فکر انگیز پہلو ہے یہ۔"

جمرو اور زورا ہماری گفت گو میں شامل نہیں تھے۔ وہ خوش دلی اور خوش سلیقگی سے کھانے میں مصروف رہے۔ پروفیسر چونکتا، یا قہقہہ لگاتا تو بچوں کے مانند اُن کی آنکھیں چوڑی ہو جاتیں اور پلکیں تھرکنے لگتیں۔ کچھ یہی حال پروفیسر کا ہوتا تھا۔ گاہے گاہے میرے، زورا اور جمرو کے درمیان ہونے والی گفت گو میں پروفیسر کش مکش میں نظر آتا۔ اُس کی سیکھی ہوئی ہندستانی بڑی ابتدائی تھی۔

پروفیسر کے بار بار ٹوکنے پر ہم نے بساط سے زیادہ کھا لیا۔ مجھے خوشی ہوئی۔ جمرو اور زورا کو چھری کانٹے سے کھانے میں کوئی زحمت نہیں ہو رہی تھی۔ یہ بمبئی میں جولین، فیض آباد میں زریں کی رفاقت اور طویل سفر میں طرح طرح کے ہوٹلوں میں تجربے کا ثمر تھا کہ میز کرسی، چھری کانٹے کی ولایتی، یا جدید طرز میں وہ مشاق ہو گئے تھے۔ آدمی میں اخذ و استنباط کی صلاحیت ہونی چاہیے اور جست ہو۔ چاقو کا ہنر بھی امکان اور شوق سے آتا ہے۔ وقت ہی نہیں ملا، کئی بار خیال آیا کہ خالی اوقات میں پھر اُن کے لیے کتاب و قلم سے شناسائی کا بندوبست کروں۔ اُنھیں اپنی اِس کوتاہی کی بے چینی کم نہیں تھی۔ معاملے کی تہ تک پہنچنے، بال کی کھال نکالنے والے کتابوں کے سلسلے میں کیسے فروٹ روڑتے، چاقو کی گرفت میں ماہر کی قلم کی گرفت بھی اچھی ہونی چاہیے۔ جولین نے بھی کئی بار مجھ سے کہا تھا۔ کبھی فراغت سے بیٹھنے کا موقع ہی نہ ملا۔ بمبئی پہنچتے ہی کانتے چلا گیا، پھر پیرو اور ماچھی، پھر مارٹی اور حیدرآباد سے نواب ثروت یار کا خط آ گیا۔ اور یہ سفر...آدمی کو خود سے فرصت ملے تو اوروں کی طرف دیکھے۔

کھانے کے بعد خدمت گار نے شیرینی کے ڈونگے میز پر رکھ دیے۔ شیرینی کے بغیر دعوت ادھوری رہ جاتی۔ پھر کالی کافی آ گئی۔ انگریز خود گورے ہوتے ہیں، مگر کالی چیزوں سے بڑی رغبت رکھتے ہیں۔ جمرو اور زورا سگریٹ بیڑی نہیں پیتے تھے۔ کبھی کبھی شوقیہ۔ خدمت گار نے تشتری میں رکھا ہوا 'پلیئرز' کا ٹن ہماری طرف بڑھا دیا۔ انگلستان کے سگریٹ تھے۔ جمرو اور زورا نے کش پر کش لگائے۔

پروفیسر نے اپنی طرح مجھے کوئی کثیر المطالعہ، فلسفی، عالم جانے کیا کیا سمجھ رکھا تھا۔ میں اپنی معلومات کے مطابق اُس کا ساتھ دیتا رہا۔ پھر مجھے ایسا لگا کہ پروفیسر چپکے سے کوئی بات کہہ کے، کوئی شوشہ چھوڑ کے چٹکی بھرنے اور ساتھ تنکے چبھونے جیسا کوئی کام کر رہا ہے۔ کافی ختم ہو گئی تو اُس نے کیتلی سے میری اور اپنی پیالیوں میں اور کافی لوٹ لی اور چسکی لیتے ہوئے بولا،

"مجھے محسوس ہوتا ہے، اب انگریزوں کے لیے یہاں پہلے جیسے دن نہیں رہے، جہاز میں جتنے لوگوں سے ملاقات ہوئی، اُنھوں نے انگریزوں کی تعریف و توصیف کی کہ دیہی ہندستان کو شہری ہندستان بنانے میں انگریزوں کا بڑا کردار ہے۔ بجلی، ریل، مواصلات، قانون، صحت اور تعلیم کے شعبوں میں وہ انگریزوں کی کوششوں اور کارکردگی سے متاثر نظر آئے لیکن اِس برملا اعتراف کے باوجود ایسا معلوم ہوا کہ اُن کے اظہار میں توانائی کی کمی ہے، خوردہ اور ترشی ہوئی آوازوں میں فرق کرنا بہت مشکل ہے۔ شہری معاشروں سے وابستہ لوگ بالعموم اپنے بیان و اظہار میں یوں بھی شعوری ہوتے ہیں، اور اتفاق ہے، بیش تر اُنھی لوگوں سے مڈبھیڑ ہوئی۔"

"آپ کی اجازت ہو تو ایک بات پوچھوں؟" میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

"ضرور، ضرور" وہ چستی سے بولا۔

"آپ کیا جاننے کے خواہش مند ہیں؟"

"یہ تو میں آپ کو بتا چکا ہوں۔"

"اور جاننے کے بعد آپ کیا کریں گے؟"

''ظاہر ہے، یہ آگہی، نئی پالیسیاں مرتب کرنے میں کارگر ہوگی۔ نظرِ ثانی اور ترمیم سے مراد صورتِ حال کی بہتری اور خوش گواری ہے۔''

''میرا خیال ہے، شاید دیر ہوچکی ہے۔''

''کیسی دیر؟'' وہ اضطراب سے بولا۔

''ایک بات بتائیے۔''

''خدا مجھ پر رحم کرے۔'' وہ سیدھا ہوگیا۔

''میں پیشگی معذرت چاہتا ہوں۔''

''بس خنجر مت کھو لیے گا۔''

''خنجر آپ کا کیا بگاڑے گا، آپ تو بارود کے عادی ہیں۔''

''آپ کے تیور خنجر اور بارود سے کیا کم ہیں، کچھ ایسا لگا جیسے آپ آخری خواہش کے بارے میں پوچھتے ہیں۔'' پروفیسر چہچہا کے بولا، ''زندگی کی تھوڑی بہت خواہش باقی ہے کہ ابھی کچھ کام نمٹانے رہ گئے ہیں۔''

''ایسے موقعوں پر ہم ہندستانی کہتے ہیں، ہماری عمر بھی تمھیں لگ جائے۔''

''ہندستانی بہت رومان پسند، خیال آفریں ہوتے ہیں۔ شاعرانہ بیانات تو اُنھیں خوب آتے ہیں۔''

''یہی تو اُن کی کجی ہے۔ یہ خواب وخیال، شاعرانہ اطوار مجموعی طور پر مبالغہ عام کرتے ہیں۔ آئینے کے دوسرے رُخ پر شکلیں ٹٹولنے کا عمل شاعری ہے اور کسی خاص وقت اور مقام کے لیے مخصوص ہو تو موزوں ہے، یا عمر کے آخری حصے میں۔ آسمان سے شکایت کرنے، چاند سے لو لگانے اور ریت کے گھروندے بنانے کی جستجو میں کھری نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ یہ ہمہ وقت سوز وساز اور کھلی آنکھوں کے خواب، یہ ہچکولوں کی نگرانی اور پانی میں آگ لگانے کی مہم جوئی، اِس سے ہندستان کو کیا حاصل ہوا؟''

وہ مجھے دیکھا کیا۔ اُس سے کچھ کہا نہ گیا۔ چند لمحے تذبذب میں گزر گئے، پھر اُس نے دُھندلائی آواز میں کہا، ''آپ کیا پوچھ رہے تھے؟''

''میں تو بھول ہی گیا۔ یقیناً کوئی اہم بات نہ ہوگی۔''

''میرے لیے آپ کی ہر بات اہم ہے۔''

''مجھے محتاط ہونا پڑے گا۔''

''مجھے آپ اپنا دوست سمجھیے۔''

''میرے لیے یہ درجہ عزت کا باعث ہے۔''

''اور میرے سفر کا یہ کتنا اچھا آغاز ہے۔''

میرے جی میں بہت سی باتیں آئیں، لیکن میں خاموش رہا۔ اچانک موسیقی تیز ہوگئی تھی اور لوگوں نے ایک دوسرے کے گلے میں بانہیں ڈالنے کے بجائے الگ الگ ہو کے رقص شروع کردیا تھا۔ مرد وعورتیں آمنے سامنے بے تحاشا بدن لہرا رہے، تھرک رہے تھے۔ سب جیسے دیوانے ہوگئے ہوں۔ اُن کی لگامیں ساز بجانے والوں کے ہاتھ میں تھیں، جتنی تیز تانیں، اُتنی بے قراری، اُتنے پارا پارا۔ چند منٹ تک موسیقار یہ شعبدہ کرتے رہے۔ پھر زور زور سے تالیاں بجنے لگیں۔ موسیقاروں نے ساز بند کردیے۔ رقص کرنے والوں نے اُنھیں ہوائی بوسے نذر کیے۔

یکایک ایک نوجوان شعلہ اندام، مگر سنجیدہ لڑکی کی آمد پر پروفیسر ہڑبڑا سا گیا، اور ہم سب بھی۔

''ہیلو پروفیسر!'' لڑکی نے پروفیسر کو انگریزی میں مخاطب کیا، ''کیسے ہیں آپ؟''

''ہا، میری جان! میں ٹھیک ہوں۔'' پروفیسر نے شگفتگی سے کہا، ''اور تم... تم کیسی ہو؟ اور وہ اپنا جوان کدھر ہے؟''

''کہاں ہوتا ہے۔'' لڑکی نے پھیکی مسکراہٹ سے کہا۔

''وہی حال ہے، تم نے اُسے روکا نہیں؟''

''میری گزارش پر اب وہ چڑنے لگا ہے۔'' لڑکی نے اُداسی سے جواب دیا، ''میں نے سوچا ہے، اُسے اُس کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ کہنے سننے کا حاصل کچھ نہیں۔'' پھر وہ مستعد ہو کے بولی، ''آپ بتائیں، سفر کیسا گزر رہا ہے؟''

''بہت پُرلطف، اور آج تو اور زیادہ۔''

''کیوں، آج کیا کوئی نئی بات ہوئی؟''

''آج اِس نوجوان سے ملاقات ہوئی، سمجھو ایک دریافت۔'' پروفیسر نے میری جانب اُنگلی اٹھائی۔ تم سے تعارف کراتا ہوں۔ یہ نوجوان...'' میرا نام لینے کی کوشش میں وہ ہچکچانے لگا۔ میں نے اُس کی مدد کی، ''بابر زماں... اور یہ میرے ساتھی جمرو اور زورا۔''

[لڑ]کی نے مصافحے کے لیے تپاک سے ہاتھ بڑھایا، پہلے [مجھ سے]، پھر جمرو اور زورا سے، ''میں مایا البرٹ۔'' اُس نے [مسکر]اتے ہوئے رسمی خوشی کا اظہار کیا۔

''[تم] کھڑی کیوں ہو، بیٹھو نا۔'' پروفیسر نے خالی کرسی کی [طر]ف اشارہ کیا، ''ہم نہایت عمدہ باتیں کر رہے تھے، [ہندس]تان سے متعلق۔''

''میں رقص کے دوران آپ کو دیکھ رہی تھی۔ آپ لوگ [بہت م]عروف نظر آ رہے تھے۔''

''ارے، تم یہیں تھیں۔ میں واقعی تمھیں نہیں دیکھ پایا۔ [ور]نہ تمھیں بلا لیتا۔ تمھیں بھی تو ہندستانیات سے خاص [دل چس]پی ہے۔'' پروفیسر نے سرسری طور پر مجھے مایا کے بارے میں [بتایا] کہ اُس کی ماں ہندستانی، باپ انگریز ہے، اور وہ دو سال [سے پروفی]سر کی شاگرد رہی ہے۔ ہندستانیات کے موضوع پر [ڈاکٹری]یشن کے ایک مقالے میں وہ اُس کی نگرانی میں کام کرتی [رہی] ہے۔ ماں کی وجہ سے کسی حد تک ہندستانی جانتی ہے اور [ہندس]تان کی ابتدائی واقفیت میں اُس نے پروفیسر کی خاصی مدد [کی ہ]ے۔ وہ قہقہہ لگاتے ہوئے بولا، ''اِس لحاظ سے میں بھی [اس] کا شاگرد ہوں، اپنی شاگرد کا شاگرد۔''

''کیا پروفیسر!'' مایا نے انکسار سے کہا، ''میں خود کتنا [جانتی] ہوں۔''

سازندے دوبارہ مدھم ساز بجانے لگے۔ موسلا دھار بارش [کے ب]عد جیسے پھوار پڑنے لگی ہو۔ وسط کے دائرے میں کچھ [جوڑ]ے ادھر اُدھر سے اُٹھ کے ایک دوسرے میں گم ہونے لگے۔

''آج آپ میرے ساتھ...'' مایا نے بات ادھوری چھوڑ دی [اور ف]وری عذر تجویز کر کے پروفیسر کے لیے آسانی پیدا کردی۔ [وہ نزاک]ت سے بولی کہ مہمانوں کی موجودی میں پروفیسر کے لیے [شاید ح]امل اُس کی رفاقت مناسب نہیں ہونی چاہیے۔

''ہاں مایا! میں نے تمھیں بتایا نا، ہم بہت دل چسپ، اور [میر]ے خیال میں نہایت اہم مکالمہ کر رہے ہیں۔'' پروفیسر نے [معذ]رت خواہانہ انداز میں کہا، ''کچھ دیر بعد سہی... تمھارے [ساتھ رقص سے] تو مجھے سکون کا احساس ہوتا ہے۔''

[م]ایا مسکراتی اور ہماری جانب ہاتھ ہلاتی ہوئی چلی گئی۔

میں نے پروفیسر سے رُخصت کی اجازت چاہی تو کہنے لگا کہ سچ تو یہ ہے، اُسے رقص وغیرہ، اِس ہاؤ ہُو میں اب ایسا لطف نہیں آتا۔ وہ تو مایا کی وجہ سے شریک ہوجاتا ہے کہ مایا اُسے بے حد عزیز ہے، وہ جتنی حسین ہے، اُتنی ہی ذہین بھی۔ کہنے لگا کہ ہر اعتبار سے وہ ایک غیر معمولی لڑکی ہے۔

مایا کو کوئی آدھیڑ ساتھی مل گیا تھا۔ وسطی فرش پر دھیمے دھیمے سُروں پر جوڑے رقص کر رہے تھے، جیسے ہواؤں میں اُڑ رہے ہوں، پانیوں میں تیر رہے ہوں، شاید یہی زندگی کی انتہا ہے۔ دولت، طاقت اور اقتدار کے بعد آسودگی کی زندگی کئی گنا ہوجاتی ہے، دس گنا، سو گنا...

''کیسا لگ رہا ہے، میری مراد ہے یہ رقص، رقص کا یہ انداز؟''

پروفیسر کے ٹوکنے سے مجھے اپنی محویت پر ندامت ہوئی، ''رشک آ رہا ہے۔'' میں نے بجھی آواز میں کہا اور خود کو روک لیا۔ دل میں آیا تھا، کہوں کہ حسد بھی کم نہیں ہو رہا۔

''ہندستانی رقص اور موسیقی مغرب سے بالکل مختلف ہے، یہاں تو ایسا رقص نہیں ہوتا؟''

''یہ بے اختیاری تو سرخوشی اور سرشاری ہی میں ممکن ہے۔ یہاں تو سرشاری ہی عنقا ہوگئی ہے۔''

''مگر ہندستانی رقص اور موسیقی تو منتہائے کمال پر ہیں۔ کہتے ہیں، یہ تو ایک باقاعدہ علم، بڑا وسیع اور منضبط علم ہے، یہ تو

ایک کارنامہ ہے، ایک اعجاز...''

''ماضی کا کارنامہ، داستانِ پارینہ۔ ہندوستان صرف ماضی تو نہیں ہے۔ کبھی مجھے بڑی حیرت ہوتی ہے۔ ماضی کی عظمت، آثارِ قدیم ہی کا چرچا کیوں، ہمارے حال کا کوئی ذکر کیوں نہیں ہوتا۔ کیا ہم محض ماضی ہیں۔ ہندوستان کا کوئی حال نہیں ہے؟''

پروفیسر کی پیشانی تنگ ہوگئی۔ اُس کی آنکھیں جلنے بجھنے لگیں۔ ہندوستان کا ماضی نہایت عظیم ہے۔''

''ماضی ہی نا! ماضی مٹی ہوتا ہے۔ ماضی کی عظمت کا وہ سلسلہ حال تک کیوں جاری نہ رہا؟''

''میں سمجھتا ہوں، بہ ہر حال، اَب ہندوستان ایک بڑے مستقبل کی طرف گام زن ہے۔''

''شکر ہے، آپ نے پہلی بار ایک بزرگ کا طور اختیار کیا۔ مجھے بھی آپ سعادت مندی میں کم نہیں پائیں گے۔''

پروفیسر کشش و پیچ کی کیفیت سے دوچار ہوا، پھر جھینپنے کے انداز میں اُس نے میرے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں جکڑ لیے۔ اُس کی گرفت سے اُس کے احساسات کا اندازہ ہوتا تھا۔ ''اپنا اتنا اسیر مت کیجیے مجھے، آگے مشکل ہو جائے گی۔'' وہ ڈوبی ہوئی آواز میں بے ربطی سے بولا اور کہنے لگا، ''اِس عمر میں کیسی پختگی ہے، اور تپش اور کاٹ!'' پروفیسر کی پَل پَل رنگ بدلتی حالت سے جمرو اور زورا بھی حیران ہوئے۔

''معاف کیجیے۔'' یہ گمان بڑا قبل از وقت ہے۔'' میرے لہجے میں کسی قدر ناتوانی آئی، ''میں تو پہلا آدمی ہوں۔ آگے آپ کو جانے کتنے میرے ہم صورتوں سے واسطہ پڑے۔''

''قطار میں آپ پہلے آدمی نہیں ہیں۔ انگلستان میں متعدد ہندوستانیوں سے واسطہ پڑ چکا ہے۔ وہ بھی آپ سے مختلف تھے۔ اَب آپ سے مل کے سوچتا ہوں۔ کیا انگلستان میں اور قسم کے ہندوستانی جاتے ہیں؟''

''ہمی میں سے جاتے ہیں، دو ہاتھ دو پاؤں کے، لیکن آپ کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی اُن پر آپ کی بلند و بالا عمارتوں، نوع بہ نوع اشیا سے بھرے بازاروں، کرشمہ ساز مشینوں، دیوہیکل دانش گاہوں، کتب خانوں، عجائب گھروں، آپ کی سطوت و جلالت کی ہیبت طاری ہو جانی چاہیے۔ وہ کیا زبان کھول سکتے ہیں۔ فرق بھی کچھ کم نہیں ہے، تین سَو سال، چار سَو سال کا بُعد۔ ابھی آپ ہندوستان دیکھیں گے تو یونان اسطورہ کا لکھا بھی نظر آ جائے گا۔ ہوسکتا ہے ماقبل تاریخ کی زندہ بستیوں سے آپ کا گزر ہو۔ میں کہتا ہوں موئن جودڑو، ہڑپا وغیرہ کا واویلا کیوں۔ یہاں تو اُس سے پہلے کی تہذیبیں جوں کی توں سلامت ہیں۔''

''مگر، مگر...'' پروفیسر پُرعزم لہجے میں بولا، ''انگریزوں کی خواہش ہے کہ یہ فصل جلد سے جلد کم سے کم ہو جائے۔''

''مگر اُنھیں یہ خواہش کیوں ہے؟''

پروفیسر کے جسم میں کانٹا سا چبھ گیا۔ ''کیا اُنھیں نہیں ہونا چاہیے؟'' اُس کی آواز بکھر گئی۔

''کیا ہندوستانیوں نے اُن سے منت کی ہے؟''

''مگر کیا یہ ہندوستانیوں کی خواہش اور مفاد کے خلاف کوئی اقدام ہے؟''

''بے شک نہیں، لیکن کیا ہی اچھا ہوتا کہ ہندوستانیوں نے اِس نیکی کے لیے اُنھیں مدعو کیا ہوتا۔ اُن سے حاجت روائی کی درخواست کی ہوتی۔''

''ہُنہ!'' پروفیسر کا چہرہ بھاری ہو گیا، ہونٹ پھیل گئے۔

''پھر تو داستان لمبی ہو جائے گی۔''

''مگر اپنے موضوع پر تو قائم ہے۔''

''جی، جی ہاں'' اُس کا سر دیر تک ہلتا رہا۔

میں نے بچی کھچی کافی سے حلق تر کیا اور ایک بار پھر ارادہ کیا کہ پروفیسر سے اجازت لی جائے۔ جمرو اور زورا بندھے اور کھنچے ہوئے انداز میں مسلسل سگریٹ پھونک رہے تھے۔ جگہ کا بھی کیا اثر ہوتا ہے۔ آدمی جنٹل مین بن جاتا ہے۔ پروفیسر کچھ سوچتا رہا، پھر ایک مربیانہ لہجے میں بولا ''میں آپ کو یقین دلاتا ہوں، سفر شروع کرنے سے پہلے ہدایات اور اپنے کام کی نوعیت کی صراحت کے لیے جن متعلق افسروں سے انگلستان میں میری بات ہوئی، کبھی نے ہندوستان اور ہندوستانیوں کے لیے بہترین خواہشات کا اظہار کیا؟''

میں نے دل میں آئی بات خود تک محدود رکھی۔ میں کہنا چاہتا تھا کہ لفظوں کی یہ ترتیب و ترکیب تکرار و تواتر سے اب افادیت کھو چکی ہے۔ میری خاموشی پر پروفیسر کو خود احساس ہوا اور وہ محجوبیت سے بولا، ''مجھے افسوس ہے، میری تاویل بڑی رسمی اور سفارتی قسم کی ہے۔ یہ اُس رسم و راہ سے انحراف ہے جس کے لیے میں نے خود آپ سے گزارش کی تھی۔''

''میں بھی کچھ یہی کہنا چاہتا تھا۔'' میں نے نرمی سے کہا۔

''جواب میں آپ کی خاموشی عین رسمی اور سفارتی تھی۔'' پروفیسر کنکھیوں سے مجھے گھورتا ہوا چہکتی آواز میں بولا۔

''یقیناً آپ کی ذمّے داریوں میں آشنا شوئی، وکالت اور تبلیغ کے اُمور شامل نہیں ہوں گے۔''

''یقیناً نہیں، بالکل نہیں۔'' پروفیسر نے شدومد سے تردید کی۔

''میں بھی وضاحت کر دوں، میرا مقصود بھی جواب طلبی نہیں ہے۔ اپنے علم اور قیاس کے مطابق مبہم و موہوم جواب مجھے معلوم ہیں۔ میرا مقصد ہے کہ سوال آپ کے پیشِ نگاہ رہیں۔''

''بے شک'' پروفیسر پھر منتشر ہونے لگا، ''کیا، کیا آپ کچھ کہنا چاہتے ہیں؟''

''ایسا کچھ نہیں'' میں نے اٹکتی زبان سے کہا، ''بہ ظاہر بچوں کی سی بات ہے۔ بس یوں ہی دماغ بھٹکتا رہتا ہے، ریت سی اُڑتی رہتی ہے سر میں۔ کبھی خیال آتا ہے کہ ہندوستان میں انگریزوں کے قیام کا اصل میں مقصد کیا ہے؟''

پروفیسر کا جسم تن گیا۔ وہ کسی معقول جواب کے لیے لفظ ڈھونڈ رہا تھا کہ میں نے اُسے زحمت نہیں دی اور کہا کہ کیا انگریز ہندوستان کو انگلستان بنانے کے خواہاں ہیں۔ یہاں کی نرم و گرم آب و ہوا اِس قدر مرغوبِ خاطر ہوگئی ہے کہ رفتہ رفتہ انگلستان کی ساری آبادی ہندوستان منتقل کر دینے کا عزم ہے، یا پھر ہندوستان کی اکثریت کو اقلیت میں بدل دینے کا کوئی خواب شرمندۂ تعبیر کر دینے کی آرزو ہے؟

''نہیں، نہیں۔'' پروفیسر نے بے قراری سے کہا، ''یہ ستم ظریفی انگریزوں سے ممکن نہیں ہے۔''

''ظاہر ہے۔'' میں نے بہ عجلت کہا، ''یہ ممکن نہیں ہے۔ پھر یہاں اُن کے طولِ اقتدار کا کیا جواز ہے؟ یہ جواز کہ ہندوستان تو سونے کی کان ہے۔ یہاں زر و جواہر کے انبار ہیں۔ زمینیں لالہ زار، شجر ثمر بار ہیں۔ ہر شخص خوش حال، اطلس و کمخواب میں ملبوس ہے اور جنسی لیے پھرتا ہے۔ فاتحین کو یہ حق حاصل ہے کہ مفتوحوں سے یہ ناز و نخوت، یہ جاہ و حشمت چھین لیں، چھینتے رہیں، یہ تو فاتحین کی ایک پرانی رسم ہے، اور واقعی یہی کچھ ہے تو انگریزوں کو ہندوستان میں اپنی قبولیت و مقبولیت کی توقع کیوں کر ہے۔ مفتوحین کا بھی پھر کوئی طور ہوتا ہے۔ کسی اچھی گھڑی، کسی اچھے ہدف کی فکر میں سرگرداں رہنا اور مناسب موقع ملنے پر غاصب سے کوئی رعایت نہ کرنا۔''

''کچھ بدمعاشوں نے ہماری گاڑی چرالی ہے۔''

پروفیسر پر سکوت طاری رہا۔ میرے چہرے پر اُس کی نگاہیں گڑھی ہوئی تھیں، میں نے ٹھیری ہوئی آواز میں کہا، ''کیا ہندوستانیوں کی غربت اور ناداری، دیدہ ریزی و جہاں شناسی انگریزوں کے علم میں نہیں ہے؟... ہندوستان کی بیش تر آبادی وہی ہے، جھونپڑیوں میں رہتی ہے۔ جفاکشی و سخت جانی اُن کا شعار ہے، شعار کیا، اُن کے پاس زندہ رہنے کا کوئی اَور قرینہ ہی نہیں ہے۔ اِدھر سرکارِ برطانیہ نے طرح طرح کے محصول اُن پر عائد کیے ہیں، مگر تحصیل کا سزاوار تو وہی ہو سکتا ہے، جس کے پاس نانِ جویں اور تن پوشی سے کچھ بچتا ہو۔ کیا دردمند انگریزوں نے کبھی توجہ کی کہ اُن کے محصولات کا بوجھ لوٹ پھیر کے اُنھی بدبختاں کی کمر پہ آتا ہے جو پہلے ہی بہت ناتواں ہیں۔ اُن محل نشیں اقبال مندوں پر نہیں، جن کے شانے بہت مضبوط اور جن کے قدموں سے زمین بیزار نہیں ہے۔ یہ صاحبانِ تدبیر

یہاں انگریزوں کے مفادات کے نگراں بن چکے ہیں، اور اُن کے نائبین کے فرائض نہایت حسن وخوبی سے انجام دیتے ہیں۔ انگریز کہیں انھیں خطابات سے نوازتے ہیں، کہیں منصب ودولت سے، حکم رانی کا یہ بالواسطہ طریق کار تو کیمیا کا گُر ثابت ہوا۔ راستے خود بہ خود روشن ہوتے گئے۔ یہی ہنر مستند ومعتبر ٹھیرا ہے، تو اب کوئی نیا تجربہ کیوں کیا جائے۔"

"میں... میں سمجھا نہیں۔" پروفیسر اضطراری لہجے میں بولا، "یہ بالواسطہ حکم رانی سے آپ کی کیا مراد ہے؟"

"کوئی ابہام نہیں، ذرا غور کیجیے تو سارا کچھ آئینہ ہوجائے گا۔" میں نے اپنی آواز دھیمی رکھنے کی کوشش کی کہ لہجے میں میرے کسی درونِ خانہ عناد کی تپش کم سے کم محسوس ہو۔ یہ قابو پانی ایک مشکل کام ہے۔ اس کے لیے آدمی کو پتھر کا ہونا چاہیے، یا لوہے کا۔ میں نے کہا، "پروفیسر صاحب! میں سمجھتا ہوں، یہ نکتہ انگریزوں کو بہت پہلے معلوم ہوگیا تھا کہ ہندستان کے ہُنرمند، کاشت کار، مزدور آخری درجے کی زندگی گزارتے ہیں اور عملاً اپنے اپنے علاقے کے راجے مہاراجوں، نوابوں، سرداروں، جاگیرداروں اور زمیں داروں کے نرغے میں ہیں، چناں چہ یہی قرینِ عقل تھا کہ وہ اِنھی ذی حشم، عالی مقام لوگوں پر توجہ مرکوز رکھیں۔ کہیں انھیں نوازشوں سے زیرِ بار کیا جائے، کہیں قوت وقدرت سے اسیر کیا جائے۔ اِن مقتدر امیروں کی تعداد ہندستان کے حقیر غریبوں کے مقابلے میں نہ ہونے کے برابر تھی، اور ہے۔ دولت مند ویسے بھی خزاں سے بہت ہراساں رہتا ہے۔ زندگی بھر وہ پشتے مضبوط کرتا رہتا ہے کہ آندھیاں اُس کی دہلیز نہ چھوسکیں۔ کہتے ہیں، جتنی دولت، اُتنی مضبوطی، پائداری، اُتنا ہی خوف۔ انگریزوں نے اِنھی ہوش مندوں کو شیشے میں اُتارا اور فرزندانِ دل پذیرِ دولتِ انگلیشیہ کے خطاب سے نوازا۔ جن چند ایک سے ہوا کا رُخ نہ پہچاننے کی نادانی ہوئی، اُنھیں کہیں اَمان نہ ملی۔ طاقت سے بڑا طاقت کا دبدبہ ہوتا ہے۔ جہاں ضرورت پڑی، وہاں طاقت کا اظہار کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں کی گئی۔ جو چند ایک عقل دشمن سرکش ثابت ہوئے، اُنھیں اُن کی زمینوں سے بے دخل کردیا گیا کہ دوسروں کو عبرت ہو۔ جنھوں نے آسمان کے بدلتے ہوئے تیور بھانپ لیے، اُن کے مدارج بلند ہوئے۔ شہ کی اِس مصاحبت میں اپنے ہم رُتبہ، ہم پیشگاں کو مغلوب دیکھنے کی بھی ایک حسرت نہاں تھی۔ کم حیثیت امیر بڑی حیثیت کے امیر کے لیے بہت کینہ دل میں چھپائے ہوتا ہے۔ انگریزوں نے ہندستان کے اِن صاحبانِ زور واثر کی باہمی رقابتیں تاک لی تھیں۔ انھوں نے ابتدا میں کم رُتبگاں کے مراتب فزوں کیے۔ الغرض، جو اُن کی پناہ میں آیا، وہ سربلند ہُوا، جو کدورت وکبیدگی کا مرتکب ہُوا، وہ معتوب ومطعون قرار پایا۔

سامنے رکھے گلاس سے میں نے گھونٹ بھر پانی پیا اور یوں پروفیسر کے چہرے سے کچھ اَخذ کرنے کے لیے تأمل کیا۔ رنجش اور برہمی کے بجائے اُس کی آنکھوں میں تجسس دیکھ کے مجھے حوصلہ ہُوا۔ میرے رُک جانے پر وہ پھر مضطرب ہوگیا تھا۔

"مطلب یہ ہے..." میں نے جکڑی ہوئی آواز میں کہا، "کیا یہ ماجرا حکومتِ برطانیہ کے اہلِ کاروں کے علم میں نہیں تھا کہ اُن کے عائد کیے ہوئے محصول کن لوگوں پر واجب ہوتے ہیں اور اِن کی ادائی کا بار کون اُٹھاتا ہے، اور یہ کہ اُن کے لائق وفائق فرزند گردہ سے کچھ نکالنے کے بجائے اپنے محکومین کے گرد حصار اَور تنگ کردیتے ہیں، نتیجے میں غریب اَور بے بس پا ہوجاتے ہیں۔ انگریزوں کو اپنے خزانۂ عامرہ کی لب ریزی سے غرض تھی، 'کہاں سے، کیسے اور کیوں' کی تشویش حجت کے مترادف تھی۔ حاصل یہ کہ چشم پوشی دانستہ تھی۔ دولت صحیح طور پر تقسیم ہوجایا کرے تو سبھی غریب ہوجائیں، یا سبھی مال دار۔ انگریزوں کو ہندستان میں یہ عادلانہ نظام رائج کرنے کی پوری مقدرت تھی، مگر شاید یہ نیکی اُنھیں راس نہیں آئی۔ کمتی کے روسا، اُمرا تک رسائی، یا اُن کی گرفت میں ایسی رکاوٹ پیش نہیں آتی تھی، جیسی تنگ وتاریک، متعفن اور مردم بیزار گلیوں سے گزر کے انبوہ تک پہنچنے میں ممکن تھی۔ یوں دیکھا جائے تو انگریز ہندستان کے عوام کے حاکم ہونے کے بجائے یہاں کے خواص کے حاکم رہے ہیں۔ درمیان کے یہ لوگ دلالی کے لیے آسانی سے دست یاب تھے۔ کھلی چھوٹ، درگزری اور پشت پناہی اِس خدمت کا صلہ طے پائی۔ اصل میں دونوں ہی کو ایک دوسرے کی ضرورت تھی۔ نیت ایک، مقاصد ایک۔ انگلستان کے

آئین کی طرح افہام وتفہیم کا غیر تحریری معاہدہ دونوں کے درمیان ایک زمانے سے عمل پذیر ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو اچھی طرح پہچانتے ہیں۔ انگریزوں کو آگہی ہے کہ اُن کے یہ پیشہ ور کارندے اپنے محکومین کی محرومیوں کے سبب سے معتبر ومفتخر ہیں۔ اِس کے سوا اُن کی کوئی اَور فضیلت نہیں۔ اِدھر یہ نمک خوار وفا شعار بھی کشورِ انگلستان کے رموزِ سلطانی وجہاں بانی سے خوب واقف ہوچکے ہیں۔ اُنھیں اندازہ ہے کہ ہندستان میں برطانوی حکومت کے لیے اُن کی حیثیت ستون کی ہے، آڑ کی سی ہے، اور وہ تو تاجِ برطانیہ کا ایک جزوِ لازم ہیں۔ اُن کے وسیلے کی سمندر پار کے آقاؤں کو عادت پڑچکی ہے۔ اِس تن آسانی میں یہ اتنی دُور جاچکے ہیں کہ اب کوئی اَور عملی حکمت وضع کرنا اُن کے لیے آسان نہیں۔ اِتنے عرصے میں ایک مروّت بھی آنکھ میں گھر کرلیتی ہے۔ ویسے بھی گورے سگ پروری میں خاصے ماہر ہوتے ہیں، اور یہ ہندستانی تو غراتے بھی نہیں۔"

اپنے لہجے کی کسیاہٹ خود مجھی کو بُری لگی۔ یہ کوئی اچھی بات نہیں تھی۔ پروفیسر کٹہرے میں نہیں کھڑا تھا، میں کوئی مدعی نہیں تھا۔ سامنے کے دائرے میں لوگ ابھی تک باہم پیوست، مست وبےخود سازوں کے اشاروں پر رقصاں تھے۔ یہ خوش گوار وقت اور سحر آفریں جگہ اِن مباحث کے لیے یک سر ناموزوں اور یہ سنجیدگی سراسر بےذوقی تھی۔ غالباً یہی بہتر تھا کہ اپنی بات مکمل کرکے میں خاموش ہوجاؤں۔ وہ کیسے لوگ ہوتے ہیں جن کا سینہ، جن کا خون اُن کے اظہارِ رائے، لہجہ ولب میں شامل نہیں ہوپاتا۔ پہلے مجھے اِس نظم وضبط کی مشق کرنی چاہیے تھی، مگر وہی ہُوا۔ میرے توقف پر پروفیسر پریشان سا ہونے لگا۔ اِس سے پہلے کہ وہ مجھے ٹوکتا، میں نے نسبتاً بےاعتنائی سے کہا، "سنتے ہیں، وقت یک ساں رفتار سے نہیں چلتا۔ وقت کے تیور کچھ بدلے بدلے سے نظر آتے ہیں۔ میرا خیال ہے، یہ سلسلہ تا دیر جوں کا توں قائم نہیں رہ سکتا۔ یہ خواہش کی بات نہیں۔ وقت کی کروٹیں محسوس کی جاسکتی ہیں۔ کسی انتہا پر تو ہندستان کے پس ماندگاں کا ردِعمل بھی فطری ہوسکتا ہے۔ انسانوں کے یہ غول ہزار جان ذروں کی زندگی بسر کرتے ہوں، جان ور تو نہیں ہیں۔ انگریزوں کو بھی شاید

یہ آپ کسی تلاطم کا احساس ہوچکا ہے۔ آپ کی آمد کی وجہ بھی، جیسا کہ آپ نے خود بتایا، کچھ اِسی سبب سے ہے۔"

"یقیناً یہی، یہی کچھ ہے" پروفیسر نے اُٹھی ہوئی آواز میں تائید کی اور کہنے لگا، "لیکن صورتِ حال پہلے جیسی قطعاً نہیں ہے۔ انگریزوں نے ہندستان میں ریل کا وسیع نظام پھیلایا ہے۔ بجلی، کارخانے، سڑکیں وغیرہ۔ اِن کے فائدے انگریزوں کے منظورِ نظر، مرغوبِ خاطر لوگوں، نواب، راجے مہاراجاؤں ہی کو حاصل نہیں ہوتے۔ کیا یہ حرکت پذیری مجموعی طور پر ہندستانی معاشرے پر اثر انداز نہ ہوگی؟"

"یہ دوئی بھی خوب ہے" میرے ہونٹ پھیل گئے۔ میں نے زہرخند سے کہا، "کوئی انکار نہیں کہ ہندستان میں شہری معاشرے فروغ پارہے ہیں۔ بڑے بڑے کارخانوں کا قیام، نئی سڑکیں، بہتر رہن سہن کی بستیاں، ریلوں کا جال، نلکوں کے ذریعے پانی، ڈاک اور تار کا جدید طریقہ، بڑے شہروں میں آمدورفت کے لیے لاریوں، ٹراموں، موٹرگاڑیوں کا رواج، جدید طرز کے شفاخانے، نئی تعلیم کے اسکول، کالج اور یونیورسٹیاں۔ یہ سب کچھ ہوتا دکھائی دے رہا ہے، مگر ساتھ میں کچھ اَور اقدام بھی تو ضروری ہیں۔ کیا اُن لوگوں کی سرپرستی سے انگریزوں نے ہاتھ اُٹھالیا ہے جو ہندستان کے عام آدمی کی شکستگی کا بنیادی سبب ہیں۔ یہ دورنگی تو ایک تماشا ہوئی۔ کیا ایک مقام سے دوسرے مقام تک ہفتوں کے فاصلے پہروں میں سمیٹنے والی ریل اور پلک جھپکنے میں بام ودر روشن کردینے والے قمقموں نے دُورافتادگاں کے لیے روزوشب کی منزلیں سہل کردی ہیں۔ اِن سیاہ روزگاراں کی نس نس میں اُترے اندھیرے مٹادیے ہیں؟ آپ کے ناز بردار مراعات یافتگاں کے تسلط سے اُنھیں نجات مل گئی؟ میں پوچھتا ہوں، اِس ایک جرأت میں

کیا قباحت ہے۔ آدھی دُنیا پر قائم سلطنتِ برطانیۂ عظمیٰ اپنے کاسہ لیسوں کے غلبہ و اثر کے آگے لاچار ہے کیا؟ ضرور کوئی اَور بھید ہے۔ سرکارِ برطانیہ کو اعتماد نہیں ہے کہ اِن سہاروں کے بغیر وہ ہندوستان پر قبضہ و تصرف میں کام یاب رہ سکتی ہے؟ دوسری کسی حکمت میں اُسے بساط بکھر جانے کا اندیشہ ہے۔"

"ابھی میں اِس باب میں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔" پروفیسر نے پژمردگی سے کہا، "بادی النظر میں آپ ہی کا تجزیہ دُرست معلوم ہوتا ہے، تاہم حکومتِ برطانیہ اپنے اِن بہی خواہوں، یا دوستوں کی رفاقت سے یوں ایک جھٹکے میں دست بردار بھی تو نہیں ہوسکتی۔"

"کیوں نہیں ہوسکتی۔ اِن لوگوں کو بے دولت کر دیجیے۔ دیکھیے، کیسے بے دست و پا ہوجائیں گے۔ اِن کی موجودی میں عام ہندوستانی کو نئی زندگی دینے کی خواہش، خواب کی حیثیت رکھتی ہے۔ پچاس فی صد، بل کہ نوّے فی صد دیہی آبادی تو آپ کے رفیقانِ خاص کی رعیت ہے، غلام ہی کہیے، یہ اُن کے مالک و مختار ہیں، اَن داتا ہیں۔"

"بات بہت دُور تک جاتی ہے۔" پروفیسر کی آواز کھوسی گئی، "میں سمجھتا ہوں، یہ میری خوش فہمی بھی ہوسکتی ہے کہ ہندوستان میں صنعتی رجحانات اور شہروں کے فروغ سے کوئی تبدیلی، بہ ہرحال، لازم ہے۔ سست رفتاری سے سہی، لیکن فرق پڑنا چاہیے۔"

بہت سے جواب میرے ذہن میں گردش کیا کیے۔ میں نے خود کو باز رکھا۔ مجھے کسی اختلاف و انحراف کی کیا ضرورت تھی۔ مجھے تو اپنے آپ پر حیرت تھی کہ میری زبان کیوں اِس قدر رَواں ہے۔ مجھے ان مسائل و مباحث سے کبھی ایسا شغف نہیں رہا۔ سفر کے دوران کبھی کبھار، اسٹیشنوں کے کتاب فروشوں سے اِکا دُکا رسالے، اخبار اور کتابیں خرید کے سرسری نظر ڈالنے سے آدمی عالم فاضل نہیں ہوجاتا۔ کوئی بھی اُلٹی سیدھی بات کسی لمحے مُنھ سے نکل سکتی ہے۔ آدمی کو جس موضوع پر دست رس نہ ہو، اُس پر لب کشائی سے پرہیز ہی کرنی چاہیے، اور میرے لہجے میں تمام تر احتیاط کے باوجود یہ کیسی سوزش عود کر آئی ہے۔ یہ تو ایک نقص ہے۔ میں نے خود کو تلقین کی کہ بس، اِتنا ہی بہت ہے۔ پروفیسر کو زچ کر کے ہندوستان کے لیے برطانوی سرکار کی فکری نہج بدل جانے کی کوئی توقع میرے دل میں جاگزیں ہے تو کیسا طفلانہ پنا ہے۔ وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا کہ بات بہت دُور تک جاتی ہے۔ شاید مجھ میں کھل کے اُس کے سامنے مدعا بیان کرنے کی سکت نہیں ہے۔ خود فکری و خودنگری، کوچہ گردی اور چاقو بازی کے سوا مجھے کام بھی کیا رہا ہے۔

ساز دھیمے ہوتے ہوتے ٹھہر گئے اور ہر جانب ہلکا ہلکا شور گونجنے لگا۔ رقص میں مستغرق جوڑے اِدھر اُدھر بکھر گئے۔ مایا اپنے خوش پوش رقص شریک سے جدا ہو کے لپکتے قدموں سے ہمارے پاس آگئی، اور پروفیسر سے رسمی اجازت لے کے اُس کے پہلو میں رکھی کرسی پر بیٹھ گئی۔

"تھکی تھکی لگ رہی ہو، کیا پیوگی!" پروفیسر نے مشفقانہ لہجے میں کہا، "تھوڑی سی شراب ایسے وقت اکسیر کا درجہ رکھتی ہے، مگر شراب سے تمھیں بیزاری ہے۔"

"ایسا نہیں کہ کبھی چکھی ہی نہ ہو۔" مایا کے ترشے ہوئے ہونٹ سکڑ گئے۔ "لیکن اب تو اِس کے ذکر ہی سے طبیعت اُلجھنے لگی ہے۔"

"تو کیا پیوگی؟"

"ابھی رہنے دیجیے۔" مایا اپنے دراز سیاہ بال درست کرتے ہوئے بولی، "کچھ دیر بعد..."

وہ مغربی اور مشرقی حُسن کا ایک دل کش امتزاج تھی، سیاہ آنکھیں، گھنی پلکیں، کشیدہ قامت، سجیلے نقش و نگار، ستواں ناک، موتیوں سے دانت، نہ بڑے، نہ چھوٹے، سرخ و سپید رنگت میں جیسے قدرت نے چٹکی بھر سُرمے کی آمیزش کر دی ہو۔ الغرض، سانچے میں ڈھلا سراپا۔ جانے کیوں، مجھے ڈاکٹر رائے کی بیٹی بینا یاد آرہی تھی۔ دونوں میں ایسی مماثلت نہیں تھی، مگر حُسن و جمال کی کوئی ایک معیاری مثال نہیں ہوتی، اور کسی کو کسی پر فوقیت نہیں دی جاسکتی۔ دینی بھی نہیں چاہیے، باطنی خوبیاں بھی تو حُسن کا حصہ ہوتی ہیں۔ مایا کے بارے میں مجھے کیا معلوم تھا، بینا ایک ہمہ صفت لڑکی تھی۔ پروفیسر نے سچ کہا تھا، مایا کی آنکھوں سے ذہانت چھلک رہی تھی۔ رفتار، گفتار، نشست،

برخاست سے شائستگی اور نفاست عیاں تھی، اعلا قسم کا سیاہ مغربی لباس پہنے ہوئی تھی۔

"میں پھر مخل ہوئی، آپ کیسی اہم اور دل چسپ باتیں کر رہے تھے کہ گرد و پیش کا کچھ ہوش ہی نہیں تھا؟"

"ہم تمھارے انگلستان اور تمھارے ہندوستان کے بارے میں بات کر رہے تھے۔" پروفیسر نے پُرجوش لہجے میں کہا۔

"میں شریک نہیں ہوسکتی؟" مایا اشتیاق سے بولی۔

"کیوں نہیں، تم اُس وقت چلی گئیں۔ کاش، یہیں ہمارے ساتھ موجود رہتیں۔ اِس نوجوان کی زبان سے جیسے سارا ہندوستان کلام کر رہا تھا، جیسے ہندوستان اپنا مقدمہ پیش کرتا ہو۔"

"اور انگلستان کٹہرے میں کھڑا ہو۔" مایا کے رخساروں پر شوخی پھوٹ پڑی، کم کم چہرے ہنستے ہوئے اِس طرح گُل زار ہوتے ہیں۔

"برصغیر میں برطانوی راج پر اِس کا تجزیہ کیا فکر انگیز ہے۔"

"کیا کہتے ہیں یہ صاحب؟" مایا خالص ہندوستانی انداز میں ٹھنک کے بولی۔ ایک لمحے کے تذبذب کے بعد اُس نے میرا نام لیا، "بابر زماں! یہی نام بتایا تھا آپ نے؟"

"آپ کو بہت یاد رہا۔" میں نے تعجب سے کہا۔

"یہ بڑی حساس، یادداشت کی پختہ ہے۔" پروفیسر ستائشی نظروں سے مایا کو دیکھتے ہوئے بولا، اور والہانہ اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ "یادداشت کی پختگی اور حساسیت آدمی کو مضطرب بھی بہت رکھتی ہیں۔"

"کیا کرتے ہیں آپ؟" مایا نے کھنکتی آواز میں پوچھا۔ مجھے تامّل ہوا۔ "کیا بتاؤں۔" میں نے مسکرانے کی کوشش کی اور کہا، "سیر و سیاحت کر لیجیے۔"

"ظاہر ہے، کسی مقصد سے۔" وہ پلکیں جھپکاتے ہوئے بولی، "میری مراد ہے، کون سے پیشے سے وابستگی ہے۔"

"سچ پوچھیے تو ابھی کوئی کام شروع نہیں کیا، ابھی تو بس یوں ہی..." میں اُسے کیا بتاتا، میں نے جھجک کے کہا، "مجھے کچھ آتا بھی تو نہیں ہے۔"

میرے جواب سے اُس کا تجسّس فزوں ہونا چاہیے تھا، لیکن اُس کا تعلق پولیس سے نہیں تھا، اُس کی تربیت ایک متمدن

"تم جیت گئے نا ہربرٹ!"

گھرانے اور معاشرے میں ہوئی تھی۔ شاید یہ اخذ کر کے کہ مجھے خود کو افشا کرنے میں کوئی عار ہے، وہ شگفتگی سے کہنے لگی، "یقیناً کسی بڑے گھر سے تعلق ہوگا، میری ماں نے مجھے ہندوستانی رئیسوں کے قصّے کہانیاں سنائی ہیں کہ وہ کوئی کام ہی نہیں کرتے، سیر و سیاحت کرتے ہیں، شکار کھیلتے ہیں، شطرنج کھیلتے، مرغ بازی، کبوتر بازی کرتے، رنگ رلیاں مناتے ہیں اور ہاں، حکم چلاتے ہیں۔"

"حکم چلانا بھی تو ایک کام ہے۔" جی میں آیا، کہوں، "اور گورے یہاں کیا کرتے ہیں۔" میں چپ رہا کہ طبعِ نازک پر بے جا گراں بار ہونے کا گمان ہوا۔ میں نے پوچھا، "آپ پہلی بار ہندوستان آئی ہیں؟"

"میں ہندوستان ہی میں پیدا ہوئی تھی۔ چھ سال کی عمر تک یہیں رہی، پھر انگلستان چلی گئی، بعد کو یہاں آنا ہی نہیں ہوا۔"

"کچھ یاد ہے یہ ہندوستان؟"

"صرف پرچھائیاں، دُھندلی دُھندلی سی یادیں۔" مایا خواب ناک لہجے میں بولی، "ماں نے بتایا تھا، شمالی ہند کے ایک پہاڑی علاقے، نہایت خوب صورت مقام شملا شہر میں میری پیدائش ہوئی تھی۔ ہمارے قریبی عزیزوں کا تعلق

ریاست بھوپال سے تھا، لیکن عیش تردنی میں رہتے تھے۔ شادی کے بعد کوئی واسطہ ہی نہیں رہا ماں کا کسی سے، اِس لیے کہ ماں نے سارے خاندان سے جھگڑ کے میرے باپ سے شادی کی تھی۔ لیکن اب میں... مجھ میں انھیں دیکھنے کی خواہش منڈلاتی ہے۔"

"مایا کا باپ ہندستان میں تعینات برطانوی فوج میں بریگیڈیئر تھا، نہایت عمدہ شخص، کم سے کم فوجی اور زیادہ سے زیادہ شاعرانہ خوبیوں کا حامل، کتابوں کا رسیا۔" پروفیسر نے دخل دیا۔ "میرے اُس سے پرانے مراسم تھے۔ عرصے تک وہ مجھ سے دُور ہندستان میں رہا۔ اُس نے کئی بار بلایا، مگر آنا ہی نہ ہو سکا۔ ہندستان میں اُسے ایک ہندستانی لڑکی پسند آ گئی، یہیں شادی کر لی، پھر اُسے انگلستان واپس بلا لیا گیا۔ میجر جنرل کی حیثیت سے ریٹائر ہوا۔ ایک بیٹا ہوا، ایک بیٹی... یہ مایا۔ بیٹا برطانوی شاہی فوج میں پائلٹ ہو گیا تھا۔ دو سال ہوئے، ہوائی حادثے میں زندہ نہ رہ سکا، نوجوان بیٹے کی موت کا صدمہ باپ سے برداشت نہ ہوا، وہ بھی جلد ہی چل بسا۔"

"اوہ۔" میں نے افسوس کا اظہار کیا۔

"وہ سب کچھ نہ دُہرائیے پروفیسر۔" مایا نے آزردگی سے کہا، "لوگ بچھڑ ہی جاتے ہیں، اچھے بُرے سبھی۔"

"ہاں، یہ میں کیا ذکر لے بیٹھا۔" پروفیسر شرمندگی سے بولا، "واقعی میں بوڑھا ہو رہا ہوں۔" پھر موضوع بدلنے کے لیے وہ مجھ سے مخاطب ہو کے تیزی سے بولا، "ہم کیا بات کر رہے تھے؟"

"آپ بھی تو کچھ کہیے، کچھ انگلستان کے بارے میں بتائیے، وہاں کے موسم... کچھ وہاں کی باتیں... سنا ہے، آنکھیں پھٹ جاتی ہیں آپ کے کرشمے دیکھ کے..."

پروفیسر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ "مگر میں استفادہ کر رہا تھا۔" وہ خوش وضعی سے بولا۔

"کچھ مجھے بھی اِس کا موقع دیجیے۔ آپ اوکسفرڈ میں اُستاد رہے ہیں۔ استفادے کی گذارش تو مجھے آپ سے کرنی چاہیے۔"

"اِس کا بھی وقت آئے گا۔" وہ شوخی سے بولا، "ہرچند مجھے شبہ ہے کہ میں آپ کے لیے کسی اضافے کا موجب ہو سکوں گا۔"

"دیکھیے، آپ نے خود ہی میری فہم کی کجی کی تصدیق کر دی۔" میں نے بے ساختہ کہا۔

"اوہ نہیں، بہ خدا نہیں۔" وہ بے چین ہو گیا۔

"مگر کچھ غلط بھی نہیں ہے۔"

"ایسا نہیں ہے۔" وہ سر جھٹکنے لگا، "اِس طرح نہیں جناب! شرمندہ مت کیجیے۔ میں نے کچھ دیر پہلے آپ سے کہا تھا کہ اَب تک جتنے ہندستانیوں سے ملنے کا موقع مل سکا ہے، اُن میں آپ سب سے ممتاز ہیں۔ یاد ہے آپ کو؟"

"جی!" میں نے سر جھکا لیا۔

"ازراہِ کرم مجھے ایک طالبِ علم سمجھیے۔" وہ منکسر لہجے میں بولا، "میں نے آپ کی ہر بات تحقیق کی ہے۔"

"لیکن میں تو... میں تو..." میں نے بھنچی ہوئی آواز میں کہا، "یہ ایک بے خیال اور بے علم کی عزت افزائی ہے۔"

"اور میرے لیے یہ اعتراف طمانیت کا باعث ہے۔" پروفیسر کے لہجے میں ذرا بھی بناوٹ نہیں تھی، کہنے لگا، "آپ کیسی اہم باتیں کر رہے تھے۔ وہ سلسلہ جاری رکھیے۔ ضرور کوئی لحاظ مانع آ گیا۔"

"شاید میری وجہ سے۔" مایا ہمک کے بولی۔

"نہیں، بالکل نہیں۔ شاید پاس کچھ بچا ہی نہیں ہے۔"

"وہی گریز!" پروفیسر نے بے کلی سے کہا، "میں آپ کو اپنی استقامت کا یقین دلاتا ہوں۔"

"مجھے اندازہ ہو چکا ہے۔"

"اور درخواست بھی تو میں نے ہی گزاری ہے۔"

"اب آپ شرمندہ کر رہے ہیں۔"

"میں تو آپ کا بے حد ممنون ہوں، ایک اجنبی کو آپ نے اِتنا وقت دیا۔ یہاں آنے کی زحمت کی۔"

"سچ تو یہ ہے، آپ کے توسط سے ہمیں اِس ممنوعہ جگہ باریابی نصیب ہوئی۔ اِس طرح انگلستان کی ایک جھلک دیکھ لی۔ یہ سب کچھ کیسا خواب ناک ہے۔ موسیقی، خوش بُو اور اِتنے دل کش، خوش منظر لوگ۔ آپ سے ملاقات نہ ہوتی تو اِتنے قریب ہو کے بھی ہم اِس نظارے سے محروم رہتے۔"

"ہاں۔" اُس کی آواز بجھ گئی، "مجھے معلوم ہے، اُنھوں نے اِس جگہ انگریزوں کی موجودگی میں ہندستانیوں کا داخلہ بند کر رکھا ہے۔ صرف چند ہندستانی استثنا میں آتے ہیں،

وہ لوگ ہیں جو کسی انگریز کے مہمان ہوں۔ یہ ایک عجیب بات ہے۔ میں اِس پابندی کی توجیہ نہیں کر سکتا۔ میرے لیے یہ رویہ حیران کن بھی ہے اور تکلیف دہ بھی۔"

"آپ کا تعلق چوں کہ درس و تدریس سے رہا ہے۔ اِس لیے یہ سب آپ کو عجیب سا لگنا چاہیے۔ کچھ دنوں ہندستان میں رہ کے آپ اِس تفریق کی توجیہ آسانی سے کر سکیں گے۔ ہم تو اَب عادی ہو چکے ہیں۔ ہمارے لیے یہ اِتنی اہم بات نہیں رہی۔"

"ہُنہ۔" پروفیسر شانے اُچکا کے رہ گیا۔

"یہ تو خیر انگریزوں کی بات ہوئی۔ وہ بہت دُور سے اپنے خاص مزاج اور رسم و رواج کے ساتھ آئے ہیں۔ یہاں تو آپس میں بھی بڑا بھید بھاؤ ہے۔ نواب راجا اور بلند مرتبت جاگیرداروں اور زمیں داروں کا بھی اپنے ہم وطنوں سے کچھ یہی سلوک ہے، اور اِس سے آگے کی منزل بھی ہے۔ یہاں آدمی اچھوت بھی ہوتا ہے۔ ایک کے چھونے سے دوسرا آدمی میلا، ناپاک ہو جاتا ہے۔"

"میں نے پڑھی ہیں اِس مسئلے پر کئی کتابیں، لیکن امیری غریبی کے بجائے اِس امتیاز کی بنیاد ہندوؤں کی ذات پات کا اٹل قانون ہے۔" پروفیسر کسمساتے ہوئے بولا، "مگر ایک اَور بات! کچھ لوگ غریب، کچھ آسودہ حال، کچھ امیر و کبیر، ایسا کیوں ہے کہ ہر معاشرے میں بعض لوگ غریب، بعض امیر، بعض پست، بعض بلند ہوتے ہیں، یا ہو جاتے ہیں، غالباً جسمی یا دماغی اعتبار سے توانا لوگ آگے نکل جاتے ہیں۔"

"معاف کیجیے، میں آپ سے متفق نہیں۔" میں نے ناگواری سے کہا، "کیا آپ جسمی و دماغی اعتبار سے برتر لوگوں کو ہمارے ہاں کے روایتی زمیں داروں کے مشابہ قرار دے رہے ہیں۔ ہمارے یہ جاگیردار، اپنے آبا و اجداد کے پس خوردے کے سبب سے ممتاز ہیں۔ یہ جدّی پشتی ورثے دار دوسرے اور خود اپنے معاشرے کے صاحبانِ علم و فن کے کس طرح مماثل ہو سکتے ہیں۔ خداداد خوبی، اکتسابی خوبی اور ورثے کی خوبی میں کوئی تو ترجیح ہونی چاہیے۔ ترکے کی دولت و امارت کے سوا ہمارے سرفراز لوگوں کی اَور کیا خوبی ہے۔"

"ہاں، بے شک۔" پروفیسر مایوس آواز میں بولا، "سب سے قابلِ قدر اکتسابی خوبی ہے۔"

"اِس کے لیے بڑی ریاضت کرنی پڑتی ہے، اور کبھی عمر صرف ہو جاتی ہے۔"

"اور کبھی عمر بھر کے ایثار، تگ و دو کے بعد بھی کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ آدمی پیاسا چلا جاتا ہے۔"

"مگر اِس تشنہ کامی کی یہ سرشاری اپنی جگہ ہے کہ عمر یوں گنوائی تو نہیں۔"

"میں دیکھ رہا ہوں۔" پروفیسر نے چمکتی آنکھوں سے کہا، "دیکھا مایا؟"

مایا کے رخساروں پر ایک رنگ آ کے گزر گیا۔

"کھلی آنکھوں کے خوابوں نے مشرق کو ایک فسانہ بنا دیا۔ مصوری، شاعری، موسیقی، صناعی و عمارت سازی، تصوریت، عینیت۔" میں نے کہا، "مشرق تو اَب محض ایک یادگار ہے۔ مغرب کے عجائب خانوں میں سجائی جانے والی کوئی نادر چیز اور ہندستان تو بہ طورِ خاص..."

"اِتنا نہیں۔" پروفیسر نے شکایتی انداز میں ہاتھ اُٹھا کے مجھے روکا، "مشرق کی عظمت ایک جیتی جاگتی حقیقت ہے، ایک زندہ اور فعّال عظمت..."

"مگر حاصل کیا ہے؟"

پروفیسر کے ہونٹ دھڑک کے رہ گئے۔

معاً اُسے پھر کسی خیال نے پریشان کیا، بے قراری سے بولا،

’’ہم ہندُستان کی بات کر رہے تھے اور میں کہنا چاہتا تھا، شجرے سے سر بلند، عزّت مآب ہندُستانی نوابین، راجے مہاراجے وغیرہ انگریزوں کی مخلوق تو نہیں ہیں۔ یہ انتظام تو انگریزوں کی ہندُستان میں آمد سے پہلے بھی رائج تھا۔‘‘

’’پر انگریزوں نے اسے ختم تو نہیں کیا۔ اُنھوں نے اِس ادارے کو اَور تقویت دی۔ انگریز تو انسانی حقوق کے علم بردار، روشن خیال معاشرے سے آئے تھے۔ اُنھوں نے عام ہندُستانی کو کس انقلاب سے دوچار کیا۔ کون سے اُس کے دن پھیر دیے، وہ زیادہ غریب اُور زیادہ بے وقار ہُوا۔ صدی کے لگ بھگ کا دورانیہ ہے، کوئی مختصر مدّت نہیں ہے۔‘‘

’’ہاں، ہاں۔‘‘ پروفیسر نے بے تابانہ میری ہم نوائی کی۔

’’تو خلاصہ یہ ہے آپ کی رائے میں، عام ہندُستانیوں کی شکستگی اور مایوسی کی وجہ انگریزوں کے پروردہ، خطاب یافتہ، بااثر، زورآور لوگوں کا وجود ہے۔ جب تک یہ لوگ انگریزوں کی نگاہوں کا مرکز و محور رہیں گے، ہندُستان کے عام آدمی کی زندگی میں تبدیلی نہیں آسکتی۔‘‘

’’صرف یہی نہیں، یہ تو ایک پہلو ہے۔‘‘

’’پھر دوسرا! مزید کیا؟ کیا...‘‘ پروفیسر بے ترتیبی سے بولا۔

’’میری ذاتی رائے کو اجتماعی رائے پر محمول مت کیجیے۔‘‘

’’ہر شخص کی رائے کسی ایک طبقۂ خیال کی نمائندگی ضرور کرتی ہے۔‘‘

’’ہوسکتا ہے، لیکن میں واضح کردوں کہ میں کسی خاص گروہ ’طبقے‘ اور مکتبِ خیال سے کبھی متعلق نہیں رہا۔‘‘

’’رائے کے قیام کے لیے یہ اِلحاق ضروری نہیں ہے۔ بہ ہر حال، اِسے جانے دیجیے، ہو سکے تو اَور اسباب کی نشاں دہی کیجیے۔‘‘

’’ہاں!‘‘ میں نے سر اُٹھا کے کہا، ’’کوئی ایک وجہ نہیں، صبح ہوجائے گی اور اسباب کا شمار ختم نہیں ہوگا، مگر... مگر سب سے بڑا سبب تو آپ خود ہیں۔‘‘

میری اِس جسارت اور گستاخی پر پروفیسر کے جسم میں کوئی تموّج نمودار نہ ہوتا تو مجھے اُس کے حواس پر ہر قسم کا شبہ کرنا چاہیے تھا، اُس کے دیدے گھوم گئے، چہرے کا رنگ متغیر ہُوا اور وہ عجب بے چارگی کی کیفیت سے متبرو آزما نظر آیا، اُس کی آنکھوں میں روشنی جیسے پھوٹنے لگی۔

’’انگریز اگر نجات دہندہ بن کے آتے تو ہندُستان میں اُن کی پذیرائی کسی اَور انداز سے ہوتی۔‘‘ میں نے تیز لہجے میں کہا، ’’دیکھنا یہ ہے کہ حاکمیّت کی اِتنی طویل مدّت میں اُنھوں نے ہندُستان کو مکمّل طور پر مسخر کیا ہے یا نہیں، اور سیدھی سی بات ہے، ہندُستانی اُن سے خوش ہیں، یا ناخوش۔‘‘

’’کسی جگہ بھی باہر سے آنے والوں کو پسندیدگی سے نہیں دیکھا جاتا۔‘‘

’’نہیں جناب!‘‘ میری زبان اُمڈ رہی تھی اور نرمی و گداز میرے بس میں نہیں رہا تھا۔ میں نے پھر اِس جبر کی کوشش ہی ترک کردی۔ میں نے کہا، ’’مصلح، مشکل کشا، نجات دہندہ حاکموں کو سر آنکھوں پہ بٹھایا جاتا ہے۔ ابتدا میں ممکن ہے کہ اُن سے مخاصمت، کدورت برتی جاتی ہو، لیکن یہ اُنھی پر منحصر ہے کہ اپنی رعایا کا تکدّر وہ کس طرح دُور کرتے ہیں۔ یہی مکمّل تسخیر ہے۔ کسی ملک کے حالات سُدھارنے، تاریکیاں دُور کرنے اور محض مہم جوئی، جنگ جوئی، مال و دولت کے لیے آنا دو مختلف باتیں ہیں۔‘‘

پروفیسر نے نہ تائید کی نہ تردید، گُم صُم سا بیٹھا رہا۔

’’ساری بات نیت کی ہے۔ آپ کتنی ہی ریلیں چلائیں، قمقمے روشن کریں، دانش گاہیں تعمیر کریں لیکن آپ ہندُستان کو اپنا ملک تو نہیں سمجھتے۔ آپ کا ملک انگلستان ہے۔ جب تک آپ ہندُستان میں ضم نہیں ہوں گے اور ہندُستانیوں کی حیثیت سے اِس خطّۂ زمین کی فکر نہیں کریں گے، ہندُستانی آپ کو اجنبی ہی سمجھیں گے۔ آپ کہیں گے کہ انگریزوں کا اپنا ایک وطن ہے، ایک عظیم الشان ملک۔ وہ اُس سے نسبت ترک کر کے ہندُستانی کیسے بن سکتے ہیں۔ پھر اُن سے یہاں کس نے التجا کی ہے کہ وہ اِتنی دُور آ کے ہندُستان کی گرم مرطوب آب و ہوا، اِس گرد و غبار میں بسیرا کریں، اور اُنھیں اپنے وطن سے ایسی ہی وابستگی ہے تو واپس چلے جانے میں کیا پس و پیش ہے۔ وہ آخر یہاں کیوں رُکے ہوئے ہیں۔‘‘

پروفیسر کو خاموش ہی رہنا چاہیے تھا کہ تدبّر اور سنجیدگی کا یہی قرینہ ہے۔ کسی مناسب دلیل، معقول جواب ہی کی صورت

میں لب کشائی اچھی ہوتی ہے۔

میں نے اُس سے کہا، ”آپ کہیں گے کہ انگریز فاتح ہیں اور فاتحین کو اختیار ہے کہ وہ جب تک چاہیں، اپنے مفتوحہ علاقوں میں قیام کریں۔ ہندستان میں فاتحین کی آمد کوئی نیا حادثہ نہیں ہے۔ پہلے بھی یہاں مختلف سمتوں سے یورش و یلغار ہوتی رہی ہے، مگر اُن فاتحین اور آپ میں بڑا فرق ہے۔ چنگیز خاں آئے، لوٹ مار مچا کے چلا گیا۔ سکندر بھی نہ ٹھہر سکا۔ اُنھی جیسے وہ ایک اور مہم جوئی کا شوق پورا کر کے آگے بڑھ گئے۔ اُن کے بعد جس نے بھی ہندستان کا رُخ کیا، وہ اسی سرزمین کا حصہ بن گیا۔ وہ سب کے سب مشرقی تھے اور ہندستانی معاشرت اور مزاج سے ایسی مغائرت نہیں رکھتے تھے، اُن کے مقاصد انگریزوں سے قطعی مختلف تھے۔ اُن کے پاس ہندستان کے بسنے والے لوگوں کو مرتبہ دینے کا ہُنر بھی تھا۔ انھوں نے اچھوتوں کو اپنے دسترخوان پر ساتھ بیٹھنے کی عزت دی۔ انھوں نے ہندستانیوں سے اُنھی کی زبان اور لہجے میں رسم و راہ بڑھانے کی جُست جُو کی۔ انھوں نے ہندستانی بود و باش، موسیقی، ذائقے، تعمیر کے فن کو داد و تحسین دی اور مختلف گوشوں میں اپنی اور ہندستانی تہذیبوں کا ایک ایسا آمیزہ تیار کیا، ایسا امتزاج پیدا کیا جو ہندستانیوں کے لیے نہایت دل پذیر ہوا۔ اُنھوں نے ہندستانی اطوار سے یک سر انحراف نہیں کیا اور عداوت نہیں برتی، اور وہ تو یہیں بس گئے۔ یہیں شادیاں کیں، یہاں کی دولت یہیں پر خرچ کی۔ انھوں نے خود کو ہندستان سے جدا نہیں سمجھا۔

”اور انگریزوں نے کیا کیا؟ ٹائی کی گرہ کھولنی بھی گوارا نہ کی، نہ جوتے کے تسمے کھولے۔ فرش پر بیٹھنا کسرِ شان جانا، ذائقوں پر مُنہ بنایا۔ اپنی زبان پر اصرار کیا۔ اُنھیں ہندستان کی سانولی عورتیں بہت دل کش لگتی تھیں، لیکن ان عورتوں کو زوجیت میں لینے اور اپنی نسل میں پیوند لگانے سے اجتناب کیا۔ انگریز تو انگریز ہی رہے، لاٹ صاحب، صاحب بہادر، ایک صدی گزر جانے کے باوجود وہ ہندستانی نہ بن سکے، اس لیے کہ وہ ہندستانی بننا ہی نہیں چاہتے۔ یہ کیسا تماشا ہے؟ بادشاہ اُس کنارے، رعایا اِس کنارے، ایک برِّاعظم سے دوسرا برِّاعظم۔ بیچ میں چھ ہزار میل کا فصل، دریاؤں، جنگلوں، پہاڑوں، صحراؤں اور سمندروں کے پار انگلستان کے بادشاہ، وزیرِ اعظم، ایوانِ بالا، ایوانِ زیریں اور پریوی کونسل قائم ہیں۔ اُن کے فرستادگاں برِصغیر کے حکم راں ہیں اور تابعِ فرمانِ فرماں رَوائے مملکتِ برطانیۂ عظمیٰ بھی۔ اشارے انگلستان سے ہوتے ہیں، کٹھ پتلیاں یہاں شعبدے دکھاتی ہیں، کارندوں کی سُرخ رُوئی کارکردگی پر ہے، اور بہتر کارکردگی سے مراد برِصغیر میں برطانوی سلطنت کا پہلے سے زیادہ اور زیادہ استحکام ہے، اور استحکام سے مراد ہندستانیوں کی پہلے سے زیادہ بہتر مال و دولت کی کشید بھی ہے۔ قرائن کہتے ہیں کہ یہ جاں نثار سب خیر ہے کے جاں فزا نامے بالعموم اپنے آقاے ولی نعمت کو ارسال کرتے ہوں گے۔ ممکن ہے، کبھی اُن مراسلوں میں وحشت کا اظہار بھی ہوتا ہو، لیکن سانحوں کی خبر فاصلوں پر بیٹھے ہوئے متعلقین کو اِتنا مضطرب نہیں کرتی جتنا قریب کے لوگوں کو ایذا پہنچاتی ہے۔ مقصود یہ ہے کہ انگلستان میں فروکش اصل حکم راں اپنے نائبین اپنے عمال کی آنکھوں سے دیکھتے ہیں اور شہادتوں کی بنیاد پر نئے فیصلے کرتے، یا سابقہ احکام کی توثیق کر دیتے ہیں۔

پروفیسر اور بابا دونوں کی نگاہیں مجھ پر مرکوز تھیں۔ پیالی میں بچی کافی ٹھنڈی ہو چکی تھی، اُس کا آخری گھونٹ لے کے میں نے حلق تر کیا، اور کسی قدر تھکی ہوئی آواز میں کہا، ”یہ سلسلہ سَو سال سے کام یابی سے جاری ہے اور ضروری نہیں کہ آئندہ سَو سال تک بھی اسی طرح جاری رہے۔ چوں کہ یہ عمل بھی عقل اور منطق کی ضد ہے، اِس لیے جلد، یا بدیر اِسے ندامت سے دوچار ہونا ہے، برِصغیر اُنھی لوگوں کا ہے جو یہاں بستے ہیں اور کسی اور طرف نہیں دیکھتے۔ اُن کی کثرت گو کوئی قوت نہیں ہے، لیکن ایک قوت ایک حقیقت تو ہے، سنا ہے، ایک بار چیونٹیوں نے کسی بستی پر یلغار کر دی تھی۔ بستی کے سارے مکیں بھاگ کھڑے ہوئے۔ ہندستانیوں کی تعداد ہندستان میں تعینات انگلستانی حکومت کے وظیفہ یاب کارندوں سے ہزاروں گنا، لاکھوں گنا بڑی ہے، بل کہ لاکھوں اور کروڑوں کا فرق ہے یہ، اور اِس تعداد میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ کسی وقت یہ فیصلہ کن بھی ہو سکتی ہے، انگلستان کے زرہ بکتر سجائے حصار بند کارندے اپنے ہتھیاروں، اوزاروں اور مشینوں کے بل پر آج کثرت

سنگ رنگ

پر غالب ہیں تو یہ کوئی مضبوط اساس نہیں۔ ہو سکتا ہے، کل یہ تعداد سنبھالے نہ سنبھلے، سینوں کے آگے ہتھیار کم پڑ جائیں۔ اَب بھی انسانوں کے اِن غولوں کو کھونٹے پر باندھے رکھنا مشکل ہو رہا ہے۔ سنتے ہیں، کسی علاقے میں انسانوں کی جتنی بڑی کثرت، اُتنی ہی مسائل و مصائب کی افزائش اور کش مکش و کشاکش کی فراوانی، اور حکم رانوں کے لیے نظم و ضبط، انتظام و انصرام کی دشواری۔ اور کہتے ہیں، آدمی ہتھیار نہیں ہوتا، لیکن ہتھیار سے زیادہ مہلک ہو سکتا ہے۔"

اِس دوران مجھے احساس ہی نہ رہا کہ میں پروفیسر کا مہمان ہوں اور وہ، بہ ہر حال، نسلاً فرنگی ہے اور گوروں کے مفادات کے لیے یہاں آیا ہوا ہے، اور مایا بھی اُس کے ساتھ ہے، جو نصف ہندستانی ہونے کے باوجود مغربی اطوار میں ڈھل چکی ہے، لیکن اِس ہذیان سے مجھے کوئی تسکین مل رہی تھی۔ دُھندلی چھٹ رہی ہو جیسے۔

میں نے پروفیسر سے پوچھا، "اگر یہ تسخیر کا کوئی جذبہ، فتوحات کا شوق اور قوتِ بازو کا اظہار ہے تو انتہا کیا ہے۔ برصغیر پر حکم رانی سے انگریزوں کی انا کو کوئی آسودگی ملتی ہے تو ہندستان تو کب سے تسلیم و رضا پر کاربند ہے۔ اَب مزید کیا مطلوب ہے؟ انگریزوں کو خاطر جمع رکھنی چاہیے کہ تاریخ میں مندرج صفِ اوّل کے تمام فاتحین میں اُن کا درجہ بلند ہے۔ اُنھوں نے دارا و سکندر، چنگیز خان و ہلاکو جیسے فاتحین سے بڑی معرکہ آرائیاں کی ہیں، لیکن کیا انگریزوں نے تہذیبوں کے عروج و زوال کے درسِ عبرت المیوں پر مشتمل کتابوں کو اپنے کتب خانوں سے ہٹا دیا ہے۔ کوئی نئی تاریخ مرتب کرنے کا سودا اُن کے سر میں سما گیا ہے۔ برتر تہذیبیں، کم تر تہذیبوں پر غالب آ جاتی ہیں، مگر یہ برتری و کم برتری ہمیشہ کیوں نہیں رہتی۔ ہر تہذیب کو ایک زوال کیوں لازم ہے؟ غالباً اِس لیے کہ قومیں اپنے شباب پر پہنچ کے تن آسان ہو جاتی ہیں کہ درختوں پر اُن کے لیے سونے چاندی کے ثمر پیدا ہونے لگتے ہیں۔ پھر وہ اپنی ابتدا کی مشقتیں، ریاضتیں بھول جاتی ہیں۔ پھر نئی نسل آ جاتی ہے۔ اُن کے طور طریقوں میں نازکی، نفاست آ جاتی ہے۔ وہ شیشے کے بن جاتے ہیں اور پھولوں سے اُن کا شغف گہرا ہو جاتا ہے۔ جب موسموں کی نیرنگی اعصاب پر اثر انداز ہونے لگے، ذرا سا شور سماعتوں کو بارِ خاطر ہو۔ ہوا کے کسی تیز جھونکے سے چہرے کمھلانے لگتے ہوں، جب احتیاطیں حد سے سوا ہو جائیں اور مصوری، شاعری، موسیقی کا غلبہ ہو جائے تو نازک اور لطیف قومیں مراجعت کا سفر کرنے لگتی ہیں اور کہیں سے اُجڈ، گنوار، بے تہذیب لشکر تیر کمان اُٹھائے شیش محل مسمار کرتے، چمن زار روندتے ہوئے نمودار ہوتے ہیں اور شبستانوں کو آگ لگا دیتے ہیں۔

"کتابوں میں کچھ یوں مرقوم ہے کہ ایک غیر معیّن عرصے کی برتری و بالادستی کے بعد اعلا تہذیبیں نیم جاں ہو جاتی ہیں۔ اگر وہ چاق چوبند، منظّم، مربوط اور ہوش مند رہیں تو برتری کی ایک بڑی عمر بھی نصیب ہو سکتی ہے۔ میں کوئی سماجیاتی کلیہ وضع کرنے کا اہل نہیں ہوں، لیکن میرا خیال ہے، اور میں نے کہیں پڑھا بھی تھا کہ تہذیبیں اپنے مختلف اداروں کے توازن و تناسب سے زندہ اور ممتاز رہتی ہیں، اور اداروں کی بے توازنی کی شعوری، غیر شعوری غفلت اور کوتاہی ہر معاشرے سے سرزد ہو جاتی ہے، چل کر ہوتی رہی ہے۔"

پروفیسر کے پہلو بدلنے اور گہری سانس بھرنے پر مجھے بھٹک جانے اور اپنے مفروضے کی طوالت کا گمان ہوا، میں ٹھٹک سا گیا۔

"کیا! کیا ہوا؟" پروفیسر گھبرا کے بولا، "پھر کسی غیر ضروری شائستگی یا بے تیجگی کا احساس دامن گیر ہوا؟"

"ہاں، کچھ یہی۔" میں نے بوجھل آواز میں کہا، "شاید میں تجاوز کا مرتکب ہو رہا ہوں۔"

"یقین کیجیے، سب کچھ نہایت متوازی اور پُراثر ہے۔" پروفیسر کے سیمابی لہجے میں بڑی وارفتگی تھی، کہنے لگا، "کئی بار جی کیا، لیکن میں درمیان میں اِس صاف گوئی کی داد و ستائش سے یوں باز رہا کہ دخل در معقولات نہ ہو جائے اور یہ اہم سلسلۂ کلام منتشر نہ ہو جائے۔"

"آپ کتنے اچھے انگریز ہیں۔" میں نے بے اختیار کہا، "کیسی دل جوئی کرتے ہیں۔"

"اور آپ کتنے دل نشیں ہندستانی ہیں، کیسا سچ بولتے ہیں۔" اُس نے شیدائیت سے کہا اور خلطِ مبحث کے اندیشے

میں باہمی خوش نودیٔ طبع کی اِس رسمِ ادائی کو سرِ دست موقوف کیا، متجسّس لہجے میں بولا، "آپ اداروں کی بے توازنی کی بات کر رہے تھے۔ آپ کے خیال میں کیا انگلستان کا سیاسی اور سماجی نظام اداروں کے انتشار کے مرحلے میں داخل ہو چکا ہے؟"

"نظر کچھ یہی آ رہا ہے۔" میں نے کسی جھجک کے بغیر کہا، "دُنیا کے طول و عرض میں حکومتِ انگلستان کی توسیع پسندی کی حرص و ہوس بدترین انجام تک لے جا سکتی ہے۔ کچھ ایسا نظر آتا ہے، انگریزوں کو خود نہیں معلوم کہ اُنھیں اور کہاں تک جانا ہے، جتنی دُور وہ جا چکے ہیں، وہاں سے واپسی بھی آسان نہیں رہی ہے۔ آدھی دُنیا رہ جاتی ہے، مگر ساری دنیا پر یونین جیک لہرانے کا خواب شرمندۂ تعبیر کرنے سے وہ کیوں گریزاں ہیں؟ وہ ٹھیر کیوں گئے ہیں؟ قریب قریب ساری دُنیا اُن کے آگے تشتری میں رکھی ہوئی ہے اور ہاتھ بڑھانے کی دیر ہے۔ وہ ارادہ کریں تو دو ایک جگہوں کے سوا کہیں بھی مزاحمت کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ مقبوضہ دُنیا میں حکم رانی کے پیش از بیش مسائل ہی شاید اُنھیں باقی دُنیا پر پیش قدمی سے روکے ہوئے ہیں۔ یہ بھی کچھ انگریزوں کی توفیق سے زیادہ ہے۔ وہ اِدھر سے سرا پکڑتے ہیں تو اُدھر سے سرک جاتا ہے۔ دُنیا بھی اَب پہلے جیسی نہیں رہی ہے۔ گردش وہی ہے، لیکن تیور بدل گئے ہیں۔ یوں بھی دُنیا کبھی ایک سی نہیں رہتی، یہ ایجادوں کا دور ہے۔ دُنیا کے دوسرے اقبال مند ملکوں کے مانند انگلستان بھی طرح طرح کی ایجادوں کی تجسیم و تشکیل میں مصروف ہے، اور کیا ایسا نہیں ہے کہ کبھی کوئی ایجاد وقت سے پہلے وجود میں آ جاتی ہے اور کسی معاشرے کا سارا نظامِ فکر منتشر کر دیتی ہے؟ اور موجد و مولد قوم کا یہ ہے کہ اپنی کسی تخلیق اور ایجاد کے شیریں ثمر اُسے سب سے پہلے نصیب ہوتے ہیں تو زیاں کی آزمائش، یا بدبختی کے مرحلے سے بھی سب سے پہلے اُسی کا سابقہ پڑتا ہے کہ ایجادوں کے منفی اثرات کبھی اُن کے ثمرات سے کثیر ہوتے ہیں۔ نت نئی اختراعات و ایجادات میں انگلستان صفِ اوّل میں شامل ہے۔ وہاں دوسرے ملکوں کی جدید ترین، محیر العقول مصنوعات حاصل کرنے کی بھی سکت کچھ کم نہیں ہے۔ کہنا یہ ہے کہ ساختۂ انگلستان اور انگلستان کے باہر سے

"جناب! بجٹ کا چالیس فی صد سروے پر، تیس فی صد اشتہاروں پر اور بیس فی صد تقریبات پر... آخر ہم منصوبہ کب شروع کریں گے؟"

آئی ہوئی ایجادیں مل جل کے وہاں کے روایتی معاشرے پر کس قدر اثر انداز ہوتی ہیں، ہو سکتی ہیں، یہ آپ مجھ سے بہتر جانتے ہوں گے۔"

"بے شک۔" پروفیسر نے فکرمندانہ لہجے میں بے دریغ میری حمایت کی۔ "انگلستان کے متعدد سکّہ بند، بجھ گھرانے اِن کرشماتی مصنوعات کی پذیرائی میں جتنے پُرجوش تھے، اُتنے ہی اَب اِن سے آزردہ، کبیدہ اور ہراساں دکھائی دیتے ہیں۔ کیوں مایا، تم کیا کہتی ہو؟"

مایا اُچھل سی پڑی۔ "میں... میں کیا کہوں۔ آپ ٹھیک کہہ رہے تھے پروفیسر کہ آپ استفادہ کر رہے ہیں۔ مجھے احساس ہوتا ہے کہ رقص کے فضول مشغلے میں ایک بہترین تجزیے سے محروم رہی۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔" میں نے عاجزی سے کہا، "میں کیا اور کتنا جانتا ہوں۔ یہ پروفیسر صاحب کی بندہ نوازی ہے کہ وہ مجھے اور میرے ساتھیوں کو ہمارے لیے ممنوعہ اِس گوشۂ فردوس میں لے آئے، اور جانے کیوں، یہاں آ کے سینے میں کب سے اَٹا ہوا غبار اُمڈ آیا۔ یہ ایک اجنبی اور عام شخص، سڑک پر چلتے ایک راہ گیر کی عزت افزائی ہے۔ میں آپ سے سچ کہوں، میں ایک بہت معمولی آدمی ہوں، میں اور میرے دونوں ساتھی..."

"وہی مشرق، وہی مشرقی انکسار..." پروفیسر نے تکرار کی۔ اُس کے لہجے میں کوئی بناوٹ نہیں تھی۔ "سنا تھا، آج سامنے ہے،

آج نظارہ کرلیا۔"

رفتہ رفتہ ساز پھر بیدار ہونے لگے۔ سازندوں نے اپنے اپنے ساز سنبھال لیے تھے۔ مجھے جمرو اور زورا کا خیال تھا۔ بہت دیر ہوگئی تھی۔ بہ ظاہر اُن دونوں نے کسی تکدر کا اظہار نہیں کیا تھا۔ انگریزی کیا خاک اُن کی سمجھ میں آرہی ہوگی۔ انھیں اُکتا جانا چاہیے تھا، لیکن یہ سحر آفریں ماحول اُن کے لیے کسی خواب کے مانند ہوگا۔ وہ کافی کی چسکیاں لیتے، خشک میوہ ٹونگتے اور سگریٹ پھونکتے رہے۔ پروفیسر کے چہرے پر بدلتے رنگوں، اُس کے اضطراب اور اشتیاق سے وہ کچھ سمجھنے کی کوشش کرتے رہے ہوں گے۔ میرے ہذیان کے دوران مایا کی محویت اُن کی نظر میں میرے لیے داد کی حیثیت رکھتی ہوگی۔ اپنے عزیز کی قدر و منزلت پر اُس کے رفیق جو فخر اور شادمانی محسوس کرتے ہیں، کچھ وہی اُن کی کیفیت تھی۔ ہندستان پر گوروں نے اپنی اعلا دماغی اور بالانسلی کی دھاک بٹھا رکھی تھی۔ جمرو اور زورا اِس غلبے سے کس طرح مستثنا رہ سکتے تھے۔ وہ گوروں کی نشاط گاہ میں بہ تمام و کمال موجود، ایک گورے اور گوری کی معیت میں، اُن کے مہمان کے رُتبے سے معزز و مفتخر تھے۔ خوش بوؤں سے بسی اِس جگہ کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔ اشارے پر مؤدب ہندستانی خدمت گار حاضر ہوجاتے تھے۔ گوروں نے اِن کے امتیاز کے لیے خصوصی لباس مقرر کر دیے تھے، بالکل یہاں کے راجاؤں اور اُن کے درباریوں کے لباس کی طرح۔ یہ بھی کیا خوب تماشا تھا۔

"آپ بمبئی میں قیام کریں گے، یا آگے...؟" مایا نے چمکیلی آنکھوں سے مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"کچھ عرصے بمبئی ہی میں رہنا ہوگا۔" میں نے کہا۔

"کچھ دن ہمارا قیام بھی بمبئی میں رہے گا، کیا آپ سے دوبارہ ملاقات ممکن ہے؟" اُس کی پُر تمکنت آواز میں طلب بھی تھی، حسرت بھی، اور بھی کچھ...

"کیوں نہیں، آپ وہاں کہاں ٹھیریں گی؟"

"ابھی کچھ نہیں معلوم۔" اُس کے چہرے پر کشمکش ہویدا ہوئی۔ "رابطے کا کوئی ذریعہ معلوم ہوجائے تو میں خود آپ سے رابطہ کرلوں گی۔"

"ضرور، بل کہ آپ ہمارے گھر آئیے گا، وہاں آپ کو دیکھ کر سبھی خوش ہوں گے۔"

"آپ کا گھر بمبئی میں ہے؟"

"بمبئی میں بھی..."

"کیا مطلب؟ اور بھی گھر ہیں دوسری جگہوں پر؟"

"جی... جی ہاں..."

"واقعی! کتنے گھر؟" وہ حیرانی سے بولی۔

"سو، دو سو نہیں، یہی کوئی دو تین۔" میں نے ہنس کے کہا۔

"لیکن میں کچھ زیادہ وقت بمبئی میں رہوں گا۔" پروفیسر اُچکتی آواز میں بولا، "یاد رہے، اگر آپ کو کوئی مصروفیت مانع نہ ہو، اور مناسب سمجھتے ہوں تو مجھے بھی آپ کو زحمت دینی ہے، میری سکونت کا انتظام کسی بنگلے میں کیا گیا ہے۔ نام یاد نہیں آرہا، شاید کولابا نام کی کسی جگہ..."

"ہمارے گھر سے ذرا دور ہے، مگر بڑے شہر میں فاصلے کیا اہمیت رکھتے ہیں... اور یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں، مصروفیت اور مناسبت کی بات! آپ سے دوبارہ ملاقات میرے لیے اعزاز ہوگی۔ میں تو کہتا ہوں، آپ ہمارے ہاں ہی مہمان رہیں۔"

پروفیسر نے تپاک سے ہاتھ بڑھایا۔ میں فوراً سمجھا نہیں، لیکن پھر میں نے بھی اُس کی تقلید کی۔ اُس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں زور سے داب لیا۔

ساز تیز ہوگئے تھے اور مختلف گوشوں میں بیٹھے جوڑے پھر وسطی فرش پر آکے تھرکنے لگے تھے۔

"آپ میرے ساتھ رقص کرنا پسند کریں گے؟" یکایک مایا نے تمنائی آواز میں مجھے پیش کش کی۔

"میں... میں کہاں۔" آواز کے ساتھ میرا جسم بھی سست گیا۔

"مجھے بالکل نہیں آتا۔"

"یہ تو بہت آسان ہے۔"

"ہاں، ہاں بہت آسان، بس ایک ذرا سی توجہ..." پروفیسر نے مایا کی ہم نوائی کی۔

"ایک قدم آگے، پھر دو قدم... اِن رقصاں جوڑوں کو ذرا غور سے دیکھیے۔"

"پھر بھی نہیں، میرا لباس بھی اِس رقص کے لیے موزوں نہیں۔"

مجھے زیادہ عذر کرنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ پروفیسر نے مایا کو کہنی ماری۔ دھاری دار سرمئی سوٹ میں ملبوس دو نوجوان سامنے کے دروازے سے داخل ہوئے، دونوں کی عمریں تیس پینتیس سال کے درمیان ہوں گی، چہرے لال بھبوکا تھے، جیسے آگ جلتی ہو۔ مایا فوراً اُٹھ گئی اور ہم سب سے معذرت کرکے اُنھی کی جانب بڑھ گئی۔

"مایا کا شوہر ہے۔" پروفیسر چپکے سے بولا، "وہ دائیں طرف لمبوترے چہرے والا دراز قد نوجوان، میجر البرٹ۔ تین چار ماہ میں لیفٹیننٹ کرنل ہوجائے گا۔"

میں نے دیکھا، میجر کے قدم فرش پر ٹھیک طرح جم نہیں رہے تھے۔ اُس کا ساتھی بازو تھامے ہوئے تھا۔ اِدھر مایا نے تیز قدموں سے انھیں جالیا تھا۔

پروفیسر نے آہستگی سے بتایا کہ ابھی تین مہینے ہوئے، مایا سے اُس کی شادی ہوئی ہے۔ مایا اُس کی چچا زاد بھی ہے۔ خاندانی طور پر دونوں ہی صاحبِ اقبال ہیں۔ برنارڈ اپنے والدین کا اکلوتا ہے۔ اِدھر مایا بھی بھائی کے چلے جانے سے اپنے گھر کی اکلوتی رہ گئی ہے۔ چار سال سے برنارڈ ہندستان میں تھا، اور چھ مہینے کی چھٹی لے کے شادی کے لیے انگلستان آیا ہوا تھا، اب بیوی کے ساتھ واپس جا رہا ہے۔"

"نہایت مکمل، شان دار نوجوان ہے۔" میں نے کہا۔

"ہاں، بہ ظاہر۔ مایا خوش نہیں ہے۔"

"کیوں؟" مجھے پوچھنا نہیں چاہیے تھا لیکن رہا نہ جا سکا۔

"مایا کو دیکھا آپ نے! کیسی حسین، نرم و نازک، پھولوں جیسی لڑکی ہے۔ تعلیم بھی اعلا حاصل کی ہے۔ شوہر کا مزاج بالکل جدا ہے۔ برنارڈ کے باپ اور مایا کی ماں کی خواہش یہی تھی کہ اُن کی شادی ہوجائے۔ کئی اور بھی مصلحتیں ہوں گی اِس رشتے کی۔ مایا انکار کرسکتی تھی، لیکن وہ برنارڈ کو ناپسند نہیں کرتی تھی، اور اصل میں وہ اُس برنارڈ سے واقف تھی جو ہندستان نہیں گیا تھا، اُسے کوئی اندازہ نہیں تھا، ہندستان جاکے وہ کتنا بدل چکا ہے، کثرت سے پینے لگا ہے، اُس میں ایک عجب تناؤ اور کھردرا پن آگیا ہے، کوئی وحشت سی۔ انگلستان آکے برنارڈ نے بچپن کے دوست ٹونی کے ساتھ ہی تمام تر وقت گزارا۔ شادی کے

"سنو! میں چلتا ہوں، میری بیوی کہیں فون کرنے کی منتظر ہے۔"

بعد بھی وہ زیادہ تر ٹونی کی رفاقت کی جستجو میں رہا ہے، اور اب اُسے ساتھ ہندستان لے کے آگیا ہے۔ مایا تو پہلے کی طرح تنہا ہے۔ مایا نے کبھی شکایت کی تو کان نہیں دھرے، درشتی پر اُتر آیا۔ شادی کے اِتنے مختصر عرصے ہی میں دونوں کے درمیان کشاکش شروع ہوچکی ہے، اور آگے بھی کچھ بہتر نظر نہیں آرہا۔ میں تو بہت ہراساں ہوں اور دُعا ہی کرسکتا ہوں دونوں کے لیے۔" پروفیسر اپنی دُھن میں کہتا گیا۔ اِس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ مایا کے لیے کتنا گداز رکھتا ہے۔

مایا نے ایک جانب سے شوہر کا بازو پکڑ لیا تھا، دروازے کے قریب رکھی کرسیوں پر وہ تینوں بیٹھ گئے۔ ٹونی کی طلبی پر خدمت گار اُن کے لیے شراب لے آئے۔ میں نے دُور سے دیکھا، مایا نے شوہر کو روکنا چاہا تھا، لیکن وہ جام اُٹھا کے ایک گھونٹ میں خالی کر گیا اور رقص میں شامل ہونے کے لیے کھڑا ہوگیا۔ اور کیا دماغ میں آئی کہ لمحے بھر بعد پھر بیٹھ گیا۔ ٹونی نے بازو پھیلا کے مایا کو رقص کی دعوت دی تھی۔ مایا نہیں اُٹھی۔

رقص کرتے جوڑوں کے پانو، اُن کے جسم سازوں کے زیر و بم سے بندھ گئے تھے۔ اُن کا اپنا کوئی ارادہ نہیں رہا تھا۔ ساز انھیں جہاں چاہتے، لے جاتے اور واپس لے آتے۔ موسیقی میں بھی حکومت کی کیسی خُو ہوتی ہے۔ سننے والے کو اپنا تابع کرلیتی ہے۔ گورے حکم راں بھی اُس کے اسیر ہوجاتے ہیں، مگر وہ اطاعت ہی کیا، جس میں آدمی کی رضا شامل ہو۔

میری اور پروفیسر کی نظریں مایا پر بکھری ہوئی تھیں۔ اُس کا شوہر برنارڈ خاصا خوش نظر آرہا تھا۔ اُس کے پانو تھرک رہے تھے۔ ٹونی بھی وجد کی کیفیت میں تھا۔ کسی لمحے اُس نے برنارڈ کی توجہ

ہماری طرف مبذول کی کہ برنارڈ کی پیشانی پر بل پڑ گئے، اور دیکھتے دیکھتے اُس کا چہرہ بگڑنے لگا۔ اُس نے ناگواری کا اظہار کیا تھا کہ مایا نے اُس کا بازو تھپک کے کچھ باور کرانے کی کوشش کی۔ برنارڈ یک دم اُٹھ گیا۔ مایا نے اُس کا بازو پکڑ لیا تھا، لیکن وہ اُسے روکنے میں ناکام رہی۔ ٹونی بھی برنارڈ کے ساتھ تھا۔ اُن کا رُخ ہماری جانب تھا۔ دونوں کو اِتنا ہوش تھا کہ رقصاں جوڑوں کے انہماک میں کوئی خلل واقع نہ ہو۔ ہماری میز کے سامنے آ کے برنارڈ رُک گیا اور کسی تمہیدی کلمے کے بغیر اُس نے پروفیسر کو مخاطب کیا، ''آپ کو معلوم ہے پروفیسر! یہ جگہ کن کے لیے مخصوص ہے؟''

پروفیسر نے خوش خلقی سے برنارڈ اور ٹونی کو بیٹھنے کی دعوت دی، اور نرمی سے بولا، ''یہ میرے مہمان ہیں۔''

''صرف منتخب ہندستانی معززین کو یہاں داخلے کی اجازت ہے۔ یہ نظم وضبط کا معاملہ ہے۔'' برنارڈ نے تلخی سے کہا۔

''یہ نہایت معزز لوگ ہیں۔ میں درخواست کر کے انھیں یہاں لایا ہوں، اور واقعہ یہ ہے، اپنے موضوع پر میں نے اِن سے بہت کچھ حاصل کیا ہے۔'' پروفیسر کے لہجے کی شائستگی جبری تھی۔

''آپ انھیں کتنا جانتے ہیں؟''

''آج ہی، ابھی کچھ دیر پہلے ہم ملے ہیں۔''

''آپ پہلی بار ہندستان آئے ہیں۔ برطانوی حکومت نے ہندستانی رعایا سے رسم وراہ کے کچھ قواعد وضوابط طے کیے ہیں۔ آپ کو وہاں رہنما ہدایات ضرور دی گئی ہوں گی۔''

''برطانوی حکومت نے مجھے بھی یہاں ایک ذمے داری تفویض کی ہے۔'' پروفیسر کبیدہ ہو کے بولا، ''یہاں ہر طبقے کے لوگوں سے ملاقات میرے کام کا حصہ ہے، اور میجر! تمھیں خیال ہونا چاہیے کہ میرے اِن مہمانوں میں سے ایک انگریزی خوب سمجھتا ہے۔''

''سمجھا کرے، میں ضوابط کی بات کر رہا ہوں۔'' میجر برنارڈ نے زہریلی آواز میں کہا۔

''یہ سلوک ہماری روایات کے منافی ہے۔ مجھے اپنی توہین محسوس ہو رہی ہے۔''

''آپ خود روایت شکنی کے مرتکب ہوئے ہیں پروفیسر! بہتر ہے، انھیں عزت سے رخصت کر دیجیے، ورنہ...''

میں فوراً اُٹھ گیا، میرے ساتھ جمرو اور زورا بھی۔

پروفیسر شدید ذہنی خلفشار سے دوچار دکھائی دیتا تھا۔ اُس نے مجھ سے ٹھیرے رہنے کی منت کی، اُدھر سے مایا بھی ہماری طرف بڑھتی تھی۔

لمحوں میں ہم نے دروازہ عبور کر لیا۔

دروازے سے باہر آتے ہی جمرو نے میرا کندھا پکڑ لیا، ''کیا بولتا تھا وہ حرام کا جنا... بندر کی اولاد؟''

''جانے دو۔'' میں نے سنجیدہ آواز میں کہا۔

''نہیں لاڈ سے، اُس کی تو ماں...''

''میرا بھی خون کھول رہا ہے۔''

''پھر جانے دو مجھے...'' جمرو کا جسم پھڑکنے لگا تھا۔ ''کیا ہوگا، زیادہ سے زیادہ؟''

''نہیں، ابھی نہیں... اِس وقت نہیں اور اِس طرح نہیں۔'' میں نے سختی سے کہا، ''دیکھیں گے پھر...''

بازیگر سب رنگ کا سب سے مقبول سلسلہ
ایک بے اختیار بے قرار نوجوان کا افسانۂ زندگی
اُمنگوں حوصلوں، آنسوؤں اور آہوں کی داستان
پانچویں درویش کا بیان
باقی واقعات آئندہ

بجھل عرشے کے ایک ستون سے ٹیک لگائے بیڑی سے دھواں کشید کر رہا تھا۔ وہ ایک ماہی خور کی جانب متوجہ تھا، جو اُس کے قریب ہی جہاز کی ریلنگ پر ستانے آ بیٹھا تھا۔ بے کراں سمندر پر ڈولتے جہاز اور کشتیاں اِن آبی پرندوں کے لیے کسی نعمتِ غیر مترقبہ سے کم نہیں ہوتے، جب دل چاہا ستا لیا، نہ تھکن سے ڈوب مرنے کا ڈر، نہ بار بار ساحل پر لوٹنے سے وقت کا زیاں! دفعتاً بگلے نے سمندر کی جانب زقند بھری اور اوجھل ہو گیا۔ شاید اُسے شکم پُری کا سامان نظر آ گیا تھا۔ جسمانی تناؤ کے اخفا کے لیے میں نے شانے جھکا دیے، اور آنکھیں تو اِدھر سے اُدھر پھیری جا سکتی ہیں۔ بجھل کی آزمودہ کار بر فیلی گولی میں مسلسل چبا رہا تھا، لیکن میجر برنارڈ کی سلگائی ہوئی آگ فزوں تر ہی ہو رہی تھی۔ واقعتاً میری کیفیت زورا اور جمرو سے مختلف نہ تھی۔ میں نے اُن سے کہہ تو دیا تھا کہ میرا بھی خون کھول رہا ہے، مگر خون کھولنا ایک بے محل محاورہ تھا، حال اِس سے کہیں سوا تھا۔

ہم خاموشی سے بجھل کے پاس جا بیٹھے۔ بگلا اپنی چونچ میں استطاعت سے بڑی مچھلی دابے ریلنگ پر پھر فروکش ہو گیا۔ مچھلی بری طرح تڑپ رہی تھی۔ بگلے نے بے چینی سے اِدھر اُدھر دیکھا، اُسے مچھلی کو زمین پر پٹخ مارنے کی مناسب جگہ نظر نہیں آ رہی تھی۔ بجھل خوب شوق سے تماشا گیر تھا، اُس کے چہرے پر معصوم بچوں سی مسکراہٹ کھلکھاریاں مار رہی تھی۔ اُس کی بچگانہ محویت دیکھ کے میرا غصہ تمام ہو گیا۔ اُس کے چہرے پر میں نے بہت ہی کم تاثرات کی حکم رانی دیکھی تھی۔ سو خفگی تو اشتہار ہے، کوئی بھلا کب تک چھپائے!

"جارے ناڑی! بے استاد اشکاری ہے، میا پاس کچھ عمر یا اور گزار جاکے۔" بجھل نے بگلے کے غم میں سر دھنتے ہوئے کہا، کیوں کہ مچھلی بگلے کی چونچ سے نکلنے میں کام یاب ہو گئی تھی، لیکن بد قسمتی سے جہاز کی اَور آ گری، اور اچھلتی ہوئی سیدھی بجھل سے آ ٹکرائی تھی۔ "اِس کی قسمت اِس کے ساتھ، اور تیرے داؤ تیرے ساتھ۔" بجھل نے چشم زدن میں مچھلی کو

پونچھ سے پکڑا اور کلائی کے خفیف جھٹکے سے اُسے سمندر کی طرف فضا میں اچھال دیا۔ ماہی خور مچھلی کے ساتھ ہی فضا میں اچھلا، مگر مچھلی اپنی عمر ساتھ لائی تھی، بگلے کی چونچ خالی گئی اور وہ سمندر میں جا گری۔

''کھانا کیوں نہیں کھایا'' میں نے آہستہ سے کہا۔ کھانے کی کشتی میں تمام سامان جوں کا توں تھا، سوائے مچھلی کے ایک آدھ ٹکڑے کے۔

''کھالیں گے رے، اب اُدھری جا کے کھائیں گے۔'' بنھل نے ہماری طرف نہیں دیکھا۔ وہ پُر شوق نظروں سے ریلنگ کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''ابھی استاد گھر جانا مانگتا ہے۔'' زورا نے جمرو کی طرف آنکھ مٹکائی۔

''پہنچا دو رے، جدھر سے آئی ہیں۔'' بنھل بڑبڑایا، اُس نے رُخ ہماری طرف پھیر لیا تھا۔ خلافِ طبع اُس کے چہرے کا تبسم بکھر رہا تھا، اور کوئی رمق تھی جو خاکستر سینے میں چھپا رہی تھی۔ میں اُس کی بات سمجھ نہیں سکا تھا۔ جمرو نے دیر نہیں لگائی، تلی ہوئی مچھلی اور جھینگوں سے بھری کشتی آناً فاناً اٹھا کے ریلنگ سے باہر اچھال دی۔ جگہ خالی ہوتے ہی بنھل نے پانو پسار لیے۔ میرے جی میں آئی کہ کچھ کہا مروں، بس اب بمبئی یا فیض آباد، اِسے کہیں نہ کہیں نکلنا ہوگا۔ اِسی کو شوق ہے لاشہ گھسیٹے پھرنے کا... تو جائے تنہا... میجر برنارڈ کے سلگتے ہوئے جملے اور چرمرایا ہوا بنھل... اچھی کیمسٹری تھی۔ میرے جسم سے پھر آگ نکلنے لگی۔

''تھوڑا کھا کے آئے ہو؟'' بنھل نے چٹخارے ہوئے کہا۔ اُس نے ہمارے چہروں پر نوشتے پڑھ لیے تھے۔

''ہاں قسم استاد! اکھا جنت ہے۔ اور حور بھی ہے اور...''

''لنگور بھی۔'' جمرو نے زورا کے مصرعے پر گرہ لگائی۔

بنھل جھانسے میں نہیں آیا۔ کچھ دیر ہم تینوں کی طرف بہ غور دیکھا کیا، جیسے اُس نے سب کچھ جان لیا۔ پھر سر کو خفیف جھکایا اور آنکھیں موند لیں، کہ خود ستائی کسی کی دست نگر نہیں ہوا کرتی، خاموشی کریدنے سے گریز، کارِ محال بھی ہے، کارِ خیر بھی۔

''آنکھیں میچ لو رے، بس گھنٹے ہیں۔ اُدھر جلدی سے اینڈنے کو نہیں ملے گا۔'' بنھل نے نیم باز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ پھر آنکھیں میچ لیں۔ مجھے پیرو کی گیتا اُس کی کولی میں ہمکتی دکھائی دی۔ کیا کہے گا اُن سے؟ رانی، گیتا اور پھر پیرو دادا کا خیال چھم سے در آیا، جیسے اندھیری رات میں چاندنی کے ہلکورے، تازہ تازہ، اور جواں جواں۔

جہاز ٹھمک ٹھمک پھسلتا جا رہا تھا۔ سورج دھیرے دھیرے سمندر کی اَور اتر رہا تھا۔ میجر برنارڈ کی شعلہ خیز نگاہیں بھی جاتے دن کے ساتھ ساتھ رخصت ہونے لگیں۔ ہم اَور کر بھی کیا سکتے تھے! زور آزمائی، نتیجہ انگیز داؤ پیچ، چاقو زنی کے حیران کُن کرشمے! زیادہ سے زیادہ میجر برنارڈ اور ٹونی کو پچھاڑ لیتے، مار گراتے، پھر کیا ہوتا، کہاں جاتے؟ اِس جہاز میں کون سے رستے، کون سے دروازے تھے۔ کیبنوں میں تجسّسی گوری فوج سے مقابلہ کرتے؟ پھر وہی دنگا، وہی فساد خون سے عبارت، بھاگتے دوڑتے چھپتے پھرتے دن رات! سب کچھ بے فائدہ اور لاحاصل۔ زورا اور جمرو بھی سوتے چہروں کے ساتھ لیٹ چکے تھے۔ انھیں انگریزی کی معمولی سی جان کاری ہوتی تو میرے روکے سے نہ رکتے، مگر میں نے ایسا کیوں کیا؟ میجر کے نوکیلے کاٹ دار الفاظ، آگ برساتی انگارہ آنکھیں مجھے مہمیز کیا کرتیں، خاکستر بھی نہ کر سکیں۔ یکا یک میرے اندر وہی پرانا رفیقِ کار، ہم دم، خود آ گیا نفرت کا جوالا مکھی پھٹ پڑا۔ پھر نہ جانے کتنا وقت گزر گیا، میں جیسے خلا میں بیٹھا رہا۔ آگ کے گولے مجھ پر برستے بھی رہے اور مجھ پر پھوٹتے بھی رہے اور بجھ بجھ کر مہیب اندھیرے میں گم ہوتے رہے۔

بنھل، زورا، جمرو سو چکے تھے۔ شام بھی ڈھل چکی تھی، عرشے پر مسافر کیڑوں کی طرح آڑے ترچھے پڑے ہوئے تھے۔ کہیں کہیں چار یا پانچ کی ٹولیاں جمی تھیں۔ جن کے بیچ سے چائے کا دھواں اُڑ اُڑ کے اپنی ہم جنس، مگر سرد ہوا سے گلے مل رہا تھا۔ بھانت بھانت کی بولیوں پر مبنی دھیمی سرگوشیاں، دبے دبے قہقہوں سے بوجھل آوازیں اور جہاز گیر ہوا کا شور یک ساں و یک رُو معلوم پڑتا تھا، لیکن یہ میرے اندر سر پٹختی چیخوں کے سامنے ہیچ تھا۔ کاش، یہ چیخیں خنجر بدست ہوتیں، ہتھوڑوں، کدالوں، پھاوڑوں، تیز دھار بھالوں سے آراستہ ہوتیں، تو یہ پتھر کا سینہ چیر پھاڑ دیتیں۔ اُن آنکھوں کو پھوڑ کے آزاد ہو جاتیں جن کے سامنے فمی پانو میں گھنگھرو باندھے مجرا کر رہی تھی، اُن راہ گزیدہ قدموں کو چورا چورا کر دیتیں، جن کی راہ تکتے تکتے امی جان منوں مٹی تلے جا سوئی تھیں۔ ماں کا قاتل!... لیکن امی جان کو میں نے نہیں مارا تھا۔ صرف ایک بابر کے لیے چھ بچوں کو بے یار و مددگار چھوڑنا! کیسی ممتا تھی!... نہیں امی جان یہ آپ کا انصاف نہیں تھا۔ آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھے۔ کیا برا تھا جو آپ بابر کی جدائی کو حرزِ جاں نہ بناتیں تو شاید فمی کوٹھے نہ پہنچتی، جہاں گیر دربدر نہ ہوتا۔ ابا جان کا غدود میں چھپے خیرہ کُن پتھروں کی اوٹ نہ لیتے۔ میری بہنیں، امی جان میری بہنیں جن کی پرچھائیں کسی غیر نے نہیں دیکھی، اُن پاک باز خان زادیوں کو نظر بازوں کی ہوس ناکی سے چھانی نہ ہونا پڑتا، فرخ پر مجید سے سا شہد ادانت تیز نہ کرتا، اگر آپ بابر زماں پر لعنت بھیج دیتیں تو یقیناً فمی کا جنازہ کوٹھے سے اٹھنے کی بجائے گھر سے اُس کی ڈولی اُٹھتی۔ آخر میں ہی کیوں؟ مجھی کو زیرِ بار، مجھی کو گنہ گار کیوں کیا جاتا ہے؟ میں نے کسی کا کیا بگاڑا ہے، مجھے تنہا کیوں نہیں چھوڑ دیا جاتا؟ زندگیاں کیوں مجھ سے وابستہ کی جاتی ہیں؟ میں نے کب کسی سے کہا ہے کہ میرے ساتھ چلو، میرے لیے سب کچھ چھوڑ دو، میری ہم راہی اختیار کرو، مجھ سے محبت کرو۔ میں تو خود تہی دست و تہی داماں ہوں، بھلا کسی کو کیا دے سکتا ہوں۔ میں طلب گار ہوں۔ یہ لوگ کیوں نہیں سمجھتے۔ کیوں میرے لیے کمربستہ و آمادۂ شوق رہتے ہیں۔ جان سے جاتے ہیں۔ میرے ہونے یا نہ ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ مجھے مردہ تصور کر لیا جائے تو کیا دنیا رک جائے گی، گردش ختم جائے گی؟ اور اگر میں مر ہی جاؤں تو کیا قیامت ٹوٹ پڑے گی؟ میری بے قراری و بے چینی تو میری ملکیت ہے۔ یہ اَوروں کو کیوں کھلتی ہے۔ بنھل کو کیا تکلیف ہے جو مجھے لیے دربدر مارا مارا پھرتا ہے۔ یہ لوگ تو مجھے انسانیت کے ادنا ترین درجے میں بھی شمار نہیں کرتے۔ یہ اپنی جاں نثاری پر نازاں رہتے ہیں، مگر میں کس بات پر فخر کروں، کیا ہے میرے پاس؟ یہی کہ سلطان، پیرو دادا، مارٹی، کانتے، سونیا اور نہ جانے کس کس کی موت کے تمغے! اذیتوں کے عذاب! آزردگی کے سونپے گئے سودے! لیکن نہیں، بھلا کسی کا کیا قصور؟ مثال ہے؟ یہ سب ہیر پھیر تو میرے سبز قدموں کا ہے۔ یہ مصیبتیں مجھی سے پیوستہ ہیں۔ یہ راستے میرے دشمن ہیں، دشمن داری میرے اپنوں سے کرتے ہیں۔ فساد کی جڑ تو میں ہی ہوں۔ جاں نثاری دوسروں ہی کا وطیرہ کیوں ہے۔ میں کیوں نہیں مر جاتا؟ کیا مشکل ہے کہ اِس جہاز سے کود جاؤں! بنھل بھی رو دھو کے چپ ہو جائے گا، کم از کم اِس دربدری سے گلو خلاصی تو ہو جائے گی۔ زریں کے پاس، مشفق، حسین و جمیل زر جواہر سے مرصّع و باکمال زریں کے پاس جا بسے گا۔ زورا اور جمرو بھی اپنے شہروں کی مانوس گلیوں میں چین سے راج کریں گے۔ کیا اچھا ہوگا جو میرا منحوس سایہ اِس دنیا سے اٹھ جائے! بہن بھائیوں کی زندگی میں سکھ چین آ جائے گا۔ کتنے دن ابا جان، فرخ، فارہہ، فریال، اکبر اور جہاں گیر سے دُور رہا ہوں، میرے بغیر وہاں راوی نے چین ہی چین لکھا ہوگا۔ میں پھر وہاں جا رہا ہوں، سبز قدم پھر فرح کے آنگن میں پڑنے والے ہیں۔ نہ جانے اب وہ کس مصیبت سے دوچار ہوں گے، اب کس سے کون جدا ہوگا۔ رانی اور گیتا سے پیرو تو جدا ہو گیا۔ مارٹی بھی نہ رہا، جولین کا راستہ روکنے والا ماسٹر مارٹی! میرے ذہن میں بالترتیب بہت سے چہرے بن اور مٹ

رہے تھے۔ عرصہ ہوا خود کو حالات اور بٹھل کے رحم و کرم پر چھوڑے ہوئے۔ بے حسی میں خول بند ہو کے جینا کچھ آسان ہو چلا تھا، مگر آج پھر وہی دورہ! وہی لاحاصل خیالات، لاجواب سوالات کا جمگھٹا! کورا اِتنی اہم ہے؟ کیا ایک کورا کے لیے متاعِ جاں زندگیاں بھینٹ کی جا سکتی ہیں؟ میں نے خواہ مخواہ کورا کا ہوّا کھڑا کر دیا ہے۔ کورا کا خیال آتے ہی میری حالت مزید غیر ہو گئی۔ حبسِ دم سے سینہ جکڑنے لگا۔ ترستے ہوئے حلق میں گرہوں کا انبار لگ گیا، نہ جانے وہ کس حال میں ہو گی! یہ طے تھا کہ مولوی صاحب نے مجھ سے بہتر اُس کی پاس بانی کی ہے پھر میں کیوں اُس کا دعوے دار بنا پھرتا ہوں۔ وہ مولوی صاحب کے ساتھ سکھ میں ہے، باامان ہے تو رہے۔ میرے سبز قدم تو اُس کا سکھ چین بھی غصب کر لیں گے۔ اُس کے سر سے مہرباں کا سایہ چھن جائے گا۔ میری امان میں اُسے کیا ملے گا؟ میں تو خود بے امان ہوں۔ میں کورا کا اہل نہیں، میں تو چند دن بھی اُس کی حفاظت نہیں کر سکا۔ یہ میری ہی نامرادی تھی جو اُسے مولوی صاحب کی پناہ میں جانا پڑا، لیکن نہیں! کورا نے میری بے تابی وارفتگی بھی دیکھی ہو گی۔ اُسے چھونے والے شہدوں کے لاشے میں نے آن کی آن میں برلبِ راہ بچھا دیے تھے۔ کورا سے میری دُوری ہی اُس کے لیے بہتر ہے۔ خیالات کے بھنور مجھے چکراتے چکراتے مرکز کی طرف لے آئے۔ بٹتی مٹتی تصویروں میں پھر ایک صورت ٹھہر گئی۔ میری آنکھیں جلنے لگیں۔ سانس تو گویا تھا ہی نہیں۔ میں نے لرزتے ہاتھوں سے برش تھاما اور لگا تصویر کو دس برسوں کا پھیر دینے۔ دراز پلکیں کچھ اور لانبی کیں، محرابِ چشم کو کچھ اور خم دیا، کچھ اور تراشا، آنکھیں میں کچھ خود سپردگی، کچھ انتظار اور کچھ التماس سمویا، عارض اِس عرصے میں بھر آئے ہوں گے، کچھ مزید ابھارے، ستواں اور ترشیدہ ناک پر مزید نزاکت آزمائی کی، دہکتی پنکھڑیوں کو کچھ اور سرخ کیا۔ ایک سرگرداں لٹ کشادہ پیشانی پر آراستہ کی، رنگت کے آمیزے میں صندلیں شربت کی مزید آمیزش کی۔ پھر دیکھا کیا۔ دلِ بے قرار نے اُس کے چہرے پر ماہ و سال کی مشتاقانہ چھیڑ چھاڑ بھی مسترد کر دی۔ اِسے تو وہی کورا درکار ہے، جس کی آخری شبیہ جس کا آخیر عکس کلکتہ میں راہ شمار کیا تھا۔ پھر کسی نے وہ شاہ کار تصویر مٹا دی۔ مصور نے نہ ماتم کیا نہ احتجاج، بس خاموش تماشائی، محوِ اضطراب محوِ شوق کہ اب پردۂ غیب پر کچھ نمودار ہوا چاہتا ہے۔ اچانک میجر برنارڈ کی حقارت بھری تمسخر آفریں نگاہیں مجھ پر گڑ گئیں۔ میرے ہاتھوں میں برش کی جگہ خنجر کا آنا تھا اور چشم زدن میں میجر برنارڈ کی پیشانی پر پیوست ہوتا تھا کہ آنکھ کھل گئی۔ آسمان نے سیاہ چادر اوڑھ لی تھی۔ میرا جسم پسینے سے شرابور تھا اور سانس درہم برہم۔ آنکھیں انگارہ ہو رہی تھیں۔ صورتِ حال سمجھنے میں کچھ وقت لگا۔ اپنی پیمائش کرتے کرتے میری آنکھ لگ چلی تھی۔ زورا اور جمرو میرے بائیں پڑے تھے۔ بٹھل دائیں جانب سیدھی کروٹ لیٹا تھا۔ اُس کے سونے کا یہ انداز مخصوص تھا۔ عرشے پر موجود تقریباً تمام مسافر نیند کے مزے لُوٹ رہے تھے۔ میں نے سر کو دائیں بائیں جھٹکا دے کے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی، مگر بے سود، وہاں سر نہیں کوئی پھوڑا تھا۔ میں نے بٹھل، زورا اور جمرو کی طرف بہ غور دیکھا۔ آج یہ میرے ساتھ نہ ہوتے تو کم از کم میجر برنارڈ اِس وقت سانس نہ بڑھا رہا ہوتا۔ اچانک ابھر آنے والے اِس گم گشتہ خلجان کی وجہ عقل میں آنے لگی۔ میں آہستہ سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ عرشے پر نیم تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ سائبان کے ستونوں میں طاقچیاں بنی ہوئی تھیں، جن میں شام ڈھلے قندیلیں رکھ دی گئی تھیں، جو اِس وقت ٹمٹما رہی تھیں۔ کیبنوں والا حصہ جگنوؤں سے چمک رہا تھا۔ گمان پڑتا تھا کہ جہاز کے اِس وسیع و بلند گوشے پر جگنوؤں کا جھنڈ اُتر آیا ہو۔ انجن کی گول چمنی اوپر تک چلی گئی تھی، جس سے نکلتا گاڑھا دھواں رات میلی کر رہا تھا۔ میں بکھرے ہوئے لوگوں سے پیر بچاتا دنبالے کی جانب چلا آیا۔ اندازاً پو پھٹنے تک جہاز بمبئی کے

ساحل پر لنگر انداز ہو جاتا۔ میں ریلنگ سے لگ کے کھڑا ہو گیا۔ یہاں میرے سوا کوئی نہیں تھا۔ نیچے کالے سیاہ سمندر میں دُور تک ایک سلوٹ دار لکیر تھی، جو جہاز کے پیچھے سرپٹ دوڑ رہی تھی۔ چاروں اُور حدِ نگاہ تاریکی ہی تاریکی تھی۔ جہاز کے انجن کی مدھر گڑگڑاہٹ سناٹے کا وقار مجروح نہیں کر رہی تھی۔ نیم سرد ہَوا کے تھپیڑے بھلے معلوم پڑ رہے تھے۔ میری نظریں سیدھ میں بھٹک رہی تھیں، جہاں گاڑھا اندھیرا تھا۔ میرے ہاتھ سینے پر کچھ ٹٹولنے لگے۔ مالا اُس کے لمس سے معطر تھی۔ جیسے لمحہ بھر پہلے ہی اُس نے چھوا ہو۔ سینہ جیسے زنجیروں کی جکڑ سے آزاد ہو گیا۔ سوتے پھوٹنے لگے، لیکن آنکھوں کے صرف گوشے ہی نم ہوئے۔ سمندر بھی غضب کا جادوگر ہے، جلا دیتا ہے۔ نہ جانے میں کتنی دیر یوں ہی کھڑا رہا۔ دفعتاً کوئی بالکل میرے ساتھ آ کے کھڑا ہو گیا۔ خوش بو بتا رہی تھی کہ وہ کوئی عورت ہے۔ وہ عین میرے برابر، بالکل ساتھ کھڑی تھی۔ میں نے اُس کی جانب متوجہ ہونے اور دیکھنے سے گریز کیا۔ ریلنگ پر جمے میرے دائیں ہاتھ کی پشت پر حرارت آمیز ریشمی لمس کا احساس ہوا تو میں نے دیکھا، اُس کا ہاتھ شفاف چاندنی سے ڈھلا تھا۔

"آپ رو رہے ہیں مسٹر بابر!" دھیمی اور نغمگیں آواز میرے لیے غیر متوقع نہیں تھی اور نہ ہی غیر شناسا، وہ مایا تھی۔

"اور اِس وقت شرمندگی کا اظہار بے معنی ہے مسٹر بابر۔" اُس نے میرے ہاتھ پر اپنی گرفت مضبوط کرتے ہوئے کہا۔

"آپ کے آنے کی توقع تھی۔" میں نے شائستگی سے اپنا ہاتھ ریلنگ سے اُٹھاتے ہوئے کہا۔

"اِس کا مطلب ہے کہ آپ تمام انگریزوں کو یک ساں نہیں سمجھتے۔" اُس نے اپنا ہاتھ سرد اور برفیلی ریلنگ پر جماتے ہوئے کہا۔

میں نے وضع دار مسکراہٹ سے اُسے جواب دیا۔ وہ نفی یا اثبات دونوں ہی معنی اخذ کرنے میں آزاد تھی۔

"پروفیسر تھامپسن نہایت افسردہ اور گراں بار ہیں۔ اُنھوں نے کئی مرتبہ آپ سے معافی مانگنے کے لیے آنے کا قصد کیا، لیکن اُن میں آپ کا سامنا کرنے کی تاب نہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ میرے شوہر نے اُن کی حقیقی شان و شوکت چھین لی ہے۔" اُس کی آواز آزردہ اور لہجہ پُر ملال تھا، وہ میرے کچھ اور قریب آ گئی۔

دخل در معقولات مجھے بے طرح کھلی تھیں۔ "آپ کو کس طرح معلوم ہوا کہ میں جہاز کے اِس حصے میں موجود ہوں مسز برنارڈ۔" میں نے دانستہ اُسے شوہر کی نسبت سے پکارا، حالاں کہ اُس نے اپنا نام بتایا تھا۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ انگریز خواتین اُدھیڑ عمری سے قبل شوہر کی کنیت سے پکارے جانے کو ناشائستہ سمجھتی ہیں اور ناگوار بھی۔

"برنارڈ نشے میں بہک رہا تھا۔ میں نے زیادہ تر اُسے صلح پسندی اور انصاف کی طرف مائل دیکھا ہے۔" اُس نے

سفید اسکرٹ اور سفید ہی بلاؤز پر فر کا بھورا کوٹ پہن رکھا تھا۔ شانوں پر جھولتے اُس کے سیاہ بال تیز ہَوا میں لہرا رہے تھے گویا کہ رقص کر رہے تھے۔ گہری لال سرخی سے اُس کے ہونٹ اندھیرے میں بھی خوب چمک رہے تھے۔

"مجھے یاد آیا، آپ پچاس فی صد مشرقی بھی ہیں۔"

"اوہ!... کیا مطلب مسٹر بابر؟"

"مشرق میں عورتیں شوہر پرست ہوتی ہیں، یہاں خاوند کی حمایت و یک جائی عبادت سمجھی جاتی ہے۔"

"آپ بات کرنے کا ہنر جانتے ہیں..." اُس نے جز بز ہوتے ہوئے کہا، "برنارڈ اور میں اکھٹے کھیل کود کے جوان ہوئے، اُس سے خوب واقف ہوں۔ میں آپ کے پاس اُس کی صفائی دینے نہیں آئی، معافی کی خواستگار ہوں۔ برنارڈ نے زیادتی کی ہے۔"

"ایک حاکم دوسرا محکوم، کیسی زیادتی، کیسی معافی؟" میرا لہجہ تلخ ہو گیا تھا۔ "بات تو پورے ہندُستان کی ہے۔ پروفیسر صاحب شاید مزید کسی عقدہ کشائی کے منتظر ہوں گے۔"

"آپ بہت شان دار انسان ہیں، غصہ آپ کو اَور شان دار بناتا ہے۔" اُس نے پُر شوق نگاہوں سے دیکھتے ہوئے مسکراہٹ آمیز لہجے میں کہا۔ میں نے جواب میں کہنا چاہا کہ جاہ و حشم کا شہرہ ہی تو ہندُستان کی بدقسمتی رہی ہے، جو کشاں کشاں فاتحین کو یہاں کھینچتی رہی ہے، لیکن ناگوارِ خاطر ہُوا، مجھ سے کچھ نہ کہا گیا۔

"برنارڈ آپ کو وہاں سے اٹھانے پر قادر نہیں تھا۔ آپ از خود ہی چلے آئے۔ پروفیسر تھامپسن نہایت قابلِ عزت اور بااثر ہیں۔ اُن کی رسائی کا ہم پلہ اِس جہاز میں کوئی نہیں۔"

"پروفیسر تھامپسن کی ہماری سماجی حیثیت اور مرتبے تک رسائی نہیں، جبھی وہ ہمیں وہاں لے گئے... لیکن ہمیں اپنی اوقات کا بخوبی ادراک ہے۔ تبھی ہم وہاں سے چلے آئے۔" میں جواباً کچھ نہیں کہنا چاہ رہا تھا، لیکن زبان سے جملے خود بہ خود پھسل گئے۔

"آپ شادی شدہ ہیں؟" اُس نے خوش گوار انداز میں گفتگو کا رخ موڑنا چاہا۔

"ہاں... نہیں... ہاں ہاں..." غیر متوقع سوال سے میں ہڑبڑا گیا تھا۔ کیا خوب سوال تھا کہ سوال بھی متاعِ جاں، جواب بھی متاعِ حیات۔

"انگلستان کے مرد شادی چھپانے کے فن سے خوب آشنا ہیں۔" مایا نے اِٹھلا کے کہا۔ وہ میری خاموشی سے من پسند معنی کشید کر رہی تھی۔ خفیف انداز میں وہ میرے کچھ اَور قریب ہو گئی۔ میں چپ ہی رہا، جیسے کسی نے قوتِ گویائی یک دم سلب کر لی ہو۔ چیرے گئے پانی کی چرچراہٹ بھلی لگ رہی تھی۔ دیو ہیکل سفینہ تیر کیا رہا تھا، بس پھسلے جا رہا تھا۔ جہاز کسی ساحل کے قریب سے گزر رہا تھا۔ دائیں جانب دُور مدھم مدھم روشنی کے دھبّے نظر آ رہے تھے، بستی تھی یا چھوٹا ساحلی شہر۔ چاندنی مایا کے سراپے کو شرابور کر رہی تھی۔ تیز ہوا کے تھپیڑوں میں اُس کے تراشیدہ بال مسلسل لہلہا رہے تھے۔ بلاشبہ وہ مشرق اور مغرب کا حسین امتزاج تھی، نمکین اور سُریلا۔

"میرے ماں باپ کے درمیان مثالی محبت تھی۔ میرے والد کی والہانہ چاہت اور وارفتگی کے باوجود وہ خود کو کم تری کے احساس سے آزاد نہیں کر سکی تھیں۔" مایا نے کچھ توقف کے بعد خاموشی توڑتے ہوئے کہا۔ وہ ٹھہر ٹھہر کے دل نشیں انداز میں بولتی تھی۔ اُس کے شستہ انگریزی لہجے میں پنہاں مشرقیت گو کہ اپنا اظہار نہیں کرتی تھی، لیکن انکار بھی نہ تھا۔ "دل جوئی کی ہر کوشش اُن کی آزردگی میں اضافہ کرتی تھی۔ وہ انگلستان کی ہر چیز پر ہندُستانی تمثیل لایا کرتیں۔ جو والد صاحب کو ناگوار گزرتی، لیکن وہ خندہ پیشاں تھے، گرانیِ طبع کے باوجود اُن کی 'ہاں میں ہاں' ہی ملاتے۔ مغرب جن طور طریقوں اور رسم و رواج کو فرسودہ اور وقت کا زیاں قرار دیتا ہے، والدہ محترمہ کے نزدیک وہ زندگی کی علامت تھے۔ وہ کہا کرتی تھیں کہ جدت طرازی کے تعاقب میں اندھا دھند دوڑا جا رہا ہے، انسانی رشتوں کو دقیانوسی قرار

دینے کا محض ڈھول پیٹا جا رہا ہے، حقیقتاً ایسا نہیں ہے۔ اُن کے نزدیک ذہنی اختراع سے وقوعات نہیں بدل سکتے، البتّہ طرزِ وقوعہ تبدیل ہو سکتا ہے۔ سماج کی قید ہی میں انسان کی اصل آزادی ہے۔ وہ کہا کرتی تھیں کہ مغرب نے اپنی قید کے لیے جس قفس کا انتخاب کیا ہے اُس سے آزادی نہیں موت ملتی ہے، اور وہ بھی صدیوں کے بعد، صرف نئی تہذیب کی نمو کے لیے، نئے معاشرے کی تشکیلِ نو کے لیے... اوہ، میں آپ کو زحمت دے رہی ہوں؟..." بولتے بولتے، اُسے کچھ احساس ہُوا۔ "دراصل میں آپ کو یہ سب بتانا چاہتی ہوں۔ میں نے آپ کی گفتگو سنی تو یقین جانیے مجھے آپ میں والدہ محترمہ کا عکس نظر آیا، وہی انداز، وہی تلخی، وہی تیکھاپن... پروفیسر تھامپسن تو آپ کی مدح سرائی کرتے نہیں تھک رہے۔ اُن کا خیال ہے کہ آپ کی صورت میں اُنھیں اور اُن کی تحقیق کو گوہرِ نایاب میسّر آ گیا ہے۔ وہ آپ کی قربت سے کسی طور دست بردار ہونے کو تیار نہیں ہیں... اور... اور مسٹر بابرا!" میرے نام پر اُس کی زبان لڑکھڑا گئی، وہ اب تک سمندر کے رخ میرے متوازی کھڑی تھی، اپنے جملے کا آخری لفظ ادا کرتے ہوئے وہ یک دم میری جانب مڑی۔ اُس نے ٹھیرے ہوئے اور معنی خیز لہجے میں کہا، "مسٹر بابر! آپ کے بارے میں میرا خیال بھی پروفیسر تھامپسن سے مختلف نہیں ہے۔ آپ بہت شان دار شخصیت کے مالک ہیں مسٹر بابر!" اُس کی سانس میں خفیف لرزش تھی اور آنکھوں میں طوفان۔

"آپ نے بہت اچھے انداز میں میری دل جوئی کی ہے۔ آپ اِس بیکراں سمندر سے پوچھیے کہ اِس دیو ہیکل فولادی جہاز کی اوقات اِس کی نظر میں کیا ہے۔ جو جواب بحرِ بے کراں کا ہوگا، وہی مجھ ناچیز کی اوقات و بساط ہوگی۔"

"خوب!... چہ خوب مسٹر بابر... کیا خوب صورت طور سے جواب گو ہوئے ہیں آپ... والدہ کہا کرتی تھیں کہ ہندُستانی مزاج کی بے جا عاجزی و انکسار نے اُس کے گلے میں غلامی کا

طوق ڈال رکھا ہے۔" وہ بچّوں کی طرح خوش ہوتے ہوئے بے ساختہ بولی۔ اُس کی گویائی میں وقار بدرجۂ اُتم موجود تھا۔

میں خاموش رہنا چاہ رہا تھا۔ مسلسل پہلو تہی کے باوجود جوابی فقرہ میری زبان سے خود بہ خود ہی پھسل جاتا تھا۔ وہ میرے اندازے سے کہیں بڑھ کر غوّاص تھی۔ میں اُسے پڑھ رہا تھا، اور وہ مجھے مہمیز کر رہی تھی۔ "جس توجیہ کو آپ کی والدہ عاجزی و انکسار کہتی تھیں، وہ درحقیقت اپنی ذات سے عدم شناسی ہے۔ ہندُستان کے لوگ خود کو فریب دینے کے لیے اِسے عجز و انکسار ہی پر محمول کرتے ہیں، اور یہی بیان ہندُستان کے گلی کوچوں سے پنپ کے مغرب کے در و بام تک پیغام بن کے پہنچ گیا۔"

"وضاحت کریں۔"

"آپ نے سرکس کا شیر دیکھا ہے مسٹر برنارڈ؟" میرا لہجہ کوششِ ناتمام کے باوجود تلخ ہو گیا۔

"ہاں... کئی بار۔" مایا نے فوراً جواب دیا۔ اُس کی آنکھیں شوق سے جھلکنے لگی تھیں۔

"سرکس میں شیر کے علاوہ اَور بھی جان وَر ہوتے ہیں۔ ریچھ، کتّے، بن مانس، بندر، سانپ، اژدھے، وغیرہ وغیرہ۔"

"ہاں... وہیل اور ڈولفن مچھلیاں بھی اب سرکس کی زینت بننے لگی ہیں۔"

"اِن مختلف النوع جان وَروں کو اشاروں پر نچانے والوں کی ایک ہی قسم ہے اور وہ ہے حضرتِ انسان۔" میں نے دانستہ توقف کیا۔

"آں... ہاں... بات جاری رکھیں۔" وہ مچلتے ہوئے بولی۔

"کیا یہ جان وَر طاقت اور زور میں انسان سے کم ہیں؟ ہم پلّہ ہیں؟"

"بالکل نہیں!"

"عجز و انکساری نے ہندُستانیوں کے گلے میں پٹا نہیں ڈالا۔ ہندُستانی سرکس کے جان وَروں کی مثال ہیں۔ اِنھیں سیلابِ بے اماں کی قوت کا اندازہ نہیں... انگریز کے پاس مداری کی طرح

بہ ترین اور انتظامی صلاحیت موجود ہے۔ اور ہندُستان کے لوگوں کے پاس اپنی طاقت سے عدم واقفیت! مداری کرتب دکھا رہا ہے اور شیر سرکس میں ناچ رہا ہے۔"

"میں آپ کی اِس رائے سے متفق نہیں ہوں... طاقت تو سامانِ حرب میں پوشیدہ ہے۔ اِس سے ہمارے لوگ مالا مال ہیں... بمبار طیارے، گولہ بارود، خود کار بندوقیں، ٹینک، تربیت یافتہ فوج، بہ ترین مواصلاتی نظام، سب سے بڑھ کر سائنس و ٹیکنالوجی کی ہزار جہتی قوت انگریزوں کے پاس ہے۔ آپ کس بل پر ہندُستان کے لوگوں کو طاقت وَر کہہ سکتے ہیں۔ مداری اور شیر میں جو فرق ہے، بعینہٖ ہندُستانی عوام اور انگریزی حکومت میں وہی فرق تو ہے۔"

"آپ ایسا کہہ سکتی ہیں۔" میں نے یک دَم قطعی اور اختتامیہ لہجے میں کہا۔ اُس کا جواب مجھے کچھ سطحی سا لگا، اور کچھ اُس کے انداز میں یکا یک دَر آنے والے فخر و انبساط نے طبیعت کو مکدّر کر دیا تھا۔ لطفِ کلام نہ رہے تو دلیل کا حسن ماند پڑ جاتا ہے، اور لطفِ کلام تو مخاطب کی فکری برتری کا محتاج ہوتا ہے۔ ذہانت و فطانت آسمانی عطا ہے، لیکن اِس میں پختگی و بالیدگی سِن یا تجربے کی مرہونِ منّت ہوتی ہے۔ زندگی کی اُونچ نیچ اور تجربے سے کم مستفید ذہین و فطین لوگ ٹمٹماتے دیے کی مانند ہوتے ہیں، ذرا لَو بھڑکی تو آسمان اُٹھا لائے، مدّھم ہوئی تو زمین پر چلنے سے محروم۔

"آپ لاجواب ہوئے ہیں، یا جواب نہیں دینا چاہتے۔" وہ گھبراہٹ سے بولی۔ اُس نے میرے چہرے پر نمودار ہونے والی ناگواری بھانپ لی تھی۔ اُس لمحے وہ بہت اچھی لگی۔ میری زبان پھر متحرک ہو گئی، نہ چاہتے ہوئے بھی۔

"لوازماتِ دنیا پر غور کیا جائے تو پتا چلتا ہے کہ سبھی کچھ فطرت کے مسلّمہ اصولوں کے ماتحت ہے۔ فطری اصولوں کی ابدیّت کو آج کا جدید انسان بھی تسلیم کرتا ہے۔ انسان نے اپنے تئیں اب تک تمام تبدیلیاں قانونِ فطرت کے مسلّمہ اصولوں کے ماتحت ہی کی ہیں۔ انسان کے تمام

اکتشافات دریافت محض ہیں۔ لطف کی بات ہے کہ قدرت نے کرۂ ارض پر طاقت کا منبع انسان کو بنایا ہے۔ ارضی مخلوقات میں انسان صرف عقل کی بنیاد پر ممتاز نہیں ہے، بل کہ قدرت نے اُسے یگانگت و یک رُوئی سے بھی نوازا ہے۔ ایک انسان دو انسانوں کے برابر نہیں ہو سکتا۔ اِس رائے کی حمایت میں فوری دلیل لانے سے میں قاصر ہوں، لیکن مشاہدے نے یہی سکھایا ہے کہ ایک انسان دو کے مساوی نہیں ہو سکتا۔ محض اپنی لیاقت کے بل پر وہ دیگر چند انسانوں پر جزوقتی برتری، حکومت ضرور حاصل کر سکتا ہے، لیکن اِس فتح کو دوام حاصل نہیں ہو سکتا۔ فاتح سلطان ہو یا وائسرائے، سبھی کی فتح استقامت کے لیے انسانی سلسلے کی محتاج ہے۔ سلطان کو فاتح بننے کے لیے رعایا نہیں صرف سپاہی اور سامانِ حرب درکار ہُوا کرتا ہے، لیکن سلطان کو بادشاہ بننے کے لیے رعایا درکار ہوتی۔ بالکل ایسے ہی پہلے مرحلے پر جنگلی جان وَروں کو طاقت کے بل پر آہنی پنجروں میں جکڑ لیا جاتا ہے، لیکن سرکس تماشے کے لیے مداری کو جان وَر کے دل و دماغ پر حکومت کرنی ہوتی ہے، ورنہ سر پھرے کب زیرِ نگیں ہوتے ہیں۔ اِسی طرح پہلے مرحلے پر سلطان فتح کے لیے کشتوں کے پشتے لگا دیتا ہے، لیکن دوسرے مرحلے میں انسانوں کی فتح ہی اُس کا سب سے بڑا مسئلہ بنتی ہے۔ یہی دائمی وابستگی ہے۔ جو اِس مرحلے میں کام ران ہُوا، اُسی کو تاریخ نے عزّت و احترام سے یاد کیا ہے۔ انگریز پہلا مرحلہ تو سامانِ حرب کی برتری کی بدولت سر کر چکے ہیں۔ میں یہ نہیں کہوں گا کہ انگریزوں کو دوسرے مرحلے کا ادراک نہیں ہے، لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ وہ اِس مرحلے پر ناکامی سے دوچار ہیں۔ اُنھوں نے ہندُستان کو طاقت کے بل پر پنجا ڈال کے سرکس میں لا کھڑا کیا ہے، لیکن دل و دماغ کی فتح بہت دُور ہے۔ اِس وقت محض عدم آگہی کی بنا پر شیر بہ جبر و کراہ تماشا دکھا رہا ہے، لیکن جس دن شیر کو احساس ہو گیا کہ اُس کے جبڑے مداری کے

ہنٹر سے زیادہ طاقت وَر ہیں، اُس دن وہ مداری کو مار کھائے گا کہ اُس کے دل میں مداری کے لیے نرم گوشہ نہیں ہے۔ ہندُستانی عوام کا جبڑا اُن کی خوف ناک اور بے پناہ عددی برتری میں پوشیدہ ہے۔ انگریز امتیاز کے ساتھ اپنی فتح کو دوام دینا چاہتے ہیں، جو کہ ناممکن ہے۔ قدرت نے انسانوں کو مساوی بنایا ہے۔" میں نے کچھ توقف کیا۔ وہ گنگ اور سحر زدہ انداز میں مجھے تکے جا رہی تھی۔ میں نے غیر محسوس طریقے سے اُس کے اور اپنے درمیان ختم ہو جانے والا فاصلہ بحال کیا۔ جہاز ساحل سے کچھ اور قریب ہو گیا تھا۔ چمکتے ہوئے دھبّے کچھ اور واضح ہو رہے تھے۔ دُور اندھیرے میں چھوٹی چھوٹی کشتیوں کے ہیولے نظر آ رہے تھے۔ ہیولے متحرک تھے یا جامد یہ فیصلہ کرنا دشوار تھا۔ جہاز سست رَو تھا، ورنہ اِسے اب تک بمبئی پہنچ جانا چاہیے تھا۔ ہو سکتا ہے روشنیوں کے یہ دھبّے بمبئی ہی کے قرب و جوار سے ہوں۔ ہَوا میں سمندری کڑواہٹ کے ساتھ ساتھ کچھ فرحت اور تازگی بھی دَر آئی تھی۔ وہ ایک ٹک مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے جھینپ کے نظریں جہاز سے پیوستہ سفید سمندری لکیر پر مرکوز کر لیں۔

"ہندُستانی شریف النفس ہوتے ہیں..." وہ بڑبڑائی، جیسے کوئی نکتہ اُس کی دست رَس میں آ گیا ہو۔ وہ چونک کے بولی، "آپ نے انسان کے مساویانہ درجے اور امتیاز کی بات کی، آپ کے نزدیک فاتح اور حکم ران میں فرق ہے... لیکن حکم ران اور رعایا کے درمیان عدمِ مساوات کا جو وسیع پاٹ ہے اُسے آپ کیا کہیں گے مسٹر بابر!" اُس کے لہجے میں انتہائے دل چسپی اور بکمال شوق تھا۔

"انسانی رویّوں کو سمجھنے کے لیے قانونِ فطرت کا تھوڑا بہت ادراک از حد ضروری ہے مسز برنارڈ!"

"مجھے مایا پکارے جانا پسند ہے۔" اُس کے لہجے میں تپش بھی تھی اور لرزش بھی۔

میں نے اُس کے اعتراض پر تبصرہ کرنے کی بجائے سلسلۂ کلام جاری رکھا۔ لطفِ کلام گویا دَر آیا۔ "سلطان

وکیل صاحب... میں نے ناول کے مطابق اپنا کردار ادا کیا

اور حکم ران میں بنیادی فرق ہی امتیاز کی نوعیت کو واضح کرتا ہے۔ سلطان اپنی مرضی اور طاقت کے بل بوتے پر قابض ہوتا ہے، اور حکم ران رعایا کی منشا سے عنانِ حکومت چلاتا ہے۔ جو حکم ران اپنی رعایا کو مساوی درجہ نہیں دیتے اُنھیں بہت جلد بغاوت، شورش اور حکم کی غیر مقبولیت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مقبول حکم ران اور رعایا کے درمیان امتیاز رضا و رغبت سے جڑا ہے۔ کس میں دَم ہے جو کسی پر حکومت کرے، یہ تو من کے سودے ہیں، جسے من چاہے اپنا حکم ران بنا لے۔ رعایا کا از خود تفویض کردہ انتظامی حق امتیاز کو جنم نہیں دیتا، امتیاز مسلّط کی گئی حکم رانی کے بطن سے جنم لیتا ہے۔" اُس کی بڑی بڑی شربتی آنکھیں حیرانی سے گویا پھٹنے کو ہو گئیں۔ وہ مبہوت سکتے کے عالم میں کافی دیر مجھے تکتی رہی۔ پھر خود کار انداز میں بڑبڑائی، "آج سے پہلے ہندُستان میری نظر میں ایک پسماندہ سرزمین تھا... آپ کی نکتہ بیانی نے میری نظر ہی بدل دی۔ من چاہے حکم ران کا انتخاب تفریق کو ختم کرتا ہے۔ بہت خوب مسٹر بابر! بہت خوب! اِس نکتے کی مزید وضاحت کریں گے؟"

"اِس نکتے کو آپ اپنی ذات پر منطبق کیجیے! کیا آپ کی منشا کے بغیر آپ پر کوئی حکومت کر سکتا ہے؟ بہ جبر و کراہ کسی کا کہا ماننے پر آپ کی کیا کیفیت ہوتی ہے؟ جب آپ کے شوہر نے ہمیں طعام گاہ سے نکال باہر کیا، بہ ظاہر آپ

نے بھی برنارڈ کی تعمیل کی۔ سچ بتایئے! اِس میں آپ کی کتنی منشا تھی؟...‘‘ اُس کی آنکھیں اُبلنے لگیں۔ آگہی و ادراک کی لذّت اُس کے چہرے پر نئی مصوری کر رہی تھی۔ ’’مایا! میرا سوال غور سے سنیئے گا۔ میری گفتگو کا خلاصہ اور حاصل ہے۔‘‘

’’میں ہمہ تن گوش ہوں!‘‘ وہ بولی، جیسے ہپناٹائز کے زیرِ مشق بولتے ہیں۔

’’میری آپ سے چند گھنٹوں کی ملاقات ہے۔ اِس مختصر جان کاری کے باوجود یہ سوال میرے ذہن میں کلبلایا ہے۔‘‘ اچانک ایک جھجک مانع ہوئی، اور میں سوال کرتے کرتے ٹھیر گیا۔ اُس نے قطعِ کلامی کو میرے طرزِ بیاں پر محمول کیا، اور بے تابی سے کچھ دیر میرے بولنے کا انتظار کیا، لیکن جب خاموشی کئی لمحوں پر محیط ہوگئی تو وہ مضطرب ہو کے بولی،

’’بہ راہِ کرم! پوچھیے!‘‘

’’از روئے دل بتایئے ماریا! میجر نارڈ آپ پر مزید کتنے عرصے حکومت کر سکتا ہے؟‘‘ میرے مُنہ سے یک دم چاتو نکل گیا۔ اُس کا چہرہ دفعتاً تاریک پڑ گیا تھا۔ اُس کی دمکتی آنکھیں بجھ سی گئیں۔ ’’آپ کا جواب ہی ہندُستانی عوام کا انگریز سرکار کو پیغام ہوگا۔‘‘ نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے اپنا مدّعا تمام کر دیا۔ وہ ایک ٹک مجھے تکتی رہی، جیسے کوئی خلا میں جھانکتا ہو۔ میرے سوال نے اُس کا یقین، اعتماد اور سر سے سائبان کھینچ لیا۔ مغربی سہی آخر وہ عورت تھی۔ اُس نے کچھ بولنا چاہا، لیکن اُس کے ہونٹ لرز کے رہ گئے۔ اچانک جیسے بجلی کوندی۔ وہ مجھ سے لپٹ گئی، اور زار و زار سسکنے لگی، بھل بھل اُبلنے لگی۔ ’’آپ نے یہ کیسے سمجھا! مسٹر بابر!‘‘

میں نے اُسے دھیرے سے علیحدہ کرنا چاہا۔ اُس نے گرفت مزید مضبوط کر لی۔ ’’سامنے کی بات ہے... رات کا یہ وقت ہے ہی خاوند اور زوج کے لیے... اور آپ اسے... آپ اِس کے برعکس خاوند کو چھوڑ کے اُس کے معتوب کی دل جوئی کرنے چلی آئی ہیں۔‘‘

’’میں برنارڈ سے نفرت کرنے لگی ہوں۔ جس کا اظہار و ادراک آج پہلی مرتبہ ہوا ہے، آج یوم آگہی ہے مسٹر بابر۔‘‘ اُس کا لہجہ گلوگیر تھا۔ وہ بدستور سسک رہی تھی۔ میرا دم گھٹنے لگا۔ مجھ پر بھی تو کسی کا سکہ رواں دواں تھا۔ ایک بلاشرکتِ غیرے حکومت تھی، نہ ہجر کا گلا نہ وصال کی امید، نہ سود و زیاں کا حساب، یہی ایک پُرشوق آبلہ پائی ہم رکاب ہے، نہ تشنگی کا احساس نہ سیرابی کی لذت۔ کتنی صدیاں بیتیں اُس سیر چشم کو دیکھے اور کوئی لمحہ تھا جو وہ اوجھل ہوئی ہو۔ کورا کی حکومت کیسی شان دار تھی۔ پایۂ تخت پر اُس کی گرفت کیسی پُراسرار تھی، جسے نہ سپاہ کی ضرورت نہ انقلاب کا خوف! میں نے ایک جھٹکے سے مایا کو خود سے علیحدہ کرنا چاہا کہ یک دم جیسے دائیں کاندھے کا جوڑ کھل گیا، ضرب نپی تلی اور زوردار تھی۔ شدید درد نچلے دھڑ تک سرایت کر گیا۔ اِس سے پیش تر میں صورتِ حال کو سمجھ پاتا، میرے سر پر ایک زوردار دھماکا ہوا۔ ساتھ ہی مایا کی دل دوز چیخ ابھری۔ وہ چیختی ہوئی دنبالے کے فرش پہ جا گری۔ میرے سر میں بڑی زوردار آواز سے گھنٹے بجنے لگے۔ منظر بری طرح چکرانے لگا۔ میں نے بے اختیار سر کو تھاما، اور لہرا کے مایا کے اوپر ہی گر پڑا۔

’’ہندُستانی کتیا کے بچے! تیری اتنی اوقات! اتنی جرأت!‘‘ وہ میجر برنارڈ کی آواز تھی، غیض و غضب سے بھڑکتی ہوئی۔ مغلظات کا طوفان اُس کی زبان پر اُمڈ رہا تھا۔ ہیجان، وحشت، جنون اور بہت کچھ اُس کے لہجے میں عیاں تھا۔ میں نے خود کو دائیں ہاتھ کے زور پر اٹھا کے مایا پر سے ہٹانا چاہا، مگر بازو نے بوجھ اٹھانے سے انکار کر دیا۔ دفعتاً بائیں پہلو پر زوردار ضرب لگی۔ برنارڈ نے پوری قوت سے لات ماری۔ میں اُلٹ کے فرش پر چت ہو گیا۔ اب سارا منظر میرے سامنے تھا۔ برنارڈ اور ٹونی مایا کے سرہانے کھڑے تھے۔ وہ پھٹ پڑنے کو تھا۔ اُس کے مُنہ سے کف بہہ رہا تھا، چہرہ لال بھبوکا ہو رہا تھا۔ وہ نشے میں جھول رہا تھا۔ مایا اُٹھنے کی کوشش کرنے لگی۔ دفعتاً برنارڈ نے جھک کے اُسے بالوں سے پکڑ کے اُٹھایا۔

’’ہندُستانی کتیا کی بیٹی!... حرام زادی!... گلچھرے اُڑانے

ہندستان جا رہی ہے؟" برنارڈ نے مایا کے بال پکڑے پکڑے ہی ڈھیلے ہاتھ کا طمانچہ رسید کر دیا۔ میرے لیے حواس بحال کرنے کا یہی موقع تھا۔ بقولِ بٹھل کہ تلوے اور زمین کے گٹھ جوڑ کے ساتھ زندگی جڑی ہے۔ جس کے تلوے نے زمین چھوڑ دی، وہ گیا۔ میں نے سانس روک کے جسم میں اُٹھنے والے شدید درد کو قابلِ برداشت کیا۔ ظالم نے نپی تلی ضربیں ماری تھیں۔ برنارڈ یقیناً لڑائی بھڑائی کے فن میں تربیت یافتہ تھا۔ وہ مایا کو بری طرح تھپڑا رہا تھا۔ مایا اُس کا مُنہ نوچ رہی تھی، اور ترکی بہ ترکی اُسے مغلظات کا جواب دے رہی تھی۔ ٹونی اُن دونوں کو جدا کرنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ میں نے اپنی دونوں ٹانگوں کو قوس کی مانند اوپر اٹھایا اور پشت کے زوردار جھٹکے سے تلووں کو زمین کی طرف گرا دیا۔ اگلے ہی لمحے میں اپنے قدموں پر کھڑا تھا۔ اگر میں کروٹ کے بل کھڑا ہوتا تو ایک لمحہ ایسا ضرور آتا جب وہ تینوں میری نظروں سے اوجھل ہوتے، اور یہ سارا کھیل ہی نظر کی چوکسی کا ہے۔ معمولی سی غفلت مجھے ایک اور نپی تلی ضرب سے ہم کنار کر سکتی تھی، جس کا میں اِس وقت متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ مجھے کھڑا ہوتا دیکھ کے برنارڈ نے مایا کو ٹونی کی طرف دھکیلا اور طمنچہ نکال کے مجھ پر تان لیا۔ شدید غصّے سے اُس کے ہاتھ لرز رہے تھے۔ میرے لیے اندازہ لگانا مشکل نہ تھا، وہ گولی چلانے سے دریغ نہیں کرے گا۔ نشے میں ڈولتے ہوئے جنونی سے کچھ بعید نہیں تھا۔ وہ مجھ سے کم از کم تین گز کے فاصلے پر تھا۔ جیب سے چاقو نکالنے کی مہلت نہیں تھی، چہ جائیکہ کھٹکا دبا کے اُسے کھولا جائے۔ میں نے یک سوئی سے نظریں تمنچے پر جما دیں۔ لبلبے کی خفیف تحریک پر میں حرکت کرنے کے لیے تیار تھا، لیکن گولی سے بچ نکلنے کے آثار مفقود تھے۔

"تیسرے درجے کے شہری! تمھاری اوقات بھوکی مچھلیوں کی خوراک سے زیادہ نہیں... حرامی کتے!" برنارڈ وحشیانہ انداز میں پوری قوت سے چلّا رہا تھا۔ شدّتِ جذبات سے اُس کی گردن کی نسیں اُبھر آئی تھیں۔

میری کنپٹیاں سلگنے لگیں۔ دماغ میں کچھ پکنے لگا۔ وہ گولی ہی چلا سکتا تھا، لیکن اِس عرصے میں اُس کی گردن کی ہڈی ضرور تڑخائی جا سکتی تھی۔

"کتیا کے بچے... چل پیچھے کی جانب چل۔" اُس نے چیختے ہوئے کہا، اور پستول سے مجھے ریلنگ کے ساتھ لگنے کا اشارہ کیا۔

میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ بٹھل کی برفیلی گولی جل کے خاکستر ہو گئی۔ میں نے فیصلہ کر لیا۔ مزید کچھ سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ اُدھر مایا ٹونی کی گرفت میں بے طرح پھڑ پھڑا رہی تھی۔ اُس کی چیخیں کافی تیز تھیں۔ برنارڈ پر جست لگانے کے سوا چارہ نہ تھا۔ وہ فوجی افسر تھا، اُس کا نشانہ خطا جانے کا امکان ندارد تھا۔ میں نے پنجوں کا دباو زمین پر دیا کہ بٹھل نظر آیا۔ وہ برنارڈ کے عقب میں پنجوں کے بل دنبالے کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔ بٹھل نے نظریں چار ہوتے ہی مجھے برنارڈ کا حکم ماننے کا اشارہ کیا، میری سانس جہاں تھی وہیں رہ گئی۔ ٹونی کی نظر کسی بھی لمحے بٹھل پر پڑ سکتی تھی، لیکن وہ مایا سے اُلجھا ہوا تھا، اور کچھ میری جانب بھی متوجہ تھا۔ وہ برنارڈ کے ساتھ ہی کھڑا تھا۔ میں نے اُلٹے قدموں دنبالے کی ریلنگ کی طرف کھسکنا شروع کر دیا۔ بٹھل دھیرے دھیرے برنارڈ کی جانب بڑھ رہا تھا۔ گز سوا گز کی دُوری رہی تھی۔ معمولی سی آہٹ یا ٹونی کو موجودی کا احساس بٹھل یا مجھ میں سے کسی ایک کی جان لے سکتا تھا۔ میں چند قدم کھسک کے ریلنگ سے لگ چکا تھا۔

"ریلنگ پر چڑھو اور سمندر میں کود جاؤ... میرے حکم کی فوراً تعمیل کرو!"

برنارڈ کے چہرے پر یکا یک ایک مخصوص اور زہرخند مسکراہٹ نمودار ہوئی، قاتل بھی اور متجسس بھی۔ بلاشبہ بپھرے ہوئے سمندر میں تھک ہار کے ڈوب مرنا گولی کی موت سے زیادہ ہول ناک اور روح فرسا تھا۔ بٹھل اُس کے سر پر آ چکا تھا۔

"کود جاؤ سمندر میں... ورنہ تمھاری ٹانگوں میں گولیاں مار کے سمندر میں پھینکوں گا... لیکن زندہ ہی..." اُس نے تمنچے سے مجھے ہانکا۔ پھر تضحیکانہ لہجے میں بولا، "پور بندر قریب ہے۔ تیرتے ہوئے اُدھر پہنچ جانا۔"

میں برنارڈ کی جانب پشت کیے بغیر ریلنگ پر چڑھنے لگا تو بٹھل نے سخت نظروں سے گھورا۔ میں اُلجھ گیا، کچھ تھا جسے میں نظر انداز کر رہا تھا۔ دفعتاً بٹھل کا سر برنارڈ کے عقب سے غائب ہو گیا۔ اُس کے عین پیچھے پروفیسر تھامپسن اور زورا نظر آ رہے تھے۔ جمرو بھی یقیناً انھی کے ساتھ ہو گا۔ پھر کوندا لپک گیا، اور چشم زدن میں برنارڈ مُنہ کے بل زمین پر آ رہا۔ بٹھل نے پیچھے بیٹھ کے خاص انداز میں برنارڈ کے دونوں ٹخنے اپنی جانب کھینچ لیے تھے۔ بٹھل نے اُس کے ٹخنوں کو زمین سے اٹھا کے اپنی جانب کھینچا تھا، اگر وہ ایسا نہ کرتا تو برنارڈ کا پلک جھپکتے ہی زمیں بوس ہونا ناممکن تھا، طمنچہ اُس کے ہاتھ سے چھوٹ کے سیدھا میرے قدموں میں آ گرا تھا، لیکن میں نے طمنچہ اٹھانے کی بجائے ٹونی کی فکر کی، جو عرشے کی جانب بھاگنے کو پر تول رہا تھا۔ مجھے بڑھتا دیکھ کے اُس نے مایا کو میری جانب دھکیل دیا۔ میرے لیے فوری طور پر پلٹنا یا دائیں بائیں ہونا ممکن نہیں تھا۔ میں مایا سے اُلجھ گیا۔ اِس سے پیش تر میں مایا کو ایک طرف کرتا ٹونی نے دنبالے سے عرشے پر چھلانگ لگا دی۔ کیبنوں والے حصّے تک ٹونی کے صحیح سلامت پہنچنے کا مطلب ہمارے لیے بے پناہ مشکلات تھیں۔ میں نیچے جانے لگا تو بٹھل نے مجھے منع کر دیا۔

"مشٹنڈا ادھری ہے... سنبھال لے گا رے۔" وہ اچھلتا ہوا میری طرف آیا تھا۔ "مُنہ دے آیا تھا تو بتانے میں تیرا ہرج نہیں تھا۔ ایسے نہ ستایا کر۔" بٹھل سیدھا مجھ سے آ ٹکرایا۔ اُس نے دو ہتڑ میرے سینے پر مارا۔ پھر جھڑک کے اپنی آغوش میں جکڑ لیا۔

برنارڈ اوندھا پڑا ڈکرا رہا تھا۔ اُس کے مُنہ سے خون کی پتلی لکیر بہتی ہوئی ریلنگ تک چلی گئی تھی۔ نیچے گراتے ہی بٹھل نے دونوں ٹخنے اُس کے کولھوں سے ملا دیے تھے۔ پھر اُتنی ہی تیزی سے وہ اُس کی مڑی ہوئی ٹانگوں پر گرا تھا، اور گرتے ہوئے اُس نے کہنی کی کاری ضرب کمر کے عین درمیان میں ریڑھ کی ہڈی پر لگائی تھی۔ برنارڈ کے زمین پر پڑا رہنے کے لیے یہ بہت زیادہ تھا۔

"میں آپ سے بہت شرمندہ ہوں... یہ سب میری وجہ سے ہوا۔" مایا ہچکیوں سے رو رہی تھی۔

"کیا گٹ پٹ کر رہی ہے رے؟" بٹھل نے مجھ سے الگ ہوتے ہوئے کہا۔ اُس نے معنی خیز نظروں سے مایا کو دیکھا۔ دفعتاً اُلجھن کا سرا میرے ہاتھ آ گیا۔ برنارڈ مجھ سے انگریزی میں کہہ رہا تھا، بٹھل کیسے اُس کی بات سمجھ رہا تھا، اور مجھے تعمیل کرنے کے اشارے دے رہا تھا! میں نے بٹھل کی طرف دیکھا۔

"چوکھٹا پڑھ لیتے ہیں رے۔ اِن کی گٹ پٹ سانجھی ہوتی ہے۔" بٹھل نے میری ٹھوڑی پکڑتے ہوئے کہا، "بابا جی کچھ بولے ہیں اِس کے بارے میں۔" اُس نے پروفیسر تھامپسن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ وہ بھی سہمے ہوئے ہمارے قریب آ گئے تھے۔

"خدا کا شکر ہے مسٹر بابر! آپ کی جان بچ گئی۔ متوقع جواب طلبی کی آپ چنداں فکر نہ کریں... حکومت برطانیہ کے گراں قدروں میں شمار ہے۔" پروفیسر تھامپسن نے حیرانی سے بٹھل کو دیکھتے ہوئے کہا، جیسے گڑگانو کے جاٹ بمبئی دیکھتے ہیں۔ "یہ بہت طاقت ور اور حیرت انگیز انسان ہیں۔ آپ کی اور آپ کے دوستوں کی رفاقت مطلوبِ خاطر ہے مسٹر بابر!"

اِس اثنا میں زورا ٹونی کو کاندھے پر ڈالے دنبالے پر چڑھ آیا۔ اچھا خاصا شور و غل مچ چکا تھا۔ میں نے دنبالے سے نیچے جھانک کے دیکھا۔ وہ ایک دوسرے پر چڑھے کھڑے تھے۔ عرشے کے سوئے ہوئے مسافروں کی بڑی تعداد دنبالے کی سیڑھیوں پر جمع ہو چکی تھی۔ سبھی کی نظریں استعجاب اور فکر مندی سے ہماری طرف تنی ہوئی تھیں۔

سرگوشیوں اور چہ مگوئیوں کی بھنبھناہٹ سمندری شور پر حاوی
ہو چکی تھی۔ صورتِ حال ہماری توقع سے زیادہ گمبھیر تھی۔
بجھل کی پیشانی پر فکر کی لکیریں نمایاں ہو چکی تھیں۔
ہمارے چاروں طرف سمندر تھا اور جہاز پر ہماری گرفتاری
یقینی تھی۔ فوجی افسر پر حملے کو انگریز غداری سمجھتے تھے، جس پر
کسی بھی قسم کی رعایت نہیں کی جاتی تھی۔ پروفیسر تھامپسن کو
ہندستان کی صورتِ حال کا ذرا بھی ادراک نہیں تھا۔ وہ
خلوصِ نیت سے ہمیں بے فکری کی تلقین کر رہے تھے، لیکن
ہمارے لیے وہ محض تسلیوں سے بڑھ کر نہیں تھی۔ میں نے
اُن کی بات بجھل تک بڑھانی مناسب نہیں سمجھی۔ وہ متفکر
کھڑا رہا۔ عرشے پر ہجوم بہ دستور بڑھ رہا تھا۔ برنارڈ بے
ہوش ہو چکا تھا۔ مایا اُسے سیدھا کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔
پروفیسر تھامپسن اُس کی مدد کو بڑھے۔ دونوں نے مل کے برنارڈ
کو سیدھا کر دیا۔ اُس کا چہرہ خون سے تر بہ تر تھا۔ دفعتاً بجھل نے
آگے بڑھ کے برنارڈ کا گرا ہوا طمنچہ اٹھا لیا۔ طمنچہ میرے حوالے
کرتے ہوئے اُس نے سرگوشی میں مجھے کچھ ہدایات دیں۔ خود
زورا اور جمرو کی طرف بڑھ گیا، جو دنبالے کی سیڑھیوں پر کھڑے
عرشے کے مجمع کو گھور رہے تھے۔ میں نے بجھل کی بات پر
پروفیسر تھامپسن اور مایا کو اعتماد میں لیا۔ اُنھوں نے فوراً حامی
بھر لی۔ پروفیسر تھامپسن نے کہا، "تمھارا ساتھی جہاں دیدہ
ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ میرا واسطہ عظیم بہادر انسانوں سے پڑا
ہے۔ اِس سنگین صورتِ حال میں آپ چاروں کے چہرے
پُرسکون ہیں نہ کوئی خوف نہ سراسیمگی۔"

"نہایت افسوس ہے کہ میں آپ کے پاس ایک مصیبت
کے ہم راہ چلی آئی۔ آپ گرفتار ہو گئے تو اُس کے بعد برنارڈ
کی غضب ناکی کا مجھے بخوبی اندازہ ہے۔ یہ کینہ پرور انسان ہے۔
آپ کو شدید نقصان پہنچائے بغیر چین سے نہیں بیٹھے گا۔ آپ کے
ساتھی نے درست فیصلہ کیا ہے۔ میں ہر قیمت پر آپ کا ساتھ دوں
گی۔" مایا نے پروفیسر تھامپسن کی بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔
اُس کی والہانہ نگاہیں بصد شوق میرا طواف کر رہی تھیں۔

بجھل نے ہر قیمت پر گرفتاری نہ دینے کا فیصلہ کر لیا
ہم آنے والے پل کی نوعیت کا اندازہ لگانے سے
تھے۔ جہاز پر کم و بیش سو کے لگ بھگ مسلح محافظ تو
ہوں گے۔ بجھل برنارڈ، ٹونی، مایا اور پروفیسر تھامپسن
یرغمال بنا کے کسی قریبی ساحل پر اترنا چاہتا تھا۔ بی ا
ہماری بمبئی یاترا ملتوی ہو چکی تھی۔ یہ بہت بڑا اقدام تھا
تاجِ برطانیہ سے براہِ راست ٹکر! جہاز سے اترنے کے بعد
ہماری مشکلات میں بے پناہ اضافہ ہونے والا تھا۔
کہاں تک چھپتے پھرتے؟ ہمارے حلیے ہندستان بھر میں تار
کر دیے جاتے۔ دیس بھر کے تھانوں سے ہماری گرفتاری
طلب کی جاتی۔ کھوجی اور ہرکارے طول و عرض میں دوڑ پڑتے
ہم بمبئی جا رہے تھے، ہماری تلاش بھی بمبئی سے شروع ہوتی
بمبئی میں ہمارے حلیے کا چند گھنٹوں میں سراغ لگا لیا جاتا
ابا جان، فرخ، فارہہ، فریال، اکبر اور ان سب کی زندگی جہنم
بننے والی تھی جن کا ہم سے ذرا بھی واسطہ تھا۔ میں وہاں پہنچا
نہیں تھا، لیکن میری نحوست پہنچنے والی تھی۔ ہمیں گرفتاری
دینی چاہیے۔ بجھل یہ سب کچھ مجھ سے پہلے سوچ چکا ہوگا،
یرغمالیوں کے بدلے جہاز والوں سے وہ کیا مطالبہ کرنے
والا تھا، اِس سے میں بے خبر تھا۔ دفعتاً انجن نے گڑگڑانا
بند کر دیا اور جہاز کی رفتار سست ہو گئی۔ میں نے چمنی کی طرف
نظر دوڑائی، وہاں سے دھوئیں کا اخراج تقریباً بند ہو چکا
تھا۔ یقیناً جہاز کو روکا جا رہا تھا۔ جہاز کو اِس وقت روکنا بعید از
عقل تھا۔ ممکن ہے انجن میں خرابی پیدا ہو گئی ہو یا پھر کسی سگنل
کی وجہ سے معمول کے مطابق روکا گیا ہو۔ ہماری وجہ سے
جہاز کو ٹھہرانا ناممکن سی بات تھی۔ دفعتاً کیبن والے حصے سے
غلغلہ بلند ہوا۔ بھگدڑ کی طرح لوگوں کا ریلہ عرشے کے عقب
کی جانب آیا، لوگوں کی بھنبھناہٹ چیخ و پکار میں تبدیل ہو گئی۔
دفعتاً یکے بعد دیگرے کئی طمنچے دھاڑے۔ عرشے پر سناٹا
چھا گیا۔ میں نے نیچے جھانکنا چاہا، بجھل نے یک دم میری
طرف جست لگائی اور مجھے رگیدتا ہوا فرش پر پڑ گیا۔

"چپکا پڑا رہ رے... مالک نے فرشتے بھیجے لگتے ہیں۔"

میرے نیچے گرتے ہی طمنچہ چلا اور گولی وہیں لگی جہاں کچھ دیر پہلے میرا سر تھا۔ میں نے غیر ارادی طور پر مڑ کے دیکھا، زورا اور جمرو بھی ہمارے ساتھ ہی فرش پر لیٹے تھے۔ عقب میں پروفیسر تھامپسن، ماریا، برنارڈ اور ٹونی لیٹے ہوئے تھے۔

"استاد بڑا الفڑا ہے۔ جہاز کے آجو باجو ڈاکوؤں کی کشتیاں لگ گئی ہیں۔" زورا نے بٹھل کے کان میں سرگوشی کی۔ وہ سرکتا ہوا بٹھل کے ساتھ آ لگا تھا۔

"ڈاکو نہیں لگتے رے!" بٹھل نے دھیمے سے جواب دیا۔ وہ خاصا متفکر دکھائی پڑتا تھا۔ میں نے بہت کم اُسے اتنا فکر مند دیکھا تھا۔ دفعتاً ہمارے عقب میں ٹن ٹن کر کے کئی مرتبہ لوہا بجا۔ ہم چاروں چشم زدن میں پلٹے، گویا یک جان ہوں۔ ریلنگ کے پائپ پر چاروں طرف آنکڑے پھنسے ہوئے تھے۔ اُن سے بندھی تنی ہوئی سفید رسیاں نیچے کی طرف جارہی تھیں۔ زورا اور جمرو نے کھٹاکے سے چاقو کھول لیے، آنکڑوں کی رسیاں کاٹنے کی اجازت بٹھل سے طلب کی۔

"کتنی کاٹو گے؟ ہزاروں دِکھتے ہیں... آنے دو رے۔" بٹھل نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ہم چاروں تن بہ تقدیر اُٹھ کے بیٹھ گئے۔ ہماری دیکھا دیکھی ماریا اور پروفیسر تھامپسن بھی اُٹھ بیٹھے۔

"آپ لیٹ جاؤ... تو گٹ پٹ کر دے رے!"

میں نے بٹھل کی ترجمانی کرتے ہوئے اُنھیں بدستور لیٹے رہنے کا کہا۔ ہماری نظریں آنکڑوں اور رسیوں پر جمی تھیں۔ ہم انتہائی چوکنے بیٹھے تھے، حالاں کہ ہماری سلامتی کا انحصار آنے والوں پر تھا۔ نہ جانے یہ کون لوگ تھے، ان لوگوں نے جہاز کس طرح رکوا لیا، اور جہاز کے تربیت یافتہ مسلح محافظوں سے یہ کس طرح نمٹیں گے؟ بحری قزاق عموماً اس طرح کے بڑے جہاز نہیں لوٹا کرتے، اور نہ ہی ایسے منظم بحری قزاقوں کا تذکرہ اب تک سنا تھا۔ دنبالے سے سطحِ سمندر کا فاصلہ تیس سے پینتیس فٹ تھا۔ دفعتاً پردۂ غیب سے کچھ نمودار ہوا۔ جہاز کے بیرونی کنارے پر ریلنگ کے جنگلے کے نیچے دو آنکھیں نمودار ہوئیں۔ ہمیں اپنی جانب متوجہ پا کے غڑاپ سے غائب ہو گئیں۔ لحظہ بھر بعد پورے دنبالے پر تینوں اطراف سے بندوقوں کی نالیاں برآمد ہوئیں، جن کی تعداد پچیس کے لگ بھگ اور سبھی کا رخ ہماری طرف تھا۔

"اے خبردار! ہلنے کا نئیں اے۔" سامنے کی طرف سے چیخ کے کہا گیا۔ ہم تو پہلے ہی بہ رضائے تقدیر بیٹھے تھے۔ "ہتھیار وغیرہ پھینکنے کا ہے۔ باپو کی طرف سے جندگی کی جمانت ہے بھاؤ۔"

بٹھل نے چاقو پھینک دیا۔ ہماری تقلید ناگزیر تھی۔ چابک دستی اور تنظیم سے وہ تمام دنبالے پر آ موجود ہوئے۔ اُن میں سے ایک نے آگے بڑھ کے طمنچہ اور چاقو سمیٹ لیے اور اپنے میں سے ایک نمایاں شخص کے سامنے پیش کیے، جو یقیناً منصب دار تھا۔ اُن میں بیش تر سیاہ فام اور حبشی رُو تھے۔ چند کی رنگت عام ہندوستانیوں کی طرح نیم سیاہ یا گہری گندمی تھی۔ سبھی کرتے پاجاموں میں ملبوس تھے۔ کڑھے ہوئے کُرتے، سیاہ، سرمئی، جامنی، کتھئی اور سبز رنگت کے تھے، جب کہ پاجامے یک ساں طور پر سفید براق تھے۔ کسی کے سر پر رومال بندھا تھا، اور کسی نے مخصوص انداز میں گردن پہ لپیٹا ہوا تھا۔ کانوں میں بالیاں اور ہاتھوں میں چاندی کے منقش کڑے تھے۔ "انہاں باندراں کا نئیں کولٹایا... اے بھاؤ... اے گھوڑا سرکاری دِکھے نا۔" منصب دار نے برنارڈ کا طمنچہ بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ سب اپنی جگہ پر بندوقیں تانیں ساکت کھڑے تھے۔ اُن میں صرف منصب دار ہی حرکت کر رہا تھا۔ اُس نے ہماری طرف خاص توجہ نہیں کی۔ البتہ مایا کو دیکھ کے اُس کی آنکھیں چمک گئیں۔ "چھوکری سوہنی ہے۔" اُس نے مایا پر ہاتھ چمکاتے ہوئے کہا۔ مایا بری طرح سہمی ہوئی تھی، اُس کا سینہ دھونکنی کی مانند پھول پچک رہا تھا۔ خوف زدہ ہرنی کی اصطلاح مایا ہی کے لیے ایجاد ہوئی تھی، پسینے سے شرابور، دیدے پھٹے ہوئے۔

"ابھی میری سکل دیکھنے کا نہیں ہے۔ کچے پکائے چار

بلیٹے نجر نہیں آنے کا؟" اُس کے مُنہ سے فقرہ نکلتے ہی چار آدمی مایا اور پروفیسر تھامپسن پر جھپٹ پڑے۔ سوتی ڈوریاں اُن کے پاس تھیں۔ چند ہی لمحوں میں اُن دونوں کے ساتھ ساتھ برنارڈ اور مارٹی کی بھی مشکیں کس دی گئیں۔ پھر ایک نے مایا کو کاندھے پر ڈالا، اور کمالِ مہارت سے ریلنگ پر چڑھ کر رسّی پر جھولتا ہوا سمندر کی طرف اتر گیا۔ پروفیسر تھامپسن مسلسل خاموش تھے کہ اُن کی تحقیق عملی دُور سے گزر رہی تھی۔ باقی تینوں کو بھی اسی طرح مہارت سے نیچے اتار دیا گیا۔ انھوں نے ہم سے تعلّق محض بندوق تاننے تک محدود رکھا تھا۔ منصب دار چاروں گوروں کو اپنی نگرانی میں نیچے کشتیوں میں اتروانے میں مصروف تھا۔ وہ مسلسل ہدایات دے رہا تھا، اور بل کھاتے ہوئے سانپ کی مانند بار بار پہلو بدل رہا تھا۔ اُن چاروں کو نیچے پہنچانے کے بعد وہ ہماری طرف متوجہ ہوا۔

"انگریج کو لوٹنے کا تھا بھاوا؟... ابھی اِدھر بھاروٹیہ باپو آ گیا ہے۔ تم لوگ کا کام ختم۔ نیچے جا کے سونے کا ہے۔" اُس نے انگلی نچاتے اور جھومتے ہوئے کہا۔ اُس کا جملہ مکمل ہوتے ہی بخشل ایک جھٹکے سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

"چلو رے نیچے! اب اِن کا وقت ہے۔" بخشل لاتعلّقی سے عرشے کی سیڑھی اتر گیا۔ جیسے اُس نے منصب دار کو دیکھا ہی نہ ہو، اُس آواز تک نہ سنی ہو۔ ہم بھی خاموشی سے نیچے اتر آئے۔ ہمارے پیچھے تمام بندوق بردار بھی اتر آئے، اور منصب دار کی ہدایات پر اِدھر اُدھر دوڑنا شروع کر دیا۔ عرشے کا منظر ہی عجیب تھا۔ پورے عرشے پر قطار باندھے ریلنگ کے ساتھ ساتھ سیکڑوں مسلح افراد بندوقیں تانیں کھڑے تھے۔ جن کے پاس بندوقیں نہیں تھیں، اُن کے ہاتھوں میں عریاں، چمکیلی تلواریں تھیں۔ کیبنوں کے اوپر جا بہ جا مسلح افراد تعینات نظر آ رہے تھے۔ یقینی طور پر جہاز پر اُن کا مکمل قبضہ ہو چکا تھا۔ کیبنوں سے منتخب انگریزوں کو نکال نکال کے باہر لایا جا رہا تھا۔ عرشے کے وسط میں بھاری جثّے کا ایک آدمی کرسی پر بیٹھا تھا۔ اُس نے سیاہ رنگ کی باقاعدہ پگڑی باندھ رکھی تھی۔ اُس کے ساتھ ہی جہاز کے انتظامی عملے کی وردی میں ملبوس ایک شخص کھڑا تھا۔ عرشے پر بکھرے ہوئے مسافر سمٹ کے ایک ستون کے پیچھے بیٹھے محوِ تماشا تھے۔ اُن کے چہروں سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ خوف زدہ ہونے کی بجائے حیران ہیں۔ کیبنوں سے نکال لائے جانے والے انگریزوں کو فرداً فرداً کرسی پر فروکش موٹے آدمی کے سامنے لایا جاتا۔ وہ ساتھ کھڑے جہاز کی انتظامیہ کے فرد سے کھسر پھسر کرتا۔ پھر اُس کے اشارے پر انگریز کی مشکیں کس کے جہاز سے نیچے اتار دیا جاتا یا پھر کیبنوں کے ساتھ ہی ایک گوشے میں کھڑا کر دیا جاتا۔ البتہ جوان عورتوں کو بغیر کسی صلاح مشورے کے جہاز سے نیچے پہنچایا جا رہا تھا۔ یہ کارروائی کئی گھنٹے جاری رہی، حتّا کہ سورج اُگ آیا اور اندھیرا چھٹنے لگا۔ انھوں نے عرشے کے دیسی مسافروں سے تعرض نہیں کیا۔ اُن کی زبان، لہجے اور لباس، اُن کا تعلّق کاٹھیاواڑ سے بتا رہے تھے۔ کراچی کے بعد بمبئی تک کاٹھیاواڑ کا ساحل تھا۔ کاٹھیاواڑ میں چھوٹی چھوٹی کئی ہندو مسلم ریاستیں تھیں۔ یہ سرسبز و شاداب علاقہ اپنے جنگلات کی وجہ سے پورے ہندستان میں مشہور تھا۔ دُور دراز کے راجے مہاراجے اور نوابین شکار کی غرض سے عموماً یہیں کا رخ کرتے تھے۔ ہمارے ہم راہ بیٹھے ہوئے ایک کاٹھیاواڑی مسافر نے مسلح افراد کے بارے میں انکشاف کرتے ہوئے بتایا کہ یہ باروٹیہ باپو کے کرانتی کار ہیں۔ باروٹیہ باپو کی ہیبت گجرات سے نکل کے پوری انگریز سرکار میں پھیل چکی ہے۔ مہان دیالو ہیں۔ مہاجن، ساہوکاروں اور بنیوں کو لوٹتے ہیں، اور غنیم غربا میں تقسیم کر دیتے ہیں۔ گجراتی مسافر کرشنا داس پولیس میں نوکر تھا۔ وہ باروٹیہ باپو کا تذکرہ عزّت و احترام سے کر رہا تھا۔ باروٹیہ کے کارندے اپنی کارروائیوں میں مصروف تھے تو وہ گاہے گاہے اپنی معلومات سے اپنے اِردگرد بیٹھوں کو مستفید کر رہا تھا، جن میں ہم بھی شامل تھے۔ اُس کی بتائی ہوئی معلومات کے مطابق گجراتی

میں باپو عزّت و تکریم کی علامت ہے، جب کہ باروٹیہ لٹیرے کو کہتے ہیں۔ باروٹیہ باپو کا مطلب "معزز لٹیرا" ہے۔ باروٹیہ چھلاوا ہے، سیکڑوں کارندوں کے ہم راہ آناً فاناً غائب ہو جاتا ہے، زمین نگل گئی یا آسمان نے اُچک لیا، واردات کے بعد باروٹیہ کا سراغ نہیں ملتا۔ اُس کا عمومی ٹھکانا گرناتھ کا گھنا اور خطرناک جنگل تھا۔ گر کے جنگل میں وہ کہاں روپوش ہوتا، یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ باروٹیہ کے گروہ میں شمولیت کے بعد واپسی نہیں تھی، اور یہ بھی دل چسپ بات تھی کہ آج تک کوئی کارندہ گروہ چھوڑ کے نہیں گیا تھا۔ گرفتار ہونے والوں کو حوالات میں قتل کر دیا جاتا۔ انگریز افسروں اور سپاہیوں کو اغوا کرنے کے حوالے سے باروٹیہ باپو کی شہرت ملکہ برطانیہ تک پہنچی ہوئی تھی۔ مشہور تھا، ملکہ گرفتاری کے بعد باروٹیہ سے ملاقات کا اشتیاق رکھتی ہیں۔ انگریز سرکار نے بیتیری مرتبہ باروٹیہ کے گرد میلوں گھیراؤ کیا، ریاستی ہانکا لگایا، مگر باروٹیہ کا بال بیکا نہ کر سکی۔ اُس کی گرفتاری کے منصوبے ولایت سے بن بن کے آئے، مگر وہ پیش بند بلا کا تھا، حملے سے پہلے ہی حملہ کرنے کی کام یاب حکمت عملی اُس کا وطیرہ تھی۔ آندھی کی مانند تند و تیز شب خون مارتا۔ مہمان خانوں، ڈاک بنگلوں، سرکاری دفتروں سے ملحقہ انگریز آبادیوں پہ کڑے پہرے دھرے رہ جاتے، اُس کے ہاتھ جو انگریز لگتا، اٹھا لے جاتا۔ اُس کی گرفتاری کے لیے اٹھایا جانے والا ہر قدم جب تک واپس نہ لے لیا جاتا، شب خون بڑھتے ہی جاتے۔ سپاہیوں کے کٹے ہوئے سر اور انسانی لوتھڑے چوراہوں پہ پھنکوا دیے جاتے۔ یہاں تک کہ اُسے گرفتار کرنے کا خواہاں نو خیز مہم جو سرد پڑ جاتا، باروٹیہ کی فائل بند کر دی جاتی، لیکن عمل داری کا بھرم رکھنے کے لیے رسمی کارروائیاں جاری رہتیں۔ پھر چھاپے اور تعیناتیاں ہو جاتیں، کوئی سر پھرا گورنر آ جاتا، وہی چکّر دوبارہ چل جاتا، لیکن خوش قدمی نے ہمیشہ باروٹیہ ہی کو چوما۔ وہ انگریز سرکار کے لیے مستقل دردِ سر بنا رہا، اور اُس کی گرفتاری انگریز سورماؤں کے لیے خواب۔ اُس نے 'تیری بندوق، تیری چھاتی' کے مقولے پر خوب عمل کیا تھا۔ عام حالات میں وہ اغوا کنندگاں کے عیوض بھاری اسلحہ حاصل کرتا، اور یہی اسلحہ بارود اُس کی ہیبت بنائے ہوئے تھا۔ ایک لٹیرے کے لیے فوجی پیش قدمی کو ہتک سمجھنے کے باوجود باروٹیہ باپو کی گرفتاری کے لیے خصوصی فوجی کمپنیاں بھی تشکیل دی گئیں، برما کے محاذ سے نامی گرامی افسروں کو بلوایا گیا۔ گرفتاری پر گراں بہا انعام اور اعلا ترین سول و فوجی اعزازات کا اعلان کیا گیا۔ مقامی افراد کو نتیجہ خیز معاونت پر سونگا تو تک تفویض کرنے کا لالچ دیا گیا۔ گجرات بھر میں مخبروں کا جال بچھایا۔ معمولی سی مخبری کو بھی ہنگامی اہمیت دی جاتی، مگر باروٹیہ چھلاوا تھا، کبھی ہاتھ نہ آیا۔ البتہ مخبری کے مضبوط نظام کی وجہ سے باروٹیہ کو مسلسل متحرک رہنا پڑتا، جو اُس کے لیے بہت تکلیف دہ تھا۔ بھاری جثّے کے ساتھ حرکت کرنا اب آسان نہیں رہا تھا۔ مڈبھیڑوں میں اضافہ ہونے لگا۔ ابتدا میں یہ جھڑپیں صرف فرار حاصل کرنے کے لیے کی گئیں، کام یابی نے ایک دن تن کے کھڑا ہونا بھی سکھا دیا۔ گئے برس شب خون مارنے والے باروٹیہ نے دو بدو لڑائی میں ایک کمپنی کے چیتھڑے اڑائے تو کاٹھیاواڑی عش عش کر اٹھے اور باروٹیہ کو کرانتی کار گردانا گیا۔ انگریز سرکار نے جرائم پیشہ افراد کی فہرست سے اُس کا نام خارج کر کے باغیوں میں شمار کر لیا اور یوں باروٹیہ ایک لٹیرے سے کرانتی کار بن گیا۔ جن اشرافیہ سے وہ بھتّے اور تاوان وصولتا تھا وہ اُسے امداد، نذرانے دینے لگے، کاٹھیاواڑ میں اُسے قبولِ عام کی سند مل گئی۔ اُس کے مقابل ریاستی راجوں، مہاراجوں اور نوابین کی عمل داری مفقود ہو کے رہ گئی۔ ریاستی عمّال باروٹیہ کے کارندوں سے باز پرس بھی گناہ سمجھتے۔ ایک مرتبہ راجوں اور نوابین نے مشترکہ وفد دلّی بھیجا۔ جس نے وائسرائے سے ملاقات کی، اور کہا کہ حکومت برطانیہ باروٹیہ سے چھیڑ چھاڑ کر کے اُسے ڈاکو سے کرانتی کار اور مجاہد بنا رہی ہے۔ باروٹیہ کو اُس کے حال پر چھوڑنا ہی مناسب حکمت عملی

ہوگی۔ اُسے کرانتی کار کا رتبہ حادثاتی طور پر ملا ہے، ورنہ حقیقت میں وہ ڈاکو ہی ہے۔ اگر انگریز سرکار اُس کی سرکوبی کے لیے فوج بھیجتی رہی تو عن قریب پورے کاٹھیاواڑ پر باروٹیہ کا راج قائم ہو جائے گا۔ وائسرائے نہ صرف مان گیا، بل کہ باروٹیہ کے خلاف ایک نئی چال چلی، وفد کو ڈاکوؤں کا ایک چھوٹا گروہ تشکیل دینے کی صلاح دی گئی، جس پر ریاستوں نے سہاوے عمل کیا، اور باروٹیہ کی طرز کا ایک جعلی گروہ تشکیل دیا گیا۔ اِس گروہ نے ورمیانے طبقے کے لوگوں سے لوٹ مار شروع کر دی۔ باروٹیہ کے خلاف عوامی جذبات بھڑکانے کے لیے خصوصی طور پر عورتوں کو اٹھا لیا جاتا، گاؤں اور بستیوں کو جلا دیا جاتا۔ باروٹیہ عورتوں کے معاملے میں بدنام تو تھا ہی، چناں چہ انگریز سرکار کا تیر نشانے پر جا لگا۔ باروٹیہ کے بھرم میں گھاٹا پڑنے لگا۔ اُسے باپو کہنے والوں کی زبان لڑکھڑانے لگی۔ باروٹیہ بھی اِس گمبھیرتا میں ٹِک کے نہیں بیٹھا تھا۔ اُس نے اپنے خطرناک چھاپہ مار مجیدے بھائی کو جعلی باروٹیے کا ہر حال میں قلع قمع کرنے کا ہدف دے دیا، اور دوسری طرف خود اُس نے انگریز خواتین کو اٹھانا شروع کر دیا۔ مہینے بھر میں سات انگریز خواتین کی برہنہ لاشیں مانا ودر، باٹوا، جام نگر، کشورم پور، بندو، دھورا جی واساوادر، پراچی، دلوادا کے چوراہوں پر پھنکوا دی گئی تھیں۔ اُن کی موت کی وجہ کثرتِ جماع تھی۔ باروٹیہ نے اِس سے بڑھ کے ایک قدم اور اٹھا لیا۔ اُس نے گر کے جنگل کی سیاحت کو آئی ہوئی برطانوی اشرافیہ کی تین انتہائی معزز خواتین کو اغوا کر لیا۔ گر کا جنگل ببر شیروں سے اَٹا پڑا ہے۔ مشہور ہے کہ افریقا کے بعد گر کا جنگل دنیا کا اکلوتا مقام ہے جہاں ببر شیر پائے جاتے ہیں۔ بمبئی میں مقیم انگریز گاہے گاہے یہاں سیاحت کے لیے آتے تھے۔ اغوا ہونے والی تین معزز برطانوی خواتین میں سے ایک کا تعلق شاہی خاندان سے تھا اور وہ بہت بڑے افسر کی یکتائے حسن و جمال بیوی تھی۔ باروٹیہ کی اِس کارروائی سے پہلو تہی وقتی کے لیے ممکن نہ تھا، لیکن پیش قدمیاں بے سود رہیں۔ چند ماہ بعد خبر مشہور ہوئی شاہی خاندان سے تعلق رکھنے والی معزز خاتون مادام باروٹیہ باپو کے بچے کی ماں بننے والی ہے۔ وہ باپو پر دل و جان سے فریفتہ ہو چکی ہے، باروٹیہ اُسی کے علم ہوش رُبا کا بری طرح گرفتار ہو چکا ہے اور اُسے اپنے ساتھ جوڑ کر بٹھاتا ہے۔ پھر اطلاع آئی کہ اُس نے باروٹیہ کے نہایت خوب صورت بیٹے کو جنم دیا ہے، یہ اطلاع تھی یا جوالا مکھی، دلّی سے لندن تک سب کچھ لرز گیا۔ ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا گیا گر کا جنگل کھنگال ڈالا گیا، لیکن باروٹیہ کا سراغ نہ ملنا تھا اور نہ ملا۔ جاسوس اِتنا جان سکے تھے کہ باروٹیہ نے زیرِ زمین ٹھکانا بنا رکھا ہے۔ اِس وقوعے کے ٹھیک تین ماہ بعد اِس سے بڑی خبر کاٹھیاواڑ کے چوراہوں میں سنسنا گئی، مادام مارتھا باروٹیہ کے اکلوتے فرزند کو لے کر فرار ہو گئی تھی۔ باروٹیہ آگ بگولا ہو گیا تھا۔ وہ اپنے بیٹے کو دل و جان سے چاہتا تھا۔ اُس نے پہرے داری پر معمور دس کارندوں کو شیروں کے آگے ڈال دیا تھا۔ وہ اپنے بیٹے کے فراق میں ماہیِ بے آب کی طرح تڑپ رہا تھا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ دلّی تب گئی اب گئی، باروٹیہ کسی بھی لمحے قہر و غضب بن کے انگریزوں پر ٹوٹ پڑنے والا ہے۔

کاٹھیاواڑی مسافر دفورِ اشتیاق سے باروٹیہ باپو کے متعلق بتا رہا تھا، اُس کی چمکیلی آنکھیں سامعین سے بار بار ستائش طلب کرتی تھیں، جیسے باروٹیہ وہ خود ہی ہو۔ اُس کی مبالغہ آمیز گفتگو سے صرفِ نظر کیا جائے تو بھی اِس دھڑلے سے برطانوی بحری جہاز سے انگریزوں کو اغوا کرنا کسی قزاق کا کام نہ تھا۔

جہاز سے تمام انگریز عورتیں اتار لی گئی تھیں۔ اِس کے علاوہ پچاس کے لگ بھگ دیگر برطانوی باشندوں کو بھی اتارا گیا تھا۔ انھوں نے دیسی مسافروں سے ذرا بھی تعرض نہیں کیا، بل کہ اُن سے کلام بھی شائستگی سے کیا جا رہا تھا۔ انھوں نے عرشے کے کسی مسافر کو نہیں لوٹا تھا، البتہ کیبنوں

سے صندوق بھر بھر کے لے جا رہے تھے۔ دیسی مسافروں سے اُن کی اُنسیت کی اِس سے بڑھ کے مثال اور کیا ہوگی کہ ہمیں دنبالے سے نیچے اتارنے والوں میں سے ایک ہماری طرف سے گزرا تو اُس نے بے پروائی سے چاقو ہماری طرف اچھال دیے تھے، البتہ طمنچے کی ملکیت اُس نے اپنا ہی حق جانا۔ بجھل بڑے سکون سے بیٹھا بیڑی پر بیڑی سلگائے جا رہا تھا۔ وہ پھسلتی ہوئی ایک آدھ نظر جہاز پر دوڑتے پھرتے باروتیہ کے کارندوں پر ڈال لیتا، اور پھر بیڑی کا لمبا کش کھینچ کے مرغولے چھوڑنے میں مگن ہو جاتا۔ عرشے کے بہت سے مسافر بھی کاندھوں پر بندوقیں لٹکائے اِدھر اُدھر لپک رہے تھے۔ یقیناً جہاز پر کمال منصوبے سے قابو پا لیا گیا تھا۔ جہاز کے عملے میں باروتیہ آدمی شامل تھے۔ کراچی سے سوار ہونے والوں میں بھی بیش تر باروتیہ کے آدمی تھے۔ جو اپنے ساتھ اسلحہ بھی جہاز پر چڑھانے میں کام یاب ہو گئے تھے۔ جہاز پر عدم مزاحمت باروتیہ کارندوں کی مشاقی کی گواہ تھی۔ ایسے منظم گروہ کی تشکیل کرنے والا کوئی معمولی انسان نہیں ہو سکتا تھا۔ بجھل کے وجود سے چھلکتی آزاد منشی واقعی بے فکری تھی یا وہ ایسا ظاہر کر رہا تھا۔ معاً ایک خیال کوندے کی طرح لپکا، پھریری سی وجود میں دوڑ گئی۔ بمبئی کی بندرگاہ پر حالات ہمارے لیے سنگین ہو سکتے تھے۔ بجھل بمبئی کی سوچ رہا تھا۔ یہ معمولی واقعہ نہ تھا۔ وہاں ذرّے کی بھی کھال اتاری جاتی۔ پھر یہ کس طرح ممکن تھا کہ ہم سے تعرض نہ کیا جاتا۔ دنبالے پر میجر برنارڈ اور ہماری جھڑپ کا پورا عرشہ چشم دید گواہ تھا۔ نہ جانے وہ اِس واقعے کو کس تناظر میں لیتے، لیکن یہ بات مترشح تھی کہ بمبئی میں جہاز سے اترتے ہی ہماری گرفتاری یقینی تھی۔ کسے خبر کہ باروتیہ سے ہی ہمارا تعلق جوڑ دیا جاتا۔ حالات بہرصورت ہمارے خلاف تھے۔

اجالا سمندر پر اتر آیا تھا۔ باروتیہ کے کارندوں نے جہاز خالی کرنا شروع کر دیا تھا۔ حیرت انگیز طور پر وہ خون خرابے کے بغیر اتنی بڑی کارروائی کر کے جا رہے تھے۔ بچے کھچے انگریز مسافروں کو اُنھوں نے کیبنوں میں دھکیل کے تالا بند کر دیا تھا۔ بقیہ کو وہ کشتیوں میں لاد کر نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہو گئے تھے۔ اِس کے باوجود اب بھی مکھیوں کے جھنڈ کی طرح کشتیاں جہاز سے چمٹی کھڑی تھیں، دھیرے دھیرے آگے پیچھے ہوتی ہوئیں۔ جہاز کے لنگر نہیں گرائے گئے تھے۔ دفعتاً کسی نے سور پھونک دیا، سوتے پھوٹ پڑے، جہاز پر قابض مسلح افراد ''جے ہند'' کے نعرے لگاتے ہوئے مچلنے تڑپنے لگے۔ سمندر کی کھلی فضا میں بھی کان پھاڑ شور بلند ہو رہا تھا۔ وسط میں کرسی کے ہتے پر سے بیٹھا ہوا موٹا بھی جھٹکے سے مؤدب کھڑا ہو گیا۔ دفعتاً عرشے پر ایک قد آور شخص نمودار ہوا، اُسے دیکھتے ہی یوں لگا جیسے جہاز کے در و دیوار رقص اور وجد میں آ گئے ہوں۔ سلامی کو بیک وقت سیکڑوں بندوقیں گرجیں۔ کئی نے گریبان چاک کر لیے۔ وہ دیوانوں اور جنونیوں کی طرح ''جے ہند، جے ہند'' چیختے اور چلّاتے جا رہے تھے۔ نو وارد سے پیوست ہونے کے لیے اُن کی بوٹی بوٹی پھڑک رہی تھی، مگر کوئی اپنی جگہ سے ہلا نہیں۔ وہ شخص کچھ دیر کھڑا اُن سب کو دیکھا کیا۔ اُس نے سفید کرتا پاجامہ اور گلے میں سرخ اونی مفلر لپیٹ رکھا تھا۔ ہاتھوں میں موٹی موٹی جڑاؤ انگوٹھیاں، پانو میں سلیم شاہی کھسے، تیل میں چپڑے کاندھوں تک آتے سپاٹ کالے بال، دائیں کان میں چاندی کا پتلا کڑا، جھلسی ہوئی سانولی رنگت، چہرے کے تیکھے اور جاذب نقوش، بھاری مگر چست ورزشی جسم کا مالک وہ شخص یقینی طور پر ''باروتیہ باپو'' ہی تھا۔ حلیے بشرے سے وہ ڈاکو دکھائی نہیں پڑتا تھا۔ بلاشبہ وہ ایک طلسمی شخصیت کا مالک تھا وہ کچھ دیر سنجیدگی سے چاروں اور تڑپتے، پھدکتے اور مچلتے ہوئے اپنے کارندوں کو دیکھتا رہا۔ یکا یک اُس نے قطعی انداز میں اپنا ہاتھ بلند کیا، گویا جسموں سے سانس کھینچ لی ہو، یک دم ایسا ہول ناک سناٹا چھا گیا، جیسے جہاز پر کوئی ذی روح موجود ہی نہ ہو۔ وہ ہاتھ گرا کے کرسی کی جانب بڑھ گیا، اور لوگوں کی بھن بھن پھر شروع ہو گئی۔ اُس کے

دائیں بائیں اور عقب میں دس سے زائد افراد کا جتھا تھا۔ وہ سب کے سب چھٹے ہوئے چنیدہ لوگ نظر آتے تھے۔ اُن کے ہاتھوں میں بندوقوں کی بجائے برہنہ اور چمچماتی دو دھاری تلواریں تھیں، اور چہروں پر زخموں کے مخصوص نشان۔ وہ کرسی پر جا بیٹھا۔ عرشے کے سمٹے اور سہمے مسافر پہلے بھی ہونٹ سیے ہوئے تھے اور اب بھی مہر بہ لب تھے۔ موٹا اُس کے سامنے دست بستہ کھڑا ہو گیا اور اُسے کارگزاری سے آگاہ کرنے لگا، جواب میں وہ صرف گردن ہلاتا رہا۔ پھر اُس نے موٹے سے کچھ کہا، موٹا یک دم پھڑک کے سیدھا ہوا اور دھاڑا، ''مجید بے بھائی، راموپٹیل، گیگا، کالو نتھا!''

اُس کی آواز گونجتے ہی جہاز کے طرفین میں دوڑ مچ گئی، صرف چند لمحوں میں وہ چاروں باروتیہ کے سامنے آ موجود ہوئے۔ اُن کی صورتیں شناسا محسوس ہوئیں۔ مجھے گمان گزرا کہ وہ جہاز کے مسافروں میں شامل تھے، اور چلتے پھرتے میری نظروں میں آئے تھے۔ باروتیہ اُن سے تیز تیز سوال کیے جاتا، اور وہ سر جھکائے جلدی جلدی جواب دیے جاتے، وہ اُسے تفصیل سے آگاہ کر رہے تھے۔ ہم تک اُن کی آوازیں سرگوشیوں کی مانند آ رہی تھیں۔ جن سے کچھ اخذ کرنا ممکن نہیں تھا۔ تاہم وہ یقینی طور پر اپنی کارگزاری سے آگاہ کر رہے تھے کہ کس طرح یہ فتنہ ساماں جہاز قابو کیا۔ دفعتاً اُن میں سے ایک نے بات کرتے کرتے ہماری طرف اشارہ کیا تو پورا جہاز ہمیں دیکھنے لگا۔ میں سمجھ گیا تھا۔ اُنھوں نے دنبالے پر میجر برنارڈ سے ہماری جھڑپ کے بارے میں بتایا ہوگا۔ باروتیہ نے نظر گھما کے سیدھا میری جانب دیکھا۔ میں اُسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ نظریں چار ہونے سے قبل ہی میں نے زاویہ نگاہ تبدیل کر لیا۔ بجھل ایک ٹک باروتیہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اُس کی کنپٹیاں پھڑکتی ہوئی صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ ہمارے نزدیک کھڑے افراد نے اچانک جھپٹا مارا اور مجھے کھینچ لیا۔

''اے تیرے کو دیکھنے کا نئیں ہے، باپو بلانے کا ہے؟''

اُن میں سے ایک نے میرے پہلو میں زوردار لات رسید کرتے ہوئے کہا۔ میں کسی مزاحمت کے بغیر اُٹھ کھڑا ہوا۔ پھر بھی اُنھوں نے پشت پر دو ہتڑ مار کے مجھے دھکیلا۔

''نواب صاحب، اِدھر چلیں گا تیرا باپ۔''

''دھیان سے رے! بھیجا ٹھنڈا رکھ۔'' بجھل نے سرگوشی کی۔ اُس کی آنکھیں جل کے انگارہ ہو رہی تھیں۔ جمرو اور زورا کے چہرے پھٹ پڑنے کو تھے۔ بجھل کا ہاتھ جمرو کے پہلو پر مضبوطی سے جم گیا۔ مجھے دھکیلتے ہوئے باروتیہ کے سامنے کھڑا کر دیا گیا۔ اُس نے چمکتی آنکھوں سے میرا اوپر سے نیچے تک جائزہ لیا۔ میرا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ آنے والے لمحے کا کچھ پتا نہیں تھا۔ کسے خبر کہ وہ میرے متعلق کیا سوچ رہا ہے۔

''نام بول!'' باروتیہ مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ اُس کی آواز کاٹ دار اور تیشہ صفت تھی۔

میں نے ایک لمحے کو توقف کیا کہ گدی پر کسی نے ہاتھ چھوڑ دیا۔ ''اسکول کا ماسٹر نام پوچھنے کا نئیں اے۔ باپو ہے باپو۔''

''بابر زماں!'' میں نے سر کو جھٹکتے ہوئے کہا۔ ظالم نے بجلی کا ہاتھ مارا تھا۔

”گوری چھلیا سے تیرا کیا ناتا تھا؟“ بارو ٹیہ غرّایا۔

”کچھ نہیں! وہ اپنے شوہر کے ساتھ سفر کر رہی تھی۔“ میں نے بغیر کسی توقف کے اُسے جواب دیا۔ سوال سے اندازہ ہو چلا تھا کہ اُسے کسی طرح کی آگاہی دی گئی ہے۔ کاٹھیا واڑی مسافر ہمیں بتا چکا تھا کہ بارو ٹیہ باپو انگریز عورتوں کا رسیا ہے۔

”اپنا ناتا بول! تیرا ناتا کیا ہے؟“ بارو ٹیہ نے میری پشت پر کسی کو اشارہ کیا۔ معاً میری ریڑھ کی ہڈی پر کسی نے کہنی ماری۔ پھر فوراً ہی دونوں پہلوؤں پر گھٹنوں کی زوردار ضرب پڑی۔ بیک وقت پڑنے والی دو متوازی ضربوں نے میرے پیٹ کو جیسے چکّی کے پاٹوں میں پیس دیا۔ میرے مُنہ سے پانی نکل آیا۔ دَم سینے میں گھٹتا محسوس ہوا۔ میں نے خود کو گرنے سے بچایا۔

”جہاز ہی میں ملاقات ہوئی تھی۔“

”انگریجی بھی جہاج میں سیکھی تھی؟...“ بارو ٹیہ نے زہرخند لہجے میں کہا۔ ”کیا سمبندھ ہے تیرا انگریجوں سے؟“

”انگریزوں اور انگریز خاتون سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے! تمھیں بتانے والوں کو یقیناً غلط فہمی ہوئی ہے۔ ہم بمبئی اپنے گھر جا رہے ہیں۔ مسز برنارڈ سے میری جان کاری چند گھنٹوں سے زیادہ نہیں ہے۔“

”بڈّھے انگریج سے بھی جہاج میں ہی جان پہچان ہوئی ہوگی؟“ بارو ٹیہ نے تمسخرانہ انداز میں سوال کیا۔

”وہ پروفیسر تھامپسن ہیں۔ میری اُن سے جہاز کے ریستوراں میں ملاقات ہوئی اور اُنھوں نے ہی مجھے مسز برنارڈ سے ملوایا تھا۔“ میں نے جلدی جلدی اُسے جواب دیا۔ میں نے کوشش کر کے اپنا لہجہ فدویانہ ہی رکھا تھا، لیکن صاف محسوس ہو رہا تھا کہ گرہ مضبوط پڑ چکی ہے۔ وہ مجھے انگریزوں کا گماشتہ ہی سمجھ رہا تھا۔

”گھنٹوں کی جان پہچان! گوری شوہر سے بھڑ گئی۔ چاقو پستول!“ بارو ٹیہ نے دیدے گھماتے ہوئے کہا۔

”اے باپو! لے چل اِسے... اے انگریج کا... لگنے کا ہے۔“ ساتھ کھڑے موٹے نے اُسے مشورہ دیا۔ میرے جسم میں چیونٹیاں رینگ گئیں۔ اگر یہ مجھے لے جاتے تو بجھل جیسے جی مجھے جہاز سے نیچے نہ اترنے دیتا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اُس کے بعد میرا نام ونشاں بھی نہیں رہے گا۔ میرا ہاتھ جیب پر جم گیا جس میں خنجر موجود تھا۔ میں بارو ٹیہ سے قریباً ڈیڑھ گز کی دوری پر کھڑا تھا۔ اُس کے دائیں بائیں چار افراد اور چار ہی لمبی اور چمک دار تلواریں اُس کی پشت پر سونتے مستعد کھڑے تھے۔ اگر میں جست لگا کے بارو ٹیہ کے سر پر پہنچتا تو اگلے ہی لمحے میرا سر عرشے پر پھڑک رہا ہوتا۔ اُس کے بعد بجھل، زورا، جمرو... مجھے چند لمحوں میں کچھ کرنا تھا، مگر کیا! سیکڑوں بندوق برداروں کے نرغے میں اور وہ بھی بیچ سمندر کے، کوئی بھلا کیا کر سکتا تھا۔

”اور کتنے بھاڑو تیرے ساتھ ہیں؟“ بارو ٹیہ نے گرجتے ہوئے کہا۔

”جہاز پر اور ہندُستانیوں کی طرح ہم چار دوست بھی سفر کر رہے ہیں۔“

”مجیدے بھائی!“ بارو ٹیہ نے غالباً اُسے پکارا، جس نے میرے بارے میں جان کاری دی۔

”چار ہی ہیں باپو! یہ اُن کے میل کا نہیں دکھائی پڑتا۔“ مجیدا کھنکھیایا۔ بارو ٹیہ کرسی سے اچھلا۔ جیسے کوندا لپکا ہو۔ چٹاخ پٹاخ کی آوازیں گونجنے لگیں۔ ”آپ ہی پھیسلے کر رہا ہے۔ میں پھالتو ہے کیا؟ جیادا وقت ہے؟“ مجیدے ساکت اور خاموش کھڑا رہا۔ بارو ٹیہ کے طمانچوں سے اُس کا دایاں گال پھٹ گیا تھا۔

”بھڑوو! میری سکل ہی دیکھو گے! جہاج پر ہی ٹھکانا بنالوں... ڈھول پیٹوں۔“ بارو ٹیہ چنگھاڑتا ہوا موٹے کی طرف پلٹا۔ وہ مجھ سے صرف ایک ہاتھ کی دوری پر رہ گیا تھا۔ میں اُسے چاقو کی زد پر رکھ لیتا، مگر اُس کے بعد کیا ہوتا؟ اُس کے بعد بھی خلاصی ناممکن تھی، صورتِ حال مکمل طور پر ہمارے خلاف تھی، تاہم میرا ہاتھ جیب میں رینگ گیا، اور چاقو پر مضبوطی سے جم گیا۔ مجیدے پھدک کے بجھل کی نشست کی طرف دوڑا چلا گیا۔ اُس کے ساتھ کئی بندوق بردار بھی حرکت میں آ گئے۔ چند لمحوں بعد بجھل، زورا اور جمرو بھی میرے برابر کھڑے تھے۔ بارو ٹیہ کچھ دیر ہمیں گھورا کیا۔ وہ واپس کرسی پر براجمان ہو چکا تھا۔ اُس کی نظریں ہم چاروں کا طواف کرتے کرتے یک دم بجھل پر ٹھہر گئیں۔

”پلا پلایا سانڈ ہے سالا! تُو بول... انگریج کدھر لے جانے کا ہے؟“

”انگریزوں سے اپنا ناتا رشتہ نہیں ہے! ابھی تیرا وقت ہے، جو مرضی بول۔“ بجھل نے تن کے جواب دیا، اُس کے جبڑے سختی سے بھنچے ہوئے تھے۔

”رِستے داری! اللہ دے رستے داری تو ہے... کیا لگنے کا ہے۔“ بارو ٹیہ نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”پوچھو کیا نہیں لگتا۔“

”ماں کا یار بھی ہے کیا؟“

”ابھی تیرا وقت ہے! سنبھال کے رکھ۔“

”بڑا جور ہے سیاں!“ خلافِ توقع بارو ٹیہ کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

”جور کانٹے پہ بولتا ہے، تم زبان سے بولے ہو!“ بجھل کا لہجہ آگ بھڑکانے والا تھا۔

وہ کچھ دیر پھر بجھل کو گھورا کیا۔ وہ نظریں تھیں یا پیمانہ، مگر اُس نے کچھ تول لیا تھا۔ پھر وہ زہرخند لہجے میں بولا، ”ٹھکانے پر ہی جور داروں کا جور دیکھنے کا ہے۔“

بجھل کا تیر خطا نہیں ہوا تھا۔ بارو ٹیہ اڈّے پاڑے کا استاد نہیں تھا، لیکن کس بل تو ضرور مشترک تھا، بل کہ بارو ٹیہ کو امتیاز حاصل تھا کہ اُس نے کس بل سے چوکی نہیں چھینی تھی، بل کہ بنائی تھی۔ بارو ٹیہ حکم دے کے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُس کے مُنہ سے جملہ نکلتے ہی ہمارے اطراف میں کھڑے سورما ہم پر جھپٹ پڑے۔ ہم چاروں کو رسّیوں سے بری طرح جکڑ دیا گیا۔ بارو ٹیہ جا چکا تھا۔ جہاز سے کرانتی کاروں کی واپسی شروع ہو گئی تھی۔ ہمیں گٹھے کی شکل میں جدا جدا باندھا گیا تھا۔ سب سے پہلے مجھے گھسیٹ کے ریلنگ تک لے جایا گیا۔ اُس کے بعد ناف کے پاس لپٹے ہوئی رسّی میں ایک کنڈا پھنسا کے مجھے جہاز سے نیچے لٹکا دیا گیا۔ اچانک جیسے رسّی کو چھوڑ دیا گیا ہو۔ میں جہاز کی بیرونی دیوار سے رگڑتا ہوا تیزی سے نیچے گرا، مگر کسی نے فوراً ہی رسّی کو تھام لیا۔ شدید جھٹکے سے کمر کی ہڈی جاتی محسوس ہوئی۔ مُنہ سے پانی نکل آیا۔ ہاتھوں میں تھام کے کنڈا نکالا گیا اور مجھے کشتی میں ایک طرف اچھال دیا گیا۔ میرا سر تختے پر دھڑام سے لگا۔ ”دوسرا پھینک؟“ کسی نے چیخ کے کہا۔ اُس کے ساتھ ہی میرے ذہن پر تاریکی چھا گئی۔

نمکین کرکراہٹ سے مُنہ بھرا محسوس ہوا۔ چہرہ سلگتے ہوئے کوئلوں پر رکھا محسوس ہوا۔ میں نے ایک جھٹکے سے اُٹھنا چاہا، مگر کراہ کے رہ گیا۔ جسم میں پھوڑے پھوٹ رہے تھے۔

”پوری کھینچ!“

”جلدی کرنے کا۔“

”بدھیا ہے کیا چھلکا... سالا سب خود ہی کھانے کا ہے۔“

”دھندا نہیں سرکار۔“

”اچھا! اچھا... ابھی نکل۔“

”اے گیگا... ادھر دوڑ۔“

”سیدھا چلنے کا بھاوا۔“

”آجو باجو چوکس ہے، پھر تہیں کرنے کا۔“

”تلاؤ پر روک ہے۔“

”ابھی یہ تیرا کام نہیں ہے چل نکل!“

”لے رکھ لے۔“

”نہ باپو، بہت ہے۔“

”باپو کی اچھا ہے۔ رکھ لے... یہ بھی لے... جموں کا ٹھرا ہے...“

”جی جی... سرکار کی جے۔“

”اے پللو! جلدی ابھی تیری باری آنے کا ہے۔“

اِس طرح کی مختلف آوازیں کان میں چھید کر رہی تھیں۔ میں نے بمشکل زور لگا کے خود کو سیدھا کیا۔ میں کسی تپتی ہوئی ریت پر اوندھا پڑا ہوا تھا۔ میرے ہاتھ پشت پر سختی سے بندھے ہوئے تھے، باقی جسم آزاد تھا۔ ریت مُنہ میں بھر گئی تھی۔ دانت کرکر چرچر کر رہے تھے۔ شانوں سے رگڑ رگڑ کے مُنہ صاف کیا۔ آنکھوں میں مرچیں ناچ رہی تھیں، اور حلق میں کڑوے کانٹے اُگے جا رہے تھے۔ یہ کیسی اُفتاد تھی۔ اب کوئی ستم تھا جو روا نہ کیا جاتا۔ نہ جانے بخُھل، زورا اور جمرو کس حال میں ہوں گے۔ اُن کے ساتھ کیا بیتی ہوگی!

دھیرے دھیرے میری آنکھیں کھل گئیں: دن چڑھ آیا تھا، سورج زمین کی طرف لپک رہا تھا۔ ہم ایک ویران ساحل پر غلّے کے ڈھیر کی طرح پڑے تھے۔ کنارے پر دُور تک چھوٹی چھوٹی کشتیاں نظر آ رہی تھیں۔ جن کی تنی ہوئی رسیاں پانی میں گم تھیں۔ میرے دائیں بائیں جہاز سے اتارے گئے انگریز مسافر آڑھے ٹیڑھے پڑے تھے۔ اُن میں سے بیش تر بے ہوش تھے، جب کہ بعض ویران اور متحیر نگاہوں سے ساحل پر دوڑتے بھاگتے مسلح افراد کو دیکھ رہے تھے۔

میں نے دانت بھینچ کے کہنی کے بل خود کو سمیٹا اور اُٹھ بیٹھا۔ بے اختیار میری نظریں چاروں طرف گھوم گئیں۔ اُن میں سے وہاں کوئی نہیں تھا۔ میرے دل کو کسی نے سینے سے نوچا اور حلق میں رکھ دیا۔ تشنج کی سی کیفیت سے میں لرزنے لگا۔ اُن تینوں کو یہیں کہیں موجود ہونا تھا۔ میں ساحل کے رُخ بیٹھا تھا۔ پیچھے مُڑ کے دیکھا تو ذرا اونچائی پر دُور تک چھکڑوں کی قطار کھڑی تھی۔ ہر چھکڑے میں دو بیل جتے تھے: کالے، سفید، چتکبرے اور گول سینگوں والے، گاڑیوں پر کھلتے رنگوں کی جھولیں پڑی ہوئی۔ گاڑی بان باگیں تھامے ہوئے تھے۔ قطار سے جدا ایک چھکڑا ہمارے بالکل ساتھ چوبی رخ پر کھڑا تھا۔ چھکڑے میں بوریاں لادی جا رہی تھیں۔ کچھ افراد اغوا زدگان کو بوریوں میں ڈال کر اُس کا مُنہ سُتلی سے سینے میں مصروف تھے۔ بوری بند کرنے کے بعد اُس کے اوپری حصے سے ایک ٹکڑا کاٹ دیا جاتا۔ یہ سانسوں کی آمدورفت کا سامان تھا۔ یہ منظر دیکھ کے گونا گوں اطمینان محسوس ہوا۔ بخُھل جمرو اور زورا کو مجھ سے پہلے بیل گاڑیوں میں روانہ کر دیا ہوگا۔ یکا یک ایک خیال آنے پر میں نے پھر چاروں طرف نظریں گھمائیں۔ مایا، پروفیسر تھامپسن، میجر البرٹ برنارڈ اور ٹونی میں سے بھی یہاں کوئی موجود نہ تھا۔ انھیں بھی کسی محفوظ ٹھکانے کی طرف بھیج دیا گیا تھا۔ ایک بیل گاڑی میں تین بوریاں لادی جا رہی تھیں۔ اس کے بعد پچھلے حصے سے کھلی ہوئی کپڑے کی جھول کو مکمل بند کر دیا جاتا۔ پھر چرخ چوں کی آواز سے چھکڑے کے چوبی پہیے حرکت میں آ جاتے۔ اُس کی جگہ دوسری بیل گاڑیاں آ لگتیں۔ لوگوں کو بوریوں میں بھرنا، بوریاں چھکڑوں میں لادنا، ایک چھکڑے کی جگہ دوسرے چھکڑے کا لگنا اور ہدایات جاری کرنے والے موٹے کی زبان ہنگامی حالت میں متحرک تھے۔ کچھ ہی دیر میں میری باری آ گئی۔ ایک نے گُدی سے پکڑا اور دوسرے نے شانے سے گھسیٹا اور بوری والے کے پاس پہنچا دیا۔

”رستے میں خاموش رہنے کا ہے۔“ بوری والے نے میرے پیروں پر بوری چڑھاتے ہوئے کہا۔ بوری عام ناپ سے بڑی دکھائی دیتی تھی۔ ”پانی، دارو، کھانا سب ملنے کا ہے۔ بس خاموش رہنے کا ہے...“ بوری پہلوؤں تک چڑھ گئی تو بولا، ”میرا باپ اندر جانے کا ہے... چترائی نہیں کرنا۔ رندھاوا قسائی ہے سالا۔ جان جانے کا ہے بھاوا۔“

بوری میں اترنے کے بعد ہی معلوم پڑ سکتا ہے کہ بوری بند ہونا کیسا لگتا ہے۔ گھٹنے اور کہنیاں ساتھ مل گئی تھیں۔ نہ جانے مجھ سے قبل اُس بوری میں کیا بھرا گیا تھا۔ سڑی ہوئی سبزی کی بساند دماغ پھاڑ رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد چہرے کے عین سامنے ٹکڑا کاٹ کے بوری میں سوراخ کر دیا گیا۔ اب باہر سے سانس لیا جا سکتا تھا۔ پھر بوری کو اٹھا کے چھکڑے میں پٹخ

دیا گیا۔ پشت کی طرف سے مسلسل بندھے رہنے سے کاندھوں کے جوڑ بری طرح دکھ رہے تھے۔ پہنچوں اور ہتھیلیوں کو مہارت سے جکڑا گیا تھا۔ رسّیوں سے ہاتھ آزاد کرنا ناممکن تھا۔ میں خاصی تگ و دو کر چکا تھا۔ بیلوں کے سانسوں کی تیز آواز کے ساتھ گاڑی کے غیر ہم وار پہیّے حرکت میں آئے تو احساس ہوا کہ یہ سفر کتنا ہول ناک اور تکلیف دہ ہوگا۔

”ٹن، ٹن، ٹن۔“ بیلوں کے گھنٹے بجنے لگے۔

”چیخ... چیخ... کک، کک، کک... آ آ میرے شیر ببر۔“ گاڑی بان ہشکارے دینے لگا۔ ہمارے نیچے پختہ سڑک نہیں، مسلسل آ رہا رہے پگ ڈنڈی ابھر آئی تھی۔ ”چرخ چوں“ کے شور کے ساتھ پہیّوں اور پگ ڈنڈی کی ذرہ بھر ناہم واری بھی ہتھوڑے برسا رہی تھی۔

”وحشی سُورا! اِس سے بہتر ہے ہمیں جان سے مار دو!“ میرے برابر والی بوری سے کوئی انگریزی میں چیخا۔ اُس کے ساتھ ”ٹھک“ کر کے دھمک پیدا ہوئی۔ ”جندگی پیاری ہے تو بولنے کی نہیں ہے بھاوا۔“ تو ربان کی آواز آئی، غالباً اُس نے مڑ کے چیخنے والے انگریز کو سوٹا مارا تھا۔ میں گاڑی کے دائیں گوشے میں پڑا تھا۔ میرے بائیں طرف بالترتیب دو بوریاں اور پڑی تھیں۔ چھکڑے نامعلوم منزل کی جانب رواں دواں ہو چکے تھے۔ کسے خبر تھی کہ جاں کنی کا یہ سفر کتنا باقی تھا، چند گھنٹے، پورا دن یا پھر کئی دن۔ تکلیف کا بھی عجیب عاشقانہ مزاج ہے، اِسے جتنا سہا جائے اِتنی پُرلطف اور جاں گیر ہو جاتی ہے۔ عدم سے وجود میں آتی ہے اور پھر معدوم بھی ہو جاتی ہے۔ بوری کے حبس میں جکڑا ہوا لاچار جسم، ٹھک چیخ، چوں چوں کرتا گاڑی کی چولوں کا شور، گڑھوں کی ضربیں اور مسلسل زبان چلاتے والے توربان کا شور مل جل کے تکلیف پر حاوی آ گئے۔ کوئی کب تک پڑا رہے۔ میرے ساتھ والا انگریز سسکیوں سے رو رہا تھا۔ میں نے بہ مشکل کروٹ لی، گاڑی کے دائیں تختے سے جا لگا۔ ہوا کے لیے بوری میں بنایا گیا روزن میری گردن پر تھا۔ اگر یہ تھوڑا اوپر ہو جائے کم از کم نظروں کا ساتھ تو ہو جائے۔ پیروں اور دانتوں کی مدد سے ایسا کیا جا سکتا تھا۔ میں نے پانو کی انگلیوں میں بوری کا سوت پکڑنے کی کوشش کی، مگر بوری کی سلوٹ پنجوں کی پکڑ سے موٹی تھی۔ میں نے اپنی کوشش جاری رکھی۔ آخر کچھ دیر کی مشق کارگر ثابت ہوئی، بوری پنجوں کی گرفت میں آ گئی۔ میں نے کئی بار یہ عمل دہرا کے مشق پختہ کی۔ پانووں کی نسبت بوری کا مُنہ سے پکڑنا آسان رہا۔ متواتر کوششوں سے بالآخر میں بوری کا روزن اپنے چہرے پر لے آنے میں کام یاب ہو گیا۔ میرے عین سامنے تختے میں اچھی خاصی درز تھی، باہر کا منظر صاف نظر آنے لگا۔ سائے ڈھل رہے تھے۔ دُور تک سبزہ اور گھنا جنگل تھا۔ پگ ڈنڈی کے ساتھ ساتھ درختوں کی قطار تھی، جن میں صرف تنے ہی مجھے نظر آ رہے تھے۔ شیشم، جامن اور کہیں کہیں کیکر کے درخت تھے۔ باہر کا منظر نظر آنے سے وقت کچھ سہل ہو گیا تھا۔ میں آنے والے وقت کے بارے میں سوچنے لگا۔ اگر میں کسی طرح اپنے ہاتھ آزاد کر لیتا تو یہاں سے بچ نکلنا کچھ مشکل نہیں تھا، لیکن اِس طرح میں بخُھل، جمرو اور زورا کا نشان گم کر سکتا تھا۔ خاموشی سے پڑے رہنا ہی درست معلوم ہوا۔ میرے ہم سفر انگریزوں نے آپس میں گفتگو شروع کر دی تھی، وہ دونوں

فوجی تھے اور چھٹیاں گزار کے واپس ہندُستان آ رہے تھے، وہ ملکہ برطانیہ کو مغلظات سے نواز رہے تھے۔ انھیں فوج میں جبری بھرتی کیا گیا تھا۔ ایک نے حالیہ چھٹیوں میں نئی محبوبہ بنائی تھی اور دوسرا اپنی بیوی سے چھٹکارا حاصل کر کے آ رہا تھا۔ اُس کا ارادہ اب ہندُستان کے نمکین حسن سے خوشہ چینی کا تھا۔ اُس کا دل اپنے گھریلو خدمت گزار کی بیٹی کستوری پر آ گیا تھا۔ کستوری نے شادی کے بغیر ہاتھ رکھوانے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ کستوری کا باپ بھی حکومتِ برطانیہ کا ملازم تھا، اِس لیے اُس نے بھی ہاتھ رکھنے سے گریز ہی کیا۔ اُس کا ارادہ تھا کہ جب تک ہندُستان میں نوکری ہے تب تک کستوری سے شادی کر لینے میں کیا حرج ہے۔ کستوری کا ذکر کرتے کرتے اُس نے باروثیہ باپو کو بے دریغ گالیاں بکنا شروع کر دیں۔ میں خاموشی سے بس سنا کیا۔ اُنھوں نے دو ایک مرتبہ مجھے پکارا تھا، جواب نہ پا کے انگریزی سے نابلد سمجھ لیا تھا، اور ایک دوسرے سے بات کر کے اذیت جھیلنے کی کوششیں کرنے لگے تھے۔ باروثیہ نے اُن کی پکی پکائی کھیر کی کھڑونچی الٹ دی تھی۔ محاورے ایجاد کرنے والے بھی خوب تجربہ کار ہوتے ہیں، اُن کی باتیں سنتے اور درخت گنتے گنتے مجھے بھی گویا سولی پر نیند آ گئی۔

دھکّے کی زوردار ضرب سے ہوش آیا۔ اُس درد کی کوئی تعریف ہو تو یہاں کی جائے، معاملہ درد سے کہیں آگے جا چکا تھا۔ جڑے جڑے جسم پتھرا گیا تھا۔ بوری کی قید سے جان نہیں چھوٹی تھی۔ چھکڑے پر سے بوری گھسیٹ کے زمین پر چھوڑی گئی تھی۔ عجلت کار نے دوسری بوری بھی کھینچ کے میرے اوپر ہی پٹخی تھی۔ کسی نے ٹھٹھا مار کے بوری میرے اوپر سے گرائی۔ بوری میں سے دل دوز چیخ ابھری، ”تیری ماں کا... سالے بندر کے تخم چپ! لاڈ ساب... ہونہہ۔“ کسی نے غراتے ہوئے پے در پے کئی لاتیں اُسے رسید کیں۔ اِس مرتبہ کوئی چیخ بلند نہ ہوئی۔ کھردری زمین پر بوری گھسیٹی جانے لگی۔ میں باہر کا منظر دیکھنے سے قاصر تھا۔ بوری کا روزن پیچھے کو کھسک چکا تھا۔ چند گز گھسیٹ کے بوری کا منہ کھول دیا گیا۔ پھر تو جیسے ٹھنڈی اور آزاد ہوا والہانہ پن سے سینے میں گھستی چلی گئی۔ بوری کی بساند ناقابلِ برداشت تھی۔ نہ جانے کون سا پہر تھا۔ آسمان پر چاند کے بنا ہی ستارے جھلملا رہے تھے۔ جہاز سے اغوا کیے گئے تمام افراد وہیں آڑے ترچھے ایک دوسرے پر لدے پڑے تھے۔

یہ گھنے درختوں کے جھنڈ میں ایک چھوٹا سا میدان تھا۔ درمیان میں الاؤ روشن تھا۔ جلے ہوئے زیتون کی مہک چاروں طرف رچی ہوئی تھی، الاؤ کے قریب ہی کچھ ہرن پڑے تھے۔ کچھ افراد عرق ریزی سے اُن کی کھال اتارنے کا کام کر رہے تھے۔ چند لمحوں تک میں سمجھ نہیں سکا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ میں یہاں کیوں پڑا ہوں۔ معاً ایک گھٹا گھٹا سا ابال سینے میں اٹھا۔ ایک خیال کے جھماکے نے بدن میں بجلی گرما دی۔ میں نے تڑپ کے نظریں گھمائیں۔ چند گز کے فاصلے پر میجر برنارڈ نظر آیا۔ وہ میری ہی طرف دیکھ رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں سے مسکینی برس رہی تھی۔ کچھ اور آگے پروفیسر تھامپسن بھی نظر آ گئے۔ اُن کی حالت زار دیکھ کر ترس آتا تھا۔ ہندُستان اُن پر تحقیق آزما تھا۔ پھر جٹھل پر نظر پڑتے ہی میری اٹکی ہوئی سانس چل پڑی۔ اُس کی آنکھیں مجھے دیکھ کے چمک رہی تھیں۔ زورا اور جمرو بھی وہیں قریب ہی بیٹھے تھے۔ جہاز سے اغوا کی گئی خواتین میں سے یہاں کوئی نہیں تھی۔ لگ بھگ ستر کے قریب انگریز ایک قطار میں پڑے تھے جن میں سکت تھی، دم خم تھا وہ بیٹھے تھے۔ باقی بے حس و حرکت پڑے تھے۔ سبھی کے ہاتھ پشت سے بندھے تھے۔ جامن، سپیدے، گوندنی اور شیشم کے تناور درخت تیز ہوا میں مستا رہے تھے۔ درختوں کے گھیرے کے ساتھ ساتھ مسلح افراد بھی چوکس کھڑے تھے۔ جٹھل بڑے سکون سے جما بیٹھا تھا۔ جیسے چوکی پر بیٹھا ہو۔ کبھی کبھی ارد گرد سے کوئی کراہ اُٹھتا، یا گاہے گاہے سیال رو پڑتے، ورنہ سناٹا ہی سناٹا تھا۔ باروثیہ کے کارندے بالکل خاموشی سے کھڑے تھے۔ ہمیں بھی خاموش رہنے کی تنبیہ کی گئی تھی۔ بندوبست سے یہ عارضی پڑاؤ محسوس ہو رہا تھا۔ لگتا تھا کہ ذرا دم لینے اور شکم پری کے لیے ٹھیرا گیا ہے۔ اُن کی منزل ابھی دُور ہے۔ ایک مرتبہ پھر بیل گاڑی کے اذیّت ناک سفر کے تصور سے دماغ جھنجھنا اُٹھا۔ یوں ہی پڑے پڑے کئی ساعتیں گزر گئیں۔ جنگل کے خطرناک اور موٹے موٹے مچھر بڑی شان سے ہماری ضیافت اُڑا رہے تھے۔ ہرنوں کو بڑے بڑے پارچوں میں تقسیم کر لیا گیا تھا۔ انھیں بھوننے کا انتظام کیا جا رہا تھا۔ ہمارے پیٹ میں خوراک نام کی کوئی چیز گئے ہوئے چوبیس گھنٹوں کے مساوی وقت تو گزر ہی گیا تھا۔ نقاہت فطری امر تھا۔

”پانی پلا دو! خدا کے لیے پانی پلا دو!...“ ٹونی سسکتے ہوئے چیخا۔ ”ایک گھونٹ دے دو، میں مر رہا ہوں۔“

اُس کے قریب ہی کھڑا سیاہ فام بندوق بردار دوڑتا ہوا آیا اور بندوق کا بٹ ٹونی کے پہلو میں دے مارا۔ ”کب میں باٹر، کب میں باٹر... باٹر پلانے کا ہے... چل تیری ماں کا... سالا۔“

ٹونی کی چیخ پر اُس نے ایک مرتبہ پھر بٹ کی ضرب لگائی۔

”مار دو مجھے... میں تمھاری منت کرتا ہوں۔ صرف ایک گولی میرے سر میں اُتار دو!“ ٹونی بری طرح سے تڑپتے ہوئے چیخنے لگا۔ اُسے ضرب لگانے والا سیاہ فام انگریزی کی شد بد رکھتا تھا۔ اُس نے ایک جھٹکے سے بندوق سیدھی کی اور کھٹکے سے گولی چڑھالی۔ ٹونی سمیت چاروں طرف سانپ سونگھ گیا۔ کوئی لمحہ تھا کہ لبلبہ دبتا۔ سیاہ فام کچھ دیر ٹونی کو گھورا کیا۔ معاً اُس نے مُنھ بھر کے ٹونی پہ تھوک دیا۔ ”اور نال اوپر اٹھا دی۔ ”پھکر نہ کر... وکھت آنے پر گولی بھی ملے گی۔“

اچانک درختوں کے درمیان سے وہی موٹا برآمد ہوا جو جہاز پر کرسی جمائے بیٹھا تھا۔ وہ شاید باروثیہ کا نائب تھا۔ ”او کلسا! کون سور مچا رہا ہے؟“ اُس نے سیاہ فام کے قریب پہنچ کے اُس سے استفسار کیا۔

”پانی مانگ رہے ہیں بھاوا۔“ سیاہ فام کلسا کی آواز میں نرمی سمٹ آئی تھی، شاید سفارش بھی کہ پانی پلا دیا جائے۔

”پانی سے کون منع کیا۔ پلاؤ پانی۔ روٹی کھلاؤ... ابھی جندہ رکھنے کا ہے... سور بالکل نہیں۔“ موٹے نے بہ عجلت ہدایات دیں۔ اُس کا گریبان کھلا تھا۔ کرتے کی شکنوں اور بے ترتیبی سے لگتا تھا کہ بدحواسی میں جسم پر چڑھا کے آیا ہے۔ اُس کے لٹکے ہوئے گلے سرخ ہو رہے تھے۔ جیسے کسی نے نوچا کھسوٹا ہو، تھپڑایا ہوا، وہ جتنی تیزی سے آیا تھا اُتنی ہی تیزی سے پھدکتا ہوا چلا گیا۔ کلسا الاؤ کے قریب بیٹھے ہوئے لوگوں کے پاس چلا گیا۔ نہ جانے وہ وہاں کیا باتیں کرتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد اُس کے ساتھ دو افراد اور چلے آئے۔ اُن میں سے ایک رتبے میں برتر لگتا تھا۔ چہرے کی روشنائی بتا رہی تھی کہ خوب نشیب و فراز سے گزر چکا ہے۔ وہ میرے قریب ہی آ کے کھڑا ہوا، اور بولا، ”ہم آپ سب کی مشکیں کھول رہے ہیں، پانی بھی دیا جائے گا اور کھانا بھی ملے گا۔ جنگل کے چپّے چپّے پر ہمارے آدمی پھیلے ہوئے ہیں۔ اگر کسی نے ہوش یاری دکھائی وہ خود تو مارا جائے گا ہی، لیکن عتاب کا شکار سب ہوں گے۔ کوئی اپنی جگہ سے نہیں ہلے گا۔ بصورتِ دیگر زبان سے نہیں گولی سے بات کی جائے گی۔“ اُس شخص نے نہایت شستگی اور روانی سے انگریزی میں کہا۔ پھر اُس نے وہی ہدایات ہمارے لیے بھی ترجمہ کر دیں۔ اپنی بات مکمل کر کے وہ واپس الاؤ کی جانب چلا گیا۔

”دھِکسی آ جا دکرنے کا ہے۔“ کلسا نے ہماری پشت پر کھڑے کسی شخص کو مخاطب کیا۔

مگا ہمارے عقب کے درختوں سے کئی افراد نکل آئے۔ اُنھوں نے بندوقیں درختوں کے ساتھ ہی چھوڑ دی تھیں۔ کچھ ہی دیر میں ہمارے ہاتھ کھول دیے گئے۔ ہاتھ آگے کی طرف لاتے ہوئے میں نے محسوس کیا جیسے کچھ غلط کر رہا ہوں، اُن کی اصل جگہ تو پشت ہی پر ہے۔ کہنیوں سے شانوں تک ہاتھ بالکل اکڑ گئے تھے۔ زورا اور جمرو بھل کے قریب ہی بیٹھے تھے۔ میں بھل سے پچیس سے تیس گز کی دُوری پر تھا۔ میں نے سوچا کہ کلسا سے کہوں وہ مجھے میرے ساتھی کے قریب بیٹھنے کی اجازت دے۔ کلسا میرے قریب سے گزرا بھی، لیکن میں اُس سے کچھ نہ کہہ سکا۔ تھوڑی دیر بعد ایک ننگ دھڑنگ شخص کمر سے مشک لپیٹے آن وارد ہوا۔ اُس نے لنگی نام کے چیتھڑے سے سر ڈھانپا ہوا تھا۔ پانی دیکھ کے بے حس و حرکت پڑی ہوئی قطار میں پھریری دوڑ گئی۔ گویا زندگی نے مسکرا کے انگڑائی بھری ہو۔

"چلو چلو پلا دے سب کو" کلسا نے مشک بردار سے کہا۔ اُس نے مشک رچاؤ سے اُٹھا رکھی تھی کہ وہ کہنہ مشق سقہ ہی تھا۔ "پہلے اُس کیکر میں ٹپکا ہے۔" اُسی نے ٹولی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اُس کی آواز میں اطمینان بھری چاشنی کا رچاؤ تھا۔

"ٹھیرو... ٹھیرو... اے بھاوا جرا روکنے کا ہے۔" الاؤ کی طرف سے ایک پستہ قد اچھلتا کودتا ہوا آیا۔ اُس کی آواز سن کے ٹولی کی طرف بڑھتا ہوا اپن بارا رک گیا۔

کلسا نے اُسے دیکھ کر منہ چڑھایا "او گانجھے! تیرے کو کیا مستی چڑھی ہے؟"

"اِتنا بڑے بڑے لوگ میجر، کرنل، کمشنر، کلکٹر، چلو میں پانی پئیں گے کیا؟"

پستہ قد، جسے کلسا نے گانجھے کے نام سے پکارا تھا نے کولھے مٹکاتے ہوئے کہا۔ گانجھے کا قد بمشکل 4 فٹ ہوگا۔ اُس کا سر جسے کی نسبت دگنا بڑا تھا۔ پکوڑا سی ناک کے نیچے دو دھاری تلوار مونچھیں، اُس پر خوب اُس کی چچکیلی آواز!

"نوٹنکی لگانے کا نہیں مٹکو! سور نہیں کرنا!" کلسا نے گانجھے کو ہنستے ہوئے تنبیہ کی، گویا کہہ دیا کہ لگاؤ تماشا!

"روکنے کا نہیں کلسا، اپنا گانجھا سیکسپیئر ہے سالا!" ایک دوسرے نے آواز لگائی۔

"گھونٹا تو بھرنے دو، مر رہے ہیں سور۔" ایک تیسرے نے گرہ لگائی۔

"پانی تو سیوجی کا ہے... جو رام رام کرے، اُسے پلاؤ!"

"ہر آنے والا آواز کستا ہوا آ رہا۔ ادھر ادھر سے کھسکتے ہوئے چار چھ وہاں جمع ہو گئے تھے۔ گانجھا پن ہارے سے چمٹا کھڑا تھا۔ "میں اپنی مرجی سے پانی پلانے کا ہے۔" "اے کلسا! بولے نا اس کو!"

"پانی تو حجرت حسین کی نیاج ہے۔ کربلا والوں کا نجرانہ ہے۔ پانی پلانا کرانتی ہے باپو!" ایک باریش جوان نے اچکتے ہوئے کہا۔ وہ الاؤ سے اُٹھ کے چلا آیا تھا۔

"اے گھپار! ہم سمجھا ہوں کرانتی، سمجھانے کا نہیں ہے۔" رام رام کی صلاح دینے والے نے باریش جوان کی طرف انگلی تانتے ہوئے کہا، وہ ایک دم ہتھے سے اکھڑ رہا تھا۔

"ہمارا دھرم سب کی ایکت کرنا سمجھاتا ہے باپو!" باریش جوان نے بھی تنک کے جواب دیا۔

"او گھپارے۔ او میندو! اِتنے مندر مسجد نکیں ہے۔ کرانتی ہے کرانتی! کاٹھیاواڑ کی کرانتی۔" کلسے نے فوراً بیچ میں پڑ کے دونوں کو جھڑک دیا۔

"تجھے جو کرنا ہے کر پھر ادھر سے کھسک۔ موج میلہ ٹھکانے پر لچھا لگنے کا ہے۔" کلسے نے گانجھے کی طرف رخ پھیرتے ہوئے اُسے بھی جھڑکا۔ قیدیوں کی نگہبانی کرنے والوں میں کلسا کی ممتاز حیثیت نظر آئی تھی۔ اُس کی نرم گوئی رعب و دبدبے میں حائل نہ تھی۔

گانجھے کی جسمانی ساخت اور چہرے کے نقوش نوٹنکی کے مسخروں جیسے تھے، یہ معمہ ہی رہا ہے کہ انسانی خدوخال مزاج کے تابع ہوتے ہیں، یا مزاج خدوخال اُستوار کرتا

ہے۔ بہ ہر حال، صورتوں کی آئینہ گری کا اقرار سبھی نے کیا ہے۔ پستہ قد، غیر متناسب بڑا سر، اُبلتی آنکھیں، سیاہ رنگ، بھدے ہونٹ اور لڑھکتی ہوئی چال کے مالک یہ مسخرے سرکسی اور نوٹنکیوں کا جزو لاینفک ہوتے ہیں۔ انھیں ٹھنگو، چھوٹا، بغلی، طفیلیہ، پستہ، ناٹا اور اس طرح کے دیگر ناموں سے پکارا جاتا ہے۔ کہیں سے گزر جائیں تو راہ گیروں کی نظریں لطف کشید کرتی ہیں، دبا دبا استہزا تو کہیں واشگاف ٹھٹھول اِن کے ہم راہ چلتا ہے کہیں بیٹھ جائیں تو تماشا بچ جاتا ہے۔ ان میں اور میر زادیوں میں سر مو ہی فرق ہوتا ہے۔ طوائف کا دھندا بالا خانے میں بیٹھ کے چلتا ہے۔ ہزار حیلوں سے تماش بین سیڑھیاں چڑھتے ہیں، لیکن یہ وہ خوش نصیب ہیں جن کے لیے بستیاں، گانو، شہر، گلی کوچے، دنیا کا چپہ چپہ بالا خانہ ہے۔ سوائے اُس کھولی کے جسے اندر سے بند کر کے یہ خود کنڈی لگالیں۔ ورنہ یہ مانگیں یا نا مانگیں، پائی دو پائی، چونی اٹھنی، حتا کہ رُپیا بھی انھیں دیا جاتا ہے کہ کارِ خیر ہے، گویا خالق نے کوئی غلطی کر دی ہے۔ یہاں بھی کچھ ایسا ہی معاملہ تھا۔ گاتجے کے میدان میں رونما ہوتے ہی دائیں بائیں آگے پیچھے سے پہریدار کشاں کشاں سارس کے گرد کھنچے چلے آئے تھے۔ درختوں کی اوٹ سے بھی نکل نکل کے مسلح افراد آرہے تھے کہ جگھٹے کی کوئی صدا نہیں ہوا کرتی، اس کی پُر کشش آوازیں محسوس کر لی جاتی ہیں۔ بس درو دیوار اس سے مستثنا ہیں، اور غول تو سبھی کے خود رو ہوتے ہیں، کیا انسان تو کیا جان ور!

میں بِجھل کے قریب جا بیٹھنے کی تدبیر سوچ رہا تھا۔ ہم ایک ناگہانی مصیبت میں گرفتار ہو چکے تھے۔ خاکِ داماں جھٹکنے سے مُنھ پر ہی آئی تھی۔ اب تک پیش آنے والے حالات سے یہ واضح تھا کہ باروٹیہ اور اُس کا گروہ کاٹھیاواڑی مسافر کے بیان سے کہیں زیادہ منظم اور سریع الحرکت ہے۔ کاٹھیاواڑ کے ساحل پر برطانوی بحری جہاز کا اغوا ہر اعتبار سے ایک غیر معمولی کام تھا۔ اب تک پورے ہندستان کی مشینری میں کھلبلی مچ گئی ہوگی۔ ایک ایک انگریز کی بازیابی تک وائسرائے کی جان پر بن آئے گی۔ بمبئی میں شکلا بابو کے ہاں اخبارات و رسائل پڑھنے کے مواقع بہم رہتے تھے۔ اُن دنوں میں نے پڑھا تھا کہ ہندستان میں ملازمت کے دوران ہلاک یا لاپتا ہونے والے انگریزوں سے متعلق خبریں شائع کرنے کی برطانیہ میں پابندی تھی۔ اخبار کے مطابق انگلستان میں غیر قوموں پر حکومت کا فلسفہ رد کیا جا رہا تھا۔ وہاں کے دانش ور اور اہلِ سخن ایسی مہم جوئیوں کو بے سود اور وقت کا زیاں قرار دے رہے تھے۔ ایسے حالات میں طبقہ اشرافیہ سے تعلق رکھنے والے کم و بیش سَو افراد کا اغوا قیامت خیز ہی تھا۔ نہ صرف دلّی کی باج گزار کاٹھیاواڑ ریاستیں ان کی بازیابی کے لیے بھرپور وسائل جھونک دیں گی، بل کہ اس کارروائی میں انگریز براہِ راست ملوث ہو سکتے تھے۔ کاٹھیاواڑی مسافر کے مطابق اگر واقعی باروٹیہ اپنے بیٹے کا حصول چاہتا ہے۔ تو صورتِ حال پریشان کُن نہیں تھی۔ ان اغوا زدگان کے تبادلے میں انگریزوں کو باروٹیہ کے سو پوت بھی دینے پڑتے تو وہ بہ رضا و رغبت ایسا کرتے، لیکن اگر معاملہ کچھ اور تھا تو صورتِ حال تشویش ناک تھی۔ کشتیوں کے ایک پورے شہر کے ساتھ جہاز پر دھاوا بولنا اور اِس آسانی سے انگریز افسران کو بوریوں میں بھر کے چھکڑوں پر روانہ کر دینا زور آوری کا بے وقوفانہ گھمنڈ تھا یا پھر باروٹیہ کو ریاست کی پشت پناہی حاصل تھی۔ بوری بند انسانوں سے لدے ہوئے چالیس یا پچاس چھکڑوں کا دھڑ سلے اور بنا روک ٹوک کے دن بھر سفر کرنا ناممکن بات تھی، لیکن ایک بات میں بھول رہا تھا، اِتنا بڑا واقعہ لامحالہ ایک طویل منصوبہ بندی کا متقاضی تھا۔ پہلے جہاز کا عملہ یقیناً اس واقعے میں ملوث تھا۔ جس وقت باروٹیہ کے کرانتی کار جہاز پر چڑھے تھے تب تک شاید جہاز انتظامیہ کے ہاتھوں سے نکل چکا تھا۔ مسلح محافظوں سے نامعلوم اور پُراسرار طریقے سے نمٹا گیا تھا۔ یقیناً باروٹیہ کے

آدمیوں کی بہت بڑی تعداد جہاز میں پہلے ہی سے سوار تھی جن میں بارسوخ افراد بھی شامل تھے۔ جو جہاز کی مکمل جان کاری رکھتے تھے۔ ایسی رسائی راتوں رات کا کھیل تماشا نہیں تھی۔ دو چار روز یا مہینا نہیں، برسوں پہلے قدم اُٹھایا گیا تھا۔ ریاست کی لاعلمی میں کشتیوں کی اتنی بڑی نقل و حرکت ناممکن سی بات تھی۔ ثوربان بھی اپنے لب و لہجے سے گروہ کا حصہ معلوم ہو رہا تھا۔ سامنے کی بات ہے اتنی منظم کامیابی میں اجرتی چھکڑوں کی جگہ موجود نہیں تھی۔ چھکڑے اُن کے اپنے ہی تھے کوئی لٹیرا یا ڈاکو اتنے وسائل مہیا نہیں کر سکتا تھا۔ معاملہ کچھ اور ہی تھا۔ ان کے تیور بتا رہے تھے کہ یہاں قیام عارضی ہے بس کچھ ستا کے چل دیا جائے گا۔ جھنڈ کے دائیں بائیں سے اُن کی آمد و رفت متواتر تھی۔ یہاں صرف مرد قیدی رکھے گئے تھے۔ قافلے کے کرتا دھرتاؤں، انگریز خواتین کا پڑاؤ ساتھ ہی کہیں تھا۔ ہمیں چھکڑے سے اتارے گئے کئی گھنٹے ہو گئے تھے۔ انگریز قیدی خوف سے گھبرائے ہوئے تھے۔ ان میں سے بیش تر پہلی مرتبہ ہندستان جا رہے تھے۔ اپنی راج باٹی میں ایسے سلوک کی توقع اُنھیں بالکل نہیں تھی۔ نفرت سے بھبکتی، سلگتی انگارہ آنکھیں مسلسل اُن کا طواف کر رہی تھیں۔ قریب سے گزرنے والے تھوکنے اور لات مارنے سے نہیں چوکتے تھے۔ اُنھوں نے ہمیں توجہ کے قابل نہیں سمجھا تھا۔ البتہ ہمیں دیکھتے ہوئے اُن کی آنکھوں میں الجھن اور ٹیڑھ پیدا ہو جاتی اور زاویہ نگاہ تیزی سے تبدیل کر لیا جاتا جیسے دیکھ کر چوری کر لی ہو۔ صاف لگتا اُن کے لیے انگریز قیدیوں کے درمیان ہماری موجودگی اچنبھا تھی۔ ہم اِس منظر نامے میں موزوں نہیں تھے۔ اہم نہیں تھے، اور قاعدہ ہے کہ اہمیت ہی آپ کو زندہ رکھے ہوئے ہے اور زندہ رکھتی ہے، باروٹیہ نے ہمیں انگریزوں کا کوئی اہم آلہ کار یا گماشتہ سمجھ کے جہاز سے اُٹھوا لیا تھا، لیکن جب اُس پر اپنی غلطی کا حال کھلتا، جو کہ جلد یا بہ دیر کھلنا ہی تھا۔ تو کیا ہمیں عزت و احترام سے رخصت کر دیتا؟ انگریز کے گماشتہ ہونے کی چھاپ ہی ہماری اہمیت تھی۔ ہماری حیثیت پر شک و شبہ جہاز پر ہی ہمیں فائدہ پہنچا سکتا تھا۔ اب ہمیں چھوڑے جانے کا خطرہ مول نہیں لیا جا سکتا تھا۔ تاوقتیکہ انگریزوں کا کوئی فیصلہ نہ ہو جائے، جو گروہ اپنے گرفتار ہونے والے ساتھیوں کو قتل کرنے کی شہرت رکھتا ہو اُس کی طرف سے قیدیوں کو رہا کرنے کی روایت یقیناً نہیں ہوگی۔ ہر چند باروٹیہ کے آدمی جہاز پر ہندستانی مسافروں سے خوش روی سے پیش آئے تھے۔ ہمیں ہمارے چاقو تک لوٹا دیے گئے تھے لیکن یہ بھی تو حقیقت ہے کہ ہمیں رسیوں سے جکڑ کے اور بوریوں میں ٹھونس کے یہاں تک لایا گیا تھا۔ ظاہر ہے آنے والا وقت ہمارے لیے کسی طور پر اچھا نہیں تھا۔ بِجھل اس خوش گمانی میں بیٹھا تھا کہ وہ پُرسکون نظر آرہا ہے۔ مجھ سے نظریں چار ہوتے ہی وہ بے فکری سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگتا تھا۔ یا زورا اور جمرو کی طرف کوئی فقرہ اچھال دیتا، لیکن آنکھوں کی سوزش کو کوئی کیا کہے، جو دل کی سوختگی کی آئینہ دار ہوتی ہیں۔ اب کے نظریں چار ہوئیں تو بِجھل نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے وہیں تک کے بیٹھے رہنے کا اشارہ کر دیا۔ وہ ہمیشہ سے ایسا ہی کرتا ہے۔ ”اٹینشن! وائسرائے ہند تشریف لائے ہیں!“ گاتجے نے گھن گرج سے لے اُٹھائی تھی۔ اُس کا مختصر سا سینہ مرغے کی طرح باہر نکلا ہوا تھا۔ ایک تازہ ٹہنی بغل میں دبی ہوئی تھی۔ اُس کے خاکی کرتے کا دامن سفید چوڑی دار پاجامے میں روپوش ہو گیا تھا اُس کی توند خاصی مضحکہ خیز تھی، مانو پیٹ کے آگے بڑی گیند چپکا دی ہو۔ وہ وائسرائے ہند بن کے تشریف لا چکا تھا، آنکھیں پیشانی پر تنی ہوئیں، تھوڑی اوپر اُٹھی ہوئی، پن ہارا اُس کے پیچھے مشک کیے کھڑا تھا۔

”وائسرائے کی پتلون میں ناڑا ہے۔“ کسی نے ہانک لگائی۔ سب نے مُنھ پھاڑ کے قہقہہ لگایا۔

”ایک مَسک کا بائسرائے... ہاہاہا۔“ ایک جیسے بالوں

والے نے تان اٹھائی۔ وہ پیٹ پکڑ کے لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔ واقعی اُسے دیکھ کے مسکراہٹ کلبلانے لگی تھی، چہروں پہ معصومیت بھی کوئی چیز ہے۔ گانجھا اِس فقرے بازی سے کچھ اَور تن گیا۔ اُس نے تلے قدم اٹھائے اور پہلے قیدی کے پاس لڑھکتا ہوا پہنچ گیا۔ ین ہارا اُس کے پیچھے پیچھے تھا۔

''تم واٹر مانگتا؟'' اُس نے انگریز کے چہرے پہ ٹھنی ٹکائی اور حیرت انگیز پھرتی سے اچھل کے ہوا میں لَوٹ گیا۔ کمال یہ تھا کہ قلابازی کے دوران ٹھنی انگریز کی تھوڑی پر ہی ٹکی رہی، گویا اُس نے اپنا بازو کاٹ کے وہیں رکھ دیا، اور قلابازی لگا کے پھر بازو سے جڑ گیا ہو۔ انگریز قیدی بھی حیرت سے آنکھیں پٹپٹانے لگا۔ اُدھر تماش بینوں نے سیٹیوں سے آسمان سر پر اٹھالیا۔ اچھل اچھل کے اور چیخ چیخ کے داد وتحسین کے ڈونگرے برسائے جانے لگے۔ سکوت کی ہدایت دینے والا کلسا بھی اُن میں شامل تھا۔ گانجے کی حالت دیدنی تھی وہ فخر ونخوت سے پھٹا جا رہا تھا۔ اُس نے اُسے پانی نہیں پلایا، بل کہ ایک قدم بڑھا کے دوسرے کے پاس پہنچ گیا۔ ''تم شریف آدمی لگتا ہے۔ ہم تم کو پانی جرور پلائے گا۔'' گانجے نے دیدے نچاتے ہوئے کہا۔ اُس کے کولھے غیر محسوس انداز میں مٹک رہے تھے۔ اور لہجے میں اچانک بے پناہ لوچ، بلا کا درد اور مخاطب سے بے پناہ ہم دردی سمٹ آئی تھی۔ پھر اُس نے جھپٹ کے ین ہارے سے مٹی کا کٹورا پکڑا۔ ''اِس میں پانی ڈالو ظالم لوگ! تم لوگ کو سرم نہیں آئی، اتنا پیارے لوگاں کو پانی نہیں پلاتا۔''

ین ہارے نے مسکراتے ہوئے مشک کی ڈوری ذرا ڈھیلی کر کے ڈھوبرے میں پانی بھر دیا۔ بہت دور سے پانی کی مترنم چھن چھناہٹ میرے کانوں کو بھی بھلی لگی۔ انگریز کی آنکھوں میں پانی بھر آیا وہ کپکپاتے لرزتے ہونٹوں سے کٹورے کو تک رہا تھا۔ ''تم اچھا دِکھتا ہے، مُنہ کھولو ہم خود تم کو پانی پلائے گا۔'' گانجے نے کٹورا اُس کے مُنہ کے قریب لے جاتے ہوئے کہا۔ کٹورا قریب آ کے دیکھ کے اُس نے جھٹ مُنہ کھولا۔ گانجھا اچانک دھڑام سے زمین پر گرا اور لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ وہ مچھلی کی طرح تڑپ رہا تھا، مگر کٹورا اُس کے دائیں ہاتھ کی انگلی پر ساکت وقائم تھا، جس سے پانی کا قطرہ بھی نہ چھلکا تھا۔ انگلی کی نوک پر کٹورا تھامے رکھنا کوئی کمال نہ تھا، لیکن اِس طرح تڑپتے ہوئے پیالے کو استقرار بخشنا واقعی کمال تھا۔ اِس مرتبہ سیٹیوں کے شور میں پورا جنگل شریک ہو گیا تھا۔ وہ اچھل اچھل کے چیخ رہے تھے۔ بعض ایک ہاتھ کولھے پر اور ایک گردن پر جمائے ٹھمکے لگا رہے تھے۔ وہ اچھل اچھل کے انگریزوں کو چڑا رہے تھے جو اُنھیں سکتے کے عالم میں ہونقوں کی طرح تک رہے تھے۔ بعض کے چہرے آنسوؤں سے تر تھے۔ گانجے کے زمین سے اُٹھتے ہی ماحول ٹھنڈا پڑ گیا۔ گانجھا تیسرے کی جانب بڑھ گیا۔ پھر وہ اِس طرح مختلف کرتب دکھاتا ہوا چوتھے، پانچویں سے آگے کی طرف بڑھتا گیا، لیکن اُس نے کسی کے حلق میں ایک قطرہ بھی نہ ٹپکایا تھا۔ پیاس کے ماروں نے اُس کی طرف امید بھری نظروں سے تکنا چھوڑ دیا تھا، لیکن وہ مستی اور جنون میں اچھلتا کودتا بڑھتا چلا آ رہا تھا کہ بنھل تک پہنچ گیا۔ میرے جسم پر باریک باریک چیونٹیاں سنسنانے لگیں، زورا اور جمرو کے نتھنے پھڑکتے دکھائی دے رہے تھے۔ بنھل ویسے ہی بیٹھا تھا۔ وہی خالی اور لاتعلق چہرہ، کسے خبر تھی کہ وہ کیا سوچ رہا ہے۔

''اے دیس والا بابو ہے نا! ابھی تیرے کو پانی کیا سربت پلانے کا ہے۔'' اُس نے کٹورا گھماتے ہوئے ہوا میں اچھالا اور واپس تھام لیا۔ اُس کے ہاتھوں سے برسوں کی ریاضت جھلکتی تھی۔

''اِدھری پیاس نہیں ہے رہے... آگے جا۔'' بنھل کے لب ہلے اور میرا سانس بند ہونے لگا۔

''نہ رے نہ بھگوان! ابھی باپو کو گنگا جل پلانے کا ہے۔'' اُس نے پیالہ بنھل کے مُنہ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ بنھل کے ہونٹ سختی سے بھنچے ہوئے تھے۔ میرا دل بے طرح

سے ڈولنے لگا تھا۔ یہاں معمولی سی بھی گڑ بڑ موت کا سیدھا پیغام بن سکتی تھی، لیکن میں اپنی آنکھوں کے سامنے سب کچھ ہوتا نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میرے ہاتھ چاقو پر جم گئے۔

''دیس والے ناراج ہیں۔'' آخری لفظ ادا کرتے ہوئے اُس کا لوچ دار لہجہ غصّے میں مدغم سا ہوا، ''چل بابو! تو بھی کیا یاد کرنے کا ہے۔ مُنہ کھول ساباس!'' اُس نے پیالہ ہونٹوں کے بالکل قریب کر دیا۔ اُس کے سان وگمان میں بھی نہیں تھا کہ اِس قطار میں کوئی ایسی کج روی کا مظاہرہ بھی کر سکتا ہے، اور کچھ انگریزوں کی گھگھیاہٹ نے اُس کی آتشِ شوق مزید بڑھکا دی تھی۔ وہ ہٹیلا ہو گیا۔ ''ساباس پانی پی۔'' بیٹھے ہوئے بنھل سے اُس کا قد کوئی سوت دو سوت بھر ہی اونچا ہوگا۔ میں دل میں دعا کرنے لگا کہ بنھل مُنہ کھول کے تھوڑی ہتک برداشت کر لے، مگر اُس پستہ قیامت نے لپک کے بنھل کی گدی پر ہاتھ جمایا اور اُس کے بال پکڑ کے پیالے کی اور جھٹکا دیا۔

''تیری ماں کی... سالے... اپن کے استاد پر ہاتھ ڈالتا ہے۔'' زورا شیر کی دھاڑا اور بجلی کی طرح تڑپا تھا۔ اُس نے سینے پر ہاتھ جما کے اُسے پرے دھکیل دیا۔ گانجھا گیند کی طرح گھومتا ہوا کئی فٹ دُور جا گرا تھا۔ اس سے پیش تر بنھل اُس کا ہاتھ پکڑتا زورا چاقو لہراتا، تڑپتا، بل کھاتا کھڑا ہو گیا تھا، ''ابھی اپن کھڑا ہے اِدھر... آؤ سالو... کوئی مائی کا لال ہے تو آوے اِدھر، لگاوے اپن کے استاد کو ہاتھ... اپن کاٹ کے پھینک دوں گا۔ تم سمجھتا کیا ہے حرامی لوگ! اپن اِن سوّروں کی طرح ہے!'' زورا چیخ چنگھاڑ رہا تھا۔ غیظ وغضب سے اُس کا رواں رواں کانپ رہا تھا۔ کلسا پریشان نظروں سے زورا کو دیکھ رہا تھا۔ باقی مجمع کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ وہ سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ یکایک یہ کیا ہو گیا۔ میں نے چاقو جیب سے نکال کے ہاتھ میں دبا لیا تھا، بس کھٹکا دبا کے کھولنے کی دیر تھی۔ مجھے زورا اور جمرو کی طرف سے اِسی بات کا ڈر تھا۔ بنھل کی صورت ویسے ہی تھی، تاثرات سے عاری، مگر آنکھیں اُس کے قابو سے باہر ہو رہی تھیں۔ ہمارے اِرد گرد سیکڑوں کی تعداد میں بندوقیں اور طمنچے موجود تھے۔ یہاں چاقو کا بھلا کیا کام! اِس سے پہلے کہ کہیں سے گولی چلتی یا باروٹیہ کے آدمی کوئی جوابی قدم اُٹھاتے۔ چشم زدن میں بنھل چیتے کی طرح اچھلا اور زورا پر جا پڑا۔

''اِدھر استاد تمھارا بھڑوا بیٹھا ہے۔ اُس کو زنخا سمجھ لیا ہے رے!'' بنھل نے زورا کو لاتوں اور ٹھڈوں پر رکھ لیا، ''صرف چاقو نہیں سکھائے تجھے... چاقو چلانے آ گیا... یہ تیرے باپ ہیں، رشتے دار ہیں۔ حرامی دوسرے بھی مروائے گا۔''

بنھل اُسے بری طرح رگید رہا تھا۔ لاتوں ٹھڈوں اور ہاتھوں سے اُس تھپڑا رہا تھا، اور زورا تو وارفتگی وعقیدت میں بے سدھ ہوا جا رہا تھا، گویا شادیٔ مرگ سے لرز رہا ہو۔ اُس نے چاقو پھینک دیا تھا۔ اُس نے ایک سسکاری نہیں بھری۔ مجمع اُسے بھی تماشا سمجھ کے دیکھ رہا تھا۔ اُنھیں ہماری بے کسی کا اپنے وجود کی طرح ہی یقین تھا اور کچھ بنھل اُسے بے طرح کے جنون سے پیٹ رہا تھا۔ پھر جیسے ہی وہ ہانپتے ہوئے رکا۔ زورا نے تڑپ کے اُس کے پانو پکڑ لیے۔ اور بچوں کی طرح بلک بلک کے رونے لگا۔ ''استاد ابھی رکتا کیوں ہے؟ ماں قسم! اتنا مزا آ رہا تھا، ابھی اپن کی آنکھیں نوچ دے استاد... اپن کا بھیجا پھوڑ دے استاد! یہ سالا تیرے کو ایسے دیکھنا نہیں مانگتا۔'' زورا مچلا جا رہا تھا، اور دیوانوں کی طرح بنھل کے قدموں سے لپٹا اُنھیں چوم رہا تھا۔

بنھل کی صورت پر زردی کھنڈ گئی تھی، کوئی لمحہ تھا جو ایک سایہ اُس کے آر پار ہوا، اور پھر وہی لاتعلقی، وہی بے اعتنائی۔ وہ زور زور سے سانس بھر رہا تھا۔ اُس کے اندر

اب کچھ نہیں تھا، کریدی ہوئی راکھ کا ڈھیر تھا، جس نے انگارے کو نہ جانے کہاں چھپایا تھا۔ عجیب نظروں سے بٹھل نے زورا کو گھورا، اِن میں بہت کچھ تھا بھی اور بالکل خالی بھی تھیں۔ ”زندہ ہیں... مرے نہیں رے!“ اُس نے ایک جھٹکے سے زورا سے بازو چھڑوایا اور اپنی جگہ آ کے بیٹھ گیا۔ مجمع کی حیرانی اور سکوت ہویدا ہو گیا۔ اُن کے چہروں سے خشونت تو گویا نوچ لی گئی تھی۔ وہ سب زورا کو ہمدردی سے دیکھ رہے تھے۔ یہ وہی زورا تھا جو اُنھیں کچھ لمحے قبل خنجر لہرا لہرا کے للکار رہا تھا۔ چند لمحوں پہلے میں نے دو چار کو مار کے مرنے کا یقین کر لیا تھا، لیکن اب اُن کے چہروں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ قہر و غضب ٹل چکا ہے۔ یہ بٹھل ہی کا کرشمہ تھا۔ بقول بٹھل کے دماغ کی سرخی ہاتھ پیروں کی سچائی نگل جاتی ہے۔ مشق اور ورزش جسم کی نہیں، دماغ کی ہوتی ہے۔

وہ آپس میں بھنبھنانے لگے تو کلسا کی آواز آئی،

”اِدھر سے اُٹھنے کا ہے۔ ابھی استاد کی گود میں بیٹھو۔“ وہ زورا سے مخاطب تھا۔ اُس کی آواز میں نرمی اور پچکار تھی۔ پھر سبھی کے دوستانہ قہقہے اُمڈ پڑے۔ اُن میں سے بعض ہنستے ہنستے پیٹ پکڑ کے دوہرے ہو گئے۔ پھر تو جیسے قہقہوں کا مقابلہ شروع ہو گیا۔ وہ بڑھ چڑھ کے زور و شور سے چلّانے لگے۔ کافی دیر یہ ہذیان گوئی جاری رہی۔ انگریز قیدی مسلسل حیرانی سے تک رہے تھے، وہ یہ معاملہ سمجھ نہیں پائے تھے۔ معاً ایک گیند لڑھکتی ہوئی آئی اور زورا سے لپٹ گئی۔ وہ گانجھا تھا، وہ زورا سے لپٹ کے بلکنے لگا۔ ”اے استاد! تم تو ایک دم اصیل گھوڑا لگنے کا ہے۔ سیوو کی سوگندھ! تم چاقو لہرا کے اپنا دل لُوٹ لیا۔ اِدھر جندگی گجرنے کا ہے۔ استاد کی سیوا کا ایسا نجارا اپن نہیں دیکھنے کا ہے۔ ابھی سو گولی چلتا تیرے اوپر۔

”واہ استاد نے کیسا سیر پالا ہے۔“ گانجھے نے زورا کی گردن میں ہاتھ ڈالا اور اُس کی پیشانی چوم لی۔ زورا جو اُسے مسلسل گھور رہا تھا یک دم مسکرا دیا۔ اِس مرتبہ سیٹیوں کی چیخ پکار کا شور درختوں کے پتے پتے سے اُمڈ پڑا تھا۔

”ارے ہجنو! گانجھے نے عاشقی معشوقی سروع کر دی ہے!“ کسی نے راگ چھیڑا اور ٹھمکے لگنے شروع ہو گئے۔ کچھ دیر یہ شور و غل جاری رہا۔ پن بارے نے مشک کا مُنھ کھول دیا۔ اُس نے قیدیوں کو کٹورا بھر بھر کے پانی پلانا شروع کر دیا تھا۔ کئی پہروں کے پیاسے بدحواسی سے پانی پی رہے تھے۔ لرزتے اور پھڑ پھڑاتے ہونٹ آدھا گرا رہے اور آدھا حلق میں انڈیل رہے تھے۔ آخر پروفیسر تھامپسن کو بھی پانی پلا دیا گیا۔ وہ اب تک نڈھال پڑے ہوئے تھے۔ میجر برنارڈ خلا میں تک رہا تھا۔ پانی پی کے ٹونی کے چہرے پر رونق اُمڈ آئی تھی۔ بٹھل کو گانجھے نے اپنے ہاتھوں سے پانی پلایا، اور زورا سے لے کے اُس کا بچا ہُوا پانی خود پیا۔ انگریز قیدیوں کے چہروں پر بھی رونق اُبھرنے لگی تھی۔ الاؤ والوں نے ہرن بھون لیے تھے۔ بھنے ہوئے قتلوں کو مزید ٹکڑے کر کے پہرے داروں میں تقسیم کیے جا رہے تھے۔ اشتہا انگیز خوشبو تیزی سے ہمارے اِرد گرد پھیل رہی تھی پھر کلسا کی ہدایت پر ایک ایک ٹکڑا قیدیوں میں بھی تقسیم کیا جانے لگا۔ بٹھل کو قدرے بڑا اور اچھی طرح سِکا ہُوا ٹکڑا دیا گیا۔ گوشت باقاعدہ مسالا لگا کے بھونا گیا تھا۔ اُدھر کچھ نے سوڈے کی بوتلیں کھول لی تھیں۔ وہ ٹکڑیوں میں بیٹھ کے گوشت چبا رہے تھے، سوڈے کے جھاگ ایک دوسرے پر اُڑا رہے تھے۔ میرے قریب سے کلسا گزرا تو میں نے اُس سے بٹھل کے قریب جا بیٹھنے کی اجازت طلب کی۔ ”ابھی زیادہ مستی سوجھنے کا ہے، اِدھر ہی بیٹھ، چلنے کا ہے!“ اُس نے درشتی سے مجھے جھڑک دیا اور الاؤ کی طرف چلا گیا۔ کافی دیر یوں ہی گزر گئی، معاً باروٹیہ کی نیابت کرنے والا موٹا نمودار ہُوا۔ وہ تازہ دم دکھائی دے رہا تھا اُسے دیکھتے ہی کلسا دوڑتا ہُوا، اُس کے قریب چلا گیا۔ شاید اُس نے کلسا کو کوچ کرنے کی ہدایت دے دی تھیں۔ موٹا جہاں سے آیا تھا وہاں واپس چلا گیا۔ کلسا دیگر آدمیوں کو ہدایت دینے میں مصروف ہو گیا۔ کچھ دیر بعد ہمارے ہاتھ دوبارہ پشت پر باندھ دیے گئے۔

دائیں بائیں مشعل برداروں اور بندوق برداروں کے جلو میں ہمیں جھنڈ سے باہر لے جایا گیا تو اندازہ ہُوا کہ ہم تقریباً پانچ سَو افراد کے نرغے میں گھرے ہوئے تھے۔ جھنڈ میں فرلانگ بھر چلنے کے بعد ایک کھلا میدان آ گیا تھا۔ یہ رات کا غالباً تیسرا پہر تھا۔ ستاروں کی ٹمٹماہٹ میں اردگرد کا منظر دکھائی دے رہا تھا۔ ہمارے وہاں پہنچتے ہی چھکڑوں کی قطار بھی کہیں سے چلی ہوئی وہاں پہنچ رہی تھی۔ یعنی بوریوں میں بند ہونے کا مرحلہ دوبارہ شروع ہونے والا تھا۔ یہ بات واضح ہو گئی تھی کہ وہ انگریزوں کو زندہ ہی رکھنا چاہتے تھے، ورنہ رسیوں باندھ کے بوری میں ٹھونسنا، چھکڑوں میں لادنا، پھر اتارنا، رسیاں کھولنا اور اب دوبارہ باندھنا کار آساں نہیں تھا۔ اِس مرتبہ پیروں کے ساتھ مُنھ پر بھی کپڑا باندھا گیا۔ شاید وہ اب کسی ایسی جگہ سے گزرنے والے تھے جہاں اُن کے لیے خطرہ تھا۔ رسّیاں باندھنے والے کئی کئی مرتبہ تسلّی کر رہے تھے۔ اندھیرے میں کچھ دور مزید ہل جل نظر آ رہی تھی۔ شاید وہاں دوسرے پڑاؤ والے سوار کیے جا رہے تھے۔ تیسرے چھکڑے پر ہی میری باری آ گئی۔ بٹھل، زورا، جمرو اور میں پچھلی طرف تھے۔ جسم کا پھوڑا اب کچھ کم دکھ رہا تھا۔ چند ہی لمحوں بعد میری بوری پھر چھکڑے میں پھینک دی گئی۔ پھر کسی نے اُسے چھکڑے کے بغلی تختے سے جما دیا۔ دو مزید بوریاں ٹھنسے جانے کے بعد چھکڑا چل پڑا۔ اِس چھکڑے کے پہیے ہموار تھے اور چولیں بھی مضبوطی سے ٹھکی ہوئی تھیں۔ اِس میں ”چرخ چوں“ کا شور نہ ہونے کے برابر تھا۔ خوش قسمتی سے بوری کا روزن عین میرے مُنھ پر ہی تھا، ورنہ مُنھ پر کسی پٹّی کی وجہ سے اُسے موزوں کرنا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ بیلوں کے سم تک سانیت اور توازن سے کھر کھری زمین پر پڑ رہے تھے، جس سے مدھر آواز پیدا ہو رہی تھی۔ کسے خبر تھی کہ اب یہ سفر کتنا طویل تھا اور کب تک یونہی چھکڑے کے جھٹکے سہنے تھے۔ میں نے مصمم ارادہ کر لیا تھا۔ قسمت کی یاوری سے ایک مرتبہ ہم ان کے چنگل سے نکل جائیں، میں پھر گھر سے نکلنے کا نہیں تھا۔ کچھ دیر پہلے میں بہت خوف ناک تجربے سے گزرا تھا۔ بٹھل نے ایک داؤ کھیلا تھا جو کارگر ہُوا۔ بہت ممکن تھا کہ بٹھل کو ایسا موقع بھی نہ ملتا، پہلے ہی گولی چل جاتی، یا وہ ٹھٹھول مذاق میں زورا اور بٹھل دونوں ہی کو بھون ڈالتے، لیکن میں بھی تیار تھا۔ کوئی نہ مارتا تو خنجر سے اپنا سینہ خود کھول لیتا۔ اب مزید کوئی نہیں... بٹھل ہی خالی نہیں ہُوا مجھ میں بھی سکت نہیں تھی، میرے سینے میں بھی خلا بھرتا جا رہا تھا۔ بٹھل نہیں مانتا تو مجھے ہی مان جانا چاہیے۔ کورا کا تو صرف میں سودائی تھا، اُس کے لیے فقط میری جان تھی، کوئی اور کیوں سولی چڑھے۔ زریں بھی تو تھی، وہ بھی تو کسی کا انتظار کر رہی ہے۔ بٹھل زریں کی خوشی میں پگھل جائے گا۔ مجھے بٹھل پر طیش آنے لگا۔ باروٹیہ کے چنگل سے نکلنے کی دیر تھی۔ پھر سب صحیح ہو جائے گا۔ اب بہت ہو چکی، مجھی کو کچھ کرنا ہو گا۔

دن چڑھ آیا تھا۔ چھکڑا رات سے مسلسل چل رہا تھا۔ میرے پڑوس کے بوری نشیں چھکڑے کے چلتے ہی خرّاٹے مارنے لگے تھے۔ جن کی خرخراہٹ اب تک جاری تھی۔ میں تختے کی درز سے باہر کا منظر دیکھنے میں مصروف تھا۔ باجرے کی کچی فصلیں دُور تک نظر آ رہی تھیں۔ چھوٹی چھوٹی بستیاں گزرتی جا رہی تھیں۔ حیرت انگیز طور پر چھکڑے بغیر کسی روک ٹوک کے اور اطمینان سے رواں دواں تھے، حالاں کہ اغوا کی اِتنی جارحانہ واردات کے بعد ریاستی پولیس کی جگہ جگہ ناکہ بندی ہونی چاہیے تھی۔ چہ جائیکہ چھکڑوں کی قطاریں گزر جائیں۔ باہر کے منظر میں انسانی چلت پھرت کا اضافہ نظر آنے لگا۔ شاید کوئی بڑا قصبہ یا شہر نزدیک تھا۔ کچھ ہی دیر میں چھکڑے کی رفتار سست ہو گئی، کچے پکے مکانات کا سلسلہ شروع ہُوا۔ صرف اِتنا اندازہ ہو رہا تھا کہ ہم کاٹھیاواڑ میں ہیں کس ریاست کس علاقے، قصبے میں ہیں اِس کا قطعاً اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔ دن چڑھنے کے ساتھ ساتھ گرمی کی

حدّت میں خاصا اضافہ ہو چکا تھا۔ میرا پورا جسم پسینے سے تر بتر تھا۔ چھکڑا لاری اڈّے کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ یہ کچی پکی سڑک اِس قصبے یا شہر میں داخل ہوئے بغیر ہی دائیں جانب مڑ رہی تھی، اڈّے کے اکلوتے سائبان کے نیچے سرخ رنگ کی لاری کھڑی تھی، اور اُس کے اکلوتے دروازے سے لوگ سوار ہو رہے تھے۔ اجلے لباس اور ہنستے مسکراتے چہروں کے ساتھ ایک بڑھیا دروازے پر رک کے کھڑی ہوگئی۔ وہ کچھ پڑھ کے پھونک رہی تھی۔ جھاڑ پھونک کے بعد نہ جانے کہاں سے اُس نے ایک کبوتر نکالا اور فضا میں چھوڑ دیا۔ اور لرزتی ہوئی لاری میں سوار ہوگئی۔ پھر اچانک میری آنکھیں پتھرا گئیں۔ کوندے لپک لپک کے میرے چہرے پر پڑنے لگے۔ شاید مجھے وہم ہوا تھا۔ میں نے جھپٹا کے دیکھا۔ وہ صد فی صد وہی تھے۔ انھیں تو میں کروڑہا کے ہجوم میں شناخت کرسکتا تھا۔ مجھے کوئی دھوکا اور غلط گمانی نہیں ہو سکتی تھی، وہ مولوی صاحب تھے، مولوی محمد شفیق خان! اُن کے ہاتھ میں صندوقچہ تھا۔ اُن کے بالکل ساتھ ایک برقع پوش لرز رہی تھی۔ اُس کے مرمریں ہاتھ میں سرخ رنگ کا مخملیں جزدان تھا۔ وہی تھی وہی تھی، وہی تو تھی، وہی قد و قامت، وہی سراپائے گلِ ناز، وہی خیالِ دل ستاں، وہی اندازِ تجاہاں، یہ خواب نہیں ہے، یہ تو ہو بہو وہی ہے۔ میں تو برقع کے آر پار دیکھ سکتا تھا۔ "کورا! ٹھیرو، رکو میں آ رہا ہوں! میں نے چیخ کے اُسے پکارنا چاہا، معاً مجھے احساس ہوا کہ میرا مُنھ رسیوں سے بری طرح جکڑا ہوا ہے، اور چھکڑا اس منظر کو دھندلانے کے لیے سرپٹ دوڑ رہا ہے۔ میرا سانس رک چکا تھا۔ دل سینہ توڑ کے کہیں باہر دھڑک رہا۔ "مولوی صاحب خدا کے لیے رک جایئے!" میں نے بری طرح تڑپتے ہوئے چیخنا چاہا، مگر سوائے معمولی سی کھرکھراہٹ کے بوری سے باہر کچھ نہ نکلا۔ پھر مولوی صاحب نے اشارے سے اُسے لاری میں چڑھنے کو کہا، اُس نے شہزادیوں کی سی متانت اور وقار سے یاقوتی پانو لاری کے قدمچے پر رکھا۔ میں نے اپنا سر چھکڑے پر پٹخنا شروع کر دیا۔ میں وحشت اور جنون سے فٹ فٹ بھر اچھل رہا تھا۔ "بتھل اب کہاں ہے تُو! میں کورا کو تلاش کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا تھا نا! تُو تو طرّم خاں ہے۔ کلکتے کا نامی گرامی استاد بتھل! کہاں ہے تُو! آ آ بتھل میرے ساتھ خاک نوردی کا حق ادا کر۔ بتھل یہی ہیں مولوی شفیق خان صاحب! اور اُن کے ساتھ... اُن کے ساتھ۔"

میں رو رہا تھا، گھگھیا رہا تھا، بری طرح چیخ رہا تھا، اور پوری قوت سے اپنا سر چھکڑے کے تختے پر پٹخ رہا تھا، لیکن آوازیں بوری ہی میں گھٹ گھٹ کے مر رہی تھیں، "او کوئی تو سنے! وہ میری کورا ہے! مولوی صاحب کے پاس میری امانت ہے! خبردار مولوی شفیق احمد خان خبردار! جو اب تم نے کورا پر ملکیت جتائی... چھکڑے والے میری بات سنو! میرے پاس جواہرات سے بھرے صندوق ہیں... وہ سب تم لے لو... خدا کے لیے تم ہی چھکڑا روک دو۔" لیکن چھکڑا تو جیسے میری فریاد سن کے سرپٹ دوڑنے لگا تھا۔ "کوئی روکے!" میری ہچکیاں بندھ رہی تھیں۔ آخرِ کار مولوی صاحب بھی لاری میں غائب ہوگئے۔ مجھے اپنا کوئی ہوش نہیں تھا۔ اُس کے مرمریں ہاتھ خم دار لانبی انگلیاں، لاری کے قدمچے پر جمی ہوئی دودھیا پنڈلیاں، قد و قامت! وہ اُس متاعِ جاں کے سوا کوئی اور نہ تھی۔

میں ہچکیوں سے رو رہا تھا۔ میری آہ و بکا سے آسمان
جھک پڑتا، یا شاید گردش لیل و نہار تھم جاتی، اگر نہیں رکا تو
سب رنگ

وہ شور بان نہیں رکا۔ چھکڑے کی چوبی تختوں پر میرا وجود
ماہی بے آب، مرغ بسمل کی طرح پھڑک رہا تھا۔ میں بھول

چکا تھا کہ میں کہاں ہوں اور کن حالات میں گرفتار ہوں۔ میرے ذہن میں تو وہ مرمریں ہاتھ رقصاں تھے جو لاری کے دروازے پر نزاکت سے جمے تھے۔ آہ! بدنصیبی بھی کسی دیس کی باسی نہیں ہوتی۔ اِس کی حکومت تو کرۂ ارض سے ماورا ہے، یہاں بھی جلاتی ہے وہاں بھی جلائے گی۔ کوئی بستی، کوئی قریہ، کوئی شہر ایسا نہیں تھا جہاں میں کورا کی تلاش میں نہیں گیا۔ یہ اَور بات ہے کہ یہ بدبختی سائے کی طرح قدم بہ قدم میرے ہم راہ رہی تھی، اور میں کبھی اِسے ٹھوکر نہیں مار سکا تھا، پاپوش بنائے رکھا تھا۔ آج وہی پاپوش مُنہ پر پڑی تھی۔ قدرت نے میرے ساتھ دشمن داری نبھائی تھی اور وہ بھی بے وضع۔ کیا بُرا تھا اگر اُس بوری میں سوراخ نہ ہوتا؟ اور کسی کا کیا بگڑ جاتا جو میں اُس سوراخ سے باہر کا منظر دیکھنے کی استطاعت نہ رکھتا؟ اور اِس میں کیا مضائقہ تھا کہ مولوی صاحب کے لاری میں سوار ہونے اور اس طالع خور چھکڑے کے اڈّے کے سامنے سے گزرنے میں یہ ناقابلِ یقیں وقتی مطابقت نہ ہوتی۔ چھکڑا پانچ یا دس منٹ پہلے گزر جاتا یا مولوی صاحب چھکڑا گزرنے کے صرف ایک منٹ بعد ہی اڈّے پر چلے آتے۔ ستم ظریفی کا استعارہ میرے حال پر تمام تھا۔ چند لمحے قبل ہی میں کورا کی تلاش سے حتمی طور پر دست بردار ہوا تھا اور عین اُس لمحے جب میں جھولیوں میں خوشیاں انڈیلنے کی ٹھان چکا تھا، میرے دل میں کورا کی ازسرِ نو جوت جگادی گئی تھی۔ دفعتاً ایک خیال لپک سا گیا اور اس زاویے سے سوچ کے میں نہالوں نہال ہوگیا۔ میں جسے بدبختی سمجھ رہا تھا، وہ خوش بختی تھی۔ دستِ قدرت میری پشت پر تھا، اور یقیناً میرے ساتھ تھا۔ یہ واقعہ محض اتفاق نہیں ہوسکتا تھا، یقیناً اِس سارے منظر کو کہیں دُور ترتیب دیا گیا تھا۔ کوئی تیسرا بھی ہے جو اِس تماشے سے لطف کشید کر رہا ہے، کٹھ پتلیاں تھرک رہی ہیں اور ڈوریوں کے سِرے پسِ پردہ و نادیدہ ہیں، گویا ابھی صدق کے اَور امتحان مقصود ہیں، سوختگی کے مزید ثبوت درکار ہیں۔ دفعتاً ایک تیسرے زاویے سے خیال آیا تو میری طفل ہچکیاں باقرار ہوئیں۔ میں کورا کی جستجو سے دست برداری کا ارادہ باندھ چکا تھا، اور عین اُس لمحے بے بسی و بے بضاعتی کے عالم میں یوں سرِ راہ نظر آنے کا مطلب یہ بھی ہوسکتا تھا کہ قدرت اُس کی خاطر داری پر کمربستہ ہے۔ یہ اُسی کی مطلب براری کا اہتمام ہے۔ کسے خبر تھی کہ وہ کس تڑپ سے مجھے مانگتی ہوگی۔ کون جانتا ہے اُس کے سینے میں ابلتے آتش فشاں کو۔ کون سُن سکتا ہے اُس کے اُس جاپ کو جو وہ میرے نام پر جپتی ہوگی۔ تیسرے خیال پر میری سوچ جم گئی کہ کورا بھی میری تلاش میں ہے اور اُس کی تلاش میرے جان لیوا انتظار کے پنجرے میں بند ہے اور قدرت بھی اِس کھیل تماشے پر گہری نظر رکھے ہوئے ہے۔ انسان بھی عجیب ہے، بندگلی میں نت نئے دروازے تراشتا ہے۔ سو میں نے بھی تراش لیے تھے۔

چھکڑا اپنی رفتار سے چل رہا تھا اور بلکتے تڑپتے گھنٹوں بیت چکے تھے۔ کورا کا نظر آنے کے بعد دوبارہ گم ہوجانا اتنا بڑا سانحہ تھا کہ غم میری جان لے ہی لیتا، لیکن پھر خیالات و تصورات نے اِتنا مضبوط تانا بانا بُنا کہ وہ ہاتھ بھر کی دُوری پر نظر آئی۔ مجھے جلد از جلد بوری اور اس چھکڑے سے گلوخلاصی کرنی تھی، اگر میں آج یا کل تک اُس اڈّے پر پہنچ پاتا تو قوی امکان تھا کہ کچھ سراغ مل ہی جاتا۔ ظالموں نے مشکیں اِس قدر کس کے اور مشاقی سے باندھی تھیں کہ ہزار جتن کے باوجود میں کلائیوں پر سے اُن کی گرفت ذرا بھی ڈھیلی نہ کر پایا تھا۔ باروٹیہ نے انگریز سرکار کے ساتھ بہت بڑا ہاتھ کیا تھا۔ دلّی میں بہت بڑا بھونچال آ گیا ہوگا۔ اپنے فوجی افسروں کی بازیابی کے لیے انگریز ریاستی عمّال پر اکتفا نہیں کریں گے۔ بہت ممکن تھا کہ وہ ریاست پر فوج کشی بھی کرسکتے تھے۔ باروٹیہ مغویوں کو یقینی طور پر انتہائی خفیہ اور دشوار گزار جگہ پر ہی لے جا کر رکھتا اور یہ چھکڑے انتہائی مستعدی سے بلا کسی روک ٹوک اُس منزل کی جانب گامزن تھے۔ بلاشبہ ہمیں ایسی جگہ لے جایا جا رہا تھا، جس کا

انتخاب انگریزوں کی مدافعت کو مدِ نظر رکھ کے کیا گیا ہوگا۔ باروٹیہ کے ایسے خطرناک ٹھکانے پر پہنچ کے بچ نکلنا کوئی کارِ آساں نہیں تھا۔ مجھے جلد از جلد رہائی کی کوئی تدبیر کرنی تھی، اِس مرتبہ کورا کا سراغ گم ہوجاتا تو دوبارہ کبھی ہاتھ نہ آتا۔ دفعتاً کسی نے مجھے ٹوکا کہ بٹھل، زورا اور جمرو کے بغیر فرار کا سوچنا ہی رذیل کا کام ہے، لیکن میری کلائیاں مخصوص انداز میں مسلسل حرکت کرتی رہیں۔ یہ دل بھی بڑا ہی جواز کار ہے، فوراً ہی ڈھارس بندھائی کہ بٹھل کے لیے میرا آزاد ہونا اس قید سے زیادہ مفید ہے۔ میں اپنے ہم راہیوں کے لیے آزاد ہو کے ہی کچھ کرسکتا ہوں۔ چاقو میری جیب میں موجود تھا، اُسے بس انگلیوں کی لپک کا انتظار تھا۔ میں نے درز سے جھانکا تو باہر شام سیاہ مور کی طرح پَر پھیلا رہی تھی۔ حیرت انگیز طور پر چھکڑوں کے اِس قافلے کو اب تک کسی نے نہیں روکا تھا، جس کے دو ہی مطلب تھے یا تو اطلاع نہیں پہنچی تھی یا پھر ریاست کے والی درپردہ باروٹیہ کی پشت پر تھے۔ باروٹیہ، ریاست یا اغوا شدگان سے میری دل چسپی مفقود ہوچکی تھی۔ مجھے ہر حال میں یہاں سے فرار ہونا تھا۔ ثوربان بہت ڈھیٹ واقع ہوا تھا۔ میں نے گھنٹوں اٹھا پٹخ کی تھی، خوب واویلا مچایا تھا، جس کا اُس نے رتّی بھر اثر نہیں لیا تھا۔ مجال ہے جو اُس نے مڑ کے بھی جھول میں جھانکا ہو۔ میرے برابر میں پڑی ہوئی دونوں بوریوں سے آنے والی کراہیں اور انگریزی کھسر پھسر اب بند ہوگئی تھی۔ شاید وہ تکلیفوں اور جھٹکوں کو اوڑھ کے سوچکے تھے یا نڈھال بے سدھ پڑے تھے۔ میں نے کچھ سوچ کے برابر والے بوری نشین کو ہلایا اور انگریزی میں کہا، ”میری بات سنو! تم جاگ رہے ہو؟“ میں نے دھیمے لہجے میں کہا تھا، ہرچند کہ مجھے صد فی صد یقین تھا کہ ثوربان کو انگریزی کی اتنی ہی شُدھ بُدھ ہوگی جتنی بٹھل کو تھی، لیکن پھر بھی احتیاط کا تقاضا تھا کہ سرگوشی ہی کی جائے۔ جواب میں میرا پڑوسی کراہ کے معمولی سا کسمسایا تھا۔ غالباً وہ بے ہوش تھا۔ میں نے اس مرتبہ کافی قوت سے گھٹنا مارا اور کہا، ”محترم دوست! میری بات سنو!...“ وہ پہلے کی نسبت زیادہ آواز سے کراہیا اور کسمسایا، لیکن جواب ندارد تھا۔ ”محترم ساتھی! اگر آپ میرے ساتھ پر آمادہ ہوجائیں تو ہم یہاں سے نکل سکتے ہیں۔“ میں نے گھٹنے کی شدید ضرب سے اُسے تیسری مرتبہ ہلاتے ہوئے کہا۔

”وہ ہوش میں نہیں ہے...“ تیسری بوری سے لڑکھڑاتی ہوئی آواز آئی۔ آواز جوان تھی، لیکن وہ میری مدد نہیں کرسکتا تھا۔ ”تمھارے پاس کون سا طریقہ ہے۔ مجھے نکلنا ہے، میں تمھاری ہر ممکن مدد کرسکتا ہوں۔“ اُس نے میرا جواب نہ پا کر دبی دبی، لیکن پُرجوش سرگوشی کی۔ یہاں بھی بدقسمتی آڑے آ رہی تھی، اگر میرے برابر والا اِسی طرح باہوش اور پُرجوش ہوتا تو مجھے یقین تھا کہ اِس قید سے فرار ممکن ہے۔

”میرا نام لیونارڈ ہے۔ میں فوج میں تازہ بھرتی ہوا ہوں۔ میں اب تک کسی لڑکی کو اپنا دوست بنانے میں کام یاب نہیں ہوسکا۔ آغازِ سفر میں گم راہ نہیں ہونا چاہتا۔ مجھے ابھی بہت جینا ہے۔“ وہ دل گیر ہو کے بولا۔

”دوست! تم میری معاونت کی اہلیت نہیں رکھتے۔ تم میرے برابر میں نہیں ہو۔“ میں اُس کے ساتھ باتوں میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ گزرنے والا ایک ایک پل قیمتی تھا، میں یک سوئی سے بچاؤ کا راستہ سوچنا چاہتا تھا۔

”اگر تم پشت سے پشت ملا کے ایک دوسرے کی رسّیاں کھولنے کا کوئی منصوبہ رکھتے ہو تو میں تمھیں آگاہ کرتا ہوں، میں اور میرا ساتھی کئی پہر اِس مشق میں مصروف رہے ہیں۔ ہم دونوں تربیت یافتہ فوجی ہیں، لیکن ناکام رہے ہیں۔“ لیونارڈ کروٹ کے زور پر بے ہوش ساتھی پر چڑھ آیا تھا۔

دفعتاً مجھے خیال آیا کہ معمولی سی جدوجہد سے لیونارڈ یا میں درمیان والے بے ہوش آدمی کی جگہ لے سکتے ہیں۔ ”نہیں، دراصل میری بغلی جیب میں چاقو موجود ہے۔“ میں نے لیونارڈ کی طرف پلٹتے ہوئے کہا۔

"چاقو!... اوہ، یہ تو عمدہ بات ہے، لیکن چاقو سے فائدہ اٹھانا کیونکر ممکن ہے؟"

"ہاں، بہ ظاہر تو ایسا ہی لگتا ہے۔ کوشش کرنے میں کیا حرج ہے۔"

"مجھے کیا کرنا ہوگا؟"

"تم واپس تختے سے چپک جاؤ، میں تمھارے قریب آتا ہوں۔"

"مجھے بتاؤ تو سہی تم کرنا کیا چاہ رہے ہو۔"

"وقت ضائع نہ کرو۔ مجھے اُس طرف آنے کے لیے کچھ جگہ فراہم کرو۔" مجھے اُس پر طیش آ رہا تھا۔ باہر سورج تھک ہار کے گھر کو لوٹ رہا تھا۔ کیا خبر وہ پھر کہیں پڑاؤ ڈال دیتے۔ لیونارڈ تیزی سے دوسری طرف ہو گیا۔ میں نے پوری طاقت کو دائیں کندھے پر جمع کیا، پھر اُس کندھے کو مرکز مان کے نچلا دھڑ اٹھانے کے لیے زور لگایا۔ دونوں ٹانگوں کی معاونت سے دوسرے ہی لمحے میں برابر کی بوری کے اوپر تھا، اور کروٹ بدل کے تیسرے ہی لمحے میں لیونارڈ اور اُس بے ہوش آدمی کے درمیان میں تھا۔ اب اس درمیانی بوری کو دھکیل کے میری جگہ تک پہنچانے کا مرحلہ تھا۔ یہاں جل کا داؤ کار آمد تھا، ٹھل نے اِس داؤ کی خوب مشق کروائی تھی، تاہم کبھی استعمال کا موقع ہی نہیں آیا تھا۔ جل کے داؤ میں ماہی بے آب کی طرح تڑپنا ہوتا ہے۔ جل کا داؤ مٹھری داؤ کا توڑ ہے۔ مٹھری داؤ میں مخالف کی پسلیاں بازوؤں کے مضبوط شکنجے میں کس کے توڑ دی جاتی ہیں۔ مٹھری داؤ میں پھنسا ہوا پنچھی اگر جل کا مشاق ہے تو مضبوط ترین حلقہ بھی توڑ دیتا ہے۔ سرِ دست بہت معمولی جنبش کی ضرورت تھی۔ بہت تھوڑی سی کوشش بار آور ثابت ہوئی۔ لیونارڈ کو بھی خاصی ضربیں آئیں، وہ سخت جان تھا۔ چھکڑے کا تختہ اور دوسری جانب میں اُس کے لیے چکّی کے دو پاٹ بن گئے تھے، تاہم اُس نے ذرا بھی اُف نہیں کی، ذرا دیر بعد میں درمیان میں پڑا تھا اور درمیان والا میری جگہ پہنچ چکا تھا۔

میرا سینہ بری طرح پھولنے پچکنے لگا تھا۔

"اُف میرے خدایا! تم لوہے سے بنے ہوئے ہو، بہت طاقت ور، بہت شان دار۔"

"میرے دائیں پہلو کی جیب میں چاقو ہے۔ تمھیں وہ چاقو اپنے مُنھ کی مدد سے میری جیب سے نکالنا ہے..." میں نے اوپر کی طرف کھسکتے ہوئے کہا، تاکہ میری جیب کا مقام اُس کے چہرے کے قریب آ جائے۔ "تم بھی کچھ نیچے کی طرف کھسکو۔" میں نے جلدی جلدی اُسے کہا۔

"میرے دوست! میں وہ چاقو تمھاری جیب سے کیسے نکال پاؤں گا؟" بوری کی پرت بہت بھاری ہے۔ میں اپنے مُنھ کے ذریعے اُس کے نیچے کسی چیز کو حرکت نہیں دے پاؤں گا۔"

"کوشش کرنے میں کوئی حرج نہیں، ہم بہ ہر طور قید تو ہیں ہی۔" وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ واقعی بوری کی پرت اِتنی موٹی تھی کہ اُس کا مُنھ کی گرفت میں آنا بھی کارِ محال ہی تھا، لیکن نہ جانے کیوں مجھے امید تھی، یقین تھا کہ یہاں سے آزادی ممکن ہے، جب کہ بوری میں ذرا بھی گنجائش نہیں تھی کہ آدمی اُٹھ بیٹھے۔

"میری سمجھ میں نہیں آ رہا... بالفرض میں چاقو تمھاری جیب سے نکال گراتا ہوں، تب بھی کیا حاصل ہوگا۔ وہ چاقو ہماری مدد کر سکے گا؟"

اُس کی آواز میں مایوسی کا غلبہ میں نے محسوس کر لیا تھا۔ مایوسی اور کام یابی دو متضاد چیزیں ہیں۔

"تم ایک مرتبہ چاقو میری جیب سے نکال کے بوری میں گرا دو۔ میں تمھیں یقین دلاتا ہوں کہ ہم یقینی طور پر آزاد ہو سکیں گے۔ یہ ایک کرشماتی چاقو ہے۔" میں نے اُس کے سامنے امید کا چراغ جلایا، حالاں کہ میں چاقو سے متعلق اُتنا ہی فکر مند تھا جتنا لیونارڈ اس وقت بوری کی موٹی پرت کے متعلق تھا۔

"ٹھیک ہے، میں کوشش کرتا ہوں۔" لیونارڈ کا لہجہ یک دم خوشی اور جوش سے معمور ہو گیا، میں ممکنہ حد تک اوپر

کی جانب کھسک کے سمٹ گیا تھا۔ لیونارڈ بھی نیچے کی طرف کھسک چکا تھا۔ کافی ہل جل کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ اب میری جیب عین لیونارڈ کے مُنھ کے قریب ہے تو میں نے کہا، "میری کہنی کے بالکل ساتھ جیب کا مُنھ ہے۔ اُس سے تھوڑا نیچے تم سخت اُبھار سے چاقو کو محسوس کر لو گے۔ کسی طرح اُسے کھسکا کے میری کہنی تک لے آؤ، یعنی جیب کے مُنھ تک، اس کے بعد جیب سے باہر وہ خود نکل آئے گا۔"

"مجھے یقین نہیں کہ تمھارا چاقو کرشمہ دکھا سکے گا، تاہم میں کوشش ضرور کروں گا۔"

لیونارڈ نے کچھ اِس طرح کہا کہ ان حالات میں بھی میں مسکرا پڑا۔ دوسرے لمحے میرا پورا جسم سنسنا گیا۔ لیونارڈ کا مُنھ عین چاقو کے اوپر پڑا تھا۔ "یہی ہے... اِسے اوپر کھسکاؤ۔" میرے مُنھ سے برجستہ جملہ نکلا تھا۔ جواب میں لیونارڈ صرف "اوغ اوغ" کر کے رہ گیا۔ لیونارڈ نے اپنی کوششوں کا آغاز کر دیا۔ چاقو کبھی دائیں کھسک جاتا کبھی بائیں، لیکن اوپر نہیں آتا۔ تقریباً آدھے گھنٹے تک مسلسل جتے رہنے کے بعد لیونارڈ ہانپ گیا۔ "نہیں، یہ ناممکن ہے۔ میری ناک، ہونٹ اور ٹھوڑی بری طرح چھل چکے ہیں۔ ان سے خون رِسنے لگا ہے دوست۔"

نہ جانے کیوں مجھے کوفت ہونے لگی۔ میں نے ہی اُسے اِس کام پر آمادہ کیا تھا، لیکن جب وہ تگ و دو کر رہا تھا، مجھے اپنا آپ خود غرض لگا، حالاں کہ وہ سب کچھ اپنی آزادی کے لیے کر رہا تھا۔

"ٹھیک ہے، رہنے دو!" میں یہی کہہ سکتا تھا۔

"نہیں میرے دوست! آدھا گھنٹا میں نے ضائع نہیں کیا، کچھ سیکھا ہے، کچھ مشق کی ہے۔ اب میں آسانی سے یہ کام کر لوں گا۔" لیونارڈ نے کچھ دیر خاموشی اختیار کرنے کے بعد کہا۔

"تم اِسے کچھ دیر پہلے ناممکن کہہ رہے تھے۔"

"میں ہانپ گیا تھا، وقتی تھکن غالب آ گئی تھی۔ اب مجھے یقین ہے میں یہ کر لوں گا۔"

"تمھاری مرضی!"

لیونارڈ دوبارہ اپنی کوششوں میں مصروف ہو گیا۔ میرے ذہن سے ٹھل، جمرو اور زورا کا خیال محو ہو چکا تھا۔ مجھے یہاں سے نکل کر اُس نامعلوم بس اڈّے تک پہنچنے کی جلدی تھی، جہاں ایک کائنات موجود تھی۔ لیونارڈ اس سے قبل جوش سے کام لیتا رہا تھا، مگر اب وہ ہوش سے کام لے رہا تھا۔ صرف پانچ منٹ بعد چاقو میری جیب سے نکل کر بوری میں گر چکا تھا۔

"وہ مارا... ہندُستانی لباس سے واقفیت نہیں ہوتی تو شاید یہ چاقو تمھاری جیب سے نہ نکال پاتا۔ یہ تو بہت آسان کام تھا... کرشمہ دکھاؤ... جلدی سے کرشمہ دکھاؤ..." وہ بچّوں کی طرح خوش ہوتے ہوئے بولا۔

اب میرا امتحان شروع تھا۔ مجھے اپنا مُنھ چاقو تک لے جانا تھا یا پھر چاقو اپنے مُنھ تک لانا تھا۔ چاقو کا کھٹکا مُنھ سے دبوچ کر کھولنا تھا۔ دستے پر مُنھ جما کر چاقو سے کئی کٹھن کام لینے تھے۔ میں نے چاقو کو مُنھ تک لے آنے کا فیصلہ کیا۔ دونوں ٹانگوں کو اوپر بلند کر کے کئی جھٹکے دینے سے چاقو اوپر تو آ گیا تھا، لیکن وہ میرے کندھوں کے نیچے تھا۔ کافی دیر مسلسل کوششوں اور تجربوں کے بعد چاقو میرے مُنھ میں دبا ہوا تھا۔ اسی دوران لیونارڈ مسلسل بولتا رہا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ میں نے جذباتی استحصال کر کے چاقو باہر نکلوایا ہے، لیکن میں خود کچھ کرنے سے قاصر ہوں۔ چاقو کا دستہ مُنھ میں پکڑا تو ٹھل کی بات یاد آئی۔ اُس نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ لاڈلے نکانی سے بڑا کوئی کانٹا نہیں اور ارادے سے بڑا کوئی بل نہیں ہوتا۔ یہ بڑے بڑے سورماؤں کو پچھاڑ دیتا ہے، اگر یہ نہ ہو تو سورما تنکے کی طرح گر جاتے ہیں۔ میں نے لیونارڈ کو یک سر نظر انداز کر دیا، اور بھلا دیا کہ اس بوری سے باہر بھی کہیں تل بکتے ہیں۔ چند گھنٹے قبل جو کام ناممکن لگ رہا تھا، وہ ممکن ہو چکا تھا۔ تھوڑے سے محتاط عمل کے بعد ایک کھٹکے سے چاقو کا تیز دھار پھل باہر آ گیا۔ میں نے

دستے کو موزوں کر کے اپنا چہرہ دائیں سے بائیں گھمایا۔ چاقو کا پھل بوری کو چیرتا ہوا باہر نکل آیا۔ کافی دیر تک اور شدید جدّوجہد کے بعد میں بوری کا اِتنا حصّہ کاٹنے میں کام یاب ہو چکا تھا کہ میرا چہرہ بوری سے باہر نکل آیا۔ چاقو کو دانتوں میں دبا کر پاؤں کی رسّیاں کاٹنے کا میرا ارادہ تھا۔ پیروں تک اپنا چہرہ لے جاتے کمر کی تمام ہڈیاں چیخ چیخ گئی تھیں، چاقو میری لیے ایسے ہی تھا جیسے مچھلی کے لیے پانی۔ میں نے بہت آرام سے پیروں کے قریب سے بوری کاٹ لی۔ ڈور اندیشیوں نے رسّی کیا باندھی تھی، پیر جکڑ دیے تھے۔ موٹی رسّی کے بیس سے زائد بل تھے۔ رسّی کاٹنے میں بھی کوئی خاص دشواری پیش نہیں آئی۔ تھوڑی دیر بعد میرے پیر آزاد تھے اور میں مکمّل طور پر بوری سے باہر تھا۔ لیونارڈ پوری کارروائی اپنی بوری کے سوراخ سے دیکھ رہا تھا۔ وہ حیرت سے گنگ ہو چکا تھا۔

”تم انسان نہیں جادوگر ہو... حیرت انگیز... بہت زبردست!“

”سب سے اہم اور ابتدائی کارنامہ تم نے سرانجام دیا ہے۔“ میں نے تیزی سے سوچتے ہوئے کہا۔ ہاتھوں کو آزاد کروائے بغیر چھکڑے سے کودنا انتہائی بے وقوفی ہو سکتی تھی، کیوں کہ باہر کی صورتِ حال کا مجھے قطعاً اندازہ نہیں تھا۔ انگریز فوجیوں کے اغوا کا معاملہ تھا۔ یقیناً ان چھکڑوں کو سخت حفاظتی حصار میں لے جایا جا رہا ہوگا۔ سڑک کے دائیں بائیں گھنے جنگل میں مسلح گھڑ سوار قافلے کے ہم راہ یقیناً چل رہے ہوں گے۔ ہو سکتا ہے کہ میرے تمام خدشات عبث ہوں، لیکن جلد بازی نقصان پہنچا سکتی تھی، اور مجھ میں اس وقت کسی نقصان کا تحمّل نہیں تھا۔ توربان غالباً کانوں میں روئی ٹھونس کر بیلوں کو ہانک رہا تھا۔ اب تک کے سفر سے یہ اندازہ لگانا قطعاً مشکل نہیں تھا کہ چھکڑے سے کود جانے پر کم از کم توربان کو کوئی فرق نہ پڑتا۔ آخرِ کار ہاتھوں کی رسّیاں کاٹنے کا مسئلہ بھی حل ہو گیا۔ اِس سے قبل میں نے سوچا تھا کہ چاقو اپنے پیروں میں تھام کے لیونارڈ کو آزاد کراؤں گا، اور پھر لیونارڈ میرے ہاتھوں کی رسّیاں کاٹ ڈالتا، لیکن اِس میں ایک قباحت تھی، ایک لمحہ ایسا ضرور آتا، جب میں مکمّل طور پر لیونارڈ کے رحم و کرم پر ہوتا۔ میں اُس کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا تھا۔ اُس پر اعتبار کرنا شدید حماقت کے سوا کچھ نہیں تھا۔ آخرِ کار مجھے اُس پر بھروسا کرنا ہی تھا کہ دفعتاً چھکڑے کی درزوں کا خیال آیا۔ میرے پیروں کے درمیان اچھی بھلی درز تھی اور اُس کا حجم بھی معقول تھا۔ چاقو کا دستہ بہ آسانی اُس میں پھنسایا جا سکتا تھا۔ دستے کو درز پر موزوں کر کے میں نے پنڈلی کی ضرب ماری تو درز میں جم گیا، لیکن دوسری ضرب عین پھل پر لگی۔ پیروں میں جوتی نہیں تھی۔ تیز دھار پھل ہڈی تک پہنچ کر ہی رکا۔ زخم لمبا اور گہرا آیا تھا۔ خون پانی کی طرح پھوٹ پڑا، اور یہ وقت خون دیکھنے کا نہیں تھا۔ باہر چاند نمو پر تھا۔ میں نے فوراً دوسری ضرب دستے پر ماری۔ تین چار راست ضربوں سے دستہ درز میں پھنس چکا تھا۔ اس کے بعد ہاتھوں کو آزاد کروانے میں خاص دشواری پیش نہیں آئی۔ تلوے سے خون مُنہ زور نالے کی طرح بہ رہا تھا۔ اب ایک لمحہ بھی اس چھکڑے میں ٹھہرنا میرے لیے ناممکن تھا۔ چند ثانیوں میں لیونارڈ بھی آزاد تھا۔

”تم جادوگر ہو... اگر میں یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے نہ دیکھتا تو کبھی یقین نہ کرتا۔ اوہ میرے خدا!... اِتنا خون... اِسے روکو فوراً۔“ لیونارڈ کی نظر تختے پر پڑی، جو خون سے تر بہ تر تھا۔ اُس کے چہرے سے بھی خون برابر رِس رہا تھا۔

”ابھی اِس کا وقت نہیں ہے۔“ میں نے جلدی جلدی تیسری بوری کاٹ ڈالی، وہ ہنوز بے ہوش تھا۔ پھر میں نے کچھ سوچ کر اُس کے ہاتھ اور پیروں کی رسّی نہیں کاٹی۔ اُس کے لیے ہم کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ کہتے ہیں، سفر کا ساتھ چند لمحوں ہی کا کیوں نہ ہو گہری انسیت پیدا کر دیتا ہے، اُس بے ہوش انگریز سے میرا کوئی تعلّق نہیں تھا، لیکن پھر بھی اُسے چھوڑتے ہوئے مجھے دکھ ہوا۔ لیونارڈ نے جھٹ اپنی قمیص پھاڑ ڈالی۔ وہ میرے پیروں سے لپٹ گیا۔ ”تیزی سے خون بہ رہا ہے۔ تم چند منٹوں میں ہلاک ہو سکتے ہو۔ اِسے روکنا ہوگا۔“

”مجھے کچھ نہیں ہوتا... میں بے حد ڈھیٹ واقع ہوا ہوں۔“

”مانتا ہوں تم سخت جان ہو... بہ ہر حال، ایک انسان ہو۔ ابتدائی طبّی امداد کی فوجی تربیت حاصل کی ہوئی ہے میں نے... ایسے ہرگز نہیں جانے دوں گا۔“ اُس نے بہت تیزی سے اپنی قمیص کو پٹیوں میں تقسیم کرتے ہوئے کہا۔ وہ میرے بالکل سامنے آ گیا تھا۔

”تم اپنا راستہ لو... مجھے بہت جلدی ہے... بے فکر رہو، موت ہی تو ہے جو مجھے نہیں آتی۔“ میں نے اُسے ایک طرف دھکیلنے کی کوشش کی۔ میرے لیے ایک ایک لمحہ کوہِ ندا تھا۔ ہر پَل میں کورا سے دُور ہوتا جا رہا تھا۔ لیونارڈ بیس اکیس برس کا خوش شکل نوجوان تھا۔ خون واقعی آبشار کی مانند بہ رہا تھا۔ ردِّعمل کے طور پر جسمانی نقاہت مجھے محسوس ہو رہی تھی۔ لیونارڈ مچل کے میرے قدموں سے لپٹ گیا۔

”اِسے میری خود غرضی سمجھ لو۔ تم شان دار انسان ہو... مجھے یقین ہے کہ آئندہ درپیش خطرات سے بھی تمھی مجھے بچا سکتے ہو۔ تمھاری زندگی میرے لیے بہت اہم ہے، میرے دوست! یہ پانو کا کاری زخم ہے۔ نچلا حصّہ ہونے کی وجہ سے تھوڑی ہی دیر میں تمھارے جسم سے خون کی آخری بوند بھی نکل جائے گی۔“ اُس نے گڑگڑا کے کہا۔ مجھے اُس کی بات ماننا پڑی۔ اُسی نے ایک پٹّی کو کئی تہوں میں لپیٹ کر زخم پر رکھا اور پھرتی سے اُس پر گانٹھ باندھ دی۔ اُس نے ہر کام آناً فاناً کیا تھا۔

چھکڑے پر پڑی جھول کو میں نے تھوڑا سا کاٹا۔ باہر اندھیرا تھا۔ چاندنی اپنا تعارف کروانے میں ناکام نظر آ رہی تھی۔ ہمارے چھکڑے کے بالکل پیچھے دوسرا چھکڑا چلا آ رہا تھا۔ اُس کے پیچھے تیسرا، پھر چوتھا اور اِس طرح لمبی قطار تھی، یقیناً ہم سے آگے بھی اِسی طرح قطار تھی۔ ایک چھکڑے میں دو بیل جتے تھے۔ اگر ہم اِس طرح فوراً دائیں بائیں کود جاتے تو اندھیرے کے باوجود دیکھ لیے جانے کا قوی امکان تھا۔ کچی سڑک کے دائیں بائیں درختوں کے جھنڈ تھے۔ ہم لاکھ کوشش کرتے، لیکن وہ وسیع انجم گھیرا ڈالنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ بہ آسانی دوبارہ پکڑے جاتے یا پھر مار دیے جاتے۔ بہتر یہی تھا کہ بہت دُور تک جانے کے بعد بھی اہلِ قافلہ کو ہماری گم شدگی کی خبر نہ ہوتی، لیکن یہاں سے جانا بہ ہر حال، بہ ہر صورت تھا۔ بائیں جانب درختوں کے جھنڈ چھکڑے سے قدرے قریب تھے، جب کہ دائیں طرف یہ فاصلہ نسبتاً کئی گنا زیادہ تھا۔ مناسب یہی تھا کہ بائیں جانب سے جھول کاٹ کے جھنڈ میں محتاط چھلانگ لگا دی جائے۔ اس کے بعد کے معاملات تن بہ تقدیر چھوڑ دیے جائیں۔ اب سوچنا بے کار تھا۔ میں نے بائیں جانب بہت احتیاط سے جھول میں قدِ آدم نقب لگائی۔ دفعتاً ایک خیال نے مجھے پتھر کر دیا۔ گویا روح سلب کر لی گئی ہو۔ میرے فرار سے بِھلّ، زور اور جبرو پر یاروبیہ کا قہر بھی نازل ہو سکتا تھا۔ وہ میرے رفیقوں ہی کی حیثیت سے زیرِ عتاب آئے تھے۔

میرے ساتھ لیونارڈ کا فرار اِس خیال کو مزید تقویت پہنچا سکتا تھا کہ ہم انگریز سرکار کے آلۂ کار ہیں۔ اگر اسی طرح اکّا دکّا کو فرار ہونا ہوتا تو ہم میں سے ہر کوئی انفرادی طور پر پہلے پڑاؤ سے قبل یا پڑاؤ کے دوران ہی ہو جاتا، اور بہ آسانی۔ یہاں تو ایک سے دوسرے کی سانس جڑی تھی۔ مجھے نہیں جانا چاہیے تھا۔ بٹھل کے بغیر یہاں سے جانا مجھے زیب نہیں تھا۔ یک دَم میں نے فیصلہ کر لیا کہ ایسے نہیں، یوں تنہا فرار نہیں ہونا، لیکن پھر کسی غیر مرئی قوت نے مجھے اپنے حصار میں جکڑ لیا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میں چھکڑے سے زمین پر گرا اور بیلن کی طرح رِڑھتا ہوا درختوں کی اوٹ میں پہنچ گیا۔ کورا یہاں سے بہت قریب، یہیں کہیں، میرے آس پاس ہی تو تھی۔ تقلیداً مجھ سے ذرا آگے لیونارڈ بھی اوٹ لے چکا تھا۔ کسی کو خبر نہ ہو سکی، بیس سے پچّیس چھکڑوں کا یہ قافلہ اپنی روانی میں آگے بڑھ گیا۔ ان کے عقب میں خاصی تعداد میں مسلح گھڑ سوار تھے۔ وہ چھکڑوں کی نگرانی پر معمور تھے۔ اُنھیں یہ گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ ان کے دو قیدی جنگل میں روپوش ہو چکے ہیں۔

جب آخری گھڑ سوار گزرا تو میرے اندر کوئی مچل گیا۔ ایک طوفان میرے درپے ہوا۔ مجھے نہیں معلوم کہ کوئی بچّہ یا شوریدہ سر جوان۔ بس میں تنک کے سڑک پر نکل آیا۔ دایاں پاؤں میرے ساتھ نہیں تھا۔ وہ وہیں درختوں کی اوٹ میں رہ گیا تھا۔ گھڑ سوار خراماں خراماں جا رہے تھے۔ مجھے اپنا دل معدوم ہوتی ٹاپوں سے کھلواڑ کرتا محسوس ہوا۔ ذرا سے قبل پر وہ یقیناً لوٹ پڑتے۔ کسی ایک کو گرا کے بندوق چھیننا کیا مشکل تھا۔ اُس آدمی کا کیا بیاں ہو کہ جو صراط پر ہو اور اس کے دائیں بھی صراط ہو اور بائیں بھی صراط ہو۔ میں نے خنجر کو علم کیا اور گھڑ سواروں کے تعاقب میں لڑھکتا گھسٹتا دوڑ پڑا۔ دفعتاً کسی نے چھلانگ لگائی اور مجھے لپیٹتے ہوئے سڑک سے نیچے اتر گیا۔ لیونارڈ میرے دل و دماغ سے محو ہو چکا تھا۔

”میرے عزیز دوست تم پاگل ہو رہے ہو!“ لیونارڈ نے میرے مُنہ پر ہاتھ جماتے ہوئے سرگوشی کی۔

”ہاں، میں پاگل ہوں... تم اپنی راہ پکڑو!“ میری آواز میں بے پناہ سفّاکی در آئی تھی۔ وہ میں نہیں کوئی اَور ہی تھا۔ سمتیں چار ہیں، مگر میرا شیرازہ ہزار سمتوں میں بکھر گیا تھا۔ میں نے اُسے روئی کے بے وزن گھٹڑ کی طرح اُچھال پھینکا۔ میں تڑپ کے اُٹھا، لیکن ایک پاؤں سے کیسے اٹھا جاتا، تڑپ کے رہ گیا۔ لیونارڈ اِس مرتبہ میرے پیروں سے لپٹ گیا۔

”مجھے معلوم ہے تمھارے ساتھی اُن کے پاس ہیں... اس وقت تمھاری جان خطرے میں ہے۔ بہت سا خون بہ چکا ہے اور اب بھی رِساؤ جاری ہے۔ میرے عزیز دوست! تمھاری زندگی تمھارے ساتھیوں کے لیے زیادہ اہم ہے۔“

اس دوران ٹاپیں یک سر معدوم ہو گئیں۔ حلق میں ہَوا کا گھومتا ہوا گولا اٹک گیا۔ خنجر آراستہ دست تھا، مگر ہاتھ بے جان اور جسم بے روح ہو چکا تھا۔ میں نے پھر تڑپ کے اٹھنا چاہا۔ اِدھر کچھ تھا ہی نہیں جو اُٹھ جاتا۔ بے بسی آنکھوں میں اتر آئی۔ میں نے لیونارڈ سے کہنا چاہا کہ ازراہِ خدا پند و نصائح کی بجائے اس خنجر سے میرا سینہ چیر ڈالو، میں تمھارا احسان مانوں گا، مگر ہونٹ پھڑپھڑا کے رہ گئے، لیکن ایک زبان جس کے اشتراک سے کائنات کا خمیر اٹھا ہے، وہ سبھی بولتے، سنتے اور سمجھتے ہیں، لیونارڈ سے کیا ماورا۔ وہ تڑپ کے میرے پیروں سے اُٹھا اور سینے سے ٹکرایا۔ اُس نے میرا سر اپنی گود میں رکھا اور مجھے بھینچ لیا۔

”واقعی مشرقی لوگ محبت کے خوگر ہوتے ہیں... اُن سے تمھارا بہت قریبی تعلق گمان پڑتا ہے، لیکن تم فکر نہ کرو، میری زندگی تمھاری مرہونِ منّت ہے۔ میں وائسرائے کا ذاتی محافظ ہوں۔ میرا خیال ہے کہ یہ لوگ تاوان وغیرہ کا مطالبہ کریں گے۔ حکومت بہت جلد تمام مغویوں کو بہ خیریت بازیاب کروالے گی، اِس وقت تمھیں فوری طبّی امداد کی ضرورت ہے۔ میں اِس ویرانے میں آگ جلا سکتا ہوں...

زخم میں راکھ بھرے سے خون رک سکتا ہے۔ راکھ میں نقصان دہ جرثومے نہیں ہوتے۔“

کچھ لوگ بس اچھے ہوتے ہیں اِن لوگوں کا تعلق کسی مخصوص علاقے، رنگ و نسل یا مذہب سے نہیں ہوتا۔ یہ لوگ ہر جگہ، ہر خطے، ہر نسل، ہر مذہب میں پائے جاتے ہیں۔ لیونارڈ سے چند جملوں کی ملاقات تھی، لیکن وہ وارفتگی و بے ساختگی سے مجھے بھینچے ہوئے تھا، گویا جنم جنم کا ساتھ تھا۔ چھکڑے سے ہماری گم شدگی کی اطلاع کسی وقت بھی قافلے میں گردش کر سکتی تھی، وہ اچانک یہاں پلٹ سکتے تھے۔ لیونارڈ کے لیے بہتر یہی تھا کہ وہ مجھے چھوڑ کر فوراً محفوظ ٹھکانے کی تلاش میں نکل جائے، لیکن وہ بھی اَوروں کی طرح مجھ سے چمٹ کے بیٹھ گیا۔ وہ مجھے سہلا رہا تھا، پچکار رہا تھا اور تسلّی دے رہا تھا۔ مجھ سے کچھ نہ بولا گیا۔ غشی کی کیفیت طاری تھی۔ سر میں گول گول چمکتے ہوئے دائرے ناچ رہے تھے۔ ”ہم اِس وقت راستے پر بیٹھے ہیں۔ کسی پوشیدہ جگہ تک فوری پہنچنا ازحد ضروری ہے۔“ لیونارڈ نے مجھے سہارا دے کر کھڑا کرنے کی کوشش کی۔ زندگی میں اب کیا باقی رہا تھا۔ صرف خون کے سہارے ہی تو نہیں جیا جاتا۔ توانائی کے لوازمات کچھ اَور ہی ہوا کرتے ہیں۔ میں نے پھر بھی ایک مرتبہ اُٹھنے کی کوشش کی، شاید میں کھڑا بھی ہو گیا تھا، مگر پھر لڑکھڑا گیا۔ اس کے بعد مجھے کوئی ہوش نہ رہا۔

تلوے کا ناچتا ہوا درد دماغ سے تال میل ملا رہا تھا۔ میری آنکھ کھلی تو لیونارڈ مٹھی میں راکھ بھر کے تلوے پر لگا رہا تھا۔ قریب ہی چند لکڑیاں جل رہی تھیں۔ رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا، لیکن سیاہی بہ دستور جوبن پر تھی۔ وہ کسی نہ کسی طرح کھینچ تان کر کے مجھے سڑک سے دُور لے آیا تھا۔ ہم ایک درخت کے تنے سے لگے بیٹھے تھے؛ یہ گھنا جنگل تھا، درخت پر درخت اور جھاڑی پر جھاڑیاں چڑھی ہوئی تھیں۔ گادڑ اور گیدڑوں کی چیخیں گاہے گاہے گونج رہی تھی۔

”تم نے ناحق اپنا وقت خراب کیا...“ میں نے اُسے بہ غور دیکھتے ہوئے کہا، ”میں بالکل ٹھیک ہوں۔“

”بہت مضبوط آدمی ہو... بہ مشکل دو گھنٹے بے ہوش رہے ہو۔ اگر میں تمھارے حلق میں محلول خوراک انڈیلتا رہتا تو تب بھی چوبیس سے چھتّیس گھنٹوں تک ہی تمھیں ہوش میں آنا تھا، میرے لیے یہ بہت حیرت انگیز بات ہے۔“ اُس کے چہرے سے حیرانی مترشح تھی۔

”تمھیں بتایا تھا؛ میں بہت ڈھیٹ واقع ہُوا ہوں۔ موت میرا مذاق اُڑاتی ہے۔“

”تازہ زخم کی وجہ سے تم متحرک تھے، لیکن اب یہ ممکن نہیں۔ آٹھ انچ لمبا اور ایک انچ کے لگ بھگ گہرا زخم ہے۔“ لیونارڈ نے سنی اَن سُنی کرتے ہوئے کہا۔ وہ بہت مہارت سے کھولی گئی پٹیوں کو دوبارہ لپیٹ رہا تھا۔

”اپنی راہ کھوٹی مت کرو۔ چاقو اپنے پرائے کی شناخت رکھتے ہیں۔“

”زخم کو سیا نہ گیا تو مہینوں پڑے رہ سکتے ہو۔“ اُس نے عجیب انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ گویا ترازو میں تول رہا تھا۔

لیونارڈ بلا شبہ میرے ساتھ اپنائیت اور ہم دردی کر رہا تھا، لیکن مجھے اُس کی دست گیری سے غیریت کی بُو آ رہی تھی۔ کم از کم جنگل میں تو مشرق کو بالادست ہونا چاہیے۔ میری منزل کھو گئی تھی۔ دوراہا ایک جانب لاری کے اڈّے تک جاتا تھا اور دوسری جانب بٹھل کے تعاقب میں۔ بٹھل صرف میری وجہ سے پوری میں بنداذیتیں سہہ رہا تھا۔ اُس کے لیے ایسی شعبدہ گری بائیں ہاتھ کا کھیل تھی۔ دل بھی عجیب ہے سر دار بھی راستے سجھاتا ہے۔ کہنے لگا کہ تمھیں بٹھل کی ضرورت رہتی ہے۔ بٹھل تمھارا محتاج نہیں، لیکن کورا کا صبر پیمانے سے سوا ہے، اُسے تمھاری ضرورت ہے، وہ منتظر ہے تمھاری۔ میں ہڑبڑا کے اُٹھا، شدید درد نے جسم پر قفل ڈال دیے تھے، لہرا کے ہی رہ گیا۔ اُبلتے ہوئے چشمے کی طرح

میرے پورے بدن سے تکلیف پھوٹ پڑی تھی۔ لیونارڈ بے تابی سے سرہانے پر آ گیا۔ اُس نے میرے کندھوں کو تقریباً تھپکتے ہوئے تنے سے لگا دیا۔

"تمھاری جواں مردی اور بہادری میں کلام نہیں، لیکن میرے دوست یہ زخم جراحت کا متقاضی ہے۔ تمھیں سمجھنا چاہیے کہ ہم کسی قصبے یا شہر میں موجود نہیں ہیں۔ یہ خطرناک جنگل ہے، یہاں سے عمومی طور پر بھی نکل گزرنا کارِ محال ہے، چہ جائیکہ بندہ شدید زخمی ہو۔"

وہ غصّے سے ابلنے لگا۔ اُس کے لہجے میں برہمی، ناراضی، شکوہ اور خلوص سبھی کچھ تھا۔ نہ جانے یہ کیوں میری خاطر اِتنا کشٹ کاٹ رہا تھا۔

"میں ایک لمحہ بھی نہیں ٹھہر سکتا۔ مجھے جانا ہے، خواہ گھسٹ کے ہی جانا پڑے۔" میں نے زہرخند لہجے میں کہا۔ میں اُس کے لیے نرمی اور حلاوت کہاں سے لاتا۔

"یہاں کوئی بھی ٹھہرنا نہیں چاہے گا۔ ہندُستانی بے حد جذباتی واقع ہوئے ہیں۔ یہ ٹھنڈے دل سے سوچ کر عمل کرنے کا وقت ہے۔ تدبیر اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔"

"میں نے تمھیں ٹھہرنے کو نہیں کہا۔ چلے جاؤ یہاں سے۔" آخر میں پوری قوت سے چیخ پڑا۔ سینے سے کچھ نکل کے فضا میں تحلیل ہوا تھا۔

"ٹھیک ہے، تم اِس جھنڈ سے باہر نکل کے دکھا دو۔ میں تمھیں چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔" لیونارڈ ہاتھ جھٹک کے کچھ سے دُور جا کھڑا ہوا۔

میں محسوس کر رہا تھا، مجھ میں اُٹھ کھڑے ہونے کی سکت نہیں تھی، لیکن اُس آتشِ غرور کا کیا کیا جائے جو سینے میں دہک رہی تھی۔ میں نے اُٹھنے کی جاں توڑ کوششیں کیں، لیکن درد اور نقاہت نے آڑے ہاتھوں لیا۔ لیونارڈ دُور کھڑا مسکراتا رہا، لیکن اُس کے انداز میں استہزا نہیں تھا۔ آخر میں نڈھال ہو کے گر پڑا۔

"اب تم خود کو میرے سپرد کر دو۔ دن کی روشنی میں انسانی آبادی تلاش کریں گے۔ میں خوراک کا بندوبست کرتا ہوں۔ تم جامن کے درخت تلے بیٹھے ہو۔"

وہ چلا گیا۔ میں نے آنکھیں موند لیں۔ میرے پاس مقدّر کو کوسنے کے سوا کچھ نہ رہا تھا۔ اِس سے بہتر باروٹیہ کی قید تھی۔ مجھ میں بتھل کو دوبارہ اپنی منحوس صورت دکھانے کا قطعاً یارا نہیں تھا۔ باروٹیہ کوئی معمولی ڈاکو نہیں تھا۔ گرد و نواح کی بستیوں میں لازماً اُس کا اثر و رسوخ ہوگا۔ تبھی تو وہ اِس آسانی سے گزرتا چلا گیا تھا۔ اب تک ہمارا فرار پوشیدہ نہ رہا ہوگا، اور اصولی طور پر وہ بہر قیمت ہماری تلاش میں نکلے ہوں گے۔ وہ یہاں کے باسی ہیں، چپے چپے سے شناسا ہوں گے۔ وہ جلد یا بہ دیر ہم تک پہنچ سکتے تھے، اور میں اب کورا کا سراغ گنوانے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ کورا کا خیال آتے ہی بتھل کسی کونے میں جا دبکتا تھا، اور کچھ میں بھی اپنے دو غلے پن سے واقف تھا۔ لیونارڈ نے چھوٹا سا الاؤ روشن کیا تھا، مگر روشنی حسبِ ضرورت تھی، وہ ناشپاتیوں سے لدا پھدا کچھ دیر میں لوٹ آیا۔ قاشیں کاٹ کاٹ کے میرے مُنھ میں ٹھونسنے لگا۔ اُس کا کہنا تھا کہ میں جتنی زیادہ ناشپاتی کھاؤں گا بدن میں اُتنا ہی خون بھرے گا۔ میں اُس کے سامنے سپر ڈال چکا تھا۔ وہ خاصا باتونی اور دل چسپ بیاں تھا۔ اُس کی ذہانت میں سادگی کی آمیزش نمایاں تھی۔ وہ بات بے بات مجھ سے محبت اور عقیدت کا اظہار کرنے سے نہیں چوکتا تھا۔ اُس کا کہنا تھا کہ میری وجہ سے اُسے دوبارہ اپنی محبوبہ سے ملنے کی امید ہو چکی ہے، ورنہ وہ دل چھوڑ بیٹھا تھا۔ اُس کے نزدیک اِس وقت مجھے چھوڑ کے آگے بڑھ جانا محبوبہ سے بے وفائی کے مترادف تھا۔ وہ جینی کا ذکر کرتے ہوئے بچّوں کی طرح خوش ہو رہا تھا۔ اُس نے بتایا کہ جینی لندن پولیس میں افسر ہے وہ آئندہ برس شادی کر رہے تھے۔ جینی ڈھیر سارے بچّوں کی خواہش مند تھی، وہ شادی کے بعد بھرپور گھریلو زندگی کے خواب دیکھتی تھی۔ اُس معاشرے کی فضیلت کا کیا بیاں ہو جس میں عورت گھریلو

زندگی کے خواب دیکھ رہی ہو۔ لیونارڈ نے بتایا کہ اُسے جینی کا ڈھیر سارے بچّوں والا منصوبہ بالکل پسند نہیں ہے، لیکن وہ جینی کی خاطرداری کے لیے ہاں میں ہاں ملاتا ہے، تاہم اُس کے منصوبے میں بھرپور ساتھ دینے کا عزم بھی رکھتا تھا۔ لیونارڈ کے بہ قول باروٹیہ نے حماقت کی تھی، کیوں کہ انگریز حکومت کسی صورت معمولی درجے کے ڈاکو کے سامنے نہیں جھکے گی اور نہ ہی اپنے آدمیوں سے دست بردار ہوگی۔ اُس کا خیال تھا کہ آج صبح دلّی حرکت میں آ جائے گا۔ باروٹیہ نے انتہائی غیر محتاط نقل و حرکت کی تھی۔ حکومت آناً فاناً اُس کے ٹھکانے کا کھوج نکال لے گی، لیکن میرے خیال میں ایسا خطرناک قدم اُٹھانے والا غیر محتاط نہیں ہو سکتا تھا۔ لیونارڈ نے میرے اور میرے ساتھیوں کے بارے میں جاننا چاہا، پھر میری خاموشی پر اُس نے اصرار نہیں کیا۔ وہ بہت دیر تک بولتا رہا۔ اُس نے دیومالائی ہندُستان میں ملازمت کے تجربات، مشاہدات اور دل چسپ واقعات سنائے۔ وہ ایک پیشہ ور داستان گو کی طرح گفتگو میں مزاحیہ چٹکلے کا ٹانکا لگانے کا ہنر جانتا تھا۔ اُس کی زبان خوش سلیقگی سے آراستہ تھی۔ وہ میری انگریزی پر حیران تھا۔ اُس نے کسی ہندُستانی کو اِتنی شان دار اور شستہ انگریزی بولتے نہیں سنا تھا۔ وہ نہ جانے کب تک اور کیا کیا بولتا رہا۔ مجھے خبر ہی نہیں ہوئی کہ کب مجھ پر غنودگی طاری ہوئی اور کب میں سو گیا۔

تیز چہکار میں میری آنکھ کھلی۔ پرندے بھی صبح صبح گئے دن کی بھڑاس دل کھول کے نکالتے ہیں اور خوب باتیں کرتے ہیں۔ اُن کا نوکیلا شور بہت تیز تھا، لیکن خوش سماعت تھا۔ دھوپ نے گھنے درختوں کے اوپر پہرا بٹھا لیا تھا اور فرحت بخش تمازت کو ملگجی روشنی کے ہم راہ نیچے بھیج دیا تھا۔ چاروں طرف سے نکھرا ہوا سبز رنگ پھوٹ پڑ رہا تھا۔ یہ جامن، ناشپاتی، بیر، زیتون، شیشم اور پیپل کے جنگلی درخت تھے، جن پر چھوٹے چھوٹے رنگ برنگے پھولوں سے لدی بیلیں چکرا رہی تھیں۔ میں نے کچھ ہی دیر میں اندازہ لگا لیا تھا یہ انتہائی گھنا جنگل تھا۔ اِس کے بیچ سفر کرنا ممکن نہیں تھا۔ آگے بڑھنے کے لیے سڑک کے پہلو ہی میں سفر کیا جا سکتا تھا جو بے حد خطرناک تھا۔ لیونارڈ میرے پہلو میں بے خبری کی نیند کر رہا تھا۔ میں اپنے جسم میں خاصی توانائی محسوس کر رہا تھا۔ یہ ناشپاتیوں کا کمال تھا: وہ مٹھاس بھری اور رسیلی تھیں۔ میں نے ہاتھ بڑھا کے ڈھیر میں سے ایک اَور ناشپاتی اُٹھالی۔ مجھے بھوک نہیں تھی، تاہم میں نے بالجبر ایک ایک کر کے تمام ناشپاتیاں کھالیں۔ ہمارے اِردگرد موجود تمام درخت رزق سے لدے ہوئے تھے۔ وفعتاً جھاڑیوں میں سے ایک غزال نے مُنھ نکالا۔ وہ بڑی بڑی آنکھوں میں حیرانی اور معصومیت بھر کے کچھ دیر دیکھتا رہا، پھر چھپاک سے غائب ہو گیا۔ سرسراہٹ بتا رہی تھی کہ اُس نے خوب قلانچیں بھری تھیں۔ لیونارڈ بھی بیدار ہو گیا تھا۔ وہ کسل مندی سے کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا، پھر بولا، "کیا محسوس کر رہے ہو دوست!"

"تمھارا بہت شکریہ... بہت بہتر محسوس کر رہا ہوں۔" میں نے اُس سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔ جنون کو جواز بنا کر ناروائی کو روا نہیں رکھا جا سکتا تھا۔ میرا رویہ غیر مہذبانہ تھا اور وہ ایک مہذب دُنیا کا نمائندہ۔

"شکر ہے! اب بخار نہیں ہے..." لیونارڈ نے فکرمندی سے میری پیشانی کو چھوا۔ "تم نیند میں رات بھر بولتے رہے ہو۔ تکرار کی وجہ سے ایک لفظ مجھے سمجھ آ سکا۔ تم متواتر کسی کورا کو پکار رہے تھے۔"

"ذہنی خلل کا عارضہ ہے مجھے... ایسا عموماً ہوتا رہتا ہے۔"

"کورا تمھاری جینی کا نام ہے؟" اُس نے آنکھ ماری، اور فوراً اشتیاق سے نظریں جماتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال ہے... یہاں سے نکلنے کی فکر کرنی چاہیے۔"

"طرح دینے میں ملکہ رکھتے ہو۔"

"تم جب سو رہے تھے تب میں نے کوشش کی تھی۔ میرا خیال ہے کچھ دِقت ہوگی، تاہم میں چل سکتا ہوں۔"

اِسے کیسے بتاتا، کورا کا نام کسی دوسرے کے مُنھ سے ادا ہونا

مجھے کبھی بھی پسند نہیں رہا تھا۔

"قطعاً نہیں... تمھارا زخم بھرنے تک میں نے یہیں ٹھہرنے کا منصوبہ بنالیا ہے... ذرا سی بے احتیاطی گھاؤ کو ناسور بنا سکتی ہے... بہت خطرناک زخم لگالیا ہے تم نے۔"

لیونارڈ نے میرے سامنے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔

"گھاؤ میرے جسم کے لیے سوغات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اب میرے لیے ٹھہرنا ناممکن ہے۔ میرا اتنا خیال ہے تو میں تمھارے سہارے چل سکتا ہوں۔"

"بات سہارے کی نہیں ہے میرے دوست! پانو پر جیسے ہی دباؤ پڑے گا زخم ہرا ہو جائے گا۔ تمھیں کم از کم تین دن یہیں ٹھہرنا ہوگا..." اُسے میری صورت پر کھنڈتے ہوئے زلزلے واضح نظر آ رہے تھے۔ کچھ سوچ کے بولا، "ایک ترکیب یہ ہوسکتی ہے کہ کسی درخت پر مچان بنا کر تمھیں وہاں چھوڑ دوں اور سڑک پر کسی سواری سے امداد طلب کروں۔"

"ایسی غلطی کا سوچنا بھی مت۔ وہ باولے کتوں کی طرح ہمیں تلاش کر رہے ہوں گے، اور تم ایک لاکھ افراد کے مجمع میں بھی فی الفور غیر مقامی شناخت کر لیے جاؤ گے۔ مقامی آبادی کی صورتِ حال سے ہم قطعاً ناواقف ہیں۔ ہم یہ بھی نہیں جانتے کہ ہم کس جگہ پر موجود ہیں۔ مجھی کو آگے چلنا ہوگا۔" وہ ضد کر رہا تھا اور مجھے کوفت ہونے لگی۔

"تو پھر تین دن تک تم بلا چوں چراں خاموش پڑے رہو... یہ جنگل رزق سے بھرا پڑا ہے۔ گوشت، پھل اور پانی یہاں وافر مقدار میں موجود ہیں اور دسترس میں بھی ہیں۔"

اُس سے بحث کرنا بے کار تھا، لہٰذا میں نے فی الحال ہتھیار ڈالنا مناسب سمجھا۔ اپنے پانو پر کھڑا ہو کے ہی میں یہاں سے جا سکتا تھا، اور یہی سچ تھا۔ میرے تلوے میں ٹیسیں وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی جا رہی تھیں۔ کسی غیبی امداد کے آنے سے پیش تر یہاں سے نکلنا ممکن نہیں تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ میں چند قدم بھی نہیں چل سکوں گا۔ یہ آبرومندی کا خلجان تھا جو میں تنہا نکل کھڑے ہونے کے دعوے کر رہا تھا، کچھ دیر میں میرے شانے خود بہ خود ڈھلک گئے۔ میں نے خود کو تن بہ تقدیر چھوڑ دیا۔ میں نے سنا تھا جنگل میں زخمی مسافروں کو جڑی بوٹیاں مل جاتی ہیں جن کی جادوئی تاثیر لمحوں میں گھاؤ بھر دیتی ہے۔ امی نے بچپن میں خضرؑ کی کہانیاں سنائی تھیں۔ خضرؑ کی مسیحائی مسافروں ہی پر متصف تھی۔ ستارہ دست پریوں کے قصّے بھی بچپن میں بے شمار سنے تھے کہ کس طرح وہ مصیبت زدہ مسافروں کی دست گیری کرتی ہیں۔ حقیقتاً میں نے بھی ایسے ہی کسی کرشمے کے انتظار میں خود کو راضی کر لیا تھا۔ قدرت نے بڑا لطف کیا تھا۔ کورا کو ایک مرتبہ دکھا دینا ہی سیر چشمی تھی۔

لیونارڈ خربوزے سے ملتے جلتے ایک پھل کا ڈھیر اُٹھا لایا تھا۔ میرا چاقو اُس کے پاس تھا، پھر اُس نے ایک قدرے بڑے، لیکن سوکھے ہوئے پھل کو اندر سے خالی کیا اور مجھے بتایا کہ یہاں بالکل قریب ہی شفاف پانی کی ندی ہے۔ وہ اس پھل میں میرے لیے پانی لے آئے گا۔ واقعی وہ چند لمحوں میں پانی بھر کے لے آیا۔ میں اُس کے احسانوں کے بوجھ تلے دبا جا رہا تھا۔ وہ خوشی خوشی سب کام کر رہا تھا اور مجھے یہ سب زہر لگ رہا تھا۔ اُس کی چابک دستی دیدنی تھی۔ اِس سے بڑھ کے اُس کا وفورِ شوق قابلِ دید تھا۔ وہ پھل میوۂ شیریں تھا۔ لیونارڈ نے بھی طبیعت سے کھایا اور میں نے بھی معدے میں اُسے ٹھونس ٹھونس کے بھرا۔ پانی بھی ٹھنڈا اور میٹھا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد ہم فارغ بیٹھے تھے۔ مجھے پھر کوفت ہوگئی۔ چل کھڑا ہونے کو جی مچلنے لگا۔ شکم سیری کے بعد میں خود کو توانا محسوس کر رہا تھا۔ نقاہت بہ تدریج ختم ہو رہی تھی۔ میں نے تنے کا سہارا لے کے اُٹھنے کی کوشش کی۔ لیونارڈ لاتعلق بیٹھا رہا۔ اُسے معلوم تھا میں گر پڑوں گا۔ جب میں بالکل سیدھا کھڑا ہو گیا تو وہ حیرت سے آنکھیں پٹپٹانے لگا۔ میں یکا یکی اور آسانی سے کھڑا ہوا تھا۔ یقیناً مجھے خوشی ہوئی۔ لیونارڈ کی نگاہوں میں ستائش ہی ستائش تھی۔

"میں چل سکتا ہوں لیونارڈ۔" میں نے مسکراتے ہوئے

کہا۔ میرے لہجے میں تفاخر کی معمولی رمق لیونارڈ نے ضرور محسوس کی ہوگی۔

"میں آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں، لیکن یقین نہیں کر سکتا۔ نصف طبیب ہوں۔"

میں نے جیسے ہی قدم بڑھایا۔ درد کا برق رفتار سوتا زانوں سے نکل کے تلوے کی طرف دوڑا۔ پھر تلوے اور دماغ میں بہ یک وقت ایسے شدید دھماکے ہونے لگے کہ بالآخر قوتِ ارادی کو مات ہوئی اور میں خاموشی سے دوبارہ بیٹھ گیا، اور لمبے لمبے سانس بھرنے لگا۔ لیونارڈ نے چاقو بند کر کے میری طرف اچھال دیا۔

"بہت کٹیلی دھار ہے اِس کی۔ تم نے بوری کاٹتے وقت انتہائی مہارت سے چلایا تھا۔ تم چاقو زن ہو۔" لیونارڈ نے میرا دل بڑھانے کو دانستہ نیا موضوع تراشا تھا۔

"خاص مہارت نہیں ہے، البتہ یہ میری انگلیاں پہچانتا ہے، اشارے سمجھتا ہے۔"

"واہ، کیا خوب صورت انداز میں واقعہ بیان کیا ہے۔ کیا ہندُستانی، کیا انگریز... مجھے آج تک کسی نے اِتنا متاثر نہیں کیا... میرا دل نہیں مانتا کہ زندگی میں کبھی تم سے رخصت ہوں۔" اُس کے لہجے عقیدت کا شیرہ ٹپکا رہا تھا، حالاں کہ مجھے اُس کا عقیدت مند ہونا چاہیے تھا۔"

"سڑک کتنی دُوری پر ہے۔" میں نے سانس قابو میں کرتے ہوئے کہا۔

"ہم برلبِ سڑک ہی بیٹھے ہیں۔ اُن جھاڑیوں کے دوسری جانب سڑک ہے۔ تمھیں یہاں تک بہ مشکل لا سکا تھا... یہ خودرَو راستہ ہے۔ اب تک یہاں سے کوئی نہیں گزرا۔" لیونارڈ نے دائیں طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ آمد و رفت نہ ہونے سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ یہ راستہ صرف باروٹیہ کے لوگ استعمال کرتے ہیں۔ یہ شاہراہِ عام نہیں تھی۔ اِس اعتبار سے ہم باروٹیہ کے ٹھکانے کے قریب تھے۔ لیونارڈ نے میری سوچ پڑھ لی تھی۔ بولا، "مجھے بھی یہ

شاہراہِ عام نہیں لگتی، البتہ اِس کے ساتھ چلتے چلتے ہم کسی شاہراہِ عام تک پہنچ سکیں گے۔"

"وقت کافی گزر چکا ہے۔ اُن کے مطابق ہمیں اِس علاقے سے نکل جانا چاہیے تھا۔ وہ ہمیں اِس علاقے میں تلاش نہیں کریں گے۔" لیونارڈ نے مجھے خاموش دیکھ کے کہا۔

"میرا قیاس مختلف ہے دوست! اُنھوں نے رسمی تلاش کا کام مکمل کر لیا ہوگا۔ دو افراد کی کمی اُن کے مقاصد کے لیے بے ضرر ہے۔ جیسا کہ تم بتا رہے ہو، ہم برلبِ سڑک ہی پڑے ہیں تو ہمیں کھوجنا نہایت ہی آسان کام تھا۔ غالباً اُنھوں نے ایسا کرنے کی کوشش نہیں کی۔"

"مطلب... نزدیکی بستیوں میں ہمارے لیے خطرہ نہیں ہوگا؟" لیونارڈ نے چونکتے ہوئے کہا۔ وہ اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"یہ مختلف قیاس ہیں جو باہم مشروط نہیں ہیں۔ تلاش کے جوکھم سے گریز کرنا اور از خود ہی مطلوب کا حاصل ہو جانا دو مختلف باتیں ہیں۔" میں نے تنے سے سر ٹکاتے ہوئے کہا۔

"تم حیرت انگیز ہو... بے پناہ ذہین... ہندُستانی قطعاً پسماندہ نہیں ہیں۔ تم نے میری رائے تبدیل کر دی ہے۔"

لیونارڈ کے چہرے پر شوق دیدنی اور بے جا تھا۔ یہ بہت سامنے کی بات تھی۔

ہم بہت دیر تک مختلف تجزیے اور اندازے لگاتے رہے۔ بین السطور ہم دونوں ہی وقت گزاری کر رہے تھے۔ لیونارڈ کو یقین تھا کہ باروثیہ کی سرکوبی کے لیے بڑے پیمانے پر فوجی کارروائی کی جائے گی۔ وہ مجھے بار بار تسلی دے رہا تھا کہ میرے ساتھیوں کا بال بیکا نہیں ہوگا اور یہ کہ حکومتِ برطانیہ انسانی اقدار کی پامالی کو قطعاً برداشت نہیں کر سکتی۔ وہ ہندستان میں انگریز حکومت کے کارہائے عظیم گنواتا رہا۔ اُس کا کہنا تھا کہ انگریزوں نے پورے جہاں میں انسانیت کا سر بلند کرنے اور انصاف پھیلانے کا بیڑہ اٹھایا ہے اور اُسے فخر ہے کہ انسانی تاریخ کے عظیم دور میں اُس کی خدمات بلاواسطہ شامل ہیں۔ مستقبل کا مؤرخ جہاں انگریزوں کی عظمت سنہرے حروف سے رقم کرے گا وہیں کہیں اُس کا نام بھی شامل تحریر ہوگا۔ خواہ بین السطور ہی سہی۔ وہ کہنے لگا کہ ہندستان کے بوسیدہ فرسودہ نظام کو ہم نے یافتگی سے مربوط کر دیا ہے۔ ہم نے یہاں تعلیم، صحت، قانون، آمد و رفت، آسائشات کا صرف فلسفہ ہی نہیں دیا، بل کہ عین وہی نظام یہاں کے لوگوں کو دیا ہے جو مملکتِ انگلستان میں رائج ہے۔ جو نظام انگریزوں کے طویل تجربات اور عظیم اذہان کا نتیجہ ہے۔ ہم نے تعلیم کو نوابوں اور راجوں کے محلات سے نکال کے عوام الناس کی دہلیز تک پہنچایا ہے۔ ہم نے وہ تجربات جن کی قیمت صدیاں نہیں چکا سکتیں یہاں خدمتِ خلق میں فراواں کر دیے ہیں۔ وہ نہ جانے کیا کچھ کہتا رہا، میں بس خاموشی سے سنا کیا۔ میرے دل نے شمار با شمار کروٹیں بدلیں کہ ہندستانیوں کا موقف بھی اس من چلے انگریز کے روبہ رو رکھا جائے، لیکن نہ جانے کیوں لیونارڈ کی خوش گمانی اور طمانیت چھیننا، سفاکی محسوس ہوئی... کیا برا تھا جو یہ عمر بھر یوں ہی خوش اور مطمئن رہے۔

دوپہر کے وقت وہ ندی پر نہا آیا تھا، اور مزید کچھ پھل توڑ لایا تھا۔ اُس نے شیشم کی سڈول شاخ کو توڑ کے تراش لیا تھا، یوں لکڑی کا ایک بہترین نیزہ تیار ہو گیا تھا۔ چاقو بہت کارآمد رہا۔ تیسرے پہر وہ ایک تڑپتا ہوا خرگوش اٹھا لایا۔ کہنے لگا کہ میں اِسے نیزہ گھونپ کے وہیں مار دیتا، لیکن مجھے معلوم ہے کہ مسلمان اِسے مخصوص طریقے سے ہلاک کرتے ہیں، بہ صورتِ دیگر گوشت کو ناپاک تصور کرتے ہیں۔ میں نے خرگوش ذبح کر دیا، حالاں کہ پھلوں سے عمدہ گزارا ہو رہا تھا۔ دیاسلائی اُس کے لباس میں موجود تھی۔ وہ سگار کا شوقین تھا۔ لیونارڈ نے بتایا تھا کہ انگلستان میں سگار پینے والے مردوں پر خواتین ملتفت رہتی ہیں۔ کچھ ہی دیر میں اُس نے گوشت بھون لیا۔

"ہمیں جنگی میدانوں میں کھانا پکانے کی خاص تربیت دی جاتی... ویسے تمھارا چاقو خوب ہے... ذرا سوچو، اگر یہ نہ ہوتا تو شاید تم سے ملاقات نہ ہوتی۔" اُس نے چاقو بند کر کے میری طرف اچھالتے ہوئے کہا۔

بھنے ہوئے گوشت میں اگرچہ نمک مسالا استعمال نہیں کیا گیا تھا، تاہم بہت لذت آور تھا۔ تلوے کی تکلیف خاصی کم محسوس ہو رہی تھی۔ شکم سیری اور نیند جنم جنم کی سہیلیاں ہیں۔ مجھ پر بھی غنودگی غلبہ پا رہی تھی اور لیونارڈ تو گوشت چباتے وقت ہی جھوم رہا تھا۔ اُسے نیند میں مگن دیکھ کے میری بھی آنکھ لگ گئی۔ گھور اندھیرا تھا! اِتنی تاریکی تھی کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ آنکھ کا کھلنا بے وجہ نہیں تھا، لیکن وہاں سوائے سرسراتی ہوا کے شور کے اَور کچھ نہیں تھا۔ لیونارڈ میرے برابر پڑا سو رہا تھا۔ میں نے گھور گھور کے چاروں اطراف کا جائزہ لیا، مگر خطرے کی کوئی بات محسوس نہ ہوئی۔ چھٹی حس بھی صاحبانِ قلم نے خوب ایجاد کی ہے، بندے کو پیغمبر بنا دیتی ہے۔ دفعتاً عین سامنے پتوں میں غیر معمولی سرسراہٹ ہوئی۔ میں نے چونک کر دیکھا۔ جھاڑیوں کے بیچ سے دو سرخ دہکتے ہوئے انگارے اِدھر ہی تکتے ہوئے تھے۔ میری آنکھ عین موقع پر کھلی تھی، وہ کوئی درندہ تھا جو حملے

کے لیے اپنے قدم جما چکا تھا۔ میرے پورے بدن میں سنسنی دوڑ گئی۔ ایسے ظلمات میں اِس آفتِ ناگہانی سے بچاؤ ناممکن تھا۔ میں نے فوراً غیر محسوس انداز میں جیب ٹٹولی۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ مصیبت کبھی تنہا نہیں آتی۔ چاقو میری جیب میں نہیں تھا۔ وہ میرے قریب ہی زمین پر کہیں موجود تھا۔ میں نے دائیں بائیں جگہ ٹٹولی، مگر چاقو پر ہاتھ نہیں پڑا۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ درندہ گھات لگانے کے بعد شکار کی حرکت کا انتظار کرتا ہے اور ساکت شکار پر عموماً حملہ نہیں کرتا۔ اِس وقت لیونارڈ کو بیدار کرنا آ بیل مجھے مار کے مترادف تھا۔ میں ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ لیونارڈ نے کروٹ لی۔ اُس کے ساتھ ہی ہیبت ناک غراہٹ بلند ہوئی۔ جیسے برق لپکتی ہے ایک بلائے بے اماں جھاڑیوں میں سے نکلی اور سیدھی لیونارڈ پر آ پڑی۔ جیسے خواب میں ڈر کے بچہ چیختا ہے؛ لیونارڈ نے بھی ویسی ہی مادر سوز چیخ ماری۔ گھبراہٹ اور اچانک افتاد سے میرے ہاتھ پانو پھول گئے تھے۔ اندھیرے میں مجھے صرف دو دہکتے ہوئے انگارے نظر آ رہے تھے۔ میں نے بے قرار ہو کر اپنے زانو کی طرف ہاتھ مارا تو چاقو ہاتھ لگ گیا۔ اِسی اثنا میں لیونارڈ کٹے ہوئے بکرے کی طرح غرغرایا تھا۔ میرے پاس ایک لمحے کا بھی وقت نہیں تھا۔ دفعتاً جھاڑیوں کی طرف سے غراہٹوں کا طوفان سنائی دیا اور اَن گنت دائروں میں تیرتے ہوئے انگارے دکھائی دیے۔ اُس لمحے مجھے معلوم ہوا کہ درد بھی انسان کی اختراع ہے۔ میں اِس طرح کھڑا ہو گیا جیسے میرے پانو میں زخم کبھی تھا ہی نہیں۔ اگلے ہی لمحے میرا چاقو درندے کی انگارہ صفت آنکھوں میں دستے تک اتر گیا تھا۔ اندھیرے میں اِس سے بہتر ہدف ممکن نہیں تھا۔ میں نے دیر نہیں لگائی۔ اندازے سے ہاتھ مارا اور چاقو کھینچ کے دوسری آنکھ میں گھونپ دیا۔ میں سینے کے بل اُس درندے پر پڑا تھا جو میرے اندازے کے مطابق ایک قوی الجثہ شیر تھا۔ اُس نے ایک وحشیانہ دھاڑ بلند کی اور لیونارڈ کو چھوڑ کے پیچھے کی طرف الٹ گیا۔ وہ ایسی زور سے دھاڑ رہا تھا کہ زمین دھمکنے لگی تھی۔ میں نے بے تابی سے لیونارڈ کو ٹٹولا، اُس کا بدن بری طرح لرز رہا تھا اور وقفے وقفے سے خرخر کی آواز اُس کے منھ سے نکل رہی تھی۔ اُس کی گردن اور کاندھا تر بہ تر تھا۔ اِس گیلے پن کا موجب یقیناً خون تھا۔ میں نے لیونارڈ کو جھنجھوڑ کے پکارا، لیکن جواب ندارد تھا۔ اُس پر غشی طاری تھی۔ اس وقت سب سے بڑی مصیبت اندھیرا تھا۔ اندھیرے کا خیال آتے ہی میں نے ٹٹول کے لیونارڈ کی پتلون سے دیاسلائی نکالی۔ اُس نے خشک لکڑیوں کا ایک ڈھیر جمع کر رکھا تھا۔ میں نے جلدی جلدی اِن میں آگ بھڑکائی۔ یکایک روشنی سے سارا ماحول منور ہو گیا۔ لیونارڈ کے کندھے پر معمولی نوعیت کا زخم تھا۔ البتہ وہ بے ہوش تھا، جس کی وجہ بہ ظاہر بے انتہا اور غیر متوقع خوف ہو سکتا تھا۔ اگر اُس کی ہڈیاں صحیح سالم تھیں تو وہ بالکل صحیح تھا۔ اُس کے گلے سے "خرخر" کی آوازیں نکلنا بند ہو گئی تھیں۔ اب وہ متوازن انداز میں سانسیں لے رہا تھا۔ لیونارڈ کے پیروں سے چند ہاتھ آگے وہ عظیم الجثہ موذی بے حس و حرکت پڑا تھا۔ وہ بہت بڑا اور ہیبت ناک تھا۔ میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ ببر شیر اِتنا بڑا بھی ہو سکتا تھا۔ اُس کی دونوں آنکھوں سے بھل بھل کرتا خون متواتر بہہ رہا تھا۔ چاقو دماغ تک راستہ بنا گیا تھا۔ تبھی اُسے قدم بھرنے کی بھی مہلت نہیں مل سکی تھی۔ شکار میں حصہ بٹانے والے دوسرے شیر بھاگ نکلے تھے۔ وہ جان گئے تھے شکار ان سے زیادہ وحشی اور خطرناک ہے۔ میں نے فی الفور کرتا اتارا اور ایک دھجی پھاڑ کے لیونارڈ کے کندھے سے خون صاف کرنے لگا۔ وہ زخم نہیں تھا، معمولی نوعیت کی کھرونچ تھی، جس سے خون کا رساؤ اُتنا ہی تھا جو میں اُس کے کندھے سے صاف کر چکا تھا۔ اُس کے شدید زخمی ہو جانے کے خوف سے میری روح فنا ہو رہی تھی۔ اُس کی بہتر حالت کو جانچ کے میرے اندر ٹھنڈک چشمے کی طرح اتر گئی۔ دراصل انسان اس شیر کا پہلی

مرتبہ شکار بنا تھا، اور وہ اس نئی جسمانی ساخت سے ناواقف تھا، اسی لیے مطلوبہ نازک مقام تلاش کرنے میں اُسے دیر لگی تھی۔ بہ صورتِ دیگر ایک ضرب میں لیونارڈ کی گردن کی ہڈی توڑنا بہت ہی کم عرصے کا کام تھا۔ پو پھٹ گئی تھی۔ کچھ دیر بعد وہاں روشنی کے لیے آگ کی ضرورت نہیں بچی تھی۔ لیونارڈ کے بدن میں ہل چل کے آثار بتا رہے تھے کہ وہ ہوش میں آنے والا ہے۔ چند لمحوں بعد وہ ایک جھٹکے سے کسمسا کے اُٹھ بیٹھا۔ عین سامنے گوشت پوست کا ہیبت ناک پہاڑ پڑا دیکھ کے اُس کی آنکھیں حیرت سے پھٹنے کو ہوگئیں، پھر اُس نے نظریں گھما کے مجھے دیکھا اور خوابِ غفلت سے یکایک باہر آ گیا۔ کچھ دیر مبہوت دیکھا کیا۔ اس پر شادیٔ مرگ کی کیفیت طاری ہوگئی۔ تشنج کے مریض کی طرح اُس کے بدن کی بوٹی بوٹی تمازت سے پھڑکنے لگی۔ وہ لرزتا ہوا اُٹھا اور مجھ سے لپٹ گیا۔ فرطِ عقیدت سے دیوانہ وار میرے چہرے، ہاتھوں اور پیروں کے بوسے لینے لگا۔ میں نے اُسے روکنے کی بے حد کوشش کی، لیکن وہ تو پارہ صفت ہوا تھا، بجلی کی طرح مچل رہا تھا۔ ''تم بہت عظیم انسان ہو... دیومالائی کردار کی طرح دِکھتے ہو، ہرکولیس!... میں عمر بھر تمھاری غلامی میں رہنا پسند کروں گا... مجھے دو مرتبہ جنم دیا ہے تم نے...'' اِسی طرح کے تعریفی کلمات اُس کی زباں سے خودرو پودے کی طرح پھوٹنے لگے۔ وہ بے طرح بڑک رہا تھا۔ میں نے اُسے اُس کے حال پر چھوڑ دیا۔ آخر کار وہ میرے پیروں پر نزاکت سے سر رکھ کے رو پڑا۔ اُس کے سوتے بے تابی سے پھوٹے تھے۔ میں اُس کی کیفیت بہ خوبی سمجھ رہا تھا۔ کبیدگی کے باوجود میں نے اپنے پیر نہیں کھینچے۔ اسی لمحے میں نے یہاں سے فوری طور پر نکلنے کا فیصلہ کیا۔ جذباتی تھپیڑوں کی زد سے لیونارڈ جب ذرا باہر نکلا تو میں نے اُسے شیر کی آنکھ میں گھپا ہوا چاقو نکال لانے کو کہا۔ وہ لپک کر گیا اور چاقو نکال لایا۔ اِس حادثے نے موجودہ مقام کا تعین کر دیا تھا۔ یہ یقیناً ہندستان کا خطرناک گر جنگل تھا۔ میں نے شکلاجی کے ساتھ قیام کے دوران پڑھا تھا کہ افریقہ کے بعد گر کا جنگل دنیا میں وہ واحد مقام ہے جہاں ببر شیر پائے جاتے ہیں۔ گر کا جنگل سرسبز میدانوں اور مختلف النوع اشجار کے میلوں لمبے جھنڈ پر مشتمل تھا۔ ہم اس وقت یقیناً گر کے جنگل میں موجود تھے۔ یہ جنگل درندوپرند دونوں اقسام کے جان وروں سے اٹا پڑا تھا۔ ہمیں یہاں سے جلد از جلد نکلنا تھا، کیوں کہ جنگل میں جہاں لاش پڑی ہو وہاں میلا لگ جاتا ہے۔

''بلاوجہ متشکر ہو رہے ہو... تم نے اپنی زندگی خود بچائی ہے میں نے نہیں۔''

''ہاں، تم ٹھیک کہہ رہے ہو... وہ میں ہی تھا جس نے ہول ناک تاریکی میں شیر کی آنکھوں کا اِس قدر سچا نشانہ لگایا تھا... بلاشبہ چاقو زنی میں تم نادرِ روزگار ہو۔''

''مدحت سرائی کی بجائے یہاں سے نکلنے کی فکر کی جائے تو بہتر ہوگا۔'' اُس کا خلوص سر آنکھوں پر، لیکن خودنمائی کا بوجھ بے جان لاشے سے کم نہیں ہوتا۔ میرے لیے میں اکتاہٹ ایک فطری امر تھا۔

''مقدس باپ کی قسم! چلو... میں تمھارے قدموں میں بچھ جاؤں گا۔'' اُس کی آواز تپش آلود تھی۔ وہ بے چین ہو کے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے بعد ہم دونوں ایک دوسرے کا سہارا بن کے چل پڑے۔ چلتے چلتے اُس نے شیر کی کھال اتار لے چلنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ جس پر میں بھڑک اٹھا تھا۔ مجھے غصّے میں دیکھ کے وہ چپلا پڑ گیا تھا۔ میرے پاؤں میں درد کے ناقابلِ برداشت پہاڑ ٹوٹ رہے تھے، لیکن اب قدم رُکنے کے لیے بھی تیار نہ ہوئے۔ ہم نے سڑک کے کنارے کنارے چلنا شروع کر دیا۔ چلنا بھی کیا تھا، ہم دھیرے دھیرے کھسک رہے تھے۔ جہاں دَم ٹوٹتا وہاں پڑ جاتے۔ تحائفِ قدرت سے جو مل جاتا، شکم سیری کر لیتے۔ رات آتی تو باری باری نیند کر لیتے۔ قریباً چوتھے روز ہم ایک پختہ اور بڑی سڑک تک جا پہنچے۔ سرخ اینٹوں سے بنائی گئی سڑک کی دوسری جانب باجرے کی نوخیز فصل ہلکورے

لے رہی تھی۔ صبح نرم کا وقت تھا، سورج کا کاروبار ابھی ماند تھا۔ آثار قریب ہی آبادی کی نوید دے رہے تھے۔ ہم بدحالی وناتوانی کا مجسّم نمونہ بنے وہیں ڈھے گئے جہاں سے سڑک کے اُس پار کھیت نظر آئے تھے۔

''اب کیا ارادے ہیں دوست!'' لیونارڈ نے ہانپتے ہوئے کہا۔ خوشی اُس کے چہرے سے ابل رہی تھی۔ راہ چلتے گذشتہ تین دن اُس نے دنیا جہان کی باتوں میں گزارے تھے۔

''تقدیر پر منحصر ہے کہ ہمیں پہلا آدمی کس قماش کا ملتا ہے۔ البتہ مجھے قوی امید ہے کہ ہمیں خاص دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔'' میں نے اُسے تسلّی دی، لیکن میرے لیے یہ سڑک کڑا امتحان بن کے کھڑی تھی۔ مجھے اُسی جانب جانا تھا جہاں سے ہم آئے تھے۔ اُس لاری کے اڈّے پر... اس سے آگے کچھ سوچا نہ گیا۔ بہت دیر ہو چکی تھی، مولوی شفیق کے سراغ پر کئی دنوں کی مٹی پڑ چکی تھی۔ بس کا ڈرائیور یا اُس کا گماشتہ ہفتہ بھر قبل کے کسی مسافر کا سراغ نہیں دے سکتا تھا، لیکن نہیں، میں نے خود ہی اپنی رائے مسترد کی۔ وہ لاری اڈّا ایک چھوٹے قصبے کا نظر آتا تھا۔ وہاں سے مولوی صاحب کا سراغ آسانی سے مل سکتا تھا۔ بہت ممکن تھا مولوی صاحب اِس قصبے میں قیام پذیر ہوں۔ وہ کسی کام سے نزدیکی شہر گئے ہوں اور واپس لوٹ آئے ہوں۔ کورا نے بھی ان کے ساتھ جانے پر اصرار باندھا ہوگا یا پھر مولوی صاحب کے لیے کورا سے متعلق قابلِ اعتماد کوئی نہ رہا ہوگا۔ ہم کچھ دیر ستا کے وہاں سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ مجھے مغربی سمت کچھ بھینی بھینی محسوس ہوئی۔ ہم نے اُسی جانب سڑک پکڑ لی۔ کچھ ہی دیر بعد سورج نے دھوپ بانٹنی شروع کر دی۔ کچھ وہ سخاوت پر مائل تھا اور کچھ اس راستے پر سایہ مفقود تھا۔ تپش سے جسم پگھلنے لگا تھا۔ چند فرلانگ طے کرنے میں گھنٹوں لگ گئے، لیکن ہم قریب سَو کے لگ بھگ مکانات پر مشتمل بستی میں پہنچ گئے۔ ہمارا حلیہ کسی کو متوجہ کرنے کے لیے کافی تھا، گرد اور میل سے اَٹے ہوئے بے ترتیب بال اور بدن کا بالائی حصّہ ہم دونوں ہی کا برہنہ تھا۔ کرتا اور قمیص دھجیوں کی نذر ہو چکی تھی۔ اِس کے علاوہ ایک گورے انگریز کا دگرگوں حال میں نظر آنا چٹپٹی خبر تھی۔ جو ایک گلیارے میں قدم رکھتے ہی پوری بستی میں سنسنا گئی۔ چند ہی لمحوں میں متجسس نگاہوں سے گھورتے ننگ دھڑنگ بچّوں نے ہمیں گھیر لیا۔ نہ جانے کیوں محسوس ہوا، پسِ دیوار مکانوں میں سرگوشیاں اور قیاس آرائیاں شروع ہوگئی ہیں۔ بستی کیا تھی سڑک کے کنارے دو تین سَو گز تک چلے گئے مکانوں کا سلسلہ تھا۔ سڑک پر اِکّا دُکّا دکانیں بھی تھیں۔ لیونارڈ کا خیال تھا کہ یہاں پولیس کی چوکی یا کم از کم ایک سپاہی ضرور تعینات ہوگا اور وہی فی الفور ہمارے کسی کام آ سکتا تھا۔ ماتھے پر تِلک لگائے سرخ اور زرد ساڑھیوں میں ملبوس سانولی عورتیں، گورے انگریز کو دیکھنے کے لیے دروازوں پر جم گئی تھیں، اور چاروں طرف سے مرد نکل نکل کے ہماری طرف بڑھ آئے تھے۔ یہ جنگل سے قریب ترین بستی تھی۔ اگر جنگل میں باروچیہ کا ٹھکانا تسلیم کر لیا جائے تو اِس بستی میں اُس کے گماشتوں اور مخبروں کی موجودی لازم تھی، اور ہمارا سب سے زیادہ انتظار اِسی بستی میں کیا گیا ہوگا۔ ہم برگد کے ایک جسیم درخت کے سائے میں پہنچ کے ٹھہر گئے۔ درخت کا تنا بے حد تناور اور شاخیں لامکاں کی طرح پھیلی ہوئی تھیں۔ برگد کے تنے کے ساتھ کرسی میز رکھے حجام ایک بچّے کے بال تراشنے میں مصروف تھا۔ گدلا اور دھندلایا ہوا شیشہ اُس نے تنے پر ٹانک رکھا تھا۔ وہ سیاہ فام اور منحنی دیہاتی تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی سہم گیا۔ اُس کے ہاتھوں میں مشاقی سے مچلتی ہوئی قینچی دھک سے رک گئی۔ اُس کی آنکھوں میں وحشت سی سمٹ آئی تھی۔ لیونارڈ اناڑی پن سے نلکے کی ہتھی کو ہلانے لگا، جو درخت کے ساتھ ہی لگا ہوا تھا۔ میں نے حجام سے پوچھا، ''یہ کون سی بستی ہے؟'' مجھے جواب دینے کے بجائے وہ سہم کر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ درخت کے چاروں اور دیہاتیوں نے گھیرا ڈال لیا تھا، اُن کی چہ می گوئیاں اور

پریشان نظریں ہمارا احاطہ کر رہی تھیں۔ لیونارڈ نے مجھ سے کہا، ''ان سے پولیس چوکی یا کسی سرکاری ملازم کے بارے میں استفسار کرو۔'' لیونارڈ سمجھ رہا تھا کہ یہ لوگ محض متجسّس ہو کے ہمارے گرد جمع ہوئے، لیکن میں اُن کی سراسیمگی سے کچھ اور معنی اخذ کر رہا تھا۔ میں نے حجام سے پوچھا، ''یہاں کوئی پولیس والا ہے؟'' لیکن وہ میری پشت پر کچھ دیکھنے لگا۔

''کھنڈریں پولس ہے۔ بدھوائی پولس ہے بالک!''

میں نے پلٹ کے دیکھا۔ بھیڑ کو کھدیڑتا ہوا ایک لمبا تڑنگا، کالا بھجنگ میرے مقابل کھڑا تھا؛ اُس کا قد دو گز سے قدرے نکلتا تھا۔ چندیا پر سے بال اڑے ہوئے تھے۔ بچے کھچے بال تیل میں چپڑے اور سلیقے سے جمے تھے۔ آنکھیں کبوتر کی طرح سرخ تھیں۔ گلوں کا گوشت لٹکا ہوا تھا۔ اُس کی عمر چالیس سے پینتالیس کے لگ بھگ ہوگی۔ چہرے کے نشانات سے اُس کی قماش مترشح تھی۔ زرد کرتا، سفید پاجامہ پہن رکھا تھا، اور ماتھے پر سرخ رنگ کا بڑا سا تِلک چمک رہا تھا۔ اُس نے گہری نظروں سے ہمارا طواف کرتے ہوئے کہا، ''پولیس کے تھتو پر جرور چڑھوائیں گے۔ ابھی ہم سے نیاج نجر کرنے کا ہے، کھنڈریں دتوں سے انتجار کرنے کا ہے۔ بڑھیا کرارگر سے نکل کے۔'' اُس نے گلے میں ڈالا ہوا رومال زور سے جھٹکا۔

چاقو نیفے میں اُڑسا ہوا تھا۔ اس میں کوئی شبہ نہ رہا تھا کہ وہ باروتیہ کا گماشتہ تھا۔ اگر وہ باروتیہ کا گماشتہ تھا تو باروتیہ کے گروہ کی تصویر دوسری بن رہی تھی۔ میں پہلی نظر میں اُس کا قبیل جان گیا تھا۔ یعنی باروتیہ علاقے کے داداوں اور استادوں کے اکھٹ کو روایت کے برعکس استعمال کر رہا تھا، لیکن قیاس یہاں بھی اُلجھ رہا تھا۔ باروتیہ نے انتہائی منظم طریقے سے بحری جہاز اغوا کیا تھا اور نہایت آسانی سے مغویوں کی بڑی مقدار کو اپنے ٹھکانے تک پہنچانے میں بھی کامیاب ہوا تھا۔ یہ کام اڈے پاڑے کے لوگوں کے بس کا روگ نہیں تھا اور نہ ہی اس کے کارندوں میں کوئی شخص ایسا نظر آتا تھا جس پر اڈے پاڑے سے وابستگی کا شبہ گزرتا، لیکن میرے سامنے تن کے کھڑا ہوا یہ شخص ہر قسم کے شک و شبہے سے بالا تھا۔

''مسافر ہیں، راستہ بھٹک گئے ہیں۔'' میں نے اُسے رسانی سے جواب دیا۔ دفعتاً ہانپتے کانپتے چار مشٹنڈے اور آن وارد ہوئے۔ وہ کہیں دُور سے دوڑتے ہوئے آئے تھے۔ کالا بھجنگ جو یقیناً اُن کا استاد تھا کو دیکھتے ہی ٹھٹک گئے۔ انھیں دیکھ کے وہ بھڑک اُٹھا۔ ''ماں کا کھسم دیکھے گئے تھے۔ پھنے کھان ادھر سیر سپاٹے کرنے کا نہیں۔ اُن چھنال پر مرے ہوگے۔'' اُس نے آگے بڑھ کے ایک کو ڈھیلا ہاتھ بھی جڑ دیا۔ لیونارڈ نے مجھ سے صورتِ حال کے بارے میں استفسار کیا۔ میں نے اُسے تسلی رکھنے کا کہا۔ ابھی تک یہ واضح نہیں ہوا تھا کہ وہ ہم سے کیا چاہتا تھا۔ میں نے کرید لگائی۔ ''تمھیں یقیناً غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں اپنے دوستوں کے ساتھ شکار کی غرض سے آیا تھا۔ ہماری جیپ حادثے کا شکار ہوگئی۔ رات کو ہمارے پڑاؤ پر شیروں نے ہلّا بول دیا۔ ہم بہ مشکل جان بچا کے یہاں تک پہنچے ہیں۔ اگر آپ لوگ ہمیں نزدیکی شہر تک پہنچا دیں تو بے حد مہربانی ہوگی۔''

''چھلیا سے چھل کرنے کا ہے؟...'' وہ وحشت شرابی کی طرح جھوما۔ ''بڑا آیا برجمان!...'' میں اُس کے مُنہ سے اپنا نام سُن کے بری طرح اچھل پڑا تھا۔ ''کیوں سندرتا! کھڑا میلا کرنے کا نہیں ہے۔ بس نام کا چنتا تھی، تُو نے ٹھپا لگا دیا۔'' وہ ڈولتے ہوئے میرے قریب ہوگیا تھا۔ اُس کے مُنہ سے اپنا نام سُن کے میرا پورا وجود سنسنا گیا تھا۔ اُس نے اب تک لیونارڈ پر ذرا بھی توجہ نہیں کی تھی۔ میں نے دو قدم پیچھے کھسک کے اُس کے اور اپنے درمیان فاصلہ بڑھا لیا۔ اپنا نام سُن کے میں اضطرار پوشیدہ نہیں رکھ سکا تھا۔ اب بات آگے بڑھانا بے کار تھا۔

''معاملہ کیا ہے استاد؟'' میں نے اپنا لہجہ بدلتے ہوئے کہا۔ چاروں مشٹنڈوں نے چاقو نکال لیے تھے۔

''وہ پانچی دھرتی پھاڑنے کا ہے سوامی جی! کشٹ بھر دیا جگرے میں۔ تیرے سانجھیوں نے بڑا اجلم کیا ہے۔''

سانجھیوں کے ذکر پر میرے اوسان خطا ہوگئے۔ سراسیمگی و وحشت سے میرا چہرہ یقیناً تاریک ہوا ہوگا، عجیب بے بضاعتی کا عالم در پے تھا۔ بٹھل میری گم شدگی سے بپھر گیا ہوگا۔ اُس نے یہ اعتبار تو کیا ہی نہ ہوگا کہ میں فرار ہوگیا ہوں۔ وہ یقیناً آتش نمرود میں کودا ہوگا۔ میرے پیروں تلے سے زمین سرک گئی تھی۔ ''کیا ہُوا میرا سانجھیوں کو؟'' میں نے اٹکتے ہوئے اُس سے سوال کیا۔

''وہ ابھی ہونے کا ہے بھڑووں کے ساتھ... کدھر جانے کا ہے پھر۔ ادھر بستی بستی سورگباشی باپو کے بیروں سے بھری ہے۔ گر کے چاروں اور رکھوالی ہے۔ اُدھر ہی مرنے کا ہے یا پکڑنے کا ہے۔'' وہ شدید غصّے میں پھنپھنا رہا تھا۔

''سورگباشی باپو؟'' میری زبان اٹکنے لگی۔

''جرا نشانہ نہیں چوکا۔ دل میں گھسا ہے جا کے چاقو، سیدھم سیدھ... تیرے سانجھی نے باروتیہ باپو کی ہتیا کر دی، ایک راکھس مارا گیا، دو بھاگ لیے۔ گوری کنہیا کو لے کے۔ کیوں چار جنے تھے نہ تم؟''

وہ اچھل اچھل کے چیخ رہا تھا اور میرا دل بند ہو رہا تھا، دھڑکنے سے انکاری تھا۔ ایک راکھس مارا گیا کا مطلب؟ زورا! جمرو! یا بٹھل! یہ سوچ کر ہی کنپٹیاں سلگنے لگیں۔ نہ جانے کتنوں کا قتل میرے دامن پر تھا، موت بھی عجیب طور سے رسمِ عاشقی نبھا رہی تھی۔ بس میرے گرد ہی پروانہ وار رقص کر رہی تھی۔ مجھے اپنی دل بستگی کی خاطر تماشائے عالم کی خاطر زندہ رکھ لیا تھا۔ دوسروں کو گولیاں، خنجر، زخم اور بیماریاں کیوں لگ جاتی ہیں۔ یکایک میرے اردگرد کھڑے لوگ دھندلا گئے۔ میں لڑکھڑا کے گرنے لگا تو لیونارڈ نے بڑھ کے تھام لیا۔ ''بار... مجھے کچھ بتاؤ... یہ جاہل شخص کیا بکواس کر رہا ہے۔''

میں اُسے کیا بتاتا۔ یہی کہ میں اپنے پیاروں کے لیے موت کا پیامبر ہوں، دکھ اذیت اور مصیبت میری طرف سے تحفۂ عام ہے۔ جو چاہے گلے سے لگائے اور وصول لے۔ باروتیہ کو چاقو بٹھل ہی مار سکتا تھا، لیکن بٹھل نے ایسا کیوں کیا تھا، کیا اُس نے مجھے مردہ سمجھ لیا تھا۔ اگر واقعی ایسا تھا تو باروتیہ پر چاقو زنی معمولی کام تھا۔ کون سی گوری میم اُن کے ہم راہ نکلی تھی۔ کیا وہ مایا کو نکال لے گئے تھے۔

''ایک بھی انگریج نہیں چھوڑا سارے مار دیے۔ پانچ بچے ہیں جندہ، ایک تُو، یہ، گوری چھنال اور دو تیرے سانجھی!'' چھلیا نے مجھے گردن سے پکڑ کے اُٹھایا۔ ''ابھی رندھاوا تیرے کو جندہ مانگتا ہے۔''

''میں تم سے اُلجھنا نہیں چاہتا۔ میرے راستے سے ہٹ جاؤ!'' میں نے اپنے ذہن پر چھائی اندھیاری کو جھٹکتے ہوئے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔ مجھے اُس سے مکمل تفصیل کی حاجت تھی اور وہ اُس لمحے حاکمِ وقت تھا۔

''سنتے ہو بستی والو! چھلیا کو راستے سے ہٹانے کا ہے چھورا! امّا کا دودھ تجھ سے چپکا ہے پچھمن!'' بستی والوں نے قہقہہ لگانا اپنا فرض سمجھا۔ بستی میں اُس کی دہشت ٹھیک ٹھاک لگتی تھی۔

میں نے وقت ضائع کرنا غیر مناسب سمجھا۔ دو دو ہاتھ کیے بغیر چارہ نہیں تھا۔ میں نے نیفے سے چاقو نکال لیا، لیکن چاقو کھولنے سے گریز کیا۔ یہ ایک نفسیاتی حربہ تھا۔ بند چاقو تولنے کا مطلب مقابل پر حملہ نہیں، بل کہ اُسے اپنا چاقو باہر نکالنے پر اُکسانا تھا۔ یہ بات چھلیا بہت بہتر جانتا تھا۔ اُس کے گماشتوں نے یکایک اپنے چاقو کھول لیے۔ لیونارڈ صورتِ حال کو کسی حد تک سمجھ رہا تھا، اُس کے چہرے پر ایک مرتبہ پھر موت کی زردی کھنڈ گئی۔ چھلیا کی آنکھوں میں استہزا اُمڈ آیا۔ اُس نے ہاتھ کے اشارے سے مشٹنڈوں کو روک دیا۔ کمالِ چابک دستی سے اُس کا ہاتھ جیب میں گیا تھا، پھر بڑے سبھاؤ سے اُس کی کلائی مچلی تھی۔ چاقو فضا میں اچھلا اور دوسرے ہاتھ تک پہنچتے ہوئے فضا ہی میں کھٹکے سے کھل گیا تھا۔ یہ انتہائی مہارت کا مظاہرہ تھا۔

”چاقو کی نوک پر چھلیا نہ چاہے تھا چھورے! رندھاوے نے تمھیں جندہ مانگا ہے، پر تجھے مار کے مجا آئے گا۔“ چاقو شرارے کی مانند اُس کے ایک ہاتھ سے دوسرے میں لپک رہا تھا۔ مجمع میں موت کی خاموشی طاری ہوگئی تھی۔

سارا کھیل ہی نظر کا ہے۔ میری نظریں اُس کے ہاتھ سے زیادہ متحرک تھیں۔

”حماقت نہ کرو بابر! وہ چاقو زنی کا بہت بڑا ماہر معلوم ہوتا ہے۔ ذرا دیکھو تو سہی، اُس کے ہاتھ کس قدر چاقو شناس ہیں۔“ لیونارڈ نے سہمی ہوئی آواز میں سرگوشی کی۔

”بکواس بند رکھو۔ تمھاری وجہ سے میرا ارتکاز خراب ہوسکتا ہے۔“ میں نے سفّاکی سے اُسے جھڑک دیا۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو مستقل مُضر رہتا۔ میں بہ دستور ساکت کھڑا اُسے تول رہا تھا۔ میرا چاقو بند تھا۔ میں نے ایک اور نفسیاتی داؤ کھیلا۔ آنکھوں میں بھرپور تمسخر اور تحقیر بھر کے اپنا چاقو گرا دیا۔ یہ منظر دیکھ کے مجمع میں پھریری دوڑ گئی۔ سرگوشیاں بلند ہوگئیں۔ کسی منچلے نے سیٹی بھی ماردی۔ ”چھورے تو گیا!“

چھلیا نے تلملا کے چاقو والا ہاتھ سیدھا کیا اور ایک قدم کا استعمال کرتے ہوئے عین سینے پر وار کیا۔ میں نے ساکت کھڑے کھڑے ٹھیک اُس لمحے اپنی جگہ چھوڑی تھی کہ جھونک میں نکلتے ہوئے اُس کی کہنی میرے شانے کو چھوتی ہوئی نکلی تھی۔ اُسے میرے اندازے سے زیادہ خود پر قابو تھا۔ اگلا قدم زمین پر پڑتے ہی وہ ایڑی کے بل میری جانب گھوما تھا۔ چاقو والا ہاتھ نصف دائرہ مکمّل کرتے ہوئے بالکل میرے پیٹ پر آیا تھا۔ میرے پاس الٹی جست لگانے کے سوا دوسرا داؤ نہیں تھا اور اُسی کو میں نے آزمایا۔ اُس کا چاقو والا ہاتھ جیسے ہی ہَوا میں گھوم کے واپس ہُوا، مجمع نے لمبی سانس بھری۔ گویا وہاں کھڑے تمام افراد کا دل ایک آواز میں دھڑکا تھا۔ میں نے چار قدم کے فاصلے پر برق رفتاری سے کھڑے ہو کے ایک استہزائی مسکراہٹ اُس کی طرف اچھالی۔ وہ بھی گھاگ تھا۔ فوراً میرے حربے کو تاڑ گیا۔

چیخ پائی کے بجائے اُس نے پُرسوچ مسکراہٹ اپنے چہرے پر بکھیری۔

”ارے چھورے، ابھی سے ہے، چاقو اٹھانے کا ہے۔ چھلیا خلم کرنے کا نہیں ہے۔“

”چھلیا وار کر... بہانے سے وقت حاصل نہ کر۔“ میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ ہرچند وہ سمجھ رہا تھا کہ میں اُسے طیش دلوانا چاہتا ہوں، لیکن یہ روگ ہی ایسا ہے کہ انسان مزے مزے سے اسے گلے لگاتا ہے۔ چھلیا کے نتھنے پھڑکنے لگے تھے۔

”تیری ماں کا... سالے۔“

چھلیا نے لپکتے ہوئے دائیں طرف وار کرنے کا جھانسا دیا۔ میں بہت آرام سے اُس کے دام میں آگیا۔ اگلے ہی لمحے سرعت سے چاقو اُس کے بائیں ہاتھ میں تھا۔ اُس کے خیال میں میرے پاس پہلو بدلنے کی مہلت نہیں تھی۔ اُس کا خیال ٹھیک ہی تھا۔ اگر میں قبل از وقت اُس کا داؤ بھانپ نہ لیتا تو واقعتاً میرے پاس پہلو بدلنے کی مہلت نہ ہوتی، اور وہ اطمینان سے اوجھڑا نکال باہر کرتا۔ اُس نے اندازاً چاقو چلایا، لیکن میں بائیں طرف پہلو بچانے کے ساتھ ہی نیچے بیٹھ چکا تھا اور کسی کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا ہوا۔ چھلیا سیدھا فضا میں اُٹھا اور مُنہ کے بل زمین پر آرہا تھا۔ اُس کا ایک گماشتہ صورتِ حال دیکھ کے تیزی سے میری جانب بڑھا۔ چھلیا نے نیچے گرے ہوئے ہی ٹانگ اڑائی اور اُسے گرا دیا۔

”میرے جیتے اُسے کوئی ہاتھ نہیں لگانے کا ہے۔“ جندگی میں پہلی بار کی چھلیا کا چاقو کسی نے ہَوا میں گھمایا۔ چھورا گھٹ نہیں دِکھنے کا ہے۔“

وہ بڑبڑ کرتا لپک کے اُٹھ کھڑا ہُوا۔ اُس نے پینترے بدل بدل کے مجھ تابڑتوڑ حملے کیے۔ ہر ممکن داؤ آزمائے، لیکن میرے جسم پر ایک خراش ڈالنے میں بھی ناکام رہا تھا۔ میں نے محسوس کرلیا تھا، اُس کی آنکھوں میں دہکتے ہوئے الاؤ کی جگہ مچلتے ہوئے اشتیاق اور حیرانی نے لے لی تھی۔

بستی والوں کے لیے یہ لڑائی کسی دیومالائی قصّے سے کم نہیں تھی۔ وہ یوں محوِ تماشا تھے کہ پرندے سروں پر بیٹھ جائیں، پھر مجھے جیسے ہی موقع ملا میرا ایک ہاتھ اُس کی کلائی پر پڑا اور دوسرا کہنی پر، اگلے لمحے اُس کا چاقو میرے ہاتھ میں چمک رہا تھا۔ چھلیا کو تو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ وہ مبہوت مجھے دیکھا کیا۔ میں نے چاقو واپس اچھال دیا۔ اُس نے چاقو تھام لیا تھا، لیکن بہ دستور خالی نظروں سے مجھے دیکھتا رہا۔ مشہدوں کے سر جھک گئے تھے۔ مجمع کی بھنبھناہٹ تیز ہوگئی تھی، پیچھے کھڑے ہوئے چلبلے سیٹیوں پر سیٹیاں بجا رہے تھے۔

دفعتاً چھلیا نے چاقو چوما، بند کیا اور میرے قدموں میں ڈال دیا۔ چند لمحوں قبل نفرت، کدورت اور بغض سے بھرا ہُوا چھلیا اس وقت سراپائے عجز و محبّت بنا میری سامنے کھڑا تھا۔ اُس کی دیکھا دیکھی اُن چاروں نے بھی اپنے چاقو بند کیے اور میرے قدموں میں ڈال دیے۔

”ماتا پتا کی سوگند! چھلیا آج سے تیرا گلام لگنے کا ہے۔ ایسا مٹّی کسی نے پلیت نہیں کیا۔ ایسا کتائی کبھی نہیں پڑا۔“ چھلیا کی آواز رُندھ گئی، اُس کا سینہ اُبلنے لگا اور وہ کھڑے کھڑے لرز رہا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کے چھلیا کو سینے سے لگالیا اور وہ بلک بلک کے رونے لگا۔ مجمع میں ہاہاکار مچ گئی۔ ایک نے پہل کی پھر سارا مجمع ہی ٹوٹ پڑا۔ لیونارڈ حیرت سے بار بار اپنی انگلی کاٹتا تھا۔ اُنھوں نے مجھے اور چھلیا کو اپنے کندھوں پر اٹھالیا۔ چھلیا لوگوں کی منّت سماجت کرکے نیچے اتر آیا۔ اُس کا کہنا تھا کہ کندھوں پر اٹھائے جانے کا حق صرف میرے لیے تھا، پھر چھلیا کی رہنمائی میں لوگ بستی کے وسط کی جانب چل پڑے۔ میرے بے حد اصرار کے باوجود اُنھوں نے مجھے نیچے نہیں اتارا۔ عجیب تماشا لگ گیا تھا؛ عورتیں اور لڑکی بالیاں دروازوں پر لدی ہوئی اِس تراِلے جلوس کو دیکھ رہی تھیں۔ کچھ دیر چلنے کے بعد چھلیا کا ٹھکانا آگیا۔ وہ چھوٹا سا، مگر پختہ کمرا تھا۔ کمرے جتنا ہی مختصر صحن تھا، جسے باہر سے آئی ہوئی دوفٹ کی شاخوں نے مکمّل چھت دیا تھا۔ صحن کا فرش کچّا تھا جسے یومیہ لیپاپوتی کے ذریعے ہم وار اور سخت کیا گیا تھا۔ کمرے کے دروازے کے ایک طرف مٹّی کا گھڑونچا رکھا تھا؛ جس پر پانی ٹھنڈا رکھنے کی غرض سے پٹ سن کی بوری لپٹی ہوئی تھی۔ گھڑونچے کا ڈھکن لکڑی کا تھا جس کے وسط میں میخ ٹھکی ہوئی تھی، جس پر سوتی ڈوری سے لکڑی ہی کا پیالا باندھا گیا تھا۔ دروازے کے دوسری جانب چوکی رکھی ہوئی تھی جس پر زرد رنگ کا گاؤتکیہ پڑا تھا۔ صحن میں اِتنی جگہ نہیں تھی کہ ہمارے مجمع کی سمائی ہوتی۔ چھلیا نے اپنے آدمیوں کو چیخ چیخ کے ہدایات دینی شروع کردیں۔ میں نے اُسے سختی سے منع کیا کہ وہ ہمارے لیے کسی قسم کا اہتمام نہ کرے، لیکن وہ تو گراں گوش ہورہا تھا۔ ایک کو اُس نے لباس کے لیے دوڑایا تو دوسرے کو بستی کے اکلوتے مولوی صاحب کے پاس روانہ کردیا کہ اصیل قسم کے دوچار مرغ بسمل کروا آئے اور تاکید کردی کہ رتی بھر بھوجن سے عمدہ دیسی مسالے میں بھنوایا جائے۔ اگر رتی دین دھرم کی بات کرے تو اُسے چھلیا کا نام لے کے ڈرایا جائے۔ ایک تیسرے کو مختلف النوع ضروریات طعام کا انتظام کرنے کا ذمّے دار بنادیا۔ صحن میں بھاگم بھاگ ناریل کے پتّوں سے

بنائی گئی چٹائی بچھادی گئی تھی۔ ایک جوان نے مجھے کندھے پر ہنوز اٹھا رکھا تھا۔ دس بارہ اُس کے گرد گھیرا ڈالے کھڑے تھے۔ لیونارڈ عضوِ معطّل کی طرح حیرانی سے سب کچھ دیکھا کیا۔ آخر چوکی پر سفید چاندنی بچھادی گئی۔ دونوں سروں پر اگروان رکھ کے بتیاں آناً فاناً سلگادی گئیں۔ صحن کے کونوں کھدروں میں بھی جابہ جا اگربتیاں ٹھونس دی گئیں۔ ایک کارندہ دوڑا دوڑا کہیں سے سرخ مخملیں گاؤتکیہ لے آیا۔ اُسے چوکی پر زرد تکیے کی جگہ رکھ دیا گیا۔ اب چھلیا کے اشارے پر مجھے کندھے سے اترنے کا موقع فراہم کیا گیا۔ تانبے کی چمکتی ہوئی دودھ سے لبالب گھڑیا کو تانبے ہی کے تھال میں رکھا گیا اور اُس تھال کو چوکی پر رکھ دیا گیا۔ چھلیا نے ہاتھ کے اشارے سے چوکی پر بیٹھنے کی مجھ سے بنتی کی۔

''چھلیا بھائی! مجھے چوکی پر بیٹھنے کا ارمان نہیں اور نہ ہی میرے پاس یہاں ٹھہرنے کے لیے وقت ہے۔ تمھاری اِس قدر عزت افزائی نے سچ مانو پانی پانی کر دیا ہے۔ اگر کچھ بھلا ہی چاہتے ہو تو تنہائی میں کچھ وقت دے دو۔'' میں نے چھلیا سے صاف صاف بات کی۔ میں نے اب تک انتہائی تحمّل کا مظاہرہ کیا تھا۔ میں تحمّل کے ساتھ پیش آنے والے حالات کی تفصیل جاننے کے لیے یہ کشٹ اٹھا رہا تھا۔ کوئی کیسے جان سکتا تھا کہ میرا سینہ تیزاب سے لبریز ہانڈی کی طرح ابل رہا تھا۔

''مائی باپ! کھوپڑیاں اتار کے جانے کا ہے۔ بدھوئی ہند کی یاترا کی ہے، ہن کاٹھیاواڑ جھک جھک نمسکار کرنے کا ہے۔ تیس سال میں چاقو پہلی بار گرنے کا ہے۔ مانو تو ادھر رام اُترا ہے۔ ابھی جانے کا بات نہیں بولنے کا ہے۔ تیرے چاقو کا چمکار کھسری کیسا ہوئیں گا۔'' چھلیا کھڑک کے پلٹا اور میرے پانو میں حلقہ ڈال دیا۔ اُس کی عمر سے شرم آتی تھی۔ میں ہزار انکار کرتا رہا اور وہ ہزاروں اصرار۔ آخر کار چوکی چڑھنے ہی میں نجات نظر آئی۔ میرے بیٹھتے ہی چھلیا نے اپنا چاقو نکالا اور دودھ سے لبریز گھڑیا میں ڈال دیا۔ چاقو سے

بہ قدر دودھ چھلکا اور تھال میں جمع ہو گیا۔ اُس کے بعد بہت سے آئے اور باری باری اپنا چاقو گھڑیا میں ڈال گئے، پھر وہ سب میری طرف متوجہ ہو گئے۔ میں نے اپنا چاقو سختی سے مٹھی میں بھینچ لیا۔ آخر کار چھلیا سراپائے التجا بن کے کھڑا ہو گیا۔ ''سوامی جی! ایک گھونٹ داس بھرنے کا ہے۔''

''چھلیا بھائی! میری مجبوری کو سمجھنے کی کوشش کرو... مجھے یہاں سے فوراً جانا ہوگا۔''

چھلیا کچھ دیر دل مسوس کے کھڑا رہا، پھر اچانک بگولے کی طرح اُٹھا اور اپنا مُنہ تھپڑانے لگا۔ دامن چیر کے دولخت کر لیا۔ ''پاپی مورکھ کے بھاگ ابھی اور جلنے کا ہیں سوامی جی! مہاجن دیالو خالی ہاتھ پھیرے ہیں۔'' وہ دیوانہ وار تڑپنے لگا۔ اُس کی دیکھا دیکھی وہاں کہرام مچ گیا، سبھی دامن چاک کر کے صف بستہ ہو گئے۔ چھلیا خواہ مخواہ مجھے دیوتاؤں اور اوتاروں کا رتبہ دینے پر تل گیا تھا۔ چاقو گھڑیا میں ڈالنے کا مطلب اُن کے ساتھ دودھ ساجھا تھا، پھر میرے لیے ممکن نہیں تھا کہ میں اُن کی مرضی کے بغیر یہاں سے نکل سکوں۔ چھلیا کے اطوار سے لگتا تھا کہ وہ ہفتہ بھر سے پہلے مجھے نکلنے نہیں دے گا۔ آخر مجھے ایک ترکیب سوجھی۔ میں نے تیز آواز میں کہا، ''ٹھہرو، میری بات سنو!...'' میرے بار بار کہنے پر وہ بالآخر تھم گئے۔ میں نے اچانک اپنا چاقو چھلیا کے پیروں میں ڈال دیا۔

''چھلیا اب تم چاہو تو اپنے ہاتھوں سے گھڑیا میں ڈال دو! مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔''

چھلیا کے چہرے سے یک دم کسی نے خون نچوڑ لیا۔ پوری شکل پر زردی اور ویرانی کھنڈ گئی۔ وہ کچھ دیر سوچا کیا، پھر اُس نے لرزتے ہاتھوں سے چاقو اُٹھایا، کھٹکے سے کھولا، پھل کو بوسا دیا، آنکھوں سے مس کیا۔ وہ مُنہ ہی مُنہ میں کچھ بڑبڑایا، پھر اچانک اُس نے چاقو کو دوبارہ بوسا دیا اور اُسی پھرتی سے کلائی پر لمبی لکیر کھینچ دی، پھر چاقو بند کر، ہتھیلی پر رکھ کے مجھے پیش کر دیا۔ ''سوامی! آپ رکنے کا نئیں ہے تو اپنے

کو ساتھ لے جانے کا ہے۔''

میری زبان سے بے ساختہ جملہ پھسلتے پھسلتے رک گیا کہ چھلیا بھائی اِس سے بہتر ہے تم آتما جیا کر لو۔ میرے چاروں اَور موت گھومتی ہے اور ہر اُس شخص کو لپیٹ لیتی ہے جو میرے دائیں بائیں آگے پیچھے ہوتا ہے۔

''چھلیا بھائی! یہ بھی ممکن نہیں ہے، میں تو بنجارا ہوں، گلی گلی کی خاک چھانتا پھرتا۔ تم کہاں میرے ساتھ دھکے کھاؤ گے؟ شدید غلط فہمی ہوئی ہے چھلیا! وہ محض اتفاق تھا کہ میں تمھارا چاقو گرا سکا، ورنہ تم مجھ سے زیادہ دست رس رکھتے ہو۔'' میں نے اُس کے ہاتھ سے چاقو نہیں لیا۔ اُس نے میری ترکیب مجھی پر آزمائی تھی۔

پھر تو چھلیا بچوں کی طرح بلک بلک کے رو پڑا۔ فرش پر لوٹ پوٹ ہو گیا۔ باقی سب لوگ چپ سادھے کھڑے تھے۔ میں نے بہ مشکل چھلیا کو اٹھا کے لٹایا، پھر اُس نے مجھے ایک عجیب قصہ سنایا۔

چھلیا نے اناث آشرم میں ہوش سنبھالا تھا۔ تیرہ سال کی عمر میں وہ وہاں سے بھاگ نکلا۔ بمبئی کی سڑکوں پر آوارہ گردی اور فٹ پاتھ پر سوتے جاگتے اُس کی عمر بیس کے سن جا پہنچی۔ وہ اب تک چھوٹی موٹی چوری چکاری اور چھینا جھپٹی کرتا آیا تھا۔ اُسے چاقو زنی میں مہارت حاصل کرنے کا جنون تھا۔ وہ شوق کی تکمیل میں استاد بدلنے کے لیے علاقے بدلتا رہا، لیکن جب بھی وہ فن کو آزماتا، ایک آنچ کی کمی پاتا، پھر کسی ہم دم کے مشورے پر وہ دلّی جا پہنچا۔ وہاں کلّن خاں کا راج تھا۔ چھلیا نے کلّن خاں کے اڈّے کی ٹھان لی۔ پورا دلّی کلّن خاں کو حصّہ پہنچاتا تھا۔ چھلیا نے حوض قاضی کے علاقے میں چھیڑ چھاڑ شروع کر دی۔ یہ سلیم سنار کا علاقہ تھا۔ سلیم سنار کلّن خاں کے مُنہ چڑھے کی شہرت رکھتا تھا۔ ایک دن چھلیا سلیم سنار کے اڈّے پر پہنچ گیا اور اُسے للکار بیٹھا۔ سلیم سنار کے ہاتھ میں بجلی چمکتی تھی، لیکن قسمت نے چھلیا کا ساتھ دیا، اور اُس نے سنار کا چاقو گرا دیا۔

اُس کے بعد سلیم سنار دلّی میں نظر نہ آیا۔ خدا جانے اُسے زمین نگل گئی یا آسمان نے کھایا۔ حوض قاضی میں دو چار نے اور چاقو اُٹھایا، لیکن چھلیا سب پر بھاری رہا۔ استاد کلّن خاں کے پاس متواتر عرضیاں جا رہی تھیں۔ اِس سے پہلے استاد کلّن خاں کی طرف سے کوئی ردِ عمل آتا چھلیا از خود حصّہ لے کر استاد کے اڈّے پر پہنچ گیا۔ استاد کلّن خاں نے حصّہ لینے سے انکار کر دیا اور چاقو اٹھایا۔ چھلیا نے استاد کے قدموں میں چاقو پھینک دیا اور مافی الضمیر کہہ سنایا۔ پھر استاد نے چھلیا کو اپنے اڈّے پر جگہ دے دی اور سلیم سنار کی ڈھنڈوائی کروا دی۔ کہتے ہیں سلیم سنار دریا میں ڈوب مرا تھا۔ استاد کلّن سلیم سنار کو بھلا نہیں پایا تھا، لیکن اِس پر اُس نے چھلیا کو کبھی مطعون نہیں کیا۔ چھلیا استاد کے پاس پانچ سال رہا۔ اُن پانچ سالوں میں اُس نے استاد سے سارا فن نچوڑ لیا تھا۔ استاد کلّن کو غالب مُخلّے کے ایک جولاہے نے دودھ میں زہر دے دیا، جس سے استاد جانبر نہ ہو سکا۔ استاد کے بعد چھلیا دلّی میں نہیں رُکا۔ واپس کاٹھیاواڑ آ گیا۔ یہاں اُس نے احمد آباد کو اپنا مستقر بنایا۔ مہینے بھر میں پورا احمد آباد اُس کے سامنے سر جھکائے کھڑا تھا۔ استاد کلّن خاں کی محنت اُس پر خوب چمکی تھی۔ بڑے بڑے نامی گرامی استاد اُس کے سامنے پل بھر سے زیادہ نہیں ٹھہر سکے، لیکن چھلیا نے ہمیشہ اپنے اندر ایک کمی محسوس کی، جسے وہ محسوس ہی کر سکتا تھا، اُس کی نشان دہی پر قادر نہیں تھا۔ احمد آباد پر پورے دس سال کا راج تھا چھلیا کا۔ اُس کا ڈنکا ہر گلی، ہر محلّے میں بجتا تھا، لیکن چھلیا اب اکتا گیا تھا۔ کوئی زور آور اُس کے سامنے ٹک نہیں سکا تھا اور یہی بات اُس کی اکتاہٹ اور بے زاری میں اضافہ کر رہی تھی۔ وہ بھیس بدل بدل دوسرے شہروں کو نکل جاتا۔ اڈّے کے استادوں کو للکارتا، اور اگلے ہی لمحے چوکی پر بیٹھا داد دہش وصول کر رہا ہوتا۔ وہ پچھاڑ کا متمنّی تھا، اُسے جوڑ کی تلاش تھی، جو آج تک اُسے نہیں ملا تھا۔ چھلیا اپنی نوعیت کا عجیب دادا تھا کہ اُس نے

اپنی شکست کے ہزار حربے آزما لیے، لیکن وہ فاتح تھا اور فاتح ہی کہلایا۔ ایک مرتبہ وہ گرناتھ پہاڑی کی یاترا کر کے لوٹ رہا تھا، اُس کا گزر اِس بستی سے ہوا۔ یہاں اُس کی ملاقات ایک مہان گیانی سے ہوئی۔ اُنھوں نے چھلیا کے بتائے بغیر ہی اُس کا مسئلہ پڑھ لیا۔ گیانی نے چھلیا کو گیان دیا کہ اِس بستی سے ایک نوجوان کا گزر ہوگا اور وہ چھلیا کا چاقو آسانی سے گرا دے گا۔ وہی جوان چھلیا کا فن مکمل کرے گا۔

چھلیا تو ویسے ہی اڈّے بازوں سے بےزار تھا۔ اُس نے اِس بستی میں کچھ زمین خریدی اور یہیں پڑ رہا۔ پہلے سال اُسے واپس لے جانے والوں کا تانتا بندھا رہا، لیکن اُس نے سب سے ہاتھ جوڑ کے بنتی کر لی تھی۔ اِس بستی میں ٹھہرنے کی وجہ اُس نے آج سے پہلے کسی کو نہیں بتائی تھی۔ دو برس پہلے باروٹیہ اُسے تلاش کرتا ہوا یہاں تک آیا تھا۔ اُسے باروٹیہ بھلے مانس لگا تھا۔ باروٹیہ نے اُسے بتایا کہ وہ دیس کی آزادی کی جنگ لڑ رہا ہے۔ کاٹھیاواڑ کے تمام دادا اُس کے مطیع رہے ہیں، اور آج بھی ذہنی طور پر اُس کی برتری کو تسلیم کرتے ہیں، لہٰذا اُسے چھلیا کی وساطت سے کاٹھیاواڑ کے داداؤں کا تعاون درکار ہے۔ چھلیا نے اُسے بتایا کہ کاٹھیاواڑ کے داداؤں پر اُس کا زور نہیں چلتا، تاہم وہ اُن سب تک باروٹیہ کا پیغام اپنے الفاظ میں پہنچا دے گا، کیوں کہ چھلیا بھی انگریزوں کی حکومت کو سخت ناپسند کرتا ہے۔ سال بھر بعد اُسے اندازہ ہوا کہ باروٹیہ اپنے مقصد سے ہٹ گیا۔ وہ اب آزادی کی آڑ میں لوٹ مار اور عیش و نشاط کشید کر رہا ہے، لیکن اب باروٹیہ کا طوطی بول رہا تھا، اِس لیے چھلیا نے چپ رہنے ہی میں عافیت جانی۔ باروٹیہ چھلیا کی بے پناہ عزت کرتا تھا۔ اُسے مضبوط کرنے میں چھلیا کا نام بے حد کارآمد ثابت ہوا تھا۔ دو روز قبل باروٹیہ نے فتح کی خوشی میں ایک شان دار جشن کا سندیسہ بھجوایا تھا۔ اُس نے چھلیا پر بے حد اصرار باندھا تھا۔ گر جنگل کے بیچوں بیچ سرمئی پہاڑیاں ہیں، اُنھی پہاڑیوں کے غاروں میں باروٹیہ نے اپنا ٹھکانا بنا رکھا ہے۔ چھلیا نے بتایا کہ باروٹیہ ایک تعلیم یافتہ جوان تھا، اُس نے راج کوٹ سے بارہ جماعتیں پاس کر رکھی تھیں۔ چھلیا اِس سے قبل کبھی باروٹیہ کے ٹھکانے پر نہیں گیا تھا۔ باروٹیہ نے اُس کے لیے خصوصی تانگا بھیجا تھا، جو خود اُس کے استعمال میں بھی رہتا تھا۔ چھلیا نے انکشاف کیا کہ انگریزوں کو فریب دینے کے لیے ریاست کے نواب اور راجے باروٹیہ کی سرکوبی کے لیے دستے روانہ کرتے رہتے تھے، لیکن حقیقتاً باروٹیہ ریاستی سرپرستی میں پروان چڑھ رہا تھا۔ گھوڑا جب ایک دوڑ جیت جائے تو اُس کا بھاؤ بڑھ جاتا ہے اور وہ داو کے لیے پسندیدہ ترین ٹھہرتا ہے، اور باروٹیہ نے بےشمار دوڑیں جیت کر دکھا دی تھیں، اِس لیے ریاستی حکام اُس پر داو کھیل رہے تھے۔ باروٹیہ نے چھلیا کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اُسے ایک کشادہ غار میں لے جایا گیا۔ غار کا دہانہ تنگ تھا، لیکن وہ اندر سے کسی محل کی طرح کشادہ تھا۔ اُس میں ہوا کا گزر بہترین تھا۔ جگہ جگہ مشعلیں نصب تھیں، پورا غار بقعۂ نور بنا تھا۔ باروٹیہ نے چھلیا کو اپنے برابر بٹھایا۔ دو نیم برہنہ انگریز لڑکیاں مور پنکھ جھل رہی تھیں۔ باروٹیہ نے بتایا کہ اِس مرتبہ اُس نے وہ کام کر دکھایا ہے جس کا اُس نے برسوں سے خواب دیکھا تھا۔ اُس نے انگریز افسروں کی بہت بڑی تعداد اغوا کر لی ہے، ان کے ساتھ چند مقامی مخبر بھی پکڑے گئے ہیں۔ اُن کا ایک ساتھی انگریز افسر کے ساتھ فرار ہونے میں کام یاب ہوا ہے۔ اُس نے چھلیا کو بہت خاص کام کے لیے بلوایا تھا، تاہم باروٹیہ نے وہ خاص کام اب تک اُسے نہیں بتایا تھا۔ البتہ گفتگو کے دوران چھلیا یہ جان چکا تھا کہ اغوا شدگان کے تاوان میں سرِفہرست مطالبہ باروٹیہ کے بیٹے اور اُس کی انگریز بیوی کی حوالگی تھی۔ چھلیا کے آنے کے بعد سے احمد آباد میں اُس کا شاگردِ ارجمند تیتا چوکی سنبھالے ہوئے تھا۔ باروٹیہ نے اشاروں کنایوں میں ذکر کر دیا تھا، اُسے تیتا سے ضروری مدد درکار تھی۔ چھلیا کو اُس کے مقاصد کرانتی کاری کی عظیم

جدوجہد سے ہٹ کے ذاتی محسوس ہوئے تھے۔ باروٹیہ نے انگریز قیدیوں میں سے ایک دراز قد خاتون کو بلوایا۔ وہ بے حد حسین و جمیل اور باوقار تھی۔ باروٹیہ نے بتایا کہ اِس کا شوہر فوجی کپتان ہے اور وہ بھی اُس کی قید میں ہے۔ انگریز عورت کا نام مایا تھا۔ باروٹیہ نے رسیوں میں جکڑے ہوئے اُس کے شوہر کو بھی وہیں بلوایا۔ اِس کے بعد اُس نے بےہودہ حرکت کی، یعنی مایا کو بےلباس ہو کے برہنہ رقص کرنے کا حکم دے دیا۔ وہ اُس کے شوہر کو خاص تماشائی بنا کے حظ اٹھا رہا تھا۔ باروٹیہ کے ایما پر تینوں ہندُستانیوں کو بھی وہیں بلوایا گیا۔ باروٹیہ سمجھتا تھا کہ اِن تینوں کا انگریز عورت سے کوئی تعلق ضرور ہے۔ اپنی شناسا عورت کی سرِعام برہنگی کوئی برداشت نہیں کرتا۔ ہندُستانیوں کو وہاں بلوانے کا ایک مقصد اور بھی تھا، جس کا عقدہ مجھ پر بعد میں کھلا۔ ہندُستانیوں کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ مایا نے بےلباس رقص سے صاف انکار کر دیا تھا۔ وہ انگریزی میں چیخنے چلّانے لگی۔ باروٹیہ کے اشارے پر دو مسٹنڈے آ کے اُس سے نوچ کھسوٹ کرنے لگے۔ اُس عورت کے شوہر کا چہرہ تاثرات سے عاری اور سپاٹ تھا، جب کہ باروٹیہ اُسے تکلیف پہنچا کے ہی لذت کشید کرنا چاہتا تھا۔ اپنے مقصد میں ناکامی پر وہ بےچین ہو گیا۔ مسٹنڈوں نے مایا کا بالائی لباس تار تار کر دیا تھا۔ اُس کے شوہر کی نسبت ہندُستانی شدید بےچین دکھائی دیتے تھے۔ آخر اُن میں جو پختہ عمر اور سیانا تھا، اُس سے رہا نہ گیا؛ وہ شیر کی طرح گرج پڑا۔ اُس نے باروٹیہ کو سخت لعنت ملامت کی، اُس کے فعل کو گھٹیا قرار دیا اور نامردی سے تشبیہ دی۔ باروٹیہ بہت محظوظ ہوا۔ شاید یہی سب دیکھنے کے لیے اُس نے تماشا لگایا تھا۔ دفعتاً ایک مسلح پہرے دار تیز قدموں سے وہاں آیا، اور اُس نے باآوازِ بلند باروٹیہ کو بتایا کہ فرار ہونے والا ہندُستانی مخبر بھاگتے ہوئے مارا گیا۔ اُس کے بعد نہ جانے کیا ہوا چھلیا سمجھ نہیں سکا۔ یوں لگا تھا جیسے برق پارے کوندے ہوں اور بہت سے شیر مل کر دھاڑے ہوں۔ پختہ عمر ہندُستانی جسے اُس کے ساتھی بٹھل کہہ کے پکار رہے تھے، اُس نے نہ جانے کیا عمل دہرایا کہ اُس کے ہاتھ رسیوں سے آزاد ہو گئے، اور وہ آن کی آن میں تڑپتا ہوا باروٹیہ کے سر پر آ موجود ہوا۔ اُس نے خنجر کی زد پر باروٹیہ کو یرغمال بنا لیا اور اُس کی آڑ لے کر اپنے ساتھیوں اور انگریز خاتون مایا سمیت وہ نہ صرف غار سے نکلنے میں کام یاب ہوا، بل کہ کام یابی سے گر کے جنگل میں روپوش بھی ہو گیا، لیکن اِس سے قبل محافظوں نے اشتعال میں مبتلا ہو کے پیچھے سے گولیاں برسائیں تھیں، جن کی زد میں آ کے ایک ہندُستانی نوجوان جو اُن سب میں قوی الجثہ تھا، ہلاک ہو گیا۔ بٹھل جنگل میں روپوش ہونے سے قبل باروٹیہ کا نرخرہ کاٹ کے اُسے پھینک گیا تھا۔ باروٹیہ کی موت پورے گروہ کی موت تھی، وہاں کہرام مچ گیا۔ سخت اشتعال میں آ کے کارندوں نے ایک ایک انگریز قیدی کو گولیوں سے بھون دیا تھا، اب کیا باروٹیہ اور کیا اُس کا بیٹا اور کیا کرانتی کاروں کے مطالبات، سب کچھ باروٹیہ کے ساتھ ہی مٹی میں مل گیا تھا۔ تب سے کرانتی کار اُن ہندُستانیوں کو باؤلے کتے کی طرح تلاش کر رہے ہیں۔ اطلاع یہی ہے کہ اب تک وہ جنگل ہی میں روپوش ہیں، کیوں کہ جنگل کے گرد آباد تمام بستیوں میں کرانتی کار کڑی نگرانی کر رہے تھے۔

چھلیا نے بتایا کہ وہ باروٹیہ کی حقیقت سے واقف ہو چکا تھا، اِس لیے اُسے اتنا زیادہ دکھ نہیں ہوا، لیکن ریاستی عوام میں وہ ایک دیومالائی ہیرو کا درجہ رکھتا تھا۔ ریاستی عوام باروٹیہ کے قاتلوں کے لیے شدید غصہ اور نفرت رکھتے ہیں۔ چھلیا اپنی داستان مکمل کر کے ٹھہر گیا۔ میرا دماغ تو اُس کے ایک جملے پر سائیں سائیں کر رہا تھا کہ ہندُستانیوں کا قوی الجثہ ساتھی ہلاک ہو گیا تو کیا جمرو؟... اِس سے آگے مزید سوچا نہیں گیا۔ آنکھوں میں دھندلکے چھا گئے۔ چھلیا کہہ رہا تھا ''سوامی جی! ابھی تیرے کو جانا پڑ گیا ہوئے گا۔ اِدھر صرف تیرا انتجار کرنے کا ہے... چھلیا پر جا تو پھیر کے چلے جاؤ سوامی جی!... یا چھلیا

کو ساتھ لے جاؤ۔"

چھلیا اپنی بپتا کو لے کے گڑگڑا رہا تھا۔ اِدھر میرا وجود آندھیوں کی زد میں تھا، اور خشک پتّے کی طرح لرز رہا تھا۔ جمرو کی موت! اُس پر میرے مرنے کی اطلاع! بتھل تو جنگل پر جنگل اکھاڑنے پر تُلا ہوگا۔ ہنر کی سچائی مشق کی یکتائی سے وابستہ ہے تو ہم اہلِ صدمات کے ہنر کا کیا بیاں ہو۔ آخر میں بھی یکتائے ہنر تھا، نہ دل پھٹا، نہ لہو اُگلا، بس نمک بھر پانی اُمڈا، سو اُسے اندر ہی جذب کر لیا، یہی کمالِ ہنر ہے۔

"ٹھیک ہے چھلیا۔" میں نے اُس کے ہاتھوں سے چاقو اُٹھا کے چوم لیا، پھر تو جیسے در و دیوار سے شور اُمڈ آیا۔ کان پھاڑ فیل مچ گیا۔ چھلیا قہقہے مار کے ہنسنے لگا، وہ ہنس ہنس کے دہرا ہو رہا تھا۔ کسی نے لڈّوؤں سے بھرا تشت اچھال دیا۔ میں کچھ دیر خاموشی سے اُنھیں دیکھا کیا۔ بتھل کا ویران اور خاکستر سینہ مجھ سے اوجھل نہ تھا۔ وہ بارود کا پورا گروہ پھونک دیتا یا پھر جل کے راکھ ہو جاتا، لیکن یہاں سے نہیں جا تا۔ میں نے ذرا سکوت کے بعد تیز آواز میں کہا، "چھلیا! مجھے تیری مدد درکار ہے... مجھے اپنے ساتھیوں کی تلاش اور خیریت و عافیت مطلوب ہے۔"

"پھکر کرنے کا نہیں ہے سوامی جی! چھلیا نے پاپ میں مُنہ کالا نہیں کرنے کا ہے۔ ابھی تیرا ساتھی اپنا ماتا پتا ہے... بس اچھا کرو... او جدھر ہوئیں گا سوامی جی! تیرا آنکھ چھلیا ٹھنڈا کرنے کا ہے۔" چھلیا ایک دَم سینہ ٹھونک کے کھڑا ہو گیا۔

"تمھارا مجھ پر بہت بڑا احسان ہوگا... وہ میرے ساتھی نہیں۔ اُن میں ایک میرا باپ ہے۔" اس کے بعد ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے۔ آنسوؤں کا چوکی سے کیا علاقہ؟ میں تڑپ کے نیچے گر پڑا۔ جمرو ہنستا مسکراتا میرے سامنے کھڑا تھا۔ مجھے خبر نہیں ہوئی کہ کب تک بے سدھ پڑا رہا، اور نادان چھلیا مداوائے آلام کے لیے جانے کیا کچھ کرتا رہا۔ اُنھوں نے کھانے کا انتظام کر لیا تھا۔ چاندنی کا ٹکڑا صحن میں کھینچ دیا گیا۔ اس اثنا میں ہمارے لیے لباس بھی آ گیا تھا۔ سفید کُرتے پاجامے تھے۔ چھلیا نے مِنّت سماجت کر کے غسل خانے کی راہ دکھائی۔ لیونارڈ غسل کر آیا تھا۔ وہ سفید کُرتے پاجامے میں خوب وجیہ دِکھتا تھا۔ میں نے تلوے پر لپٹا ہوا کپڑا کھولا، زخم تقریباً صحیح ہو چکا تھا۔ میں غسل کر کے آیا تو چھلیا نے پکڑ کے صحن کے بیچ بٹھا دیا، پھر چاندنی کے اوپر دسترخوان چن دیا گیا۔ قابیں چن دی گئیں۔ بھنے ہوئے مرغ سے بھرا تھال عین میرے سامنے رکھا گیا۔ ایک کارندہ چھلیا کو بتا رہا تھا کہ بھٹر بھوجن نے مہمان کے لیے مونگ پھلی کے تیل اور تِل لگا کے روٹیاں بنا بھیجی ہیں۔ دسترخوان پر دُور تک قابیں اور کھانوں سے بھرے تھال نظر آتے تھے، جن میں ترکاریاں اور مختلف والیں تھیں۔ ان کے ساتھ ساتھ سفید چاولوں سے بھرے تھال بھی تھے۔ بالوشاہی، امرتی اور گلاب جامن بھری ٹوکریاں بھی آ گئی تھیں۔ چھلیا نے آناً فاناً ایک بھرپور دعوت کا انتظام کر لیا تھا۔ میں نے چھلیا کا دل رکھنے کے لیے دو چار لقمے زہر مار کر لیے، البتہ لیونارڈ نے دل چسپی اور سیری سے کھانا کھایا تھا۔ میں نے اُسے اب تک نہیں بتایا تھا کہ اغوا ہونے والے تمام انگریزوں کو قتل کر دیا گیا ہے۔ لیونارڈ کے بھی کچھ قریبی دوست اغوا شدگان میں شامل تھے۔ کھانے کے بعد بھاپ اُگلتا سماوار لایا گیا۔ میرا دل چاہا کہ اُسے چھلیا کے سر پر الٹ دوں، لیکن میں نے خاموشی سے قہوے کی پیالی پیٹ میں انڈیل لی۔ اُس کے بعد دو لڑکیاں لجلجاتی ہوئی وہاں پہنچیں۔ وہ سرو قد تھیں، اور اُن کے رنگ دھوپ نے سینچے تھے۔ پستہ قد سازندہ اُن کے ساتھ کھڑا تھرک رہا تھا، اور وہ دروازے پر کھڑی لچک رہی تھیں۔ اُنھیں دیکھ کے یہ گمان ہوتا تھا کہ قدرت نے اُن کے جسم میں خون کے بجائے رسیلا شہد دوڑا دیا ہے۔

"سوامی جی! اچھا کی مانگ رکھنے کا ہے۔" چھلیا اُنھیں دیکھ کے میری طرف لپکا اور کان میں سرگوشی کی۔ میں نے اُسے وہ شعلہ بار نظروں سے گھورا کہ اُس نے ذرا

چوں چراں نہیں کی۔ اُن لڑکیوں کو دروازے ہی سے لوٹا دیا۔ البتہ سازندے کی جیب میں وہ نوٹ ٹھونسنا نہیں بھولا تھا۔ دل کی کارستانیاں بھی عجیب متلوّن ہیں۔ جب بتھل بھول گیا تھا اور اب کورا بھول رہی تھی۔ ہر آہٹ پر دل اچھل اچھل کے حلق میں آتا تھا۔ میری شکل نوشتۂ سیاہ بن گئی تھی۔ لیونارڈ نے بارہا مجھ سے حالات جاننے کی کوشش کی، لیکن میں نے اُسے جھڑک دیا تھا۔ میں اِس وقت اپنے گرداب میں مبتلا تھا، کسی اَور کی دل جوئی کیسے کرتا۔ آخر چھلیا سب نمٹا کے میرے پاس آیا۔ اُس نے گھڑیا سے چھلکا دودھ پیالے میں بھر لیا تھا۔ وہ پیالہ لے کے میرے پاس آ گیا۔ میں نے حجت بے کار سمجھی یوں ہی وقت کا ضیاع تھا۔ وہ پھر ہٹیلا ہو جاتا اور لوٹیں لگاتا، ایک ہی سانس میں جتنا دودھ پی سکتا تھا پی لیا۔ بقیہ چھلیا کو دے دیا۔ اُس نے غٹاغٹ پیالہ خالی کر دیا۔ اُس کے بعد وہ عرض پرداز ہوا۔ "سوامی جی بدھائی دینے کا ہے! ابھی تیرے ساتھیوں کی کھوج لگا کے پلٹنے کا ہے۔"

"کیا مطلب ہے تمھارا؟ کیا میں یہاں بیٹھا رہوں گا۔" میں طیش میں اُٹھ کھڑا ہوا۔

"ابھی کھبر نہیں ہے کہ وہ پورب میں ملے یا پچھم میں... ابھی وہ مل گیا، پھر تیرے کو کھوجنا پڑے گا سوامی جی! تم اِدھر ہی رہنے کا ہے۔ تیرا ساتھی جدھر بھی ہونے کا ہے۔ دو تین دن ماں تیرے پاس لے آنے کا۔"

چھلیا کی بات درست تھی۔ گر جنگل سے کسی بھی سمت نکلا جا سکتا تھا، جب کہ مجھے توقع نہیں تھی کہ بتھل گر کے جنگل سے باہر نکلے گا۔ اگر میں بتھل کو تلاش کرتا ہوا مشرق کی جانب نکل جاتا اور بتھل مغرب میں مل جاتا تو پھر لامحالہ میری تلاش شروع ہو جاتی۔ مناسب یہی تھا کہ میں دو تین دن یہیں بیٹھ کے چھلیا کا انتظار کروں۔ ہم اِس وقت سابن گیر کے قرب و جوار میں تھے۔ چھلیا نے فی الفور اپنے کارندے دھری، کنڈلا، راجولا، دلواڑا، باگستا، بھسان، واساوور اور پراچی کے علاقوں میں روانہ کر دیے تھے۔ ان کے ہاتھ مختلف لوگوں کے لیے مختلف پیغامات بھجوائے تھے، اور خود وہ اپنے دستِ خاص نریان کے ہم راہ گر جنگل کے وسط کی جانب روانہ ہو گیا۔ اُن کے گھوڑے تازہ دَم اور چوکس دکھائی دیتے تھے۔ اب مجھے تین دن انتظار کرنا تھا، سولی پر لٹکا ہوا جان لیوا انتظار۔ چھلیا کے نکلتے ہی لیونارڈ میرے سر ہو گیا۔ یہاں جو کچھ ہوا تھا اُسے اِن معاملات کی ذرا سمجھ نہیں آئی تھی۔ وہ بس اِتنا سمجھا تھا کہ چھلیا لڑائی میں مغلوب ہونے کے بعد میرا دوست بن گیا، اور خوب دل و جاں سے مجھ پر فدا ہوا تھا۔ اُسے قطعاً معلوم نہیں تھا کہ چھلیا کہاں گیا ہے۔ میں کمرے میں گھس کے چارپائی پر پڑ گیا۔ مجھے اِس وقت صرف تنہائی درکار تھی۔ لیونارڈ میرے پیچھے پیچھے آ گیا۔

"بابر از راہِ خدا مجھے بتاؤ! یہ سب کیا ہو رہا ہے؟"

"تھکے ہوئے ہو آرام کر لو... کل صبح بات کریں گے۔" میں نے بےزاری سے اُسے جواب دیا۔

"مجھ سے ایسا برتاؤ کیوں کر رہے ہو!" اُس نے کندھے سے پکڑ کے مجھے سیدھا کیا۔

"یہاں سے قریب واساوور کا قصبہ ہے۔ وہاں ریاست کے دفاتر بھی ہیں، تم چاہو تو تمھیں وہاں روانہ کروا سکتا ہوں۔"

"میں تمھارے حالات جاننا چاہتا ہوں، تمھارا چہرہ کیوں سیاہ پڑ گیا ہے۔ تم روئے کیوں تھے... اور تم مجھے تھپڑ مار رہے ہو؟" لیونارڈ نے مجھے جھنجھوڑا۔

"تمھیں بتانے کے لیے میرے پاس کوئی نئی بات نہیں ہے۔" میں نے نظریں چرائیں۔ میں اُسے کیا بتاتا، وہ جہاز میں اپنے چار انتہائی قریبی دوستوں کے ہم راہ سفر کر رہا تھا۔ اُس نے مجھے تفصیل سے اپنے دوستوں اور دوستی کے بارے میں آگاہ کیا تھا۔ میں اُسے کیسے بتاتا کہ میرے پاس تمام انگریز قیدیوں کے مارے جانے کی اطلاع ہے، پھر اُسے کون سنبھالتا۔ اِدھر جمرو کا خیال میرے سینے میں

اُبل رہا تھا۔ بٹھل سے متعلق طرح طرح کے وسوسے ڈنک مار رہے تھے۔ ایسے میں لیونارڈ کی دل جوئی کون کرتا۔

''یار میں معذرت سے کہنا چاہتا ہوں کہ تم مجھے انسانیت سے گرا ہوا سمجھ رہے ہو۔''

''خدا کے واسطے لیونارڈ مجھے تنہا چھوڑ دو۔'' آخر مجھ سے برداشت نہ ہوا اور میں پھٹ پڑا۔

لیونارڈ چند لمحے مجھے دیکھا کیا؛ گم صم ساکت، پھر پھڑک کے مجھ سے لپٹ گیا، یا شاید مجھے لپٹا لیا۔ انسان فطرتاً تماش بین ہے۔ اِس نے اپنا معاشرتی ڈھانچہ تماشے کے خمیر سے اُٹھایا ہے، اور یہ ان تماشوں کو کمالِ خوش سلیقگی سے اجتماعیت کا نام دیتا ہے۔ انسانوں میں غم بانٹنے کا تماشا بھی خوب سجتا ہے کہ غمگین چھوت کا مریض اور غم گسار سماج میں غم کی ترسیل کا ذریعہ۔ مجھے بھی غم گسار فراواں تھے اور غم فزوں تر... میں لیونارڈ کو کمرے ہی میں چھوڑ کے باہر نکل آیا۔ مٹکے سے پیالہ بھر بھر پانی پیا۔ آگ سرد نہ ہوئی تو پیالہ سر پر انڈیل لیا۔ غنیمت تھا صحن میں کوئی نہیں تھا۔ میں ناریل کی چٹائی پر پڑ گیا۔ نہ جانے کتنی دیر یوں ہی بے سدھ پڑا رہا۔ کچھ لوگوں کے آنے جانے کو میں محسوس کرتا رہا، لیکن اِس بات کا ہوش نہیں تھا کہ وہ کون ہیں اور وہاں کیا کر رہے ہیں، پھر سیاہی جوبن پر آئی تو سناٹا ہو گیا، یعنی کہ بہت اچھا ہو گیا۔ کسی نے خوب کہا ہے کہ سیاہی، تنہائی اور خاموشی عناصر ہیں تو اِن کا مرکب آگہی و ادراک ہے، اور یہی ادراک عرفانِ مجازی سے عرفانِ حقیقی تک لے جاتا ہے۔ گزشتگی کا طوفان ذرا تھما تو مجھ پر بھی یہ منکشف ہوا: یہ سب کچھ لاحاصل نہیں، کہیں کوئی ہے جو میری طرف متوجہ ہے۔ رنج والم، یہ آفت وبلاے ناگہاں منظورِ نظر ہی کے لیے تو ہیں۔ یہ ناظر کا استحقاق ہے کہ نظر شگفتہ رکھے یا آشفتہ۔ ٹھہرے پانی میں ناؤ کھینچنی پڑتی ہے اور بہتا پانی ناؤ کو اُڑا لے جاتا ہے۔ خود کو دھارے پر چھوڑ کے مجھے بھی ڈھارس بندھ گئی۔ میں اُٹھ بیٹھا۔

وہ دو بالشت کے فاصلے پر سر نیہوڑائے بیٹھی تھی۔ پھول کی طرح لرزیدہ اور مورتی سی تراشیدہ۔ میں اس افتاد پر چونک گیا۔ وہ شاید بہت دیر سے مستغرق بیٹھی تھی۔ مجھے اچانک اُٹھتا دیکھ کے دہل گئی۔ ''ہائے رام جی!'' وہ بدکی ہوئی ہرنی کی طرح اچھل کھڑی ہوئی اور جھٹ لمبا سا گھونگھٹ کاڑھ لیا۔ ''بستی میں آپ کی دھوم مچی ہے۔ درشن بنا رہ نہ سکی۔'' اُس کی آواز میں شیرینی، سلیقہ اور لہجے میں تعلیم کی کھنک تھی۔ ''آپ دیوتاؤں سمان دِکھتے ہو!'' اُس نے ذرا سا گھونگھٹ سرکا کے میری طرف دیکھا۔ اُس کی بڑی بڑی آنکھیں بیضوی اور شفاف، پلکیں لانبی اور گھنی تھیں۔ عنابی رنگ کا گل دار گھاگھرا اور اُسی رنگ کی چولی میں لپٹا اُس کا سراپا شمع دان کی روشنی اجال رہا تھا۔ میں حقیقتاً سٹ پٹا گیا تھا۔ اندازاً نصف رات تو بیت چکی تھی۔ اس چھوٹی سی بستی میں جہاں ہر آدمی پوری آبادی کی نسلوں کو جانتا ہوگا، حسین دوشیزہ کا تنہا اڈے یا ڑے جیسی جگہ پہ چلے آنا حیرت انگیز تھا۔ بازاری ہوتی تو بھی اچنبھا نہیں تھا۔ وہ چلبلے بشرے سے معقول گھرانے کی لگتی تھی۔ لچکیلی شاخ کی طرح تن کے کھڑی تھی، خفیف جھونکے سے جھولتی ہوئی، لہکتی ہوئی۔ ''آپ کنیاؤں سے نہیں بولتے کیا؟''

میں واقعتاً مبہوت رہ گیا تھا۔ اُس کے وجود نے ماحول کو طلسمی بنا دیا تھا۔ ''کون ہو تم؟ اِس وقت یہاں آنا کسی شریف لڑکی کے لیے مناسب نہیں۔'' میں نے سنبھلتے ہوئے اُس سے پوچھا۔ وہ تو گویا میرے بولنے کی منتظر تھی۔ میری آواز سُن کے جیسے اُس کے سارے وہم اور وسوسے دُور ہو گئے۔ اُس نے جس تیزی سے گھونگھٹ کھینچا تھا، اُسی تیزی سے گرا دیا اور چھپاک سے میرے سامنے دوزانو بیٹھ گئی؛ جیسے مینا سے ساغر میں آخری بوند ٹپکی ہو۔ وہ بلاشبہ بے حد حسین تھی۔ دودھ، شہد، صندلیں شربت کے آمیزے سے اُٹھتی ہوئی اُس کی رنگت، اُس پہ طرّہ اُس کی تراشیدہ صورت، نین نقش ایسے جیسے چن چن کے ہیرے موتی جڑ دیے ہوں۔

اُس کا لب ولہجہ اور شکل وصورت غیر مقامی تھی۔ میں واقعتاً شدید اُلجھن میں مبتلا ہو گیا تھا کہ وہ کون تھی اور یوں آدھی رات کو یہاں کیا کرنے آ گئی تھی۔ پچھل پائی کا خیال آنے پر میں خود سے جھینپا تھا، لیکن جب وہ کھڑی تھی تو اضطراری طور پر میری نظریں اُس کے پیروں کا جائزہ لے چکی تھیں، اُس کے پانو عین سیدھے تھے۔

''بٹوئی ہوں کنہیا جی! دلواڑا شہر سے رکمنی کے گھر ٹھہری ہوں۔ بستی میں اودھم پڑا ہے کہ آپ کو مہاتما گیانی نریندر جی نے گیان دے کے چھلیا کے لیے بھیجا ہے۔'' اُس نے جھکی جھکی نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ اِس طرح گویا ہوئی تھی، جیسے برسوں کی شناسا ہو۔

بستی والے مجھے مہان اوتار سمجھ رہے تھے۔ یہ میں ہی جانتا تھا کہ چھلیا کا چاقو گرانے میں کس گیانی کا عمل دخل تھا۔ سرگوشی بھی بیج کی طرح ہوتی ہے اور بر گوش زمین کی طرح کہ جہاں بیج گرا وہاں پودا نکل آیا، ایک پودے میں ہزاروں پھل اور ہر پھل میں ہزاروں بیج۔ چھلیا جس وقت مجھے اپنی بپتا سنا رہا تھا اُس وقت صحن لوگوں سے کھچا کھچ بھرا تھا۔ یہاں سے نکل کے یہ قصہ چوپال میں پہنچا ہوگا۔ جہاں حیرت انگیز اور ماورا العقل داستان کے متلاشی قصہ گو اس پہ مصروفِ کار ہوئے ہوں گے۔ اب جہاں چھلیا ہوگا اور جہاں اُس کا نام لیا جائے گا، وہاں یہ داستان ضرور دوہرائی جائے گی اور ہر مرتبہ جدّتِ فسوں کے ساتھ۔ وہ جتنی دیر یہاں رہتی، کسی نئی مصیبت کے نزول کا خطرہ بڑھتا جاتا۔ اگرچہ وہ کچھ دیر بیٹھی رہتی تو کوئی حرج نہ تھا، تاہم میں نے لہجے میں سختی لاتے ہوئے کہا، ''تمھیں اور بستی والوں کو بڑی غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں گیانی یا اوتار نہیں ہوں... تم بے شک دن میں آ جانا، لیکن اب جاؤ۔''

''ہائے رام جی، بدھائی ہو! اجالے میں آ سکتی تو اِتنا کشٹ نہ اُٹھاتی۔ کنیائیں اِدھر نہیں آ تیں۔ میری آپ سے بنتی ہے، کچھ دیر کی آ گیا دیجیے۔ بڑی آس لے کے آئی ہوں۔

''نو پارکنگ''
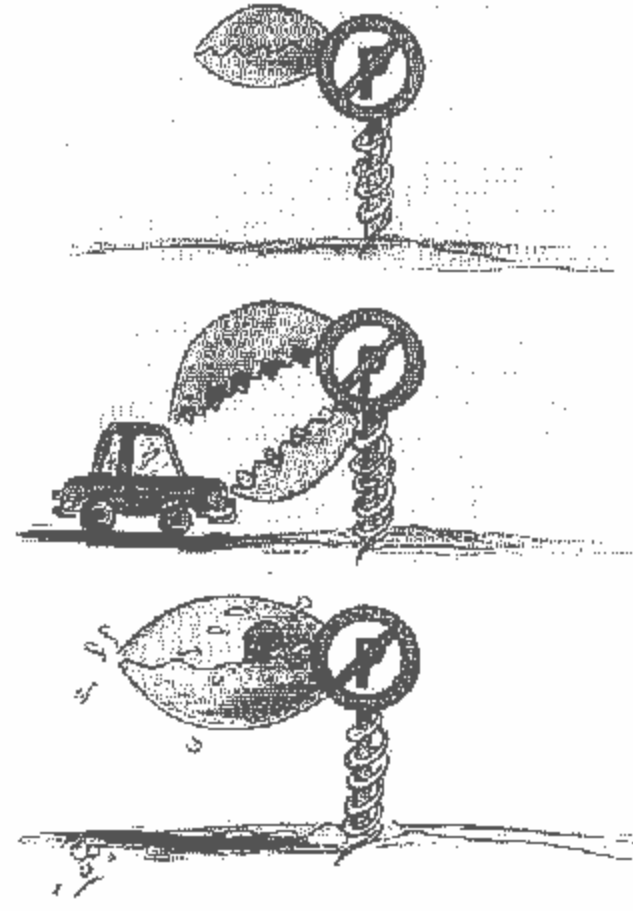
میرا کشٹ آپ کا دُور کر سکتے ہیں۔'' اُس نے ہاتھ جوڑ لیے اور جبڑے سختی سے بھینچ لیے کہ وہ کسی صورت نہیں جائے گی۔ مجھے گمان ہوا کہ مجھ سے دعا وغیرہ کروانے آئی ہے۔ چھلیا اپنے ساتھ تمام کارندوں کو لے گیا تھا۔ اڈے پر اِس وقت میرے اور لیونارڈ کے سوا کوئی نہیں تھا۔ اُس نے جوڑے ہوئے ہاتھ میرے گھٹنوں پر رکھ دیے اور ملتجی ہوئی۔ ''بھگوان کے لیے میری بات سُن لیں، پھر میں چلی جاؤں گی۔''

میں دھیرے سے پیچھے کھسکا، لیکن وہ بہ دستور میرے گھٹنے پکڑے رہی۔ میں نے اُس کے ہاتھ اُٹھانے چاہے تو اُس نے میرے ہاتھ ہی تھام لیے۔ ''بھگوان نے تمھاری صورت بہت سندر بنائی ہے۔ بھگوان جس کا مکھڑا اچھا بنا دے، اُس کے لیے سنسار میں سب کچھ اچھا بنا دیتا ہے۔ تمھارا دل بھی خوب صورت ہی بنایا ہوگا۔'' وہ ایک ہی جست میں آپ سے تم تک آ گئی تھی، لیکن ایسے جیسے بہت سلیقے سے اور قدم بہ قدم یہ سفر اُس نے طے کیا ہو۔ اُس کی

آواز اور آنکھیں اوّل ساعت ہی سے خمار آلود لگی تھیں۔

میں نے آرام سے ہاتھ چھڑائے اور اُٹھ کھڑا ہوا۔

"تم بہت اچھی اور خوب صورت لڑکی ہو! اب چلی جاؤ، اگر میں تمھاری کوئی مدد کرسکتا ہوں تو دن میں ملنے کی سبیل کرو!" میں نے سوچ لیا تھا کہ اگر اب اُس نے مزید ضد کی تو بھاگ کے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کرلوں گا۔

میری بات سُن کے وہ آب دیدہ ہوگئی، اور گریبان سے ایک پوٹلی نکال کے میرے قدموں میں پھینک دی۔

"اِس میں گہنے موتی ہیں۔ اتنے ہی اُور ہیں میرے پاس... پتا جی دھن مان ہیں۔ دھن سے تمھاری جھولی بھر دیں گے، میری بات سُن لو، پھر ادھیکار ہے چنتا کرو یا نہ کرو۔"

شدید غصّے نے میرے پیروں میں بیڑی ڈال دی۔

اُس نے یک دَم اوتار کے رتبے پر بٹھا کے لات ماردی تھی۔

میرا بھی دل چاہا کہ پوٹلی پر لات ماروں اور اُسے بھی دفعان کروں، لیکن نہ چاہتے ہوئے بھی میں بیٹھ گیا، اور پوٹلی اُٹھا کے اُس کی جھولی میں پھینک دی، پھر بھڑکتے ہوئے کہا، "ادھیکار تو... تم نے اپنے پاس رکھے ہیں۔ اپنی مرضی سے یہاں چلی آئیں۔ یہ بھی نہ سوچا کہ کوئی اِس وقت تم سے ملنا چاہتا بھی ہے یا نہیں، اپنی مرضی سے اوتار بنا دیا کہ کوئی اوتار ہے بھی یا نہیں، اور اب اپنی مرضی سے سوداگر بنا دیا کہ کوئی سوداگر ہے بھی یا نہیں۔ میرے پاس تو اِتنا بھی ادھیکار نہیں چھوڑا کہ میں یہاں سے تمھیں روانہ کرسکوں۔"

اُس نے مسکراتے ہوئے پوٹلی اٹھا کے گریبان میں ڈالی، جیسے صبا دوام سمیٹ کے گھر لوٹتا ہے۔ اُس نے مجھے واقعی بٹھا لیا تھا۔ "سوداگر نہ بناتی تو میری بات کون سنتا۔ اگر تم گہنے اٹھانے والے ہوتے موہن جی تو مجھ سی کنیا کو چھوڑ کے نہ اُٹھتے..." اُس کی آنکھوں میں معنی خیزی کے علاوہ اُور بھی بہت کچھ اُمڈ آیا تھا۔ قدرت نے صورت کے ساتھ ساتھ اُسے سبک ذہن بھی بنایا تھا۔ "میری مدد کرنے میں آپ کا اپمان نہیں ہوگا۔" اُسے بے تکلّف ہونے کا ہنر

خوب آتا تھا۔ وہ واقعی من موہنی تھی۔

"میں تمھارے مجبور کرنے پر تمھارا مسئلہ سُن سکتا ہوں، لیکن اِس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ میں تمھاری مدد کرنے پر قدرت بھی رکھتا ہوں۔" میں نے پیش بندی کرتے ہوئے کہا، کیوں کہ میں اِتنا سمجھ گیا تھا کہ اُسے دعا کے علاوہ کسی اُور قسم کی مدد درکار ہے۔ جس قسم کی مدد عموماً شرفا کو اڈّے پاڑے والوں سے درکار ہوا کرتی ہے۔ ظاہر ہے میں اس وقت چھلیا سے بڑا ادا تھا۔ میں یہاں دو ایک دن سے زیادہ نہیں ٹھہر سکتا تھا۔

"بدھائی ہو موہن جی! میرا گیان کہتا ہے کہ آپ کی یہ اِچھا ہی میرے جیون کو سورگ بنا سکتی۔ نرکھ میں سے بتا رہی ہوں۔ ایک راکھشس جان کو آیا ہے موہن جی۔"

"کون راکھشس؟ اور بھلا میں تمھاری مدد کیوں اور کیسے کرسکتا ہوں۔"

"کیوں کا جواب تو بھگوان ہی دیں گے۔ پرنتو آپ میں شکتی ہے کہ آپ اس مورکھ کا سروناش کرسکیں۔"

اُس نے رات کا ایک پہر وہاں گزارا، اور تفصیل سے اپنی کتھا سنائی۔ اُس کا نام لکشمی تھا اور وہ واقعی لکشمی تھی۔ وہ ایک مِل مزدور راج پٹیل کے گھر میں پانچ بھائیوں پر پیدا ہوئی۔ صورت دیکھ کے ہی دادی نے کہہ دیا تھا کہ راج پٹیل پر لکشمی برسے گی، چناں چہ اُس کا نام لکشمی رکھ دیا گیا۔ یہ بستی کاٹھیاواڑ کے صنعتی شہر دلواڑا کے مضافات میں آباد تھی۔ راج پٹیل دلواڑا میں تیل کی مل میں نصب مشینوں کی دیکھ بھال پر معمور تھا۔ ماہ وار اچھے پیسے مل جاتے تھے، اِس لیے وہ بستی کے خوش حال افراد میں شمار ہوتا تھا۔ لکشمی جب دو سال کی تھی تب راج پٹیل نے فصل پر بیج خرید کے ذخیرہ کرنے کا کام شروع کیا۔ اُس کا تعلق زمیں دار خاندان سے تھا۔ اِس کے علاوہ بستی والوں سے راہ و رسم مضبوط تھی، اِس لیے اپنی پونجی کے بقدر اُس نے مناسب دام پر مونگ پھلی خرید لی، اور چند ماہ بعد ایک تہائی منافع پر فروخت کردی، پھر اُس نے

تل خریدے اور چند ماہ بعد چار پیسے منافع پر اُسی مل کو فروخت کردیے جہاں وہ ملازمت کررہا تھا۔ لکشمی جب چھ سال کی ہوئی تو راج پٹیل نے ملازمت چھوڑ کے دلواڑا میں بروکری کا دفتر بنالیا۔ تب تک وہ چھوٹا موٹا سرمایہ دار بن چکا تھا۔ لکشمی آٹھ سال کی ہوئی تو راج پٹیل نے دلواڑا میں تیل نکالنے والی فیکٹری لگالی، اور وہ باپوناتھ بستی سے اُٹھ کے دلواڑا جا بسا۔ وہاں اُس نے عالی شان کوٹھی بنائی تھی، جس میں موٹر کھڑی کرنے کا کمرا علیحدہ بنایا گیا تھا، اور ہر کام کے لیے ملازم جدا جدا تھے: مالی، خانساماں، چوکی دار، ڈرائیور، نوکر چاکر۔ بچوں کو راماین پڑھانے کے لیے استاد الگ آتا اور اسکول کا سبق یاد کروانے کے لیے الگ۔ راج پٹیل نے فیکٹری کا نام بھی لکشمی آئل مل رکھا تھا۔ راج پٹیل پر دھن چھپّر پھاڑ کے برسا تھا۔ لکشمی اپنے باپ کی اِس قدر منظورِ نظر تھی کہ خواہش زبان پر آتی بعد میں اور پوری پہلے ہوجاتی تھی۔

بمبئی کے پریم بابو نے دلواڑا میں منڈوا کھولا۔ پھر لکشمی منڈوے کے ہو کے رہ گئی۔ ایک فلم دس بار دیکھتی۔ جب وہ بیس کے سن کو پہنچی تو راج پٹیل نے بیٹی کو غور سے دیکھا اور بیاہنے کی فکر کی، مگر بہت دیر ہوچکی تھی۔ لکشمی فیکٹری کے دروازے پر تعینات منشی قاسم میمن سے دل ہار بیٹھی۔ اُسے اِس بات سے مسرت ہوئی کہ اُس کا پریم فلموں سے کم تہلکہ خیز ثابت نہیں ہوگا۔ اُس کا خیال تھا کہ پتا جی کو خود ہی قاسم میمن سے اُس کے پریم کا پتا چل جائے گا، لیکن باپ کی طرف سے مسلسل خاموشی نے اُس کے فلمی پریم کا رنگ پھیکا کر رکھا تھا۔ وہ روزانہ فیکٹری پہنچ جاتی اور کافی دیر دروازے پر رک کے قاسم میمن سے باتیں کرنے لگی۔ اِس سے قبل وہ چھپ چھپا کے ملاقاتیں کرتے تھے۔ البتہ نظروں کا بے باک تبادلہ وہ شروع دن ہی سے علی الاعلان کرتی تھی۔ پھر ایک دن اُس نے سب کے سامنے قاسم میمن کے ہاتھ میں چٹھی پکڑا دی، اور اُسی رات وہی چٹھی راج پٹیل نے بیٹی کے سامنے کردی، اور پہلی مرتبہ اُس سے سخت لہجے میں بات کی۔

لکشمی کی کہانی تو شروع ہی اب ہوئی تھی۔ اُس نے باپ سے بغاوت کا اعلان کردیا۔ قاسم میمن کو فیکٹری سے نکال دیا گیا۔ لکشمی اُسے پیسے پہنچانے لگی۔ اُس نے قاسم میمن کے ساتھ جا کے بمبئی بسنے کا منصوبہ بنالیا تھا؛ جہاں وہ مدھوبالا کو مات دے سکتی تھی، لیکن کہانی اپنی مرضی سے آگے بڑھی۔ راج پٹیل نے دلواڑا کے نامور دادا رگھو بوری والا کو لکشمی اور قاسم میمن کے بیچ لا کھڑا کیا۔ رگھو بوری والا نے قاسم میمن کو دو چار مرتبہ پٹوایا تو قاسم میمن نے راج پٹیل سے دلواڑا چھوڑنے کے لیے تگڑی رقم مانگ لی۔ راج پٹیل نے قاسم میمن کو رقم لکشمی کے ہاتھ ہی سے دلوائی۔ لکشمی کو اِس بے وفائی کا ذرا ملال نہ ہوا، کیوں کہ اِس طرح کہانی کا انجام دل چسپ اور عام ڈگر سے ہٹ کے ہوا تھا، لیکن یہیں سے ایک نئی کہانی نے جنم لیا، جس نے راج پٹیل سمیت لکشمی کو بھی ہلا کے رکھ دیا تھا۔ رگھو بوری والا دل و جاں سے لکشمی پر فریفتہ ہوگیا تھا۔ وہ اِس قضیے کے دوران کئی مرتبہ لکشمی سے بالمشافہ ملا تھا۔ اُس نے راج پٹیل سے لکشمی کا ہاتھ مانگنے میں دیر نہ لگائی۔ راج پٹیل نے ہر قسم کے خوف کو بالائے طاق رکھ کے صاف انکار کردیا۔ لکشمی نے بھی یہ کہہ دیا تھا کہ اگر زندگی میں ایسی نوبت آئی جو اُسے رگھو بوری والا کے ساتھ پھیرے لینے پڑے تو زہر کھانے کو ترجیح دے گی۔ اُدھر رگھو پر عشق سات رنگ چڑھ گیا تھا۔ اُس نے اعلان کردیا کہ راج پٹیل کو تیل کی فیکٹری کا گھمنڈ ہے تو وہ بھی فیکٹری لگائے گا۔ اس کے بعد رگھو دلواڑے سے غائب ہوگیا۔ ٹھیک ایک ماہ بعد وہ دوبارہ دلواڑے میں نظر آیا، جب اُس نے فیکٹری کے لیے زمین خریدی تھی۔ اُس نے فیکٹری کی تعمیر کا کام شروع کروادیا۔ وہ احمد آباد سے کام جاننے والے کچھ لوگوں کو بھی لے آیا تھا۔ رگھو کی فیکٹری بنتی دیکھ کے راج پٹیل کا فیصلہ ڈانواں ڈول ہورہا تھا، لیکن لکشمی زہر خوری کے فیصلے پر مزید پختہ ہوگئی۔ رگھو بوری والا کی فیکٹری تکمیل کے آخری مراحل میں تھی۔ اچانک سورت اور بمبئی کی پولیس رگھو کے وارنٹ

لے کے دلواڑا پہنچ گئی۔ رگھو نے اپنے ساتھیوں کی مدد سے وہاں کئی ڈاکے مارے تھے اور کئی امرا کو مفلس کر آیا تھا۔ پولیس رگھو کو لے گئی، اور لکشمی نے ماتاجی کے بھجن گائے، دیوالی منائی، سکھ چین کا سانس لیا۔ راج پٹیل نے لکشمی کے لیے جوڑ کا رشتہ تلاش کرنا شروع کر دیا۔ آخر اُس کی نظر اپنے بھائی کے چھوٹے بیٹے وشنو پٹیل پر ٹھہر گئی۔ لڑکا قد کاٹھ، نین نقش کا بھی اچھا تھا، جب کہ راج پٹیل کی کاروباری اٹھان کا اُس کے پورے خاندان نے بھرپور فائدہ اُٹھایا تھا۔ اُس کا بھائی برابر کا نہیں تھا، لیکن پھر بھی شہر کے متموّل لوگوں میں شمار ہوتا تھا۔ سونے پر سہاگہ یہ ہوا، لکشمی اور وشنو کو سن گن ملی تو تبھی اُسی وقت اُن پر انکشاف ہوا کہ وہ تو بچپن ہی سے ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے، تاہم اوراک ابھی ہوا تھا۔ گھر کی بات تھی فوراً چوبارے چڑھ گئی۔ پجاری سے دن تاریخ نکلوائی گئی تھی کہ رنگ میں بھنگ پڑ گیا۔ پولیس کا پرچہ کچا تھا۔ برامدگی بالکل نہیں تھی۔ رگھو بوری والا جیل سے چھوٹ کے سیدھا راج پٹیل کے پاس آیا اور صاف بول دیا کہ لکشمی اُس کی نہ ہو کوئی غم نہیں، لیکن اگر لکشمی کسی اور کی ہوئی تو رگھو پھانسی چڑھ جائے گا۔ شادی روک دی گئی۔ راج پٹیل تو کیا سارا شہر جانتا تھا کہ رگھو نے ایسا بولا ہے تو وہ کر گزرے گا۔ رگھو نے فیکٹری کی تعمیر دوبارہ شروع کروا دی تھی۔ راج پٹیل کے کاروباری حریف نواب کریم جی نے رگھو سے پتی ملا لی۔ ادھر وشنو پٹیل کی ماں نے دوسری لڑکی دیکھنی شروع کر دی تھی۔ لکشمی کی ایک بُوا بستی ہی میں آباد تھی۔ بُوا کی ایک لڑکی رکمنی لکشمی کی سکھی تھی، جس سے راز و نیاز کیا کرتی تھی، اور ساتویں، پندرہویں دن لکشمی بستی کا پھیرا لگا لیا کرتی تھی۔ جب اُس نے سنا کہ ایک چھیل چھبیلے جوان نے چھلیا کو پچھاڑ دیا ہے، اور چھلیا اُس کے پیروں کو چاٹتا پھر رہا ہے تو اُسے لگا کہ اُس کی مراد بر آئی ہے۔ دراصل رگھو بوری والا کو دلواڑا کی چوکی پر چھلیا ہی نے بٹھایا تھا، اور وہ چھلیا کو باپ برابر مانتا تھا۔ راج پٹیل نے چھلیا کے آگے بھی ہاتھ جوڑے، لیکن چھلیا نے رگھو کے اِس معاملے میں ہاتھ ڈالنے سے معذرت کر لی تھی۔ چھلیا نے کہا تھا کہ وہ رگھو کا گلا اپنے ہاتھ سے کاٹ سکتا ہے، لیکن اُسے پیچھے ہٹنے کو نہیں بول سکتا۔

"تو تم مجھ سے کیا چاہتی ہو؟" اُس نے اپنی داستان ختم کی تو میں نے اُس سے پوچھا۔

وہ کچھ دیر خاموشی سے مجھے دیکھے گئی، پھر ٹھہر ٹھہر کے بولی، "میری اِچھا، چھلیا سے سہایتا لینے کی نہیں ہے۔"

"کیا اِچھا ہے تمھاری؟"

"کوئی میرے لیے رگھو دادا کے سامنے تن کے کھڑا ہو جائے۔" اُس نے اِک ادا سے پلکیں جھپکائیں اور اٹھا کے بولی تھی۔

مجھے بے ساختہ ہنسی آ گئی۔ "اور تمھارا خیال ہے کہ یہ کام میں کر سکتا ہوں۔"

"ہاں، تم شکتی مان ہو، دکھ اِسی بات کا ہے کہ رگھو کو للکارنے والا کوئی نہیں۔"

"رگھو میں کیا برائی ہے۔"

"مہیلائیں اپنے پریمیوں کو برا نہیں جان سکتیں۔ اُن کے مَن نے یہ ادھیکار نہیں دیا۔ رگھو مجھے برا نہیں لگتا، بس وہ سندر نہیں ہے۔ میری سندرتا پر نہیں جچتا۔"

"سندرتا عارضی چیز ہے لکشمی! آج ہے تو کل نہیں، اِس پر گھمنڈ مہنگا پڑتا ہے۔"

"وہ چور، ڈاکو، ہتیارا اور اپرادھی ہے۔ اڈّے کا دادا ہے، بھتا کھاتا ہے۔"

"وہ تمھارا پریمی بھی ہے۔ تمھارے بتانے کے مطابق وہ سچا پریم کرتا ہے تم سے۔"

"سچے پریمی اپنی پریمیکا کو کھشش دیکھنا چاہتے ہیں۔ پریمیکا کھشش ہے تو اُن کا پریم شانت ہے، مگر... مگر اِس پریمی نے میرے جیون سے ہر سکھ چھین لیا ہے۔ بچے بچے کی زبان پر میرا نام ہے، گلی گلی رسوا کیا ہے۔ اُسے اپنی کھشی، اپنی جیت کا دھیان ہے۔ پریمیکا مندر کی مٹی مورت ہے، شیشے کے استھان میں رکھنے والی مورت، جس کے پاس نہ مَن ہو، نہ اِچھا ہو اور نہ ادھیکار۔" لکشمی کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

"تم وشنو سے شادی کرنا چاہتی ہو؟"

"نہیں، وشنو سے اچھا ہے میں رگھو سے بول پڑھوا لوں۔ وہ ڈرپوک، بزدل، کمینہ! میرے لیے بلیدان دینے والا، مجھے دیکھ کے آنکھیں اور راستے بدل لیتا ہے۔"

"تم کیا چاہتی ہو مجھ سے۔ بالفرض میری وجہ سے رگھو پیچھے ہٹ بھی گیا تو پھر کیا ہوگا۔ میں چند دن سے زیادہ ٹھہر نہیں سکتا۔ رگھو پھر آ جائے گا۔ یہ مسئلے کا حل نہیں ہے۔"

"بس یہ کہ جھوٹ موٹ ہی سہی، مگر تم میرے لیے رگھو کے سامنے کھڑے ہو جاؤ۔ ایک بار لکشمی کے نام پر رگھو کا چاقو گرا دو... اُس کے بعد... اُس کے بعد موہن!" وہ بولتے بولتے یک دم کھو سی گئی۔ کچھ توقف سے دھیرے دھیرے بولی، "اُس کے بعد مجھی رگھو بوری والا بھی منظور ہے... تم اُس کا چاقو گرا دو، اس کے بعد رگھو آئے، میں اُس کے ساتھ پھیرے دلوالوں گی۔"

میں چونک پڑا۔ اُس نے عجیب بات کی تھی۔ "کیا مطلب؟"

"رگھو کو اپنی طاقت پر گھمنڈ ہے اور مجھے اپنی سندرتا پر مان ہے موہن جی! اِپی اِچھا سے اُس کے پیروں میں پڑ جاؤں تو دکھ نہیں، بھکڑی پر زہر کھا مروں گی۔ میری سندرتا کوئی زور نہیں موہنی جی!"

"میرا نام بابر ہے۔" شاید وہ مجھے ہندو سمجھ رہی تھی۔

"میرے لیے تو موہن ہو، بھگوان نے بہت سندرتا دی ہے تمھیں۔" اُس کی آنکھیں بارِ خمار سے بوجھل ہو رہی تھیں۔

"میرے بارے میں تمھارے تمام اندازے غلط ہیں۔ اب تم جاؤ... مجھ سے بن پڑا تو تمھارے لیے ضرور کچھ کروں گا۔" میں نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ رات کسی بھی لمحے جانے والی تھی۔ وہ واقعی دل بر لڑکی تھی، یوں تن تنہا اندھیارے میں اڈّے پر چلی آئی تھی۔ یہ کوئی باقاعدہ اڈّا پاڑا تو نہیں تھا، لیکن ایک کمرے کے اِس مکان کی بستی میں اڈّے ہی کی حیثیت تھی۔ وہ وارفتگی سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ اُس کا یہاں سے چلے جانا بہت ضروری ہو چلا تھا۔

"موہن جی میں ایسے نہیں جاؤں گی... تم مجھے وچن دو... میری مدد کرو گے!" وہ یک دم بھڑکی اور مجھ سے لپٹ گئی، پھر شمع کی طرح جلنے لگی، میں نے بہ مشکل اُسے خود سے علیحدہ کیا۔

"موہن تم میری آخری آس ہو... تم وچن نہ دو، لیکن لکشمی کا وچن ہے، تم میری اِچھا کے بغیر جس دن یہاں سے جاؤ گے میں پتھر باندھ کے ندی میں کود جاؤں گی۔"

مجھ سے وعدہ لینے کے بعد ہی وہ وہاں سے گئی۔

میں نے سوچا تھا، چھلیا سے اِس سلسلے میں بات کروں گا، وہی اِس بارے میں درست مشورہ دے سکتا تھا۔ سپیدی نے سیاہی کے شکم سے باہر آنا شروع کر دیا تھا۔ لیونارڈ نے خوب نیند کر لی تھی۔ مجھے امید تھی کہ صبح تک چھلیا کی طرف سے کوئی نہ کوئی خبر ضرور آ جائے گی۔ باروٹیہ کا کردار مجھے بالکل سمجھ نہیں آیا تھا۔ اُس کی کارگزاریوں سے لگتا تھا کہ وہ حادثاتی طور پر کرانتی کار بنا ہے۔ اُس کی چھب ڈھب، خُو بُو کچھ اور ہی تھی۔ اُس نے انتہائی منظم طریقے سے بحری جہاز اغوا کیا تھا۔ اِس درجے کی کارروائی ریاستی سپاہ کے لیے بھی کارِ محال تھی۔ اِتنی بڑی کارروائی کا مقصد محض بیٹے کا حصول نہیں ہو سکتا تھا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا تھا کہ جہاز کا اغوا اور تاوان کا مطالبہ دو مختلف اذہان کی عکاسی کرتے ہیں؛ کارروائی قوم کے لیے تن من دھن قربان کرنے کی بنیاد پر، جب کہ مطالبہ خود غرضی کی بیّن مثال۔ بٹھل کے ہاتھوں باروٹیہ کا قتل اُس کی حیثیت کے منافی تھا۔ بٹھل کی لیاقت، شجاعت، معاملہ فہمی اور طاقت میں کلام نہیں، لیکن باروٹیہ کا قتل اِتنا آسان نہیں ہونا چاہیے تھا۔ اُس نے جہاز کے اغوا سے لے کر اپنے ٹھکانے تک مغویوں کی ترسیل کے بے پناہ منظم انتظامات کیے تھے۔ ایسا آدمی جو تاجِ برطانیہ

سے ٹکرانے چلا تھا اُس کا اپنے ہی ٹھکانے پر یوں آسانی سے قتل ہو جانا مطابقت نہیں رکھتا تھا۔ ان تمام معاملات میں کہیں نہ کہیں خلا موجود تھا، جو میری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ چھلیا کے مطابق تمام انگریز قیدیوں کو شدتِ انتقام میں ہلاک کر دیا گیا ہے۔ یہ بات بھی خلافِ عقل تھی۔ کرانتی کار ہوں یا ڈاکو دونوں ہی صورتوں میں مغوی ان کے لیے انتہائی اہمیت کے حامل تھے۔ وہ جس کارِ شوق میں مبتلا تھے وہاں زندگی اور موت معمول کا حصّہ ہوتی ہیں۔ اپنے سردار کے قتل پر یہ بیخ پائی خلافِ معمول تھی۔ مانا کہ جذبات اپنے حکم ران خود ہوا کرتے ہیں، تاہم یہ حکم ران نہیں ہوتے۔ میرے دل میں خوف لکیریں بڑھا رہا تھا۔ جو لوگ اپنے سردار کے غم میں انگریز قیدیوں کو بے دریغ قتل کر سکتے ہوں، اُن کی دسترس سے بٹھل کیسے نکل آئے گا، جب کہ اِس علاقے کا چپّہ چپّہ اُن کا دست نگر ہے۔ مجھے چھلیا میں ذرا بھی کھوٹ محسوس نہیں ہوئی تھی، لیکن وہ کس بل پر میرے ساتھیوں کی حفاظت کا ذمّہ لے گیا تھا۔ باروٹیہ نے اڈّے کے لوگوں سے تعاون لیا ہوگا، لیکن اِتنے بڑے گروہ کا سردار اُن کا محتاج نہیں ہو سکتا تھا۔ پورے کاٹھیاواڑ کے اڈّے پاڑے کے لوگ یک جان ہو کے بھی باروٹیہ کو مُنہ نہیں دے سکتے تھے۔ رندھاوے نے اپنے سردار کے غم میں انگریزوں کو چھلنی کروا دیا تھا۔ وہ ہمیں کچلنے کے لیے یقیناً بپھر رہا ہوگا، اور ہماری کھوج کے لیے تمام تر وسائل بروئے کار لائے گا۔ اِس ہنگامہ خیزی میں ریاست کا کردار سب سے پیچیدہ رہا تھا۔ کاٹھیاواڑ کی تمام ریاستیں انگریزوں کی باج گزار تھیں۔ دلّی سے فوج آتی جب آتی، لیکن ریاست بھی تو پاسِ وفا کرتی ہے۔ اب تک یہ اور اس جیسی دیگر مضافاتی بستیاں چھاؤنیاں بن جانی چاہیے تھیں، لیکن ہم نے جنگل کا اِتنا بڑا حصّہ سڑک کے ساتھ چلتے چلتے گزارا، بستی میں ایک دن گزر گیا۔ سرکار کے نام پر چڑیا کا بچّہ بھی نظر نہ آیا تھا۔

میں جوں جوں سوچ رہا تھا، معاملہ اُلجھتا جا رہا تھا۔ تصویر کا دوسرا رخ بھی دیکھنا چاہیے۔ بہت ممکن ہے بڑے پیمانے پر سرکار حرکت میں آ چکی ہو۔ جنگل کی دوسری اطراف سے گھیرا ڈال دیا گیا ہو۔ بہ ہر حال میری معلومات کا ماخذ چھلیا تھا۔ اِس کے علاوہ مشاہدہ تھا۔ مجھے چھلیا پر اکتفا نہیں کرنا چاہیے۔ دن نکلنے کے بعد میں نے بستی سے سُن گُن لینے کا ارادہ کر لیا تھا۔ بستی سے مختلف باتیں مل سکتی تھیں۔ میں کمرے میں چلا آیا۔ لیونارڈ اوندھا پڑا تھا، آہٹ پر سیدھا ہو گیا۔

”بابر کچھ دیر نیند کر لو!“ اُس نے جماہی لیتے ہوئے کہا۔

”میں نیند کر چکا ہوں۔“ میں نے لاتعلقی سے کہا۔

”وہ نیند نہیں، یہ نیند کر لو۔“ اُس نے آنکھیں میچ کے دکھاتے ہوئے کہا۔

”نیند ایک ہی طرح کی ہوتی ہے۔“ شاید اُس نے مجھے لکشمی سے باتیں کرتے دیکھ لیا تھا۔ وہ اُس ملاقات کو غلط رنگ دے رہا تھا۔

”ہندستان کی خوب صورتی فاتحِ عالم ہے۔ دنیا کشاں کشاں یہاں چل کے آتی ہے۔“ وہ مسکرا رہا تھا۔

”شاید تم غلط بول گئے ہو، اصل لفظ ہے مفتوحِ عالم!“ میں نے کچھ ترشی سے کہا۔ اُس نے عذر خوب تراشا تھا۔

”وہ لڑکی بہت خوب صورت تھی بابر! کون تھی۔“

”میں نہیں جانتا۔“

”رات بھر صرف اُس کی صورت تکتے رہے ہو۔ پوچھنے کی مہلت کیا ملی ہوگی۔“ اُس نے زبردستی قہقہہ لگایا، بھلا ایسی آساں ہیں خوش کاریاں۔

”میں بستی میں جا رہا ہوں، تم تازہ دم ہو جاؤ۔ یہاں سے باہر مت نکلنا۔“ اُسے غلط فہمی تھی تو رہے۔

”ایک ہی رات میں دل اِتنا اُلجھ گیا ہے۔ نام تک نہیں جانتے۔“ لیونارڈ نے دیدے پھیلاتے ہوئے کہا۔

”لکشمی نام تھا اُس کا... اور وہ میری محبوبہ تھی... اب

خوش ہو۔“ مجھے غصہ آ گیا تھا۔

لیونارڈ مچل کے آگے بڑھا اور مجھے بازوؤں میں بھینچ لیا۔ ”تم غصے میں اور اچھے لگتے ہو۔ تمھیں دیکھ کے لڑکی دل ہار جائے تو اُس کا دوش نہیں۔ تمھیں خدا نے ہمہ اوصاف و کمال بنایا ہے۔“

صحن میں کھٹ پٹ کی آوازیں آئیں تو میں باہر نکل آیا۔ چٹائی لپیٹ کے ایک طرف رکھ دی تھی۔ کچے فرش پر ایک سقّہ چھڑکاؤ کر رہا تھا۔ مجھے دیکھ کے اُس نے میلے چکٹ کُرتے سے ہاتھ پونچھے اور نمسکار کیا۔ چلتا پرزہ لگتا تھا۔ دوڑتے قدموں سے اُس نے مٹکے کا پانی کیاری میں اُلٹ کے تازہ پانی بھر دیا۔ پھر مشک کا بچا ہوا پانی پھرتی سے دیواروں پر اچھالا اور یہ جا وہ جا۔ حالاں کہ میں اُس سے بات کرنے کا سوچ ہی رہا تھا۔ لیکن وہ مچھلی کی طرح چھپچھل گیا تھا۔ ہر انسان پر ایک نوشتہ ضرور چسپاں ہوتا ہے۔ اُسے پڑھنا قاری کی استعداد پر منحصر ہے۔ بعض کے چہرے چغلی کھاتے ہیں تو کسی کی زبان عرضِ حال کرتی ہے، تو کسی کا لہجہ چغلی کھا جاتا ہے۔ کسی کی چال نوشتہ تو کسی کا لباس نوشتہ اور کوئی سرتاپا نوشتہ۔ بالکل اسی طرح سقّے کے بارے میں گمان گزرا تھا کہ یہ خبردار آدمی ہے۔ اُس کے جاتے ہی دو آدمی صحن چڑھ آئے۔ یہ دونوں کل تمام کاموں میں نمایاں نمایاں تھے۔ ان میں سے ایک وہ تھا جو مرغ بسمل کروا آیا تھا، اور دوسرا لپکا پھرتا تھا۔ وہ دیکھتے ہی بچھ سے گئے۔ ان میں سے ایک کا نام دھیارا اور دوسرے کا نام لنگ چند تھا۔ اُسے لنگو کے نام سے بلایا جاتا تھا۔ یہ دونوں آج کل چھلیا کے آگے پیچھے پھر رہے تھے، پر چھلیا نے اب تک اِن پر ہاتھ نہیں رکھا تھا۔ دھیارا بمبئی جا کے قسمت آزمانا چاہتا تھا اور لنگو کاٹھیاواڑ کے کسی بڑے شہر میں بسنے کا آرزومند تھا۔ میں کافی دیر اُن سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا۔ وہ اُتنا ہی جانتے تھے کہ جتنا چھلیا مجھے بتا گیا تھا۔ بھوک قطعاً نہیں تھی، لیکن لنگو چکما دے کے نکل گیا۔ وہ باتیں کرتے کرتے ابھی

آیا، کہہ کے گیا اور واپسی پر پتیل کی ڈھکی ہوئی پیالیوں سے بھرا خوان لا دے چلا آیا۔ پراٹھے، باجرے کی روٹی، سرسوں کی ترکاری، دہی کا سالن اور نہ جانے کیا کیا اُس خوان میں بھرا تھا۔ لیونارڈ بھی آ گیا۔ ضروریات سے فراغت کے بعد تھوڑا بہت میں نے بھی کھا لیا، لیکن لیونارڈ آخری لقمے تک جتا رہا۔ اُسے ہندستانی کھانا بے حد پسند آیا تھا۔

ناشتے کے بعد میں باہر نکل آیا۔ لنگو اور دھیارا میرے دائیں بائیں ہو گئے۔ میں نے انھیں واپس کرنا چاہا، لیکن وہ بہ ضد رہے۔ اُن سے لاری کے متعلق دریافت کیا تو اُنھوں نے بتایا کہ یہاں سے تانگے کے ذریعے دلواڑا جایا جاتا ہے۔ دلواڑا سے ہندستان بھر کے لیے ریل بھی مل جاتی ہے اور لاریاں بھی۔ کچھ ہی دور تانگے نظر آئے جو قطار میں کھڑے تھے۔ جن پر سواریاں لپک رہی تھیں۔ ایک کے پیچھے ایک تانگا روانہ ہو رہا تھا۔ وہیں ساتھ ہی پنساری کی بہت بڑی دکان تھی جس پر خوب ریل پیل تھی۔ لنگو نے بتایا کہ جو سودا دلواڑا سے نہیں مل سکتا وہ بھوّا مہاجن کی دکان میں بھرا پڑا ہے۔ میں وہاں قریب پہنچا تو بھوّا مہاجن مجھے دیکھ کے تھر کتا ہوا دوڑا چلا آیا۔

”رام رام، دھنّے وار، جے ہو سری رام جی... سواگت ہے سرکار... ایں داس کو بھوّا بولنے کا ہے، بھوّا مہاجن۔“ اُس نے ہاتھ جوڑ کے پرنام کیا۔ کاروباری مسکراہٹ تو گویا اُس کے چہرے پر ثبت تھی۔

میں نے جواباً ہاتھ جوڑنے پر اکتفا کیا، اور آگے بڑھنے کا فیصلہ کیا، لیکن وہ آڑے آ گیا اور منت سماجت کرنے لگا کہ میں اُس کی دکان پر کچھ دیر کے لیے بیٹھوں، اُسے خدمت کا موقع دوں۔ اُسے دیکھ کے مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ بستی میں میری متعلق کیا چہ می گوئیاں ہو رہی تھیں۔ وہ کھینچ تان کر کے مجھے دکان میں لے گیا، اور ملازم کو بادام کے شربت کے لیے دوڑایا۔ شربت منگواتے وقت اُس نے بتانا ضرور سمجھا کہ اُس کے ہاں دلواڑے سے روزانہ برف

آتی ہے۔ وہ بستی کا اکلوتا خوش قسمت صاحب عیال ہے جو
برف سے یخ بستائی کشید کرتا ہے۔ اُس کی دکان خاصی کشادہ
تھی اور اسباب سے لدی پھدی نظر آتی تھی۔ ایک طرف
پٹ سن کی بوریوں کے ڈھیر تھے، جن کے مُنہ کھلے ہوئے
اور گلے گولائی میں مڑے ہوئے تھے۔ اناج، دالیں، چاول،
شکر، گھی، تیل کے پیپے، خوش بودار صابن، دھوبی صابن،
پوجا کا سامان۔ ایک طرف رنگارنگ کپڑوں کے تھان، لٹھا،
بوسکی، سوتی، ریشمی ہر قسم کا کپڑا۔ دوسری طرف شیشے کا
صندوق، چاندی سونے کے زیورات، انگوٹھیاں، قلو بند،
کنٹھے، کڑے، مالا، پٹی، سربند، ہتھلیاں، چوٹی بند، جوڑے،
جڑاو ہار اور نہ جانے کیا کچھ اس میں بھرا پڑا تھا۔ ایک طرف
چھریاں، قسم قسم کے چاقو، تلواریں، ترشول، زنجیریں،
درانتیاں، ہتھوڑیاں، چھینیاں اور دوسرا ازرگی سامان بھرا ہوا
تھا، تو ایک طرف خوش بویات، عطریات، پوجا کا مکمل
سامان، رام، کرشن، ماتا اور دیگر کی مورتیاں آراستہ تھیں۔
لوبان کی سُلگن دکان میں خوب رچی ہوئی تھی۔ ملازم بادام
کا شربت لے آیا۔ وہ سفید چاندی کا منقش کٹورا تھا۔
شربت انتہائی ٹھنڈا، شیریں اور گاڑھا تھا۔ شربت میں ایک
قسم کا بادام کا چورا پڑا تھا۔ بادام کو چاندی کے ورق کے
ساتھ چورا کیا جاتا ہے۔ اِس طرح بادام کا چورا سنہری رنگ
پکڑ لیتا ہے۔ پھر اُسے شربت بادام کے پیالے میں اوپر
سے چھڑک دیا جاتا ہے۔ یہ امرا کا مرغوب شربت تھا۔ مجھے
خیال آیا، لیونارڈ یہ شربت پی لیتا تو خوب خوش ہوتا۔ بھوّا
مہاجن نے دھیارا اور لنگو کے لیے شربت نہیں منگوایا تھا۔
"بھوّا جی! میرے ساتھ دو مہمان اور بھی ہیں۔" مجھے اچھا
نہیں لگا تھا۔ مہاجن کو یاد دہانی کروائی۔
اُس نے ایک لمحے کو کڑوا سا مُنہ بنایا، پھر وہی
کاروباری مسکراہٹ بکھیر لی۔ "ایں اے تو اپنا دھیارا اور
لنگو ہونے کا ہیں... ایں اپنا بالک ہیں مہمان کائیں کو۔"
لیکن اُس نے ان دونوں کے لیے بھی شربت منگوا دیا، البتہ
مٹی کے پیالوں میں۔ پھر وہ مجھے ہاتھ پکڑ کے زیورات کے
صندوق پہ لے گیا اور بولا، "ایں جس پہ ہاتھ رکھنے کا وہ اپنا
تیرے کو نجر کرنے کا ہے۔ سرمانے کا نہیں اے۔ بس اِسارہ
کرنے کا ہے۔"
میں نے عذر تراشا کہ ابھی جلدی ہے، پھر آ کے لے
لوں گا، لیکن وہ ہٹیلا ہو گیا۔ آخر تنگ آمد بہ جنگ آمد، میں
نے زیورات کے اوپر نظر ڈالی۔ میری آنکھوں کے
سامنے اندھیرا سا آ کے گزر گیا، میں پتھر کا ہو گیا تھا۔
یکا یک مجھے کچھ ہوش آیا تو میں نے بے اختیار گلے پر
ہاتھ مارا، کورا کی مالا وہاں موجود تھی۔ بھوّا مہاجن مجھے بغور
دیکھ رہا تھا۔ میرے جسم کی لرزش تو اندھے کو بھی نظر آ جاتی۔
زیورات کے بیچوں بیچ ایک سنگِ سفید میں پیوست وہی موتی
جگمگا رہا تھا، ہو بہو میری مالا میں پروئے موتیوں جیسا۔ میں
اُسے ہزاروں میں پہچان سکتا تھا۔ میری سانس یک دم تیز
ہو گئی۔ یہ ابا جان کی بیچی گئی مالا کا موتی نہیں ہو سکتا تھا۔ کیا کورا
کے پاس بھی ایسی مالا تھی؟ وہ مجھے ابھی علاقے میں نظر آئی تھی۔
یہ سوچ کے میرے جسم کا رُواں رُواں لرزنے لگا کہ یہ موتی
مولوی صاحب نے فروخت کیا ہوگا۔ تو کیا وہ اس بستی میں
آئے تھے۔ اگر وہ اِس بستی میں آئے تھے تو پھر وہ یہاں ممتاز
تھے، پوری بستی کے دل و دماغ میں یقیناً موجود ہوں گے۔

ساتھ ایک انگریز خاتون مایا اور اُس کا ایک ساتھی ہے، جب کہ جمرو ہلاک ہو چکا ہے۔ تمام انگریز مغوی ہلاک کر دیے گئے ہیں۔ چھلیا بٹھل کی کھوج میں نکل پڑا۔ بابر نے بستی ہی میں ٹھہرنا مناسب سمجھا۔ رات کے پچھلے پہر بابر کی آنکھ کھلی تو اُس نے ایک خوب رُو دوشیزہ لکشمی کو سرہانے بیٹھے پایا۔ وہ نزدیکی شہر دیواڑا کے امیر کبیر شخص کی اکلوتی بیٹی تھی۔ وہ بابر سے مصر ہوگئی کہ رگھوبوری والا نامی دادا سے اُسے بچا لے۔ رگھوبوری والا لکشمی پر دل و جاں سے فریفتہ ہو چکا۔ بابر کو وہ کرنے پر ہی بن پڑی۔ تب وہ آفتِ جاں دوشیزہ اڈے سے نکلی۔ اگلی صبح بابر لنگو اور دھیارا کے ہم راہ بستی کا جائزہ لینے نکلا۔ بھوا مہاجن نامی ایک ساہوکار نے اُسے اپنی دکان میں بصد اصرار بلا لیا۔ اُس کی دکان ہمہ قسم کے ساز و سامان سے لدی پھدی تھی۔ وہاں بابر کو شیشے کے ایک نمائشی صندوق میں نادر و نایاب موتی نظر آیا۔ یہ موتی ہو بہو کورا کی دی ہوئی بالا میں پروئے موتیوں جیسا تھا۔

"وہ تمھیں کہاں ملے تھے؟" میں نے بے قراری سے پوچھا۔
بھوا مہاجن نے موتی سے میری جذباتی وابستگی اُچک لی اور محتاط انداز میں بولا، "ایں موتی بڑے کھان جی کو پیش کرنے کا ہے۔ ابھی آپ کی اِچھا ہے تو...!"

"تم غلط سمجھتے ہو۔ مجھے موتی نہیں چاہیے۔ براہِ مہربانی جن سے موتی خریدا ہے اُن کا اَتا پتا بتا دو۔ وہ سیکڑوں موتیوں سے بڑھ کے ہیں۔" مجھ سے کہاں صبر ہوتا... میں نے اُس کی بات کاٹ کر فوراً غلط فہمی دور کرنے کی کوشش کی۔ مجھے تو پنکھ لگ رہے تھے کہ ابھی بھوا مہاجن پتا بتائے گا اور ابھی میں اُس کی چوکھٹ پر جا موجود ہوں گا۔ میں اُس کی لب کشائی کا منتظر تھا اور بھوا کا چہرہ گھٹ بڑھ رہا تھا۔ اُس نے کھوجتی نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا، "اپنے کو بھی پورا وسواس ہے اس کے پاس کھنڈریں موتی ہیں، مگر ابھی وہ ملنے کا نہیں ہے۔ سوامی جی! اگر تیرے کو کچھ کھبر ہوئے تو اپنے کو بتانے کا ہے۔ اے انوکھا موتی ہے ایک دم تھوڑا۔"

بھوا مہاجن نے گرگٹ کی طرح رنگ بدلا تھا، اور کچھ چھپا گیا تھا۔ یقیناً اُس نے آم گٹھلی کے دام خریدا تھا، اور اب پوری فصل خریدنے کا خواہاں تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ لازماً مولوی کے پتے سے واقف تھا اور مجھ میں اب صبر کی تاب نہیں تھی۔ میں نے بھڑک کے اُس کا گریبان پکڑا اور پوری وحشت سے جھٹک دیا۔ وہ ہڑبڑا کے اناج کی بوریوں پر جا پڑا۔ دھیارا اور لنگو شاید اشارے کے منتظر تھے۔ چاقو سوت کے لپکنے لگے، لیکن میں نے ہاتھ اٹھا کے اُنھیں روک دیا۔ یہ بچکانہ پن کی حرکت تھی۔ بٹھل ہوتا تو بھوا کو چھوڑ کے دھیارا اور لنگو کے جماتا، نہ میں بٹھل تھا اور نہ میرے پاس اِتنی فرصت تھی۔ بھوا ڈگمگاتا ہوا اٹھ رہا تھا کہ میں نے بڑھ کر گھٹنا اُس کے پیٹ میں مارا۔ وہ ڈکراتا ہوا پلٹ کے گرا۔ وہاں میرے دوسرے پیر کی ٹھوکر نے اُس کی پشت کا استقبال کیا۔ بھوا کی لرزہ خیز چیخوں سے دکان پھٹنے لگی تھی۔ کاش کہ میری وحشت کو زبان مل جاتی تو شاید بھوا کو یہ تشدد نہ سہنا پڑتا۔ آخر بھوا میری ٹانگوں سے لپٹ گیا۔

"دیا کرو سوامی جی... چھما کرو... چھما کرو۔"

دکان سے باہر آناً فاناً بھنبھناتا ہوا ہجوم جمع ہو چکا تھا۔ میں نے گدی سے پکڑ کے بھوا کو اٹھایا اور اپنے تئیں انتہائی سفاک لہجے میں کہا، "بھوا سیٹھ! دوسری بات نہیں سنوں گا۔ مجھے فی الفور اُن کا پتا بتاؤ، ورنہ تمھاری نسلیں یاد رکھیں گی!"

بھوا کی حالت دگرگوں تھی۔ اُس کے ساتھ میرا یہ سلوک انتہائی غیر مناسب تھا۔ مروت بھی کسی شے کا نام ہے۔ بھوا بے چارے نے بلا کے عزت سے بٹھایا کہ آ بیل مجھے مار۔ اب میرے پاس یہ سب سوچنے سمجھنے کی فرصت کہاں تھی۔ اگر میں یہ کچھ نہ کرتا تو وہ یوں تیر کی طرح نہ سیدھا کھڑا ہوتا۔ وہ خزاں رسیدہ پتے کی طرح کانپ رہا تھا، لیکن اُس کی سوچ چہرے پر آ کے صاف بیان کر رہی تھی کہ گویائی کی قیمت جان سے کچھ کم بھی نہیں۔ "اُدھر دلواڑے

میں شاکر بھائی کی علی مسجد تھی۔ وہ اُدھر شاکر بھائی کے گھر میں رہنے کا ہے، پر..." بھوا نے ڈوبتی آواز نکالی، "شاکر بھائی کو لاکھ پورا اور آدھا دینے کا ہے۔" وہ نڈھال ہو کے فرش پر پسر گیا۔ لمحوں میں اُس کا رنگ پیلا زرد پڑ گیا تھا۔ دکان کے اندر کوئی نہیں آیا تھا، لیکن باہر پوری بستی جمع ہو گئی تھی۔ چھوٹے علاقے اِس اعتبار سے بڑے ہوتے ہیں کہ وہاں کوئی بات چھوٹی نہیں ہوتی۔ شہروں کی بڑی بڑی اور امیر و کبیر باتیں ان بستیوں میں سرے سے موجود ہی نہیں ہوتیں اور یہ بھی خوب ہے کہ ان بستیوں کی چھوٹی چھوٹی اور نادار باتیں شہروں میں نہیں ہوتیں، لیکن پھر بھی شہر بستیوں سے قائم ہیں اور بستیاں شہروں سے۔ بھوا مہاجن کی دکان پر اس ہڑبونگ کو محض چند لمحے ہوئے تھے، گویا بستی والوں کو گھنٹوں پہلے علم ہو گیا تھا، بس انھیں انتظار تھا کہ کس دم یہاں پہنچا جائے۔ میں بھوا کے ساتھ مشغول تھا تو دھیارا اور لنگو باہر نکل گئے تھے۔ وہ ننگ دھڑنگ مغلظات سے بستی والوں کو منتشر کرنے میں مصروف تھے۔

"وہ اِس وقت شاکر بھائی کے گھر ہی میں ہے۔" میں نے بے چینی سے پوچھا۔ مجھے یقین کہاں تھا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے، ورنہ اب وہاں کیا ٹھہرنا۔

"ابھی تم اندر چل کے میری بات سننے کا ہے۔" بھوا کو پھر حال آ گیا۔ وہ پھر پھڑک کے میرے پیروں سے لپٹ گیا۔

دکان کے عقبی حصے میں دروازہ تھا، جس پر ٹاٹ کا میلا سا پردہ پڑا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ گودام قسم کی کوئی جگہ تھی۔ میرا دل کھولتے ہوئے شوربے کی طرح اُبل رہا تھا۔ میں نے بہ مشکل خود کو سنبھالا۔ جلد بازی ایک مرتبہ پھر منزل کو دُھندلا سکتی تھی۔ مجھے ایک مرتبہ پھر پوری شدت سے احساس ہوا کہ کوئی ہے جو مجھے کورا سے ملانے کے درپے ہے، ورنہ بحری جہاز تو بمبئی جا رہا تھا اور مجھے کیا پڑی تھی جو بھوا مہاجن کی دکان پر چڑھتا۔ میں نے جھٹک کے اپنے پیروں سے بھوا کو الگ کیا اور کڑک کے کہا، "اندر کیا ہے؟"

"اُدھر یہ سب سننے کا ہے۔ ابھی سارا سچ بتائیں گا۔ یہ سب لوگ میرے کو کھتم کرنے کا ہے سوامی جی۔ بڑی راج کی بات ہے۔"

میرا دل ایک بار پھر دھڑک سا گیا۔ مجھے متواتر یہ محسوس ہو رہا تھا کہ میری توقع سے کہیں زیادہ یہ شخص کورا اور مولوی صاحب کے بارے میں جانتا ہے۔ میں نے گریبان پکڑ کے اُسے اٹھا لیا اور دروازے کی طرف دھکیلا۔ "چلو، ذرا ہوش یاری دکھائی تو تمھارے ٹکڑے کوئی شمار نہیں کر سکے گا۔"

میرا ذہن بہ سرعت گھوم رہا تھا۔ دروازے کے اُس طرف واقعتاً گودام ہی تھا۔ بھوا نے ہوش رُبا تفصیل بتائی۔ اُس نے بتایا کہ قریباً ایک ماہ قبل وہ حسبِ معمول دلواڑا خریداری کے سلسلے میں گیا۔ وہاں ایک جوہری اُس کا بے حد گہرا دوست ہے۔ وہ دلواڑا جاتا ہے۔ فارغ وقت اپنے جوہری دوست ہی کے پاس گزارتا ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ وہ جوہری مسلمان تھا اور اُس کا نام حسین والا تھا۔ بھوا نے دلواڑا سے میٹرک پاس کیا تھا، جہاں حسین والا اُس کا ہم جماعت تھا۔ دونوں کا تعلق متمول خاندانوں سے تھا اور دونوں ہی کے خاندان مذہبی انتہاؤں پر اُستوار تھے۔ ایک کٹر ہندو اور دوسرا کٹر مسلمان۔ حسین والا سے بھوا مہاجن کے خوب لمبے مباحث ہُوا کرتے تھے۔ گزشتہ ایک سال سے تو ان کی ہر ملاقات اسی بحث کی نذر ہو رہی تھی، جب کہ ان فروعات سے جدا ان کی دوستی اٹوٹ تھی۔ اُس دن بھی بھوا، حسین والا پر یہ ثابت کرنے میں مشغول تھا کہ ہندو مت بے شمار دیوتاؤں کے بجائے ایک بھگوان کی وحدانیت کا پرچاری ہے۔ جب ایک باریش اور چمکتی ہوئی صورت کا مالک، نرم رُو بزرگ حسین والا کے پاس آیا تھا۔ اُس نے اپنا نام مولوی شفیق احمد بتایا اور حسین والا کو اس کے مربی شاکر بھائی کا حوالہ دیا۔ ان کے پاس یہ موتی تھا جسے وہ فوری فروخت کرنا چاہتے تھے۔ حسین والا نے موتی کے دام اُن کی توقع سے کہیں کم لگائے۔ وہ پریشان اور گھبرائے گھبرائے سے لگتے تھے۔ اُنھوں نے معمولی سی جرح کے بعد یہ ان مول موتی حسین والا کو کوڑیوں کے بھاؤ بیچ دیا اور شانِ بے نیازی سے چلتے بنے۔ حسین والا کی طویل رفاقت سے بھوا کو بھی زر و جواہر کی اچھی خاصی پہچان ہو گئی تھی۔ موتی کی اہمیت اُس سے چھپی نہ رہ سکی۔ اُس نے اپنی دوستی کا بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے حسین والا پر اصرار باندھ لیا۔ آخر کار

حسین والا کو وہ موتی معقول منافع پر بھُوا کو فروخت کرنے پڑ ہی پڑے۔ مولوی شفیق کی بے اعتنائی سے بھُوا نے اندازہ لگایا تھا کہ ان کے پاس یہ دُرِّ ان مول بے بہا ہیں۔ شاکر بھائی سے وہ رسمی طور پر واقف تھا۔ شاکر ویسے تو علی مسجد کے متولّی تھے، لیکن درپردہ اُن کے بیاج کا وسیع لین دین تھا۔ دلواڑا کی کون سی اینٹ اور کون سی دیوار تھی جو شاکر بھائی کے پیسے سے نہ لگی ہو۔ شاکر بھائی کے گزروں کی تیسری پشت علی پیر کے ہاتھوں مسلمان ہوئی تھی۔ بیاج کا بیوپار ان کا آبائی پیشہ تھا، جسے ترک کرنے پر وہ قادر نہ تھے، اور نہ ہی وہ ایسا کرنا چاہتے تھے، کیوں کہ ان کے 'کھاتا دفتر' کی الماریاں پشتوں سے مقروض لوگوں کے ناموں سے بھری پڑی تھیں۔ تاہم وہ خود کو سُود خور کہلوانا سخت ناپسند کرتے تھے، اس لیے پورا دلواڑا ان کے کاروبار سے مکمل واقفیت رکھنے کے باوجود کچھ نہیں جانتا تھا۔ شاکر بھائی کے آبا نے علی پیر کے مزار پر علی مسجد بھی بنوائی تھی، جہاں ہر گیارھویں کو بمبئی سے قوال آتے تھے۔ بھُوا اِس لیے حیران ہُوا کہ شاکر بھائی نے موتی خود کیوں نہیں خرید لیا، لہٰذا وہ حسین والا سے موتی لے کر سیدھا شاکر بھائی کی کوٹھی پر پہنچا۔ شاکر بھائی سے بوا کو ایک نسبت اَور بھی تھی۔ شاکر بھائی بھُوا ہی کی ذات برادری کا تھا اور بھُوا کا خیال تھا کہ اُس کے اور شاکر بھائی کے پردادا دُور پرے کے رشتے کے بھائی تھے۔ شاکر کا پردادا جب مسلمان ہُوا تھا تو اُس کے رشتے ناتے تبدیل ہو گئے تھے۔ شاکر بھائی بھُوا کو اپنے در پر دیکھ کے متعجب ہُوا، تاہم اس سے بڑے تپاک سے ملا۔ بیٹھک کے بجائے مردان خانے میں بٹھایا۔ بھُوا نے باتوں ہی باتوں میں مولوی شفیق اور موتی کا تذکرہ کیا تو شاکر بھائی چونک گیا۔ وہ مولوی صاحب سے واقف تھا، تاہم نادر و نایاب موتیوں کے خزانے کا اُسے علم نہیں تھا۔ مولوی صاحب تقریباً ایک ماہ سے علی مسجد کے امام کے گھر میں مقیم تھے۔ اُن کے ہم راہ اکلوتی صاحب زادی تھی۔ وہ امام مسجد کے پرانے واقف کار تھے اور سیر و سیاحت کی غرض سے چلتے چلتے یہاں تک پہنچے تھے۔ شاکر بھائی روئی کا بیوپاری تھا۔ بھُوا کی اطلاع کے بعد ایک پل کی فروگذاشت ناممکن تھی۔ اس کے عین ناک تلے انمول خزانہ کوڑیوں کے بھاؤ بِک رہا تھا اور اُسے خبر نہ تھی۔

اُس نے مولوی صاحب کو طلب کرنے کا خطرہ مول نہ لیا اور خود کانپتا لرزتا ہُوا امام صاحب کے دروازے پر پہنچ گیا۔ بھُوا ساتھ ساتھ تھا۔ وہ دستک دیا ہی چاہتے تھے کہ دروازہ عُجلت میں کُھل گیا۔ مولوی شفیق گھبرائے ہوئے نکل رہے تھے کہ اُن سے اُلجھ کر ڈگمگا گئے۔ اُن کی صاحب زادی کی طبیعت اچانک خاصی ناساز ہو گئی تھی، وہ اُسے اسپتال لے جانے کے لیے سواری تلاش کرنے نکلے تھے۔ امام صاحب اس وقت گھر پر نہیں تھے۔ بھُوا کے پاس شان دار موٹر تھی۔ اُس نے اپنی اور موٹر کی خدمات پیش کرنے میں دیر نہیں لگائی۔ مولوی صاحب کے سہارے لڑکھڑاتی ہوئی ایک برقع پوش لڑکی بھُوا کی موٹر میں آن بیٹھی۔ ان کے ساتھ امام صاحب کی زوجہ بھی تھیں۔ بھُوا نے انھیں اسپتال تو پہنچایا تھا، تاہم وہ اس دوران اپنا سب کچھ ہار گیا تھا۔ اُس برقع پوش لڑکی کا دو ایک مرتبہ نقاب کیا اُلٹا تھا کہ بجلیاں تڑپ کے بھُوا کی آنکھیں خیرہ کر گئی تھیں، سیاہ بدلیوں کی اوٹ میں ایسا ماہ تاب تھا کہ ماہ تاب بھی شرمائے۔ بھُوا نے اِتنا حسین چہرہ کبھی نہ دیکھا تھا۔ وہ ایسی صورت کا تصور تک نہیں کر سکتا تھا۔ بھُوا نے وہ موتی پایا تھا کہ جس کے سامنے ہیرے کی چمک ماند پڑ جائے۔ بھُوا نے اسپتال کی چوکی سنبھال لی۔ اس کی بے قراری مخفی نہ رہی تھی۔ نہ شاکر بھائی سے اور نہ ہی مولوی صاحب سے۔ ان کی واپسی بھی بھُوا کی موٹر میں ہوئی اور مریضہ کو اسپتال سے افاقہ ہُوا تھا۔ مولوی صاحب بھُوا کی اس ناگہاں دست گیری پر بے حد مشکور ہوئے۔ ہر چند کہ بھُوا ہندو تھا، تاہم اُنھوں نے شاکر بھائی اور اُسے بہ صد اصرار کھانے کے لیے روکا۔ امام صاحب بھی آ چکے تھے۔ وہ شاکر بھائی کے نمک خواروں میں سے تھے، اِس لیے محتاط روی سے مسکرا رہے تھے۔ مولوی صاحب نے کھانے کا کہہ کر گویا بھُوا کے دل کی بات چرائی تھی، لیکن شاکر بھائی کی مداخلت پر یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔ وہ اُسے گھسیٹ لے گئے۔ بھُوا کی زندگی میں وہ دن قیامت ڈھا گیا۔ اس کے لیے مولوی صاحب کی چوکھٹ چھوڑ کے باقی دنیا بے رنگ و بو ہو چکی تھی۔ اس نے من ہی من میں ہر قیمت پر مولوی صاحب کی صاحب زادی کو حاصل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اسے رخصت کرتے وقت شاکر بھائی نے کہا تھا

کہ اس وقت مولوی صاحب سے موتیوں کی بابت بات کرنا غیر مناسب تھا، تاہم بھُوا اب خود کو اس معاملے سے دُور سمجھے، لیکن بھُوا دوسرے دن براہِ راست مولوی صاحب کی طرف پہنچ گیا۔ اُس کا خیال تھا کہ آج بھی اُسے کھانے کی دعوت دی جائے گی۔ مولوی صاحب نے اُس کی آرزوؤں پر خاک ڈال دی۔ اُسے گھر میں بٹھانے کے بجائے محلے کے چبوترے پر بٹھایا۔ امام صاحب کے مکان میں بیٹھک کی گنجائش نہیں تھی۔ پہلے پہل مولوی صاحب نے مزید موتیوں کی موجودگی سے انکار کیا، تاہم جب بھُوا نے فی موتی قیمت پچاس ہزار بتائی تو اُنھوں نے تھوڑی سی حیل حجت کے بعد ہتھیار ڈال دیے۔ اُنھوں نے بھُوا کو بتایا کہ اُن کے پاس چند موتی اور ہیں جنھیں وہ مناسب دام ملنے پر فروخت کرنا چاہتے تھے۔ بھُوا کی پیش کش معقول تھی، لہٰذا انھیں موتی فروخت کرنے میں کوئی عذر نہ تھا۔ ابھی اُن کے درمیان یہ سودا طے پایا ہی تھا کہ فربہ جسامت کا مالک شاکر بھائی اپنے تین کارندوں کے ہم راہ چیخنا تا ہُوا وہاں آن دھمکا۔ اُس نے بھُوا سے درشت لہجے میں اپنے ساتھ چلنے کا کہا، جب کہ اُس نے مولوی صاحب فدویانہ انداز اختیار کرتے ہوئے بتایا کہ ان کے لیے علاحدہ مکان کا انتظام کر دیا گیا ہے۔ پھر اُس نے اپنے ایک ملازم کو حکم دیا کہ وہ نئے مکان میں منتقلی کے لیے مولوی صاحب کی مدد کرے، اور اس نیک کام میں کسی تاخیر کی گنجائش نہیں ہے۔ مولوی صاحب متذبذب حالت میں کھڑے ہی رہ گئے، جب کہ بھُوا کو شاکر بھائی بازو سے پکڑ کے اپنے ساتھ لے گیا۔ بھُوا نے شاکر بھائی کے ساتھ جانے میں ہچکچاہٹ دکھائی، لیکن پھر شاکر بھائی اور اُس کے کارندوں کے کڑے تیور دیکھ کر ٹھنڈا پڑ گیا۔ شاکر بھائی نے اُسے مہمان خانے میں لے جا کے بٹھایا۔ اس کے ہم راہ کھانا کھایا ہے۔ اس کے بعد بھُوا کو مہمان خانے میں قید کر دیا گیا۔ شاکر بھائی نے اِس دوران اُس سے موتیوں اور مولوی صاحب سے متعلق کوئی بات نہیں کی۔ کئی گھنٹوں کے بعد شاکر بھائی تالا کھول کے مہمان خانے میں آیا اور اُس نے بھُوا سے کہا کہ وہ جا سکتا ہے اور اسے امید ہے کہ بھُوا زبان بندی کو محترم جانے گا۔ بھُوا نے اندازہ لگا لیا کہ شاکر بھائی مولوی صاحب سے موتی حاصل

کر چکا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ اُس نے مولوی صاحب کو یہاں سے روزانہ بھی کر دیا ہو۔ عافیت کی بات تھی کہ بھُوا خاموشی سے نکل جاتا، لیکن کیا کرتا دلِ نادار کا جو نہاں خانے میں مچل رہا تھا۔ بھُوا کو گومگو کی کیفیت میں دیکھ کر شاکر بھائی بول پڑا۔ اُس نے کہا کہ وہ بھُوا کی حالت سے واقف ہے، لیکن بھُوا کو یہ یاد رکھنا چاہیے کہ وہ برہمن ہے اور مسلمانوں کے مذہبی پیشوا کی دختر پر نظر مار رہا ہے، اور یہ ناممکنات میں سے ایک کام ہے۔ شاکر بھائی نے یہ کہہ کر بھُوا کے من میں جوت لگا دی کہ اگر بھُوا اسلام قبول کر لے تو وہ بہ نفسِ نفیس اپنی سرپرستی میں بھُوا کا نکاح اس برقع پوش لڑکی سے پڑھوا دے گا۔ بھُوا کا نیم اثباتی ردِ عمل دیکھ کر شاکر بھائی نے کہا کہ ان کی جاتی کے کچھ سرکردہ افراد اسلام سے متاثر ہیں، لیکن ہچکچا رہے ہیں، اگر بھُوا مسلمان ہو جائے تو دوسروں کی راہ آسان ہو سکتی ہے۔ بھُوا نے اس سے سوچنے کا وقت لیا اور چلا آیا۔ بھُوا کے زیر بند میں ڈیڑھ لاکھ رُپے بند تھے، جو شاکر بھائی کے کارندوں نے کھول لیے تھے۔ بھُوا نے اُن کا تقاضا کیا تو شاکر بھائی نے اُن کی واپسی اُس کے جواب سے مشروط کر دی۔ بھُوا کے جی میں آئی کہ یہاں سے نکلتے ہی پولیس میں پرچہ دے دے، ایک پولیس افسر سے اُس کی جان پہچان تھی، لیکن اُسے محسوس ہُوا کہ ڈیڑھ لاکھ رُپے کی اُسے اب کوئی خاص فکر نہیں رہی تھی۔ اِتنی بڑی رقم ہاتھ سے نکل گئی تھی اور بھُوا اُس رخِ سہ ناز کے تصور میں غرق تھا۔ وہ اسلام قبول کرنے سے وابستہ خطرات کا احاطہ کر رہا تھا۔ اُسے صاف نظر آیا کہ اُس کا قبولِ اسلام بہت سوں کے لیے قابلِ تقلید مثال تھا اور شاکر بھائی کی مسلم تنہائی کو بھی خاصا افاقہ ہو سکتا تھا، لیکن دوسری طرف اُس کی جان کو لالے بھی پڑ سکتے تھے۔ اُس کا کاروبار تباہ و برباد ہونے کا قوی امکان تھا۔ وہ آج جن میں محترم تھا اُنھی میں اچھوت بن جاتا، لیکن وہ کیا کرتا۔ وہ خانہ برباد تو اُسی لمحے ہو چکا تھا جب اُس کی موٹر مولوی صاحب کے دروازے لگی تھی۔ ہفتے بھر کی سوچ بچار سے اُس نے جانا کہ عافیت مسلمان ہونے ہی میں تھی۔ وہ دوڑا دوڑا شاکر بھائی کے پاس گیا، اُسے مژدۂ جاں فزا سنایا، مگر شاکر بھائی نے اُس کے خواب چکنا چُور کر دیے۔ مولوی صاحب گذشتہ

رات اپنی صاحب زادی کے ہم راہ وہاں سے جا چکے تھے۔ شاکر بھائی نے اُسے بتایا کہ صبح دستک دی گئی تو ان کا دروازہ اندر سے کھلا تھا۔ کئی دستکوں کے بعد جب کوئی نہ آیا تو معلوم ہُوا کہ مکان تو اندر سے سائیں سائیں کر رہا ہے۔ مولوی صاحب اپنی اکلوتی صندوقچی اور صاحب زادی کے ہم راہ غائب ہیں۔ بھُوا نے انھیں بے حد تلاش کیا، لیکن کوئی اتا پتا نہیں مل سکا تھا۔ البتہ اُسے یہ سُن گُن مل گئی تھی کہ شاکر بھائی نے مولوی صاحب سے اپنے بیٹے کے لیے رشتہ مانگا تھا۔ بھُوا کو شک تھا کہ مولوی صاحب کہیں گئے نہیں ہیں، بل کہ شاکر بھائی نے انھیں غائب کروایا ہے، کیوں کہ جس مقام کو اُن کی قیام گاہ بتایا گیا تھا، بھُوا کی اطلاع کے مطابق گذشتہ کئی ماہ سے مسلسل مقفّل تھا۔ بھُوا کے استفسار پر شاکر بھائی سیخ پا ہو گیا اور بھُوا پر لاتوں اور گھونسوں کے ہم راہ چل پڑا۔ اُسی دن شاکر بھائی اور اُس کے کارندوں نے مار مار کے بھُوا کو ادھ موا کر دیا۔ اُسے موٹر میں ڈالنے سے پہلے شاکر بھائی نے دھمکا دیا تھا کہ مولوی صاحب کی کھوج میں وہ پھر کبھی دلواڑا میں نظر آیا تو وہ اس کی زندگی کا آخری دن ہوگا۔ بھُوا نے بتایا کہ قریباً بیس روز گزر چکے وہ دلواڑا نہیں گیا۔ مجھے دیکھ کے اُسے کچھ امید ہو چلی تھی۔ اُس کا خیال تھا کہ میں اگر اُس کی مدد پر آمادہ ہو جاؤں تو شاکر بھائی سے مولوی صاحب اور ان کی صاحب زادی کو برآمد کیا جا سکتا ہے، ورنہ دلواڑے کا کون سا بدمعاش تھا جس کا خرچہ شاکر بھائی نہ اٹھاتا ہے۔ اُس کے کاروبار میں شہروں کو بنیادی اہمیت حاصل تھی۔ بھُوا کے بقول موتی سے میری جذباتی وابستگی دیکھ کر پریشان ہو گیا تھا۔ بھُوا نے یہ اندازہ لگانے میں تاخیر نہیں کی تھی کہ میں مولوی صاحب کے واقف کاروں میں سے تھا۔ شاکر بھائی میں کیا کم تھا کہ یک نہ شد دو شد۔

بھُوا سے گزشتگی سن کر میں سنّاٹے میں آ گیا تھا۔ بھُوا نے بیس روز قبل تک کے حالات سنائے تھے، جب کہ میں چار دن قبل مولوی صاحب اور کورا کو لاری میں سوار ہوتے دیکھ چکا تھا، تاہم مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ لاری اڈّا کس قصبے یا شہر کا تھا۔ مولوی صاحب کے پاس وہ موتی کہاں سے آئے، جب کہ مجھے واثق یقین تھا کہ کورا کے پاس موتی یا جواہرات نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ اجین کی دی ہوئی مالا میرے پاس تھی۔ کورا کی ڈبیا کے جواہرات ابّا جان کے پاس رہ گئے تھے۔ بھُوا کا بیان سُن کر مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ مولوی صاحب کے پاس کئی موتی مالا ہی کی صورت میں تھے، اور کورا کی پلکوں کا ایک ایک بال مجھے ازبر تھا تو اتنی بڑی مالا کیسے پوشیدہ رہتی۔ موتیوں کا معمّا میری سمجھ سے بالا تھا۔ بھُوا نے بلکتی ہوئی آواز میں یہ سب کچھ سنایا تھا۔ اس کا بیان اجڑا ہُوا تھا۔ اُسے دیکھ کے میری وحشت خاکستر ہو رہی تھی۔ "ابھی میری بہت ساری جائیداد ہینگا۔ دکان میں لاکھوں کا مال ہے۔ باجار سے لاکھوں کی وصولی ہے۔ تجوری نوٹوں سے پھُل بھرنے کا ہے۔ سب تیرے کو دینے کا۔ بس اُس مولوی کو ڈھونڈنے کا ہے۔" بھُوا ہاتھ جوڑ کر ہڑکنے لگا۔ میرا دل چاہا کہ گریبان چاک کروں اور قہقہوں سے اپنی نسیں پھاڑ ڈالوں۔ طمانچہ بھُوا نے مارا تھا، لیکن ہاتھ غیبی تھا۔ جنوں کا گھمنڈ ہی تو اہلِ جنوں کو سرفراز رکھتا ہے۔ زمانے میں یکتا ہونے کا احساس ہی تو ہے جو قربان پر قربان کیے جاتا ہے، جہاں نسرین ناز آفریں کلمائے چمن ہے تو وہاں بلبل خوش نوا کی مدحت سرائی بھی حسن آفریں ہے۔ نکہتِ بہاری نقوشِ آبلہ پائی ہی پہ سے تھک تھک کے گزرتی ہے۔ اس لطف کو کیا کہیے گا جو آن ہوتا کرنے سے سر اٹھاتا ہے اور ایک خمار آگیں پندار کو جنم دیتا ہے۔ بھُوا نے ایک جملے سے میرا پندار خاک برد کر دیا تھا۔ اب کیا رہا تھا میرے پاس؟ یہ تو اپنا دھرم تک تیاگ رہا تھا۔

میں بھُوا کو کیا جواب دیتا، میں تو جیسے زلزلوں کی زد میں تھا۔ اُس نے میری لب مہری کا نہ جانے کیا مفہوم اخذ کیا کہ میرے بے حد قریب ہو کے بولا، "بھگوان نے ایسا کھوب صورت مکھڑا دوسرا نہیں بنایا، ورنہ تیرے کو جورو دکھانے کا تھا۔ جندگی میں ایک بار اسے چومنے کی اِچّھا ہے۔ اور بس!"

چٹاخ! مجھے نہیں معلوم کہ میرے ہاتھ میں کتنی قوت تھی، لیکن میری انگلیوں نے بھُوا کے رخسار کی کھال چھیل دی تھی اور ان نشانات پر گوشت پھٹ کے چیتھڑوں کی طرح امڈ پڑا تھا۔ اس میں بھُوا کا کیا قصور۔ وہ تو نردوش تھا۔ وہ تھی ہی ایسی کہ فرزانوں کے غول دیوانے ہو جائیں۔ بھُوا کو میں بری طرح پیٹ چکا تھا، مگر لگتا تھا کہ اس تھپڑ کی لذت اس

کی پور پور میں رچ بس گئی ہے۔ اس کے فہم و ادراک نے کچھ شناخت کیا تھا، وہ تہی اور خالی نظروں سے کچھ دیر مجھے دیکھا کیا۔ اُس کی کہانی اس مسودے سے کہیں بڑی تھی جو اُس نے مجھے سنایا تھا۔ باہر شور بڑھتا جا رہا تھا، اب یہاں ٹھہرنا بیکار تھا۔ میں بھُوا کو ساتھ لے دلواڑا جانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ اس اثنا میں دھیارا ہڑبڑاتا ہُوا اندر داخل ہُوا۔

"پولیس، دلواڑا کا پولیس ہے، جیپوں میں..."

دھیارا کی بات مکمل ہونے سے قبل ہی بھُوا کی گھٹی گھٹی چیخ گونج گئی۔ دھیارا کے دوڑتے قدموں ہی نے میری توجہ اپنی طرف مبذول کروائی تھی۔ مڑنے سے میری پشت بھُوا کی طرف ہو گئی تھی۔ اس دوران اُس نے نہ جانے کہاں سے ایک بڑا چھرا برآمد کر کے اپنا پیٹ چیر لیا تھا اور ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے وہ چھرا اُس نے اپنے سینے میں اُتار لیا تھا۔ کچھ لوگ کتنے آسان ہوتے ہیں۔ آسانی سے جیتے ہیں، آسانی سے مر جاتے ہیں۔ میں بے حال ہو کے بھُوا کی طرف لپکا۔ اُس کے جسم سے خون فوارے کی طرح اُبل رہا تھا۔ اُس کی مطمئن آنکھیں چڑھنی شروع ہو گئی تھیں۔ میں نے ہارے ہوئے جواری کی طرح اُسے جھنجوڑا۔ اُس کی آنکھوں نے آخری بار مجھے دیکھا اور اُس کی زبان نے لڑکھڑاتے ہوئے، ڈگمگاتے ہوئے کہا، "مولبی صاحب کا کھدا (خدا)، میرا کھدا۔ اُس کی ...چھوری کا کھدا.. میرا کھدا... میں ہندو دھرم چھوڑنے کا.."

وہ اتنا ہی کہہ سکا۔ اُس کے گلے سے "کھر کھر" کی نکیلی آوازیں نکلنے لگیں۔ وہ جاتے جاتے بھی مجھے گہری چوٹ لگا گیا تھا۔ صرف ایک جھلک کے عوض جان، مال اور دھرم سبھی کچھ دان کر گیا تھا۔ دھیارا یہ منظر دیکھ کے پتھر کا ہو گیا تھا۔ اُس کے پیچھے لنگو بھی ہوا کے مانند اندر داخل ہُوا تھا، اندر کا منظر دیکھ کے اُس کی آنکھیں بھی پھٹ پڑیں تھیں۔ کوئی دم تھا کہ ڈھیلے نکل پڑے۔ بستی کے امیر ترین ساہوکار بھُوا مہاجن کی خون میں تربتر لاش آخری ہچکیاں لے رہی تھی، اور میں اُس کے قریب بیٹھا ہُوا نہ جانے کس کا ماتم کر رہا تھا۔ دھیارا نے بدحواسی سے مجھے جھنجوڑا۔ ایسی ناگہانی کا اُسے گمان بھی نہیں تھا۔ اُس نے ڈوبی ہوئی آواز میں کہا، "بابر بھائی جونا گڑھ کی پولس دِکھنے کا ہے۔ ان لوگ کے ساتھ انگریج بھی چار پانچ ہیں.. ابھی یہ قتل..."

لنگو نے منتشر آواز میں اُس کی بات پوری کی۔

"اپنے کھاتے میں پڑنے کا ہے۔"

پولیس کی آمد میرے لیے غیر متوقع نہیں تھی، لیکن یہ میرے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا کہ پولیس عین اس وقت آئے گی جب بھُوا کی لاش میرے زانو پر پڑی ہوگی۔ مجھے اور لیونارڈ کو اس بستی میں آئے چوبیس گھنٹے ہو چلے تھے اور کھوجیوں کے لیے یہ خاصا وقت تھا۔ اگر بھُوا کی لاش کو منظر سے ہٹا دیا جائے تو پولیس کے لیے میں اور لیونارڈ انتہائی معزز مہمان تھے، لیکن یہ ناممکن تھا۔ دھیارا، جو اَور اندر کی طرف دوڑ گیا تھا، سرگوشی میں چیخا، "لنگو، اِدھر درواجا۔" اُس نے بوریوں کی اوٹ سے ایک دروازہ کھوج نکالا تھا۔ حیرت کی بات تھی کہ پولیس اب تک نہیں پہنچی تھی، حالاں کہ

باہر سے یہاں تک بیس قدم کا فاصلہ تھا۔ لنگو نے مجھے شانوں سے پکڑ کے اُٹھایا اور لاابالی پن پیدا کرتے ہوئے بولا۔ ”بابر بھائی! آپ دھیارا کے ساتھ نکلنے کا ہے۔ ۔اپنے کو ویسے ہی جیل جانے کا تھا۔“ اُس کی آواز سے تصنع مترشح تھا۔

دھیارا بھی دوڑ اہُوا آن پہنچا تھا۔ اُس نے میرا بازو پکڑ کے کھینچنا شروع کر دیا۔ میں نے بہ مشکل اپنے حواس مجتمع کر لیے تھے۔ بازو چھڑوانے کے لیے میں نے دھیارا کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو اُس کا جسم شکار چڑھے خرگوش کی طرح کانپ رہا تھا۔ ان دونوں کا پہلی مرتبہ اس قسم کی صورتِ حال سے سابقہ پڑا تھا۔ جسم نے ان کی تو شقی کا بھانڈا ضرور پھوڑا تھا، تاہم دل اُن کی آنکھوں میں دلیری سے چمک رہا تھا۔ میں نے دھیارا سے بازو چھڑاتے ہوئے کہا ”یہاں سے نکلنا ممکن ہے تو تم دونوں نکل جاؤ۔ میں یہاں دیکھ لوں گا؟؟“

”استاد گالی نہیں دینے کا...“ لنگو نے بگڑ کے کہا، ”ابھی چھلیا کو کیا مُنہ دکھانے کا ہے۔“

مجھے معلوم تھا یہ نہیں جائیں گے، تاہم میں نے آخری کوشش کی۔ ”تمھارا پولیس کی پکڑ سے آزاد رہنا میرے لیے بے حد ضروری ہے۔ مجھے کچھ کام لینا ہے۔ میں آسانی سے چھٹ جاؤں گا۔“

”ابھی یہ چھرا ایک ایک اپنے کو بھی مارنے کا ہے۔ ہم نہیں جائیں گا استاد۔“ دھیارا نے اکڑتے ہوئے کہا۔ اُس کا لہجہ اٹل تھا۔ اچانک بھُوا نے زوردار ”کھر کھر“ کی۔ میری دانست میں بھُوا مر چکا تھا، لیکن نہ صرف وہ کھر کھرایا تھا، بل کہ اُس کی چڑھی ہوئی پتلیاں واپس آ گئی تھیں۔ خون خاصا بہہ چکا تھا۔

میں نے دھیارا سے پوچھا، ”یہاں اسپتال ہے۔“

بھُوا نے مجھے اِس طرح دیکھا جیسے اُسے میری ذہنی حالت پر شبہ ہو۔ ”اِدھر ڈاکٹر بھی نہیں ہے۔ بستی والے وید سے دوا لینے کا ہے۔ جیا وہ ہے تو ولوا ڑا۔“

”پولیس اب تک اندر نہیں آئی...“ بھُوا کو اسپتال پہنچانے کا پولیس سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں تھا۔

”پہنچا ہوئینگا۔ ابھی دُور تھا، پر بھیڑ دیکھ کر اِدھری آنے کا تھا۔ بابر بھائی، بھگوان کے لیے ابھی نکلنے کا ہے۔“

”لنگو اور دھیارا۔ اگر ہم یہاں سے نکل بھی جائیں تو بھی پولیس سے نہیں بچ سکتے۔ ان کا سامنا کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ تمھارے لیے مناسب یہی ہے کہ تم اِدھر اُدھر ہو جاؤ۔“

”بابر بھائی! آپ برابر گالی دینے کا ہے۔ ماں قسم! اپن حرامی نہیں ہے۔“ دھیارا نے دُکھی ہو کے کہا۔

”اچھا تو اِسے کروٹ دینے میں میری مدد کرو۔“ میں نے جھک کے بھُوا کے بازوؤں میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔ وہ تیز تیز سانسیں لے رہا تھا۔ میں نے اب دھیان سے دیکھا تھا کہ چھرا دل سے کہیں ہٹ کے سینے میں پیوست ہُوا تھا۔ دھیارا اور بھُوا دونوں ہی نے چوڑے کپڑے کے تہہ کیے ہوئے مفلر گلے میں ڈال رکھے تھے۔ میں ان کا مصرف سوچ چکا تھا۔ میں نے لنگو کا مفلر کھینچ لیا۔ سب سے پہلے چھرے پر رومال جما کے اُسے کھینچ لیا۔ بھُوا نے ایک دردآمیز جھٹکا لیا تھا۔ یہ تسلی بخش بات تھی۔ میں نے چھرا پھینکا تو اِس دوران دھیارا اپنے مفلر کو پھاڑ کے پھویا بنا چکا تھا۔ میں نے وہ پھویا اس کے سینے پر رکھ کے اوپر سے لنگو کا مفلر لپیٹ کے سختی سے گرہ دے دی۔ پیٹ کے زخم کا پھیلاؤ بہت زیادہ تھا، تاہم وہاں سے خون کا رساؤ بہت کم تھا۔ لنگو اور دھیارا کی بے چینی کم ہوتی محسوس ہو رہی تھی۔

”اِس سے پہلے کہ پولیس یہاں آئے، ہمیں اِسے باہر لے چلنا چاہیے۔ اِسے اُٹھواؤ!“

”یہ بچنے کا نہیں ہے بابر بھائی!“ دھیارا نے نظریں چُراتے ہوئے کہا۔

میں نے بھُوا کی بغلوں میں ہاتھ ڈالے تو دھیارا اور لنگو نے سہارے سے نچلا دھڑ اٹھا لیا۔

ہم اسے لے کے عقبی گودام سے دکان کے بیرونی حصے میں داخل ہوئے ہی تھے کہ اُدھر سے چمکتی ہوئی وردی پہنے دو پولیس افسر، اجلے اُجلے سے سیاہ کوٹ پتلون میں ملبوس دو بلند قامت انگریز جنھوں نے سیاہ عینک لگائی ہوئی، ان کے عقب میں چار چھ سپاہی چوکنّی حالت میں اندر داخل ہو رہے تھے۔ خون سے تر بہ تر چار افراد سے سامنا ان کے لیے غیر متوقع تھا۔ ہڑبڑاہٹ میں ان کے قدم اُلٹے پڑ گئے۔ سپاہیوں نے فوراً ہماری طرف رُخ کر کے بندوقیں تان

لیں۔ پولیس افسروں کے ساتھ ساتھ انگریزوں نے بھی طمنچے نکال لیے تھے۔ باہر کھڑا ہجوم تو کھڑا ہی اندر کا ایک ایک منظر حفظ کرنے کے لیے تھا۔ ہمیں دیکھ کے بہت سوں کی چیخیں نکل گئیں۔ ”رام رام، ہائے کھون ہو گیا۔ بھُوا کا کھون!“ اکثریت نے وہاں سے نکلنے ہی میں عافیت جانی تھی۔ جتنی دیر میں پولیس والوں نے بندوقیں سیدھی کیں، اس عرصے میں تماشائی تختۂ سیاہ سے مٹائے گئے لفظوں کی طرح جھڑ چکے تھے۔

”وہیں ٹھہر جاؤ! ورنہ گولیوں سے بھون دیے جاؤ گے!“ نوجوان پولیس افسر نے ہمیں طمنچے کی زد پر رکھتے اور چیختے ہوئے حکم دیا۔ وہ سب سے ایک قدم آگے آ رہا تھا۔ اُس کے کندھے پر تین پھول تھے، یعنی وہی تھانے دار تھا۔

میں نے وقت ضائع کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ لہٰذا انگریزی میں کہا، ”یہ شدید زخمی ہے۔ اِسے فوری طور پر اسپتال پہنچانا ازحد ضروری ہے۔“

میری زبان سے شستہ انگریزی جملہ سُن کے دونوں انگریزوں نے بے یقینی سے بھویں سکوڑ کے مجھے دیکھا، جب کہ پولیس افسر نے کچھ لمحے تولتی نظروں سے ہمارا جائزہ لیا۔ پھر قدرے نرم لہجے میں بولا، ”اندر اور کون کون ہے؟ زخمی کو نیچے رکھ دو۔“

میرے جی میں آئی کہ اُسے تیکھا جواب دوں، لیکن اِس طرح بات مزید اُلجھ سکتی تھی اور وقت کا ضیاع الگ ہوتا۔ میں نے تابع دارقسم کے لہجے میں کہا، ”جناب! اندر کوئی بھی نہیں ہے۔ یہ زخمی اِس دکان کا مالک ہے۔ اِس کی حالت انتہائی تشویش ناک ہے۔ فوری طبی امداد نہ دی گئی تو یہ مر جائے گا۔“

میری بات سُن کے دونوں انگریز آپس میں کھُسر پھُسر کرنے لگے۔ نوجوان پولیس افسر پر ناتجربہ کاری کا خوف قابض تھا۔ اُس کے چہرے پر چھانے والی اُلجھن سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اُس کا ذہن صورتِ حال کا فوری تجزیہ کرنے سے قاصر ہے۔

”جنٹلمین! کیا بارونیہ ڈاکو کے چنگل سے فرار ہونے والے تمھی ہو!“ دائیں جانب کھڑے انگریز نے نرم لہجے میں مجھے مخاطب کیا۔

”آپ کا اندازہ بالکل درست ہے! میرے پاس آپ کے لیے بے حد مفید معلومات موجود ہیں، لیکن ازراہِ مہربانی پہلے اِس زخمی کو اسپتال پہنچوا دیں۔“ میں نے روئے سخن مکمل طور پر اُس انگریز کی طرف موڑ لیا۔ وہ چالیس سے پچاس کے پیٹے میں تھا، لیکن بے حد مضبوط اور بھاری تن و توش کا مالک تھا۔ اُس کی آنکھیں گہری نیلی اور چمکتی ہوئی تھیں۔

پولیس افسر کے چہرے پر خفیف سی ناگواری جھلک آئی۔ اُسے اپنے گورے رفیق کی مداخلت پسند نہیں آئی تھی۔ اُس نے خشمگیں نظروں سے مجھے گھورتے ہوئے کہا، ”تمھارے پاس آتشیں یا غیر آتشیں جس قسم کا اسلحہ ہے، فوری پھینک دو۔“

میں نے بیلا پیس وپیش چاقو نکال کے اُس کی طرف پھینک دیا۔ میری تقلید میں دھیارا اور لنگو کے چاقو بھی زمین پر آ رہے تھے۔

”ہاتھ اٹھا کے پیچھے مڑ جاؤ... سنتیا! ان کی تلاشی لو۔“

مجھ سے رہا نہ گیا۔ ”کیا آپ نابینا ہو گئے ہیں... اِس انسان کی زندگی کے لیے ایک ایک لمحہ قیمتی ہے۔“

”میں نے کہا ہے کہ ہاتھ اُٹھا کے پیچھے مڑ جاؤ۔ پولیس اپنا کام بہتر جانتی ہے۔“ اُس نے درشتی سے طمنچہ دوبارہ تانتے ہوئے کہا۔

میں نے لاچاری سے ہاتھ اٹھا کے مُنہ پھیر لیا۔ دو پولیس والے سرعت سے آگے بڑھے اور ہماری تلاشی لی۔ بھُوا کی کھُسر پھُسر میں اضافہ ہو رہا تھا۔

”سر! کلیئر ہے۔“

”اے تم! تم اِدھر رُخ کرو!“

میں تذبذب سے مڑ کے دیکھا۔ وہ مجھی سے کہہ رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں میرے لیے شدید ناپسندی بھری ہوئی تھی۔ میں دوبارہ رُو بہ رُو ہو گیا۔ مجھے دیکھ کے دھیارا اور لنگو بھی سامنے رُخ ہونے لگے۔ انسپکٹر انگریزی میں بات کر رہا تھا۔ تلاشی لیتے والے سپاہی ہمارے دائیں بائیں ہی کھڑے تھے۔ اُنھوں نے دھیارا اور لنگو کے ایک ایک ہاتھ جڑنے میں دیر نہیں کی۔

”مسٹر اجیت! وقت ضائع نہ کریں۔ اِنھیں لے کر

پولیس اسٹیشن چلیں اور زخمی کو اسپتال پہنچائیں۔ ہمیں اس شخص سے تفتیش کرنی ہے۔'' نیلی آنکھوں والے انگریز نے ناگواری سے نوجوان پولیس افسر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

تو اس کا نام اجیت ہے۔

''مسٹر فرینکلن! یہ انگلینڈ نہیں ہے۔ ہمارا کام کرنے کا اپنا طریقہ ہے، جو یقیناً ہندستانی لوگوں کو قابو کرنے کے لیے اکسیر کا درجہ رکھتا ہے۔'' اجیت نے ناگواری سے فرینکلن کو جواب دیا۔ فرینکلن اور اس کا ساتھی دلّی سے آئے دکھائی دیتے تھے۔ ''آپ نے دیکھا، ان تینوں کے پاس سے چاقو برآمد ہوئے ہیں، یعنی یہ عادی مجرم ہیں۔ جب انھوں نے فرار کا راستہ مسدود پایا تو جسے قتل کر رہے تھے اُسی کو ہاتھوں میں اُٹھا کے باہر نکل آئے۔ اب اُسے اسپتال لے جانے کا واویلا کر کے دائرۂ جرم سے باہر کرنے کی چالاک کوشش کر رہے ہیں۔''

''تو آپ کیا چاہتے ہیں مسٹر اجیت!'' فرینکلن نے بھڑکتے ہوئے کہا۔

''قریب ترین اسپتال دو گھنٹے کی مسافت پر ہے، جب کہ زخمی کی حالت انتہائی...'' انسپکٹر اجیت نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

مجھے سخت طیش آ رہا تھا، مگر کیا کیا جاتا۔ میں نے سلگ کر کہا، ''آپ جس دوری پر کھڑے ہیں وہاں سے کسی کی زندگی اور موت کا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔''

اِس دوران گودام سے ایک سپاہی چلایا۔ ''آلۂ قتل مل گیا ہے جناب!''

انسپکٹر اجیت نے پُرخیال نظروں سے مجھے دیکھا اور بھُوا کے قریب پنجوں کے بل بیٹھ گیا۔

جس کی ''کھر کھر'' پہلے سے کم ہو گئی تھی۔ ''اناڑی پن سے چاقو چلایا ہے۔ پیٹ کی صرف کھال کٹی ہے آنت اوجھڑی سلامت ہے۔ دل کا نشانہ بھی چُوک گیا۔'' اُس نے بھُوا کا خون آلود کرتا اوپر اُٹھایا تھا اور چھڑی سے زخموں کی نشاندہی کرنے لگا۔ ''مجھے یہ بچتا نظر نہیں آتا مسٹر فرینکلن۔''

فرینکلن نے مجھ سے پوچھا، ''ہماری اطلاع کے مطابق تمھارے ساتھ ایک انگریز بھی نکل آیا ہے؟''

''جی ہاں!''

''تو پھر وہ کہاں ہے؟'' فرینکلن اور اُس کا ساتھی بے تابی سے میرے قریب آ گئے۔

میں نے کڑے تیوروں سے کہا، ''میں آپ کو ایک ایک تفصیل بتا دوں گا، اوّل اِس کا بندوبست کریں۔''

''فرینکلن! ازراہِ مہربانی زخمی کا معائنہ کرو!'' اُس نے اپنے ساتھی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ پھر اجیت سے بولا، جو خون سے لتھڑے ہوئے چہرے کا جائزہ لے رہا تھا۔ ''مسٹر فرینکلن! ڈاکٹری پاس کرنے کے بعد فوج میں بھرتی ہوئے تھے۔''

''ہاں ہاں شوق سے معائنہ کریں۔ یہ تو بہت اچھی بات ہے تم میں سے چھرا کس نے چلایا تھا؟''

''اس نے خودکشی کی کوشش کی ہے!'' میں نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

''کیا! خودکشی؟'' فرینکلن اور اجیت بے ساختگی سے بیک وقت بولے۔ واقعی یہ حیرت ناک بات تھی۔

''تم اِس طرح سے خود کو نہیں بچا سکتے مسٹر!... نام کیا ہے؟'' اجیت نے چھڑی میری تھوڑی سے لگاتے ہوئے کہا، اُس کی آنکھوں میں استہزائیہ مسکراہٹ ناچ رہی تھی۔ واقعتاً ایک تڑپتی ہوئی لاش ساتھ ہی تین قاتلوں کی گرفتاری، آلۂ قتل کی برآمدگی بہت بڑا کارنامہ تھا۔ محکمۂ پولیس میں اُس کی واہ واہ ہونے والی تھی۔

اِس دوران سائمن اُٹھ کھڑا ہوا۔ ''جناب! زخم تو کاری نظر نہیں آتے، تاہم خون بہت زیادہ بہہ گیا ہے۔ فوری طور پر اسے خون نہ دیا گیا تو یہ مر سکتا ہے۔'' سائمن نے مؤدبانہ انداز میں فرینکلن سے کہا۔ اُس کے لہجے سے ماتحتی کی بُو آ رہی تھی، پھر اُس نے ہونٹ بھینچ کے اشارتاً نفی میں گردن ہلائی۔ یعنی یہ زخمی مر جائے گا۔

''تم اِس کے لیے فوری طور پر کچھ کر سکتے ہو سائمن؟'' فرینکلن نے اجیت کو یکسر نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔

''اِس کے لیے جراحت گاہ تک رسائی لازم ہے جناب!''

''انسپکٹر اجیت! زخمی کو فوری اسپتال روانہ کرنا مناسب ہوگا۔ سائمن اِن کے ساتھ جا سکتا ہے۔'' فرینکلن نے حکمیہ لہجے میں کہا۔ اُس کے چہرے سے برہمی نمایاں تھی۔

''اپنا کام میں زیادہ بہتر سمجھتا ہوں مسٹر فرینکلن!''

انسپکٹر اجیت نے ترش روئی سے کہا۔ انسپکٹر اجیت کے رویّے سے صاف ظاہر تھا اس کا اور فرینکلن کا ساتھ مجبوری کا نام تھا۔ ''دلیر سنگھ! اسے کمیونٹی اسپتال پہنچانا تمھاری ذمے داری ہے۔ ڈی ایچ نمبر کی جیپ لے جاؤ۔ اور ہاں... ضرورت پڑنے پر میرا انتظار مت کرنا۔ پوسٹ مارٹم کا بول دینا۔'' انسپکٹر اجیت نے آخری جملہ چبا کے بولا تھا۔

اس دوران ہمیں ہتھ کڑیاں پہنائی جا چکی تھیں۔ میرے ساتھ کوئی تماشا گیری کر رہا تھا۔ کبھی گورا کو قریب کر دیا جاتا اور مجھے پیچھے گھسیٹ لیا جاتا اور کبھی مجھے آگے بڑھا کے گورا کو غائب کر دیا جاتا۔ اب انسپکٹر اجیت نے قتل کے الزام میں ہتھ کڑیاں ڈال دی تھیں۔ حالات، واقعات اور شواہد بھی کچھ تو میرے خلاف تھے۔ بھُوا کی حالت ایسی ہی تھی کہ ایک کم فہم آدمی بھی بتا سکتا تھا کہ وہ نہیں بچ سکے گا۔ شاید سانس کے دوار ے کوئی اس کے گلے میں اٹک گیا تھا۔ فرینکلن نے چپ سادھ لی تھی، تاہم خفگی سے اُس کا چہرہ تنا ہُوا تھا۔ اجیت نے سائمن کو بھُوا کے ساتھ نہیں جانے دیا تھا۔ حالات سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ فرینکلن اور سائمن کو دلّی سے جان کاری لینے کے لیے بھیجا گیا تھا، جب کہ انسپکٹر اجیت کا لہجہ ہندستان بھر میں انگریزوں کے خلاف پھیلی ہوئی نفرت کی نمائندگی کر رہا تھا، اور یہی وجہ تھی کہ اجیت نے پہلی نظر میں مجھ پر ناپسندیدگی کی ڈالی تھی، جب کہ اسی بات سے میرے اس خیال کو تقویت مل رہی تھی کہ باروتیہ واقعی مر چکا ہے اور گر کے جنگل میں پیش آنے والے حالات سے وہ کسی نہ کسی حد تک ضرور واقف ہے، اور یہ کہ اِس کی ہم دردیاں باروتیہ کے ساتھ ہیں۔ فرینکلن اور سائمن ایک طرف کھڑے کھسر پھسر کر رہے تھے۔ بھُوا کی دکان کے باہر کھڑے مجمع سے ایک فرد بھی نہ بچا تھا، سوائے پولیس کی جیپوں، سفید موٹر اور ان کے گرد کھڑے چوکس سپاہیوں کے۔ انسپکٹر اجیت، فرینکلن اور سائمن کے لیے کرسیاں ایک طرف رکھ دی گئیں تھیں۔ کچھ اہل کار موقع کی ضروری کارروائیوں میں مصروف تھے۔ ہمیں ایک کونے میں کھڑا کر دیا گیا تھا۔ فرینکلن بار بار چمکتی نظروں سے مجھے دیکھتا تھا۔ میں یقیناً اُس کے لیے کارآمد تھا، لیکن انسپکٹر اجیت نے اُسے مجھ سے براہِ راست بات کرنے سے روک دیا تھا۔

''یہ کھانا بادشاہوں کے لیے بہت مناسب ہے''

اجیت خود بھی گاہے گاہے میری طرف دیکھ لیتا تھا۔ دھیارا اور لنگو خاموش کھڑے تھے، تاہم ان کے چہروں پر سراسیمگی نہیں تھی۔ باہر سے بھی کچھ سپاہی آ آ کر انسپکٹر اجیت سے دبے لفظوں میں بات کر رہے تھے اور وہ انھیں مزید احکامات دے کر بھیج رہا تھا۔ کچھ دیر بعد ایک حوال دار نے اسے جائے وقوع پر کی جانے والی ضروری کارروائی مکمل کرنے کا مژدہ سنایا تو اُس نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کے کہا، ''انھیں لے آؤ۔''

ہم تینوں کو اُس کے سامنے کھڑا کر دیا گیا۔

''ہاں تو محترم بابر صاحب! شروع ہو جاؤ... بھُوا سے کیا تنازع تھا، اور ہاں دھیان رہے۔ میرے پاس وقت بالکل نہیں ہے۔'' انسپکٹر اجیت نے اس توقع سے کہا جیسے میں اُسے سب کچھ فرفر سنانے کے لیے اشارے کا منتظر تھا۔ اُس نے انگریزی سے اجتناب کیا تھا۔

فرینکلن نے بےزاری سے ہیلو بولا، ''مسٹر اجیت، آپ کا ملزم شستہ انگریزی جانتا ہے۔''

اجیت نے اُس کی بات کا جواب دینا مناسب نہیں سمجھا۔

''چلو شروع ہو جاؤ۔ میں اس دکان کو تھانہ نہیں بنانا چاہتا۔'' یہ سرزنش انگریزی میں تھی۔

''میں آپ کو بتا چکا ہوں۔ بھُوا نے اپنے ہاتھوں سے خود کو زخمی کیا ہے، اور یہ محض اتفاق تھا کہ اس موقع پر میں اُس کے سامنے موجود تھا۔'' میں نے معتدل مزاجی کو تھامتے ہوئے کہا۔

''تو پھر یہی بتا دوں کہ بھُوا نے ایسا کیوں کیا؟''

"یہ بھوا ہی بتا سکتا ہے... میں نہیں جانتا؟"

"تم اسے لے کر عقبی گودام میں کیوں گئے تھے؟"

"وہ مجھے لے کے گیا تھا، میں نہیں۔"

"وہ تمھیں کیوں لے کے گیا تھا؟"

"یہ بھی وہی بتا سکتا ہے، میں نہیں جانتا۔"

"تمھارا مطلب ہے کہ وہ تمھیں پھنسانے کے لیے اندر لے گیا اور اپنے قتل کا الزام تمھارے سر تھوپنے کے لیے آتما ہتیا کر لی۔"

"میں نے ایسا کوئی مطلب ظاہر نہیں کیا۔"

"وہی بتا دو جو تم ظاہر کرنا چاہتے ہو۔"

"میں بتا چکا ہوں!"

"بکواس بند کرو!" کرسی کی ہتھی پر زور سے ہاتھ مارتے ہوئے وہ اُٹھ گیا۔ اُس کا چہرہ غصّے سے لال بھبوکا ہو گیا۔ شکل وصورت کے اعتبار سے وہ خاصا خوب صورت اور وجیہہ تھا۔ "تم پولیس کو احمق سمجھتے ہو۔"

"میں نے کب کہا کہ میں پولیس کو احمق سمجھتا ہوں، جو حقیقت ہے وہی بتا رہا ہوں۔"

"میں نے پوری زندگی میں خودکشی کا یہ طور نہ دیکھا نہ سنا، اور میں پولیس ہی میں پیدا ہُوا ہوں۔"

"تو یہ آپ کی زندگی کا نیا تجربہ ہُوا۔" میں نے اُسے اَور سلگایا۔ یہ تحمّل کا ایک تیر بہ ہدف اصول تھا کہ اڈّے پر بل چلتا ہے اور تھانے میں دماغ۔ پولیس افسر جسے مجرم سمجھ لے، اُسے اپنے پاؤں میں گڑگڑاتا دیکھنا پسند کرتا ہے، اور جو نہ گڑگڑائے اُس سے نفسیاتی طور پر مرعوب ہو جاتا ہے۔ اُس نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ خودداری منوانے کے لیے پیروں میں پڑ جانے والے کبھی نامراد نہیں ہوتے۔ مجھے آئندہ پیش آنے والے حالات کی سنگینی کا بہ خوبی ادراک تھا۔ معمولی سے گڑبڑ عمر بھر کے لیے جیل میں دھکیل سکتی تھی۔

"ہاں کچھ نئے تجربے دلواڑا جا کے ضرور کروں گا... بھوا مہاجن سے تم کیا معلوم کر رہے تھے؟" انسپکٹر اجیت نے سفاک لہجے میں کہا۔

اس سوال کا جواب تو تھا ہی نہیں، میں اُسے کیا دیتا۔

"انسپکٹر صاحب آپ کو غلط فہمی..."

میرا فقرہ مُنہ ہی میں رہ گیا، وہ جھنجھلاتا ہُوا پلٹا۔ اُس کی چھڑی نے میرے دایاں شانے میں مرچیں بھر دی تھیں۔

"غلط فہمی تمھیں ہے مسٹر بابر!" میرے چہرے پر کامل سکوت دیکھ کے اُسے پتنگے لگ گئے۔ "بڑے بڑے جغادری میرے ہاں پانی بھرتے ہیں۔"

"مسٹر اجیت، غیر اخلاقی رویّے سے گریز کریں۔" فرینکلن نے مجھے پُرشوق نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"مسٹر فرینکلن! مجھے مجبور نہ کریں کہ آپ کو یہاں سے جانا پڑے۔" اُس نے سُلگتی ہوئی آواز کی آنچ ذرا دھیمی کرتے ہوئے کہا۔

سائمن دھیرے سے کسمسایا، تاہم فرینکلن مسکرا کے خاموش ہو گیا۔ انسپکٹر اجیت فتح مندی کی زہرخند مسکراہٹ لیے دھیارا کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

"نام بول؟" اُس نے ہندی میں کہا تھا۔

"دھیارا بولنے کا ہے۔" دھیارا نے سینہ پھُلاتے ہوئے کہا۔

"چھلیا کدھر ہے؟" انسپکٹر اجیت نے چھڑی سے اُس کا پیٹ دباتے ہوئے کہا۔

"چھلیا سے پوچھنے کا ہے۔"

"ابھی تو بول بھڑوے!" انسپکٹر اجیت نے برافروختگی سے دھیارا کا گریبان پکڑا اور طمانچہ جڑ دیا۔

"میا قسم... ابھی ایک بات بولنے کا نہیں ہے۔" دھیارا نے کھولتی ہوئی آواز میں کہا اور ہونٹ بھینچ لیے۔ انسپکٹر اجیت کو باؤلے کتے نے کاٹ لیا تھا۔ وہ وحشیوں کی طرح لاتوں اور گھونسوں سے دھیارا پر پل پڑا اور کچھ ہی دیر میں ہانپنے لگا۔ اُس کے ہٹتے ہی دو سپاہی کارِ خیر میں مصروف ہو گئے، مگر دھیارا نے ہونٹوں کو فولادی شکنجے میں کس لیا تھا۔ سپاہی لاتوں اور گھونسوں کے ساتھ ساتھ بندوق کا بٹ بھی آزما رہے تھے، مگر دھیارا کی سسکی نہ نکلنی تھی اور نہ نکلی۔

تھوڑی دیر بعد انسپکٹر اجیت نے ہاتھ کھڑے کر لیے۔

"بس بس چھوڑ دو۔ حرام کی چربی ہے کنجر کی۔ اِسے گاڑی میں ڈالو... بتی بنا کے مرچیں چڑھاؤں گا..." پھر اُس نے لنگو کو گھورا۔ "اِسے بھی ڈالو۔ سوچا تھا سالوں کو اِدھر ہی نمٹا دوں گا... ابھی چالان کٹے گا۔"

دھیارا کو وہی سپاہی گھسیٹ کے باہر لے گئے، جنھوں نے بٹ مار مار کے اُس کے ہڈیاں تڑوا دی تھیں۔

"اے چل!" ایک نے لنگو کو دھکیلا۔

"ابھی صاحب سے کچھ بولنے کا ہے۔" لنگو نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔

"ہاں، بول کیا بولنے کا ہے۔" انسپکٹر نے سپاہی کو رُکنے کا اشارہ کیا۔

لنگو نے چمچماتی آنکھوں سے مجھے دیکھا اور سانس پھُلا کے بولا، "دھیارا اور بابر استاد نردوش ہیں صاب! بھوا کے چھرا میں مارنے کا ہے۔ بھوا سے بیاج پر رُپیا لیا تھا صاب۔"

"تمھیں معلوم ہے کہ تم کیا بول رہے ہو؟" انسپکٹر اجیت کے لہجے میں تمسخر تھا۔ "میری اطلاعات کے مطابق تم مکھی نہیں مار سکتے لنگو استاد!" انسپکٹر اجیت کے اِس فقرے سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ پوری بستی کو کھنگال چکا ہے۔

"پر ہم بھوا کو مارنے کا ہے صاب!" لنگو کی بات اٹل تھی۔

"شوق سے قبول کرو... لیکن یاد رکھو کہ پھانسی یقینی ہے۔ بھوا کی ذات برادری پھندے سے پہلے تمھیں نہیں چھوڑے گی۔"

"ابھی آپ دھیارا اور بابر استاد کو چھوڑنے کا ہے۔" لنگو بولتے ہوئے ناک کی سیدھ میں دیکھ رہا تھا۔

"شریکِ جرم برابر کا مجرم ہے... اُسے گاڑی میں بٹھاؤ۔" انسپکٹر اجیت نے دوبارہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا، "مفت کے قاتل بنے پھرتے ہیں بھڑوے۔"

سپاہی لنگو کو دھکیلتے ہوئے لے گئے اور وہ آخر تک چیختا چلاتا رہا کہ صاب تم اچھا نہیں کرنا کا ہے۔ بھوا کو میں مارنے کا ہے۔

"ہاں تو مسٹر بابر! اب تمھاری باری ہے۔ تم یقیناً نہیں چاہو گے کہ تمھارا حال دھیارا کی طرح کیا جائے۔" انسپکٹر اجیت نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔ اُس کا غصّہ کسی حد تک ہُوا ہو چکا تھا۔ وہ مجھ سے انگریزی ہی میں بولا۔

"میں اتنی تصحیح کر سکتا ہوں کہ لنگو نے دوست داری نبھائی ہے۔ بھوا نے اپنے اوپر حملہ بھی خود ہی کیا تھا۔" میں نے اپنے لہجے میں مفاہمانہ رچاؤ لانے کی اپنی سی کوشش کی۔

"میں یہ بکواس نہیں سننا چاہتا۔ خودکشی کرنے والے دریا میں کودتے ہیں، راستے پر لٹک جاتے ہیں، پٹڑی پر لیٹ جاتے ہیں اور زہر خورانی کرتے ہیں۔ کونچوں پہ چیرہ لگاتے۔ تیل چھڑک کے آگ لگا لیتے ہیں، مگر اپنا پیٹ چیر کے سینے میں خنجر گھونپنا... بہت انوکھا اور ایک دم ناممکن کام ہے۔ اِسے تھانے سے لے کر عدالت تک کوئی تسلیم نہیں کرے گا۔" فرینکلن اور سائمن کی گردنیں خود بہ خود انسپکٹر اجیت کی تائید میں ہلی تھیں۔

"اِسے میری بدقسمتی کہیے، لیکن حقیقی واقعہ یہی ہے۔" میں نے سر جھٹکتے ہوئے کہا۔ انسپکٹر اجیت کی دلیل کو میرے دل نے بھی سو فی صد درست قرار دیا تھا۔

"نہیں، میں نہیں مانتا۔ یہ ناممکن ہے۔"

"دیکھیے انسپکٹر صاحب! ہمارے پاس یہاں سے فرار ہونے کا پورا موقع تھا۔ گودام میں ایک عقبی دروازہ بھی موجود ہے۔ ہم بہ آسانی وہاں سے نکل سکتے تھے، لیکن ہم نے ایسا نہیں کیا، کیوں کہ ہم قاتل نہیں تھے۔" وہ اِس پہلو کو نظرانداز کر رہا تھا کہ بھوا کے سینے پر پٹی ہمی نے باندھی تھی۔

"میں اِس سوچ کو انتہائی شاطر دماغ کی کارستانی سمجھتا ہوں۔ پہلی بات یہ ہے کہ وہ دروازہ مقفّل تھا۔ دوسری بات یہ ہے کہ پوری بستی تمھیں بھوا سے جھگڑتے دیکھ چکی تھی۔ تمھیں یہ اندازہ ضرور ہو گیا ہو گا کہ بھاگ کر زیادہ دُور نہیں جا سکو گے۔" اُس نے کچھ توقف کے بعد کہا، "ہاں، البتہ میں یہ مان سکتا ہوں کہ بھوا پر قاتلانہ حملہ طے شدہ نہیں تھا۔ یہ ایک اتفاقی حادثہ ہو سکتا ہے۔ آخری بات سن کر تمھارا جواز یک دم زمین بوس ہو جائے گا، شکتی مان بابر صاحب!" پھر اُس نے مجھے دیکھ کر لذّت کشید کرتے ہوئے کہا، "وہ دروازہ تم سے کیا کھلتا، سپاہیوں نے بہ وقت توڑا ہے، لیکن لطف کی بات ہے وہ دروازہ باہر کسی کھلیان میں نہیں کھلتا تھا، بل کہ گودام کے اندر ایک اور گودام تھا، ممکن ہے کہ تمھیں اِس بات کی خبر ہو کہ وہاں سے راستہ نہیں ہے۔"

"حالات غیر موافق ہیں، ورنہ میں نے ایک ایک لفظ سچ کہا ہے۔"

"تو پھر بھوا کی آتما ہتیا کا محرک بتاؤ۔ اگر تمھاری بات درست تسلیم کر لی جائے تو اس آتما ہتیا کا محرک تمھیں معلوم ہونا چاہیے۔ یہ قطعی بات ہے۔"

فرینکلن اُٹھ کھڑا ہُوا۔ اُس نے انتہائی بے زاری سے کہا، "مسٹر اجیت! آپ کو جس مقصد کے لیے ہمارے ساتھ

بھیجا گیا تھا وہ انتہائی اہم ہے اور آپ اسے غیر اہم بنا رہے ہیں۔"

"آپ بہ صد شوق جا سکتے ہیں مسٹر فرینکلن! لیکن یہ بستی میرے تھانے کی حدود میں شامل ہے اور یہاں کا انتہائی معزز آدمی دن دہاڑے بھرے مجمع میں یقیناً قتل کر دیا گیا ہے۔ میں ایک فرض شناس پولیس افسر کی شہرت رکھتا ہوں۔ میں ملزمان سے متعلق گفتگو بستی میں رہتے ہوئے ہی کرنا ضروری سمجھتا ہوں، تاکہ مجھے بہ وقتِ ضرورت گوناگوں مصروفیات چھوڑ کر یہاں کے چکر نہ لگانے پڑیں۔"

"واہیات بات ہے۔" فرینکلن کندھے اُچکا کے دوبارہ بیٹھ گیا۔ خفت سے اُس کی پیشانی سیاہ پڑ رہی تھی۔

اُس کی خودکشی کا محرک اِتنا آسان کہاں تھا جو بیان ہوتا۔ میری زبان پر تالے پڑ گئے۔ "مجھے نہیں معلوم۔"

"تم کراچی سے بمبئی جا رہے تھے۔ بمبئی میں کہاں؟" انسپکٹر اجیت نے چبھتا ہُوا سوال کیا۔ گویا وہ میرے بارے میں مکمل چھان بین رکھتا تھا۔

"میں اپنے دوستوں کے ساتھ ہندوستان بھر کی سیر کو نکلا ہوں! کلکتہ سے تعلق ہے۔" بمبئی کا تذکرہ میں نے دانستہ گھمایا تھا۔ ابا جان تک پہنچنا ان کے لیے مشکل نہ ہوتا۔

"ہونہہ... مسٹر بابر! تمھاری شخصیت میرے لیے ایک معما بن چکی ہے..." اُس نے ایک لمبا سانس بھرا، پھر اُس نے ہندی میں کہا۔ "تم ایک ایسے جہاز میں کراچی سے سوار ہوئے جسے انتہائی منظم انداز میں اغوا ہونا تھا۔ اِسے اتفاق نہیں کہا جا سکتا کراتی کاروں کی اکثریت بھی کراچی ہی سے سوار ہوئی تھی۔ تمھارے سفری ٹکٹ کے نمبر اسی تواتر کا حصہ ہیں جو ٹکٹ خرید کے کراتی کار جہاز میں سوار ہوئے تھے۔ تم انتہائی شستہ انگریزی بولتے ہو، تمھیں جہاز کے اس حصے میں بھی جاتے دیکھا گیا جہاں ہندوستانیوں کا داخلہ ناممکن ہے۔ مختلف انگریزوں سے تمھاری ملاقاتیں بھی دیکھی گئیں۔ کچھ مسافروں کا بیان ہے کہ ایک انگریز خاتون تمھاری واقف کار تھی، حالاں کہ وہ پہلی مرتبہ ہندوستان آ رہی تھی۔ کراتی کاروں نے جب جہاز پر قبضہ کیا اُس وقت تم ایک سنسان گوشے میں چار انگریزوں کے ہم راہ اُن کے ہتھے لگے۔ باروٹیہ نے جہاز کے ہندوستانی مسافروں سے نہایت اچھا برتاؤ کیا، لیکن وہ تمھیں اور تمھارے ساتھیوں کو بوریوں میں بند کر کے لے گیا۔ حیرت انگیز بات ہے۔ انتہائی تربیت یافتہ فوج جہاں فرار نہ ہو سکے، وہاں تم باروٹیہ کی قید سے فرار ہو گئے، پھر تمھیں اِس بستی میں دیکھا گیا۔ یہاں تم نے چھلیا کو زیر کر لیا، حالاں کہ چھلیا کا سکہ پورے کاٹھیاواڑ میں چلتا ہے۔ اُس کا چاقو کوئی نہیں گرا سکا، لیکن تم نے بہ آسانی ایسا کر لیا، جب کہ ایک انگریز فوجی لیونارڈ تمھارے ساتھ تھا۔ بالکل تمھارے رفیقِ کار کی حیثیت سے، پھر تم بستی میں نکلے تو سیدھے بھُوا مہاجن کی دکان میں دیکھے گئے، وہ بھی اس حالت میں کہ بھُوا اپنی سانسیں گن رہا تھا، اور یہ وہی بھُوا ہے جس کے بارے میں مشہور ہے کہ یہ اپنی آمدنی کا بڑا حصہ باروٹیہ کو تحفتاً دیتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ تم میری تفتیش کا رُخ سمجھ گئے ہوگے۔ میرا خیال ہے کہ بھُوا کے قتل کا محرک بھی واضح ہُوا ہوگا، لہٰذا اب تمھیں بتانا ہوگا... بھُوا سے تمھیں کون سی معلومات درکار تھیں۔ یہاں تک میں جانتا ہوں کہ تم اُس سے کوئی پتا دریافت کر رہے تھے۔ کس کا پتا چاہیے تمھیں؟"

اُس کا تفصیلی تجزیہ مجھے بدحواس کرنے کے لیے کافی تھا۔ اُس کی سوچ دریا کے دو کنارے اُستوار کر رہی تھی۔ ایک جانب وہ باروٹیہ کے ساتھ کھڑا تھا اور مجھے اُس نے انگریزوں کے ساتھ دوسرے کنارے پر کھڑا کیا تھا، البتہ اُس کی بتائی ہوئی تفصیل میں باروٹیہ کی موت، انگریزوں کی موت اور وہاں سے مایا سمیت جھل کا بچ نکلنا ایسے اہم واقعات مفقود تھے۔ اِس قدر باخبر پولیس افسر سے، اِن اہم معاملات سے متعلق لاعلمی کی توقع مناسب نہیں تھی۔ اگر وہ یہ سب کچھ جانتا تھا تو اُس نے مجھ سے دانستہ پوشیدہ رکھا تھا۔ میرا دماغ بساط بھر سرعت سے ان باتوں کے اخفا کے پسِ پردہ مقاصد کھوجنے میں مصروف تھا۔ سرِ فہرست مجھے یہی سمجھ میں آیا کہ وہ فرینکلن سے یہ سب پوشیدہ رکھنا چاہتا ہے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ میری معلومات ناقص نکلتیں۔ ایسا کچھ سرے سے ہُوا ہی نہ ہو، لیکن یہ خود بہ خود ہی رد ہوئی تھی، کیوں کہ چھلیا سے دروغ گوئی کی مجھے ایک فی صد بھی توقع نہیں تھی اور نہ ہی اُس کے پاس ایسا کرنے کا کوئی جواز تھا۔ ایک ممکنہ وجہ اور سمجھ آئی تھی۔ اُس نے چوں کہ مجھے انتہائی شاطر اور خطرناک شخص سمجھ لیا تھا، اس لیے مجھے بے خبر رکھنے کا

مقصد کسی نئی کہانی کے اختراع سے باز رکھنا بھی ہو سکتا تھا۔ وہ بھُوا مہاجن کی دکان پر جم کے بیٹھا تھا۔ فی الحال اُس کا یہاں سے کوچ کا ارادہ نظر نہیں آتا تھا۔ فرینکلن کی بے زاری عروج پر تھی۔ سورج بڑی سخاوت سے آگ برسا رہا تھا۔ انسپکٹر اجیت کا یہاں ٹھیرنے کا مقصد کچھ اور ہی دکھتا تھا۔

"انسپکٹر صاحب! آپ کی معلومات اِس حد تک درست ہیں کہ ہم چار دوست کراچی سے بمبئی جانے کے لیے جہاز میں سوار ہوئے تھے، لیکن آپ نے بھی بے بنیاد مفروضوں سے ایک غلط رائے قائم کی ہے، بالکل اسی طرح جس طرح خوامخواہ باروٹیہ نے ہمیں انگریزوں کا رفیق سمجھ کر جہاز سے اتار لیا تھا۔ اُس کے بعد میں نے جو کچھ بھی کیا اپنے بچاؤ اور دفاع کے لیے کیا۔ رہی بات بھُوا مہاجن کی تو پل پل کی خبروں کے ساتھ آپ کے علم میں یہ اضافہ ضرور کیا گیا ہوگا کہ بھُوا مہاجن مجھے راہ چلتے کو بانہہ سے پکڑ کر از خود دکان پر لے گیا تھا، ورنہ میں اُسے جانتا تک نہیں تھا۔ یہ سچ ہے کہ بھُوا نے خودکشی کی ہے۔ اُس نے ایسا کیوں کیا؟ اِس بارے میں قطعاً کچھ نہیں جانتا۔ یہ میری آخری بات ہے۔" میں نے حتمی لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے... تم مہمان خانے کے آدمی ہو... وہیں فرفر بولو گے... مسٹر فرینکلن، آپ ملزم سے پوچھ تاچھ کر سکتے ہیں، لیکن جلدی جلدی۔"

"ہاں یقیناً... لیکن تنہائی ضروری ہے۔" فرینکلن نے چونکتے ہوئے کہا۔ وہ کچھ سوچ رہا تھا۔

انسپکٹر اجیت نے اسے مغائرت سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ "یہ انتہائی خطرناک مجرم ہے۔ اِسے میں آپ کے پاس تنہا نہیں چھوڑ سکتا۔"

"مسٹر اجیت، مجھے وائسرائے کے خصوصی ایلچی کے اختیارات حاصل ہیں۔ بمبئی چھاؤنی چوکنی حالت میں میرے اشارے کی منتظر ہے۔ لیکن مجھے گمان گزرتا ہے کہ آپ صورتِ حال کی سنگینی سے ناواقف ہیں۔" فرینکلن نے بھڑکتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "آپ کی ریاست پر فوج کشی کا امکان ہے۔ آپ جس کام سے آئے ہیں، اسے پایۂ تکمیل تک پہنچائیں۔"

خلافِ توقع انسپکٹر اجیت اُٹھ کھڑا ہُوا۔ "درست ہے مسٹر فرینکلن! آپ اس سے بات کریں۔ میں نے ادن دوڑائے ہوئے ہیں، جلد اچھی خبر ملنے کی توقع ہے۔" پھر اُس نے جاتے جاتے میرے کان میں سرگوشی کی۔ "اگر انگریزوں کے جاسوس نہیں ہو تو ان باتوں سے احتراز کرنا جن سے فوج کشی یقینی ہوتی ہو۔"

انسپکٹر اجیت باہر جا کے جیپ میں بیٹھ گیا۔ ایک سپاہی نے سلور کے پیالے میں آ کے پانی پیش کیا تو

فرینکلن نے بھی پانی کا اشارہ کیا اور بولا، ”ہندوستان کی گرمی ناقابلِ برداشت ہے۔“

میرے منھ سے بے ساختہ نکلا، ”تو آپ کو کس نے مجبور کیا ہے برداشت کرنے کے لیے۔ یہاں کے باسیوں کے لیے اِس گرمی میں بھی ایک حُسن ہے۔“

”بہت خوب مسٹر بابر! انسپکٹر اجیت نے آپ کو دلّی کا جاسوس نامزد کیا ہے۔“ اُس کے چہرے پر بشاشت بکھر گئی۔

”آپ مجھ سے کیا جاننا چاہتے ہیں؟“ میرے ذہن میں واضح نہیں تھا کہ مجھے کن باتوں سے احتراز کرنے کا مشورہ انسپکٹر اجیت دے گیا تھا۔

”آرام سے بیٹھ جاؤ۔“

”ضرورت سمجھوں گا تو بیٹھ جاؤں گا۔“

”ہماری اطلاعات کے مطابق اس بستی میں تم ایک نوجوان انگریز کے ہم راہ دیکھے گئے ہو... وہ کون ہے اور کہاں ہے؟“

”وہ لیونارڈ ہے... میں صبح اُسے بستی کے ایک مکان میں چھوڑ کے آیا تھا۔“

”اوہ میرے خدا! لیونارڈ... وہ دُبلا پتلا سا بھورے بالوں والا نوجوان؟“ فرینکلن نے خوشی سے چیختے ہوئے کہا۔

”ہاں، وہ اِسی حلیے کا مالک ہے۔“

”اخاہ! وائسرائے کا معتمدِ خاص لیونارڈ، کیا شانت نوجوان ہے۔ براہِ مہربانی اُس مکان کی نشان دہی کیجیے مسٹر بابر!“

”وہ اس بستی کی مقبول ترین جگہ ہے، چھلیا کا اڈّا۔“

”اوہ سائمن، دیکھا ہمارا اِتنا وقت خراب کیا ہے اس دیش بھگت انسپکٹر نے... تم اجیت سے چند سپاہیوں کو اپنے ہم راہ لے لو اور لیونارڈ کو فوری طور پر لے کے آؤ۔“

سائمن اُس کا جملہ مکمل ہونے سے قبل اُٹھ کے چل دیا تھا۔

”ڈاکوؤں کی کتنی تعداد ہو سکتی ہے؟“ فرینکلن نے مجھ سے خاصے دوستانہ مزاج سے پوچھا۔

”اِس بارے میں میں کچھ نہیں کہہ سکتا، کیوں کہ وہ ہمیں بوریوں میں بند کر کے مسلسل محوِ سفر رہے ہیں۔“

”اُن کا مستقر کہاں ہے؟“

”ہمیں چھکڑوں میں لاد کر غالباً مستقر ہی کی جانب لے جایا جا رہا تھا، تاہم میں اُس راستے میں سے بچ نکلا تھا مگر...“

”اوہ مسٹر بابر! آپ فکر نہ کریں۔ انسپکٹر اجیت آپ کو ایک دن بھی سلاخوں کے پیچھے نہیں رکھ سکتا۔ صرف دلواڑا پہنچنے دیں۔“

”وہ دلواڑا تک پہنچنے نہیں دے گا۔“ آخر میں اس بدترین خدشے کا اظہار کر دیا جو بڑی دیر سے میرے دماغ میں کلبلا رہا تھا۔

اس دوران سائمن واپس آ گیا۔ ”انسپکٹر اجیت کا کہنا ہے کہ وہ پہلے ہی بستی کا کونا کونا چھان چکا ہے، لیونارڈ کہیں نہیں ہے۔ انسپکٹر کا خیال ہے کہ وہ یہاں بیٹھ کر انتظار کرنے کے بجائے از خود سرکاری پناہ کی کھوج میں نکل گیا ہوگا۔“

انسپکٹر اجیت نے سراسر جھوٹ بولا تھا۔ لیونارڈ میرے بغیر کہیں نہیں جا سکتا تھا۔ میرے دل سے بے اختیار لیونارڈ کے لیے سلامتی کی دعا نکلی۔

”اوہ...!“ فرینکلن کا چہرہ بُجھ گیا، پھر اُس نے مجھے استفہامیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا، ”تم کئی دن سے لیونارڈ کے ساتھ ہو۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ وہ جا سکتا ہے۔“

”میں اِس بارے میں واضح رائے نہیں دے سکتا، تاہم وہ جلد از جلد یہاں سے نکل چلنے کا خواہاں تھا۔“ میں نے گول مول جواب دیا، حالاں کہ مجھے یقین تھا کہ لیونارڈ یوں نہیں جا سکتا۔

فرینکلن نے مجھے گھور کے دیکھا اور پھر اٹھ کھڑا ہوا۔

”سائمن! ہمیں خود اُس مکان تک جانا چاہیے! انسپکٹر اجیت پر بھروسا نہیں کیا جا سکتا۔“

انسپکٹر اجیت اندر اٹھ آیا تھا ”پیغام آ گیا ہے، مسٹر فرینکلن! باروٹیہ مذاکرات کے لیے تیار ہے۔ کل اُس کا نمائندہ دلواڑا پہنچے گا۔“

باروٹیہ زندہ نہیں تھا تو انسپکٹر اجیت بہت بڑا فن کار تھا۔ اُس کے چہرے نے جھوٹ کی چغلی نہیں کھائی تھی۔

”اوہ، یہ بھی اچھی خبر ہے۔ مسٹر اجیت، میں چھلیا کے مکان تک از خود جانا چاہتا ہوں۔“ فرینکلن نے اجیت کی فراہم کردہ اطلاع پر مبہم سی خوشی کا اظہار کیا تھا۔ وہ اجیت پر اعتماد کرنے کے لیے آمادہ نہیں تھا۔

”نہیں مسٹر فرینکلن، آپ کی حفاظت میرے فرائض میں شامل ہے۔ اِس بستی کا چپّا چپّا باروٹیہ کا وفادار ہے۔“

”تو پھر میں آپ کی معیّت میں وہاں جانا چاہوں گا۔“

”ہم واپس جا رہے ہیں۔ مجھے باروٹیہ کی طرف سے جواب کا انتظار تھا۔“

انسپکٹر اجیت فرینکلن کی بات سُنے بغیر واپس مُڑ گیا۔ اُس کے ساتھ آئے دو سپاہیوں نے مجھے بھی اُس کے پیچھے دھکیلا۔ ”صرف اس ہندوستانی افسر پر بھروسا کرنا چاہیے، جس کے ساتھ وقت بتایا ہو، ورنہ یہ سب ناقابلِ بھروسا ہیں۔“ میں نے اپنے عقب میں فرینکلن کی دبی دبی آواز سُنی۔

چار جیپوں کے علاوہ باہر قیدیوں کو جیل سے عدالت لے جانے والی ویگن بھی کھڑی تھی۔ کلکتہ میں مقدّمے کی شنوائی کے دوران مجھے جیل سے عدالت ایسی ہی ویگن میں لے جایا جاتا تھا۔ مجھے لات مار کے ویگن میں دھکیل دیا گیا۔ ویگن میں لنگو اور دھیارا کے علاوہ لیونارڈ بھی موجود تھا۔ ہتھ کڑیوں کے ساتھ ساتھ لیونارڈ کے منھ پر بھی پٹّی بندھی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھ کے اُس کی آنکھوں میں چمک بڑھ گئی تھی۔ وہ لپک کے میرے ساتھ آ لگا تھا اور خوشی سے جھوم رہا تھا۔ میرے سوار ہوتے ہی ویگن چل پڑی۔ تاہم جیپیں وہیں کھڑی تھیں۔ اِس کا مطلب تھا کہ وہ فرینکلن کی لاعلمی میں ہمیں کہیں پہنچانا چاہتا تھا، گو کہ کلائیاں ہتھ کڑیوں میں جکڑی تھیں، تاہم میں نے بہ آسانی لیونارڈ کے منھ سے لپٹی پٹّی کھول دی۔ کپڑے کا ایک گولا اُس کے منھ میں بھی ٹھسا ہوا تھا۔ لیونارڈ نے بتایا کہ میرے جانے کے کچھ دیر بعد ہی پولیس وہاں پہنچ گئی تھی، اور اس سے کچھ پوچھے سمجھے بنا ہی اُنھوں نے ہتھ کڑیاں ڈال دی تھیں۔ لیونارڈ کا خیال تھا کہ پولیس باروٹیہ سے ملی ہوئی ہے اور ہمیں واپس اُس کے پاس لے جایا جا رہا ہے۔ ویگن موٹی فولادی چادر سے مکمل ڈھکی ہوئی تھی، اس کی چھت پر ٹخنے کی گولیوں جتنے سوراخ ہوا کی آمد و رفت کے لیے موجود تھے، البتہ اطراف سے مکمل بند تھی۔ ہم باہر کے مناظر دیکھنے سے یکسر عاری تھے۔ لنگو بار بار کہہ رہا تھا کہ وہ جج صاحب کے سامنے انسپکٹر اجیت کی ساری بازی اُلٹ دے گا۔ جج صاحب لنگو کے علاوہ باقی سب کو رہا کر دیں گے۔

قریباً آدھ گھنٹے بعد ویگن رک گئی۔ کچھ دیر بعد ہمیں اُتارا گیا۔ وہ پولیس کی عمارت تھی۔ لیونارڈ کے منھ سے پٹّی غائب دیکھ کے ایک اہل کار نے بے دریغ اُس کی کمر پر کہنی جڑ دی۔ ”ان حرامیوں نے کھول ہوگی... ماں کے۔“

”انھیں الگ الگ بند کرنے کا ہے۔“ اندر سے ایک موٹے حوالدار نے برآمد ہوتے ہوئے کہا۔ اُس کے ہاتھ میں رجسٹر تھا۔

”نام بول۔“ اُس نے مجھ سے پوچھا تھا۔

میں بتا دیا۔ ”بابر۔“

پھر اُس نے باری باری باقی تینوں کے نام وہیں کھڑے کھڑے درج کیے۔ اس کے بعد سپاہیوں کو ہدایت دی کہ انگریز کو ”لین“ میں ڈال دو اور باقی تین کو پچھلی کوٹھڑیوں میں الگ الگ بند کر دیا جائے۔ ”لین“ سے مراد غالباً پولیس والوں کی رہائشی کھولیاں تھیں۔ دو سپاہی لیونارڈ کے دائیں طرف جہاں عمارت کے ساتھ آگے تک کروندے کی جھاڑیاں چلی گئی تھیں، لے گئے جب کہ ہمیں تھانے کا دالان عبور کر کے چھوٹی چھوٹی حوالاتی کوٹھڑیوں میں بند کر دیا گیا۔ ہماری ہتھ کڑیاں کھول دی گئی تھیں۔ کوٹھڑی میں میرے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ مرے ہوئے چوہے اور پیشاب کی سیلن زدہ بساند سے قے منھ کو آ رہی تھی۔ میں دروازے ہی سے لگ کے بیٹھ گیا، اور منھ سلاخوں میں پھنسا لیا، یوں کچھ قابلِ تنفس ہوا پھیپھڑوں کو ملنے لگی۔ سامنے دو ہاتھ کی راہداری اور اس کے دوسرے سرے پر قدِ آدم دیوار تھی۔ اس دیوار کے سوا باہر کا کوئی منظر یہاں سے نظر نہیں آ سکتا تھا۔

انسپکٹر اجیت نہ جانے کیا کرنا چاہتا تھا۔ اِس امر میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ اُس کی پشت پر ریاستی عمال موجود تھے۔ باروٹیہ کا ڈراما ریاست ہی کی ہدایت کاری میں پیش کیا گیا تھا۔ البتہ ریاست اس معاملے میں براہِ راست ملوث ہونے کا خطرہ مول نہیں لے سکتی تھی۔ انسپکٹر اجیت کے مطابق باروٹیہ زندہ تھا، جب کہ چھلیا کے بہ قول باروٹیہ بٹھل کے ہاتھوں ہلاک ہو چکا تھا اور باروٹیہ کے دستِ راست نے تمام مغویوں کو طیش میں آ کے ہلاک کروا دیا تھا۔ دونوں طرف بے پناہ تضاد تھا۔ مجھے ان باتوں سے کیا سروکار تھا؟ بٹھل نہ جانے کہاں سر ٹکرا رہا ہوگا۔ ان الجھاوؤں میں میری جمرو کی امید زندہ ہوئی تھی۔ مجھے یقین تھا وہ بہ خیر ہوگا، مگر میرے مارے جانے کی اطلاع نے انھیں کہاں جیتا چھوڑا

ہوگا۔ بُھل مجھے دیکھ کے نہالوں نہال ہو جائے گا۔ بُھل کا سوختہ چہرہ تصور میں آتے ہی نہ جانے کیا ہُوا، آنکھیں بھل بھل بہنے لگیں، سینہ ہانڈی کی طرح اُبلنے لگا۔ نہ جانے وہ اِس وقت کہاں تھے۔ کورا یہیں اِسی شہر میں رہ رہی تھی۔ دو ہاتھ کے فاصلے سے پھر کہیں جا چھپی تھی۔ مجھے شاکر بھائی سے ضرور ملنا تھا۔ کیا خبر وہاں سے کوئی خبر ہی مل جائے۔ وہ بھی تو مولوی صاحب کی تلاش میں سرگرداں ہوگا، لیکن میں یہاں سے نکل سکوں گا!

مجھے جائے وقوع سے رنگے ہاتھوں گرفتار کیا گیا تھا۔ انسپکٹر اجیت خوب ٹھونک پیٹ کے چالان بنائے گا۔ کم سے کم سزا عمر قید تھی۔ چلو اچھا ہے، خس کم جہاں پاک۔ اس طرح ایک عالم سکون میں آ جائے گا۔ نہ جانے کتنے ہیں جو میرے شوق میں اذیتوں کی مالائیں پہنے بیٹھے ہیں۔ مالائیں بھی کیا ہیں، طوق ہیں۔ موت کے طوق۔ ایک میرے اِدھر اُدھر ہونے سے کیا قیامت آ جائے گی۔ بہت سوں کو دھیرے دھیرے صبر آ جائے گا۔ بُھل کو زریں سنبھال لے گی، مگر کورا! اِس نام پر میری سوچ کے تمام دروازے بند ہوئے تھے، کوئی چپکے سے کھٹکھنایا کہ میں مرتے دم تک تمھارا انتظار کروں گی بابر!

وہ پورا دن یونہی گزر گیا، پھر رات آئی، وہ بھی گزر گئی۔ انسان بھی پانی ہی کی طرح ہے، ہر رنگ قبول کر لیتا ہے۔ کوٹھڑی کے تعفن سے حواسِ خمسہ نے دوستی کر لی تھی۔ اب وہاں تعفن محسوس نہیں ہوتا تھا، کوٹھڑی میں شاید وہ بھول گئے تھے۔ اب تک وہاں سے کوئی پہرے دار بھی نہیں گزرا تھا۔ میں سر نہوڑائے بیٹھا تھا کہ کسی کے قدموں کی چاپ دروازے پر آ کے رکی۔

"او ہیڑے۔ پیر ہٹا!"

میں نے سر اٹھا کے دیکھا۔ ایک سپاہی چنگیری لیے بیٹھا تھا، میں نے پیر کھسکا لیے۔ اُس نے دروازے کی نچلی دراڑ سے چنگیری اندر کھسکا دی۔ پتلی سی روٹی میں چنے کی دال چپڑی ہوئی تھی۔ مٹی کے کٹورے میں دو گھونٹ پانی تھا۔ سپاہی جس طرح آیا تھا ویسے ہی چلا گیا۔ چنگیری اور پانی گھنٹوں یونہی پڑا رہا۔ پھر مجھے خبر نہ ہوئی کہ کب میں نے وہ روٹی زہر مار کی، مگر مجھے اپنی سُدھ بُدھ نہ رہی۔ میں پہروں گھٹنوں میں سر دیے پڑا رہا۔ پہروں دیوار تکتا رہا۔ کوئی دیکھتا تو سنگی مجسمہ مان لیتا۔ میرے دل و دماغ بے خیالی کی آماج گاہ بنے رہے۔ میں دروازے سے لگا بیٹھا رہا۔ کتنے ہی اندھیرے دن اور کتنی ہی سیاہ راتیں گزر گئیں۔ مجھے پتا نہ چلا۔ کبھی امّی جان لاڈ سے کہتیں کہ یہ زردہ بابر کے لیے بنایا ہے۔ کبھی مُنی کے گھنگرو آنکھوں کو اُدھیڑ ڈالتے۔ کبھی کورا کی چیخیں کان پھاڑتیں، کبھی پیرو کی ارتھی سامنے رکھی نظر آتی۔ کبھی مارٹی کا چٹخنا لہجہ مجھے گرداب میں لے گھومتا تو کبھی کانتے مجھے کندھوں پر اٹھا کے جھومتا۔ کبھی سلطان خاموشی سے میرے سامنے کھڑے ہو جاتا۔ کبھی زریں اپنی پرچھائیں سے مجھ پر سایہ کرتی تو کبھی جولین سر جھکائے سراپائے انتظار نظر آتی۔ اس بے چہرہ دیوانگی نے کتنے دن اٹھا پٹخ کی، پتا نہ چلا۔ آخر ایک دن جب اجالا دیوار پر آئے کچھ ہی دیر گزری تھی کہ کوٹھڑی کا دروازہ کھولا گیا۔ وہ دو سپاہی تھے "چپی رام، اٹھو جی اٹھو، ابھی کھلاصی ہونے کا ہے۔"

میں نے اٹھنا چاہا، مگر گھٹنے تو پتھر میں ڈھل چکے تھے، بالکل ساکت، جامد!

سپاہی نے میری کسمپرسی محسوس کر لی تھی "کچھ نہیں کھاؤ گے تو یہی حال ہوگا، اب اٹھا نہیں جاتا؟"

میں نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلا دیا۔ خدا ترس لگتے تھے، پھر اُن دونوں نے مجھے کندھوں سے پکڑ کے اٹھایا۔ زنگ آلود قبضوں کی طرح گھٹنے چرچرائے۔ سر بُری طرح چکرایا اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ سپاہی پہلے ہی بساط سے بڑھ کے ہم دردی کا مظاہرہ کر چکے تھے۔ تقریباً گھسیٹتے ہوئے مجھے لے چلے۔ تھانے کی عمارت اجلی اجلی اور دھلی ہوئی لگ رہی تھی۔ دالان عبور کر کے پنج سیڑھی آ گئی۔ گیروے رنگ کے بڑے بڑے گملے رو بہ قطار چاروں طرف رکھے تھے۔ پودوں سے پانی ٹپک رہا تھا۔ وہ سیڑھیوں پر بھی مجھے گھسیٹتے ہوئے اوپر لے گئے۔ جہاں ایک راہداری تھی جس میں دُور تک گہرے سرمئی دروازے چلے گئے تھے۔ ایک دروازے کے باہر سر پر دستار سجائے، بغل میں سنگین والی بندوق دبائے، چمکتی ہوئی وردی میں ملبوس ایک سنتری چاق و چوبند کھڑا تھا۔ مجھے اسی دروازے سے اندر لے جایا گیا۔ وہاں ایک عریض میز کے عقب میں پولیس افسر بیٹھا تھا، جب کہ اُس کے سامنے انسپکٹر اجیت اور

ایک دوسرا افسر مؤدب بیٹھا تھا۔

"اوہ! اجیت، تم نے تو نوجوان کا حلیہ بگاڑ رکھا ہے!"

ادھیڑ عمر پولیس افسر نے مجھے دیکھتے ہی کہا، تاہم اُس کا لہجہ سطحی اور جذبات سے عاری تھا۔ کندھوں پر ایس پی کے عہدے کے پھول چمچما رہے تھے۔

"سر! آپ جانتے ہی ہیں، گزشتہ پانچ روز کس قدر مصروفیت کے حامل رہے ہیں۔" اجیت نے تولتی نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ خاصا خوش نظر آ رہا تھا۔

"بے شک! تم نے تاریخی کام کر دکھایا۔ بے حد حیرت انگیز رہے ہو۔" ایس پی کے چہرے سے بھی خوشی پھوٹ پڑ رہی تھی۔ "ریاست بہت بڑے کشت و خون سے بچی ہے۔ اِس میں اِس جوان کا اور اِس کے ساتھیوں کا بھی ہاتھ ہے۔" پھر اس نے روئے سخن مکمل طور پر میری جانب کیا۔ مجھے چونکانے کی بھرپور سعی کرتے ہوئے اُس نے کہا، "بابر صاحب! حکومت ہندستان نے آپ کی رہائی کے لیے خصوصی سفارش کی ہے حالاں کہ ہمارے پاس آپ کی گرفتاری کا کوئی جواز بھی نہیں رہا تھا۔"

ایس پی مجھے بہ غور دیکھ رہا تھا۔ شاید اُسے میرے چہرے پر خوشی کی کوئی رمق تلاش کرنے میں ناکامی ہوئی تھی۔ اُسے کیا خبر تھی کہ مجھے تو ایک گوشہ عافیت سے محروم کر دیا گیا تھا۔ میں پتھر بنا کھڑا تھا۔ منہ میں پتی ہوئی گھنگھنیاں ڈالے۔

"پے در پے ناگہانی مصائب حواس سلب کر لیتے ہیں۔ آپ کے ابتلا کا زمانہ ختم ہُوا بابر صاحب... آپ کو رہا کیا جا رہا ہے۔"

"ناروا سلوک پر معذرت خواہ ہوں۔ پیشہ ورانہ تقاضے ہمیں مجبور رکھتے ہیں۔" انسپکٹر اجیت بولا۔ بالکل ایسے جیسے زمین پر تھوک پھینکا ہو۔ اُس کے لہجے میں نفرت کا عنصر چھپائے نہیں چھپتا تھا، جب کہ ایس پی متوازن لہجے میں بات کر رہا تھا۔ اُس نے اجیت کو آنکھوں ہی آنکھوں میں سرزنش کی اور کھنکھار کے بولا "بھوا مہاجن نے مرنے سے قبل ڈاکٹر کو بیان دیا تھا۔ اُس کے اعترافِ خودکشی سے آپ بالکل صاف ہو گئے ہیں۔"

میرے گھٹنوں میں پھڑکنے والا درد ناقابلِ برداشت ہو گیا تھا۔ میں لڑکھڑا کے گر پڑا۔ ایس پی سپاہیوں کو مغلظات سے نوازتے ہوئے لپکا، اور مجھے سہارا دے کر اٹھایا۔ نقاہت سے میرا سر بُری طرح چکرا رہا تھا۔ اپنے افسر کو لپکتا دیکھ کے اجیت اور اُس کے ساتھی پولیس افسر بھی لپک کے اٹھ آئے تھے۔

"اجیت، تم نے بیلنا چلایا ہے؟" ایس پی نے ناراضی سے گردن جھٹکتے ہوئے کہا۔

"سر! اِسے ہاتھ تک نہیں لگایا۔ گرفتار کر کے بند کر دیا تھا۔ آج باہر نکالا ہے۔" اجیت نے مستعدی سے جواب دیا۔

"کھانا پانی؟"

ایس پی کے سوال پر اجیت نے مجھے لانے والے سپاہیوں کو جواب دینے کا اشارہ کیا۔

"وہ سر! برابر تین وقت بھری پلیٹ کھلائی ہے" سپاہی نے چور نظروں سے اجیت کو دیکھا۔ "لیکن..."

"لیکن کیا؟" ایس پی بولا۔

"اُس نے نہ کھانے کے برابر کھایا ہے" سپاہی نے دُزدیدگی سے اجیت کی طرف دیکھا۔

"نرائن! تم پانچ دن تک پرچیاں دست خط کرواتے رہے ہو!" اجیت میز پر ہاتھ مارتے مارتے رہ گیا۔

"کھانا برابر آیا ہے سر!" سپاہی سہم گیا۔

"بالکل برابر آیا ہوگا، مگر اس کنجری سا وتری کے لیے..."

"ساوتری!" سپاہی نرائن نے تھوک نگلا۔

"ہاں، وہ کالا چمڑا ساوتری۔ مجھے اپنے ماتحتوں کی مکمل خبر رہتی ہے۔ تم دیوالی سے اب تک جتنا چوبارہ چڑھ چکے، سب پتا ہے، سب جانتا ہوں۔"

"لیکن اپنے تھانے کی خبر نہیں۔ حوالات میں ملزمان کو بھوکا مارا جارہا ہے، لیکن تمھیں اِس بات کی خبر ہے کہ نرائن کس رنڈی کے پاس جارہا ہے۔ خوب اجیت! خوشی کی بات ہے۔" ایس پی نے کہا، جو کچھ دیر پہلے اجیت کی مدحت میں رطب اللّسان تھا۔

"جی سر!" اجیت کے پاس شاید یہی جواب تھا۔

"جی سر سے بات نہیں بنے گی، اجیت! ذرا اِن کا حال دیکھو! اگر دو ایک دن اور گزر جاتے تو ایک مردہ آدمی کی رہائی کے نتائج سے تم واقف ہو؟ پھر ایک ایسا آدمی جس کے لیے وائسرائے کا رُقعہ آیا ہے!"

"جی سر۔"

"مجھے مکمل رپورٹ کرو! جس کی کوتاہی ہے، اُسے سزا ملنی چاہیے۔"

"جی سر۔"

سپاہی نرائن جو کہیں سے پیالے میں دودھ بھر لایا تھا، اُس نے وہ سلور کا پیالہ میرے منہ سے لگا دیا۔ میں نے خاموشی سے پی لیا۔

"بابر صاحب، میں معذرت خواہ ہوں! ورنہ آپ یقین جانیے ریاست کی پولیس انتہائی اعلا اقدار کی حامل ہے۔"

"میں آپس سے انتہائی شرمندہ ہوں۔" اجیت نے انتہائی سپاٹ لہجے میں کہا۔

"بابر صاحب! دراصل میں نے آپ سے انتہائی اہم باتیں کرنی ہیں۔ ہمیں آپ کی مدد درکار ہے۔"

میں خاموشی سے اُسے دیکھا کیا، مجھ سا تہی داماں بھی کیا اُس نے دیکھا ہے۔

"ایس پی صاحب! مجھے رہا کرنا ہے تو کر دیں یا حوالات میں بند کر دیں، لیکن خدارا مجھے تنہا چھوڑ دیں۔" میں سسک پڑا تھا۔ میرا بند بند ٹوٹ رہا تھا۔

"میں اپنی شرم ساری بیان نہیں کر سکتا۔ ہندوستانی ہونے کے ناتے ہماری پوری ریاست کو آپ کی مدد درکار ہے۔ اور کوئی ایسا گراں بار کام بھی نہیں۔ ہمیں امید ہے کہ آپ بہ آسانی کر سکیں گے!" ایس پی نے انتہائی متانت اور کمال سنجیدگی سے کہا۔ اُس کا لہجہ اپنائیت سے بھرا ہُوا تھا۔

مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ اُنھوں نے کسی خاص مقصد ہی کے لیے مجھے یہاں بلوایا ہے۔ اگر صرف رہا کرنا ہی مقصود ہوتا تو پکڑ کے دروازے کی راہ دکھا دیتے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کام انسپکٹر اجیت سرانجام دے لیتا۔ دودھ سے نقاہت کو کافی افاقہ ہُوا تھا۔ "مجھ سے متعلق یقیناً آپ کو کوئی شدید غلط فہمی ہوئی ہے، تاہم کہیے کہ میں ہندوستانی ہونے کے ناتے کیا کر سکتا ہوں۔" میں نے اٹکتے ہوئے کہا تھا۔

"مجھے آپ سے اِسی جواب کی توقع تھی۔ میرا خیال ہے پہلے کھانا کھا لیا جائے۔" ایس پی نے دروازے سے داخل ہوتے سپاہی کو دیکھ کے کہا، جس کے ہاتھ میں کھانے کے سامان سے لدی پھندی تھال تھی۔ "بس یہیں رکھ دو۔" ایس پی از خود میرے سامنے سے میز پر رکھی فائلیں اور دفتری سامان ایک طرف رکھنے لگا۔

"ارے سر! آپ زحمت نہ کریں۔"

"اوہ نہیں اجیت! یہ بہت خاص مہمان ہیں۔"

سپاہی نے میرے سامنے تھال رکھ دی۔ مجھے بھوک کہاں تھی۔ جو ضرورت تھی وہ دودھ سے پوری ہو گئی۔

"کہیے! میں کیا کر سکتا ہوں؟" میں نے اجیت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ میری پذیرائی سے ناخوش نظر آرہا تھا۔ اُس کے کھچاؤ کا سبب واضح تھا۔ وہ مجھے انگریزوں کا گماشتہ سمجھتا تھا۔ اس کا دوسرا مطلب یہ تھا کہ وہ کرانتی کاروں کے از حد قریب تھا یا کرانتی کار تھا۔

"بابر صاحب! پہلے آپ کھانا کھائیں، مجھے مزید شرمندہ نہ کریں!" ایس پی بولا۔

"مزید کی حاجت نہیں، ورنہ بھوک کے ہاتھ کون باندھ سکتا ہے۔" میرے لہجے میں خود بہ خود اکتاہٹ بھر آئی تھی۔ اس وقت تنہائی سے بڑھ کر مرا چارہ گر کوئی نہ تھا۔ ایس پی اپنے ہی شوق میں مبتلا تھا۔

"میں آپ کے فولادی اعصاب کا قائل ہو گیا ہوں بابر صاحب! پانچ دن کا بھوکا آدمی ندیدوں کی طرح ٹوٹ پڑتا، جب کہ آپ نے دودھ بھی انتہائی متانت سے نوش کیا، لیکن جسم کے تقاضے تو بہ ہر حال، موجود رہتے ہیں۔"

ایس پی کی آواز جذبات سے بوجھل ہو گئی۔

"میرے تقاضے میں جانتا ہوں، آپ کہیے، جو کہنا ہے!" میں نے بے زاری سے کہا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ اٹھوں اور یہاں سے کسی بیاباں کی سیدھ میں دوڑتا چلا جاؤں۔

"ٹھیک ہے بابر صاحب! اگر آپ ہمارا کھانا پسند نہیں کر رہے... تو آپ سے مدد طلب کرنے کا ہمیں بھی کوئی حق نہیں۔" ایس پی کا لہجہ خلوص سے چھلکنے لگا۔

مقدر کا لکھا بھی تقدیر ہی پڑھتی ہے۔ کل تک اِنھی لوگوں نے جان وروں کی طرح ایک کوٹھڑی میں مجھے ٹھونس رکھا تھا اور آج پلکوں پر بٹھا رہے تھے۔ میں نے بھی مقدر کا لکھا سمجھ کے دو چار لقمے زہر مار کر لیے اور خاموش ہو گیا۔

ایس پی کچھ دیر مجھے بہ غور دیکھتا رہا پھر بولا، "بابر صاحب! اِس میں دو رائے نہیں ہیں کہ آپ دلی سرکار کے خاص آدمی ہیں۔ آپ کے لیے وائسرائے کا ذاتی رُقعہ آیا ہے، جب کہ دیگر شواہد بھی یہ اشارہ کرتے ہیں کہ آپ انگریزوں سے انتہائی قریب ہیں۔"

"ایس پی صاحب! باروٹیہ کی بھی یہ شدید غلط فہمی تھی اور آپ کی بھی ہے۔ چند اتفاقات سے آپ نے افسانوی تانا بانا بُن لیا ہے۔"

"باروٹیہ کی یہی سب سے بڑی غلطی تھی کہ اُس نے غلط فہمی کو غلط فہمی میں سمجھا تھا، تبھی مارا گیا..." ایس پی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "لیکن بابر صاحب، ہم اِس بحث میں پڑنا نہیں چاہتے۔ بس ایک ہندوستانی کے ناتے آپ سے درخواست ہے، یہ آپ پر منحصر ہے کہ اِسے قبول کر لیں یا رد کر دیں۔"

"مجھے انگریزوں کا گماشتہ کہلوائے جانے سے انتہائی نفرت ہے۔ گالی مت دیں ایس پی صاحب۔" اچانک مجھے طیش آگیا تھا۔

"میں معذرت خواہ ہوں بابر صاحب! تاہم میں یہ سمجھتا ہوں کہ معاملہ آپ کے گوش گزار ضرور کروں..." مجھے خاموش دیکھ کے وہ گویا رہا۔ "بابر صاحب، جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ باروٹیہ نے لندن سے بمبئی جاتے مسافر جہاز سے ایک سو دس انگریزوں کو اغوا کر کے ویرادل کی بندرگاہ پر اتار لیا تھا اور وہ انتہائی کام یابی سے مغویوں کو ویرادل سے گر کے جنگل تک لے جانے میں کام یاب ہو گیا تھا۔ دلّی کی سرکار کو ہماری ریاست سے سب سے بڑی شکایت یہ ہوئی کہ آخر باروٹیہ نے ریاست کی نظروں میں آئے بغیر اڑھائی سو میل کا یہ سفر کس طرح کیا، جب کہ کم و بیش ڈیڑھ سو چھکڑوں کا قافلہ ہوگا!... حالاں کہ حقیقتاً ایسا ہی ہُوا تھا۔ ریاست کو بالکل علم نہ تھا، کیوں کہ اس راستے پر چھکڑوں کے قافلے معمول کی بات ہیں، جنگل سے بندرگاہ تک لکڑی، ناریل، اناج، جڑی بوٹیاں وغیرہ اِنھی چھکڑوں کے ذریعے لائی جاتی ہیں۔ باروٹیہ جس قافلے میں مغویوں کو لاد کے لے گیا تھا وہ بندرگاہ پر شیشم کی لکڑی ڈھو کے واپس ساسن گر کی طرف جارہا تھا، جب کہ ڈاکوؤں سے بچاؤ کے لیے چند اجرتی گھڑسواران چھکڑوں کے ساتھ ہمیشہ چلتے ہیں، جنھیں مقامی لوگ بندوقچی کہتے ہیں۔ بندوقچیوں کو اُجرت بھی وہی دیتا ہے جس کا مال چھکڑوں پر لدا ہوتا ہے، لہٰذا بابر صاحب آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ باروٹیہ کے لیے وہ چھکڑے استعمال کرنا کتنا آسان تھا۔ ہمیں تو اس سانحے کی خبر تیسرے دن ہوئی جب دلّی سے تار آیا۔ بحری جہاز کو بچا کھچا عملہ بلا توقف بمبئی لے پہنچا تھا۔ ہمیں فی الفور اطلاع مل جاتی تو ہم باروٹیہ کو راستے میں جا لیتے، تاہم اس کے تعاقب میں گر کے جنگل میں گھسنا خودکشی تھا۔ گر جنگل کا چپا چپا باروٹیہ کا تابع دار ہے اور اس کا مخبر ہے۔ بہ ہر حال، ریاست نے مغویوں کی بازیابی کے لیے اپنی بھرپور کوششوں کا آغاز کر دیا، لیکن دلّی حکومت نے اپنے تأثرات سے مسلسل یہی پیغام دیا کہ یہ سانحہ ریاستی مدد کے بغیر ممکن نہیں ہے اور ریاست کو مختلف سفارتی انداز میں دھمکانا شروع کر دیا لیکن اِس کے برعکس ریاست نے اپنی فوج کو جنگل میں کارروائی کا حکم دے دیا۔ بابر صاحب، یہ خودکشی تھی، ہم خودکشی پر آمادہ ہو گئے، لیکن ہم نے باروٹیہ سے بات چیت کا راستہ بھی کھلا رکھا۔ باروٹیہ کے دو بڑے مطالبے تھے۔ ایک یہ تھا کہ باروٹیہ کا بیٹا اور اُس کی سابق بیوی حوالے کی جائے، جب کہ دوسرے مطالبے کے مطابق گر جنگل اور اس کے گرد و نواح کے علاقے کو اُس کی ملکیت تسلیم کرتے ہوئے ریاست دست بردار ہو جائے اور جیلوں میں قید اُس

کے تمام ساتھیوں کو رہا کیا جائے۔ پہلا مطالبہ انگریزوں سے متعلق تھا، جب کہ دوسرا ریاست سے تھا۔ انگریزوں نے بیٹا اس کے حوالے کرنے کی ہامی بھرلی، تاہم ان کا قانون باروٹیہ کی سابقہ بیوی کی جبری سپردگی پر مجبور نہیں کرسکتا تھا، جس سے اُنھوں نے کلی معذوری ظاہر کردی اور ساتھ ہی ریاست پر دباؤ دیا کہ باروٹیہ کا مطالبہ فوری طور پر تسلیم کرتے ہوئے گِر کا جنگل اُسے دے دیا جائے۔ قیدی رہا کردیے جائیں۔ ادھر خانجی نے باروٹیہ کا مطالبہ اور انگریزوں کا دباؤ دونوں مسترد کردیے۔ ہماری سپاہ جنگل کا گھیراؤ کرنے کی تیاریوں میں مصروف تھی کہ مخبروں نے باروٹیہ کے ہندستانی مغوی کے ہاتھوں قتل ہونے کی اطلاع دی۔ اِس سے قبل بابر صاحب آپ کے فرار ہونے کی اطلاع بھی ہمیں مل چکی تھی۔ اس کے بعد انسپکٹر اجیت نے انتہائی اہم کردار ادا کیا، چوں کہ باروٹیہ کے گروہ میں ہمارے مخبر براہِ راست انسپکٹر اجیت کی ماتحتی میں تھے، اور یہ ہمارے بے حد ذہین اور قابل افسر بھی ہیں، اِس لیے محکمے نے باروٹیہ کی موت سے فوائد حاصل کرنے کی ذمّے داری انسپکٹر اجیت کو سونپ دی...'' ایس پی دم بھرنے کے لیے لحہ بھر رکا۔ میں نے دیکھا اُس لمحے اجیت کے چہرے پر ایک رنگ آ کے گزر گیا تھا۔

''بہ ہر حال، آپ کو چھلیا کے ٹھکانے پر دیکھا گیا۔ آپ کو بہ حفاظت دلواڑا لانے کے لیے سپاہی بھیجے گئے تو وہاں بہ ظاہر آپ کو ایک قتل میں ملوث پایا گیا۔ قانونی تقاضے کے تحت آپ کو گرفتار کرنا مجبوری تھی۔''

میں نے اجیت کی طرف دیکھا۔ اُس کا چہرہ سیاہ پڑ رہا تھا۔ اُس نے التجائیہ نظروں سے مجھے دیکھا، گویا اجیت سرکاری طور پر میری گرفتاری سے انکاری تھا۔ یہ بات واضح ہو رہی تھی کہ اجیت کے مقاصد کچھ اور تھے۔ بہ ہر حال، میں خاموش ہی رہا۔

''اس دوران ایک اندوہ ناک خبر نے ریاست کی چولیں ہلا دیں۔ مشتعل گروہ کے ہاتھوں سَو سے زائد انگریزوں کی ہلاکت بہت بڑا واقعہ تھا، تاہم انسپکٹر اجیت اِس اطلاع کے پس پردہ مقاصد کھوجنے میں کام یاب ہوگئے۔ یہ افواہ باروٹیہ کے دست راست گلامی نے جھیل میں پتھر پھینک کے ردِ عمل جاننے کے لیے پھیلائی تھی۔ میں اختصار سے یہ بتانا چاہتا ہوں بابر صاحب کہ انسپکٹر اجیت نے روز و شب کی دوڑ دھوپ سے اِس پیچیدہ مسئلے کو سلجھا لیا۔ کثیر زرِ تاوان، اسلحے اور باروٹیہ کے بیٹے کے عوض انگریز قیدیوں کو رہا کروا لیا گیا، تاہم ایک مطالبہ ہم بے پناہ کوششوں کے باوجود تاحال پورا نہیں کرسکے، جس کی ضمانت کے طور پر ریاست کے دس اہم پولیس افسر گلامی کے حوالے کیے گئے ہیں۔ گلامی نے آپ کے بٹھل نامی ساتھی کو زندہ یا مردہ مانگا ہے، لیکن اس کے لیے آپ چنداں فکر نہ کریں۔ آپ کے ساتھی کو ان کے حوالے کرنے کا ہمارا کوئی ارادہ نہیں ہے، یہ معاملہ ہم کسی نہ کسی طور سلجھالیں گے، کیوں کہ گلامی مقامی پولیس افسروں کو بہ ہر حال، گزند نہیں پہنچائے گا۔''

بٹھل کے تذکرے پر میرے ریڑھ کی ہڈّی میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ بٹھل کے گرد منڈلاتے شدید خطرات معاً میرے سامنے وا ہوگئے۔ ایس پی فاش جھوٹ بول رہا تھا۔ یہ یقیناً اب تک بٹھل کو تلاش کرنے میں ناکام رہا ہے۔ اس کا دلاسا طفلِ تسلی کے سوا کچھ نہ تھا، لیکن میں ایسا اہم کیسے ہوگیا کہ طفل تسلیاں دی جائیں۔ بٹھل کے تصور نے میرا سویا ہُوا دماغ جھنجوڑ جگایا تھا۔ وائسرائے کا میرے لیے سفارشی رُقعہ حیرت انگیز تھا۔ یہ لوازمات اخلاق اور یہ خاطر داری اس سے بڑھ کے حیرت انگیز تھیں۔

''بٹھل اور میرے دیگر ساتھی کہاں ہیں؟'' میرے زبان سے خود بہ خود چھلکتا ہُوا سوال نکلا۔

''بابر صاحب! یقین جانیے کہ ہم تاحال اُنھیں تلاش کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ اُنھیں زمین نگل گئی یا آسمان نے اُچک لیا، کچھ خبر نہیں، لیکن ہمیں اس سے بڑھ کے مسئلہ درپیش ہے۔ اگر آپ وہ مسئلہ حل کروا دیں تو میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کے ساتھی جہاں کہیں بھی ہوں گے، ہمیں جب بھی ملیں گے، بہ خیر و عافیت آپ تک پہنچ جائیں گے۔ تاہم میں بہ وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ ریاست ہی میں موجود ہیں۔ باہر نہیں نکل سکے۔'' میں نے غور سے دیکھا تو ایس پی کے چہرے سے مکروہ نقاب کھسکتا دکھائی دیا۔ اُس نے کسی مجبوری کے تحت اقرار نہیں کیا تھا، تاہم اُس نے مجھے باور کروا دیا تھا کہ بٹھل، زورا اور جمرو اُس کے پاس زیرِ حراست ہیں۔ انکار کی صورت میں ہمیشہ کے لیے لاپتا کیے جاسکتے ہیں۔ جمرو کے خیال سے میرا ذہن پھر بھٹکنے لگا تھا۔

''بٹھل کے ساتھ کون کون غائب ہیں؟'' میں نے تسلی خاطر کو پوچھا اور دل میں ہزار دعائیں پڑھنے لگا کہ یہ جمرو سے متعلق کوئی اچھی خبر سنائے۔

''ایک انگریز خاتون ہیں، جب کہ بٹھل سمیت تین افراد اور ہیں، وہ تینوں آپس میں ساتھی بتائے جاتے ہیں۔''

میری سولی چڑھی سانس گویا پھر سے سینے میں لوٹ آئی۔ گویا چھلیا نے غلط بیانی کی تھی، مگر کیوں؟ اُس کے پاس ایسا کرنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔

''آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟'' اب میرے پاس اس کی پوری بات توجّہ سے سننے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

''ہاں میں اسی طرف آ رہا ہوں۔ آپ بے حد عقل مند اور معاملہ فہم انسان ہیں بابر صاحب!'' ایس پی نے مسکرا کے میری طرف دیکھا، میرا خون کھول رہا تھا کہ چاقو سے یہ مسکراہٹ ہمیشہ کے لیے اُس کے چہرے پر ثبت کردیتا۔

اس تمام قضیے کی براہِ راست نگرانی کے لیے دلّی سے دو انگریز افسر بھیجے گئے تھے۔ مسٹر فرینکلن اور ان کے دست راست! لیکن ہماری بد قسمتی سے مسٹر فرینکلن اور ان کا دست راست موٹر کے حادثے میں جان گنوا بیٹھے۔ یہ حادثہ گر جنگل جاتے ہوئے پیش آیا۔ جس پر دلّی کی حکومت کافی برافروختہ ہے۔ اُنھوں نے یہ نہیں دیکھا کہ ہم نے اُن کے سیکڑوں افراد صحیح سلامت پہنچا دیے۔ وہ ناگہاں موٹر حادثے میں ہلاک ہونے والے دو افراد کو لے بیٹھے ہیں۔''

میں نے بہ طورِ خاص اجیت کی طرف دیکھا۔ وہ دُزدیدہ مجھے ہی دیکھ رہا تھا۔ گویا اجیت نے یہ سب بالا ہی بالا کیا تھا، مگر کیوں؟ یہ اندازہ میں نہیں لگا سکا تھا۔

''حکومتِ ہندستان نے بطور سزا، کاٹھیاواڑ تاجروں کے لیے پورے ہندستان کے دروازے بند کرنے کا فیصلہ کیا ہے، جب کہ ہماری ریاست تمام کاٹھیاواڑ سے تجارت میں کئی قدم آگے ہے۔ بابر صاحب! ہم چاہتے ہیں کہ آپ وائسرائے تک اپنا اثر و رسوخ استعمال کریں اور اُسے مجبور کریں کہ اِس طرح ہمارا معاشی قتل نہ کیا جائے۔''

میں اور وائسرائے تک اثر و رسوخ! اِس گمبھیر تناؤ کی کیفیت میں بھی میرا قہقہے مارنے کو دل چاہا۔

''جی آپ بابر صاحب! وائسرائے کی ذاتی مہر لگا ہُوا آپ کے لیے سفارشی رُقعہ آیا ہے۔''

معاً مجھے یاد آیا کہ لیونارڈ نے مجھے بتایا تھا کہ وہ وائسرائے کے معتمدِ خاص کا رُتبہ رکھتا ہے۔

اوہ! وہ میرے ساتھ ایک انگریز؟

''ہاں ہاں، سر لیونارڈ نام تھا اُن کا۔ وہ بھی دلّی پہنچ چکے ہیں۔ تمام مغویوں کی منزل گو کہ بمبئی تھا، مگر اُنھیں سرکار کے ایما پر دلّی پہنچایا گیا ہے۔''

''تو گویا آپ نے لیونارڈ کو میرا اثر و رسوخ کروانا ہے؟''

”لیونارڈ کا ایک تار آپ کے نام بھی ہے۔“ ایس پی نے اپنے سامنے رکھا کاغذ میرے طرف بڑھا دیا۔

اس نے لکھا تھا:

میرے پیارے دوست بابر!

تمھارے ساتھ گزرے چند دن سرمایۂ حیات ہیں۔ میری آئندہ زندگی کا ہر پل تمھارا ودیعت کردہ ہوگا۔ میں بہ عافیت اپنی منزل پہنچ گیا ہوں۔ میں نے وائسرائے سے متعلق تم سے ایک تذکرہ کیا تھا، وہ ادھورا تھا۔ بابر، وائسرائے ہندستان میرے انتہائی قریبی رشتے دار بھی ہیں۔ میرا احوال سن کے تم سے ملنے کے مشتاق ہیں۔ تم بے فکر رہو۔ جلد ملاقات ہوگی، جس کا اہتمام میری ذمے داری ہے۔

تمھارا احسان مند

لیونارڈ

تار پڑھ کے واقعی وائسرائے تک میری پہنچ کا بہ خوبی اندازہ ہو رہا تھا۔ اب اُس سے کچھ بھی بے کار تھی۔ ”ٹھیک ہے۔ میں لیونارڈ سے بات کروں گا۔“ میں نے بے دلی سے کہا۔

”بابر صاحب، صرف بات نہیں، بل کہ پوری تن دہی سے آپ کو ہمارا کام کرنا ہوگا۔“ ایس پی نے کچھ توقف دے کر معنی خیزی سے کہا۔ ”ہم آپ کے ساتھیوں کی تلاش کا کام پوری تن دہی سے کریں گے۔“

”لیکن یہ آپ نے کیسے سمجھ لیا کہ میں اپنے ہم راہیوں کے بغیر یہاں سے چلا جاؤں گا؟“

”بابر صاحب! آپ تن تنہا ہیں، یہاں ریاست کی پوری مشینری پوری تن دہی سے انھیں تلاش کر رہی ہے۔ آپ بے کار وقت کا ضیاع کیوں کریں گے۔“

”لیکن میں اُن کے بغیر یہاں سے نہیں جاؤں گا۔“ میں نے حتمی اور دو ٹوک لہجے میں کہا۔

ایس پی کچھ دیر ساکت مجھے دیکھا کیا، پھر کسی نتیجے پر پہنچ کے گویا ہُوا۔ ”اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ آپ کے ساتھی ہماری حراست میں ہیں تو میں وضاحت کرنا چاہوں گا، بابر صاحب! ایسی کوئی بات نہیں ہے، تاہم یہ یقینی ہے کہ وہ نہ صرف ریاست سے، بل کہ گڑھ کے گرد و نواح سے باہر نہیں نکلے ہیں۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں نے آپ کو یہ تاثر دینے کی کوشش کی، وہ حراست میں ہیں، تاہم وہ تاحال پُراسرار انداز میں غائب ہیں۔“

”ٹھیک ہے، اُن کی تلاش کے بعد ہی میں آگے کا کچھ سوچ سکتا ہوں۔ ورنہ میری جان ہتھیلی پر ہے۔ ایس پی صاحب!“ میں نے غرا کے کہا۔ ایس پی بے حد کائیاں اور چالاک تھا، وہ پینترے بدلنے پر مکمل قدرت رکھتا تھا۔

”ٹھیک ہے بابر صاحب! جیسے آپ کی مرضی! ہم بھی تلاش کر رہے ہیں، آپ بھی کیجیے! لیکن بھُل کو بہ ہر صورت یہاں چھوڑ کے جانا ہوگا۔ تاوقتے کہ ہمارا کام نہ ہو جائے۔ آپ جا سکتے ہیں بابر صاحب! لیکن خیال رہے کہ آپ اپنی جائے قیام سے آگاہ رکھیں گے۔“

”فی الحال میری کوئی جائے قیام نہیں!“

”آپ کے خیر مقدم کے لیے آیا ہُوا ہے وہ... کیا نام ہے اُس غنڈے کا...“ ایس پی نے استفہامیہ انداز سے اجیت کو دیکھا۔

”سر! چھلیا۔“

”ہاں چھلیا چھلیا! وہ آپ کے لیے اتاولا ہو رہا ہے۔ چکر پر چکر لگا رہا ہے۔“

”انسپکٹر اجیت! چھلیا کو بابر صاحب کی رہائی کے متعلق اطلاع دے دی تھی۔“

”جی سر! بالکل وہ تو صبح سے ہی دروازے سے لگا بیٹھا ہے۔“

”اور ہاں، مسٹر بابر! ایک اور اہم اطلاع آپ کو دینا میں بھول گیا، حالاں کہ خاصی اہم بات ہے۔ میرا دماغ آج کل غیر حاضر رہنے لگا ہے۔“

”جی کہیے! ایس پی صاحب!“ مجھے شدید بے چینی محسوس ہونے لگی۔ نہ جانے یہ شعبدہ باز ایس پی اب کون سا پینترا بدلے گا۔

”بھُوا اسپتال پہنچ کے پورے ایک دن زندہ رہا۔ اُس کے وکیل اور کھاتے دار اسپتال ہی میں بلوا لیے تھے۔“ اُس نے بدمزگی سے گویا کڑوا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔ بھُوا مہاجن مجرد زندگی گزار رہا تھا۔ ویسے بھی اُس کا کوئی اتنا قریبی عزیز نہیں تھا جو وارث بنتا، تاہم مسٹر بابر! بھُوا مہاجن اپنی تمام جائیداد، مال و متاع، نقدی وغیرہ سب تمھارے سپرد کر گیا ہے۔ وصیت میں اُس نے لکھا ہے کہ تم بہتر جانتے ہو کہ اُس کا مال کس کے سپرد کرنا ہے۔“

ایس پی نے منوں وزنی گولا میرے سر پر دے مارا تھا۔ بھُوا نے جان دے کے بھی میرا پیچھا نہیں چھوڑا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ اشتعال تھا یا جنون یا کم مائیگی کا احساس۔ میرے اندر دہکتا ہُوا آتش فشاں یک دم پھٹ پڑا۔ کیا اوقات ہے اُس کی... وہ کیا سمجھتا تھا خود کو۔ میں تھوکنا بھی پسند نہیں کرتا اُس کی جانے داد پر۔ ایک بھُوا کیا میں اس جیسے ہزار خرید سکتا ہوں۔ نہ جانے وہ طوفان کہاں سے امڈ آیا تھا میں نے شعلے کی طرح لپک کے ایس پی کا گریبان پکڑ لیا۔ میری اس اچانک حرکت سے وہاں تھرتھری مچ گئی۔ ایک طرف سے اجیت مجھ پر آ رہا تو دوسری طرف سے وہاں کھڑے سپاہیوں نے مجھے دبوچ لیا۔ ”میں تھوکتا ہوں بھُوا کی دولت پر اور وہ بھی تھوک دے گی۔“ میں حالتِ جنوں میں چلّا رہا تھا کہ ایس پی کے جملے سے مجھ پر سکتہ طاری ہو گیا۔

اُس نے کہا، ”کون تھوک دے گی بابر صاحب!“ اُس نے مجھ سے متواتر یہ سوال کیا، مگر پھر مجھ سے کچھ بولا نہ گیا، بل کہ مجھے یوں محسوس ہُوا جیسے میں نے سرِ بازار اُس کا آنچل کھینچ لیا تھا۔

آخر وہ مجھے پیار محبت سے سمجھاتے بجھاتے باہر دروازے تک لے آئے۔ وہاں چھلیا مجھے دیکھ کے آب دیدہ ہو گیا اور بھڑک کے لپٹ گیا۔ دھیارا اور لنگو اُس کے ہم راہ تھے۔ چند صورتیں بھی اُس کے ہم راہ تھیں۔ اُس نے جدا ہوتے ہی گلاب کی لڑیاں میرے گلے میں ڈال دیں۔ دھیارا کے ہاتھ میں مٹھائی کا ٹوکرا تھا۔ چھلیا نے لپکتے ہوئے ٹوکرے پر چڑھا چمک دار کاغذ پھاڑا اور لڈو نکال کے میرے منھ میں ٹھونس دیا اور دھیارا کو گویا وہ ٹوکرا وہیں اُنڈیلنے کا اشارہ کر دیا۔ میں اپنے ہی حال میں ساکت کھڑا تھا، کھڑا ہی رہا۔ چھلیا نے اپنے پیچھے کھڑے ایک لمبے تڑنگے جوان کو بازو سے پکڑ کے آگے کر دیا۔ ”سوامی جی! اسے اپنا رگھو ہے، ایک دم رگھو بوری والا۔ اودھر دلواڑا کی چوکی پہ اس حرامی کو بٹھانے کا ہے۔“

”رگھو بوری والا!“ نام جانا پہچانا اور سنا ہُوا لگا۔ معاً مجھے لکشمی یاد آ گئی، وہ اسی رگھو بوری والا کا چاقو اپنے قدموں میں دیکھنے کی خواہش مند تھی۔ میری نظریں بے ساختہ اُس کی طرف اٹھیں۔ لمبا سفید کُرتا، کالا پاجامہ، گلے پر لپٹا ہُوا پیلا زرد رومال، کانوں میں ننھی ننھی سی بالیاں، گندمی، مگر اُجلی رنگت، بغیر تیل کے سیدھے کنگھائے ہوئے بال۔ سرخ ڈوروں سے بھری ہوئی وحشی آنکھیں، چوڑا اور چوکور چہرہ۔ بالوں کے پیچھے میں چھپی ہوئی پیشانی، اُس کی کاٹھی لمبی چوڑی اور کسرتی تھی۔ اُس نے میرے سامنے دونوں ہاتھ جوڑے اور کہا، ”ابھی استاد تو تمھارا مالا جپتا ہے اور میں استاد کا۔“ اُس کی آواز نہ بھاری تھی اور نہ ہلکی، بل کہ متناسب تھی اور لہجہ صاف ستھرا۔ مجھے وہ پہلی نظر میں اچھا لگا، اُس کے اندر ایک غیر مرئی چیز ایسی تھی جو خواہ مخواہ اور بلاوجہ اچھی لگتی ہے۔

”چھلیا بھائی ہیں اس قابل کے اُن کے نام کی مالا جپی جائے۔“ میں نے پھنسے پھنسے لہجے میں کہا، اور وہ میں کہاں تھا، وہ تو ایک زندہ درگور لاش تھی۔ چھلیا اپنے ساتھ اچھا خاصا ہجوم اٹھا لایا تھا۔

”یہ دروازہ تمھارے باپ کا نہیں ہے۔ ہٹو یہاں سے۔ صاب آنے کا ہے۔“ ایک توندل سپاہی بید گھماتے نہ جانے کہاں سے آن دھمکا۔

”اِسے کا ہے کو استاد استاد لگانے کا ہے۔ تیری ماں کا.. سالے۔ اڈے پر کون جانے کا؟“ چھلیا نے فوراً ہی رگھو بوری والا کی گدی پہ ہاتھ چھوڑ دیا۔

”ابھی یہ پریسان دکھنے کا ہے استاد!“ رگھو نے چھلیا کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے دھیمے سے کہا۔

”ابھی اپنا تو بڑا بند کر۔ سوامی جی کا سارا پریسانی ادھر اڈے پر ختم ہونے کا ہے۔ ابھی چل۔“

اس کے بعد رگھو کے آدمیوں نے نانا کرنے کے باوجود مجھے ہاتھوں پر اٹھا لیا۔ دھیارا اور لنگو بھی پیش پیش تھے۔ میں نے گردن گھما کے دیکھا۔ اجیت برآمدے میں کھڑا مجھے گھور رہا تھا۔ چھلیا کی سربراہی میں جلوس مجھے کندھوں پر اٹھائے چل پڑا۔ وہ ڈھول اور کھلواڑ کرتے اور نعرے لگاتے ہوئے سڑک پر آ گئے۔ راہ گیر اشتیاق اور خوف کا آمیزہ آنکھوں میں سجائے ہمیں رک رک کے دیکھتے۔ کچھ فوراً ہی اپنی راہ لیتے اور کچھ اس وقت تک وہیں کھڑے اِس جلوس کو دیکھتے رہتے، جب تک نظروں سے

اوجھل نہ ہو جاتا۔ جلوس سے الگ تھلگ اور غیر محسوس طریقے سے ساتھ چلنے والے دو سادہ لباس والے میری نظروں سے اوجھل نہ تھے۔ میرا دل چاہا کہ چھلیا سے چیخ کے کہوں بند کرے یہ تماشا گیری اور دفع ہو جائے مجھے تنہا چھوڑ کے۔ مگر لفظ تو ہمیشہ میری دست رَس سے دُور ہی رہے تھے۔ سو خاموش رہا۔ کئی سڑکیں اور گلیاں عبور کر کے ایک گلیارے اور بہت سے لوگ منتظر ملے۔ ایک آواز میرے کانوں تک بھی پہنچی تھی کہ چھلیا کا استاد آیا ہے۔ پھر تو جیسے جادو کی چھڑی گلیارے میں گھومی اور آخری سرے تک مکانوں میں پھریری سی دوڑ گئی تھی۔ دریچے کھل گئے اور مرد باہر نکل آئے۔ بعض دوڑے چلے آتے اور مٹھی بھر سکے میری اوراچھال کے ہم جلوس ہو جاتے۔ یہ رگھو اور چھلیا سے لوگوں کی بے پایاں الفت تھی، جس کا اظہار وہ مجھ پر کھلے بندوں کر رہے تھے۔ بالآخر ایک پھاٹک نما دروازے پر جلوس ٹھہر گیا۔

پھاٹک کھول دیا گیا تھا۔ یہ بالکل ویسا ہی تھا جیسا ہر علاقے میں ایک نہ ایک ضرور ہوتا ہے، جس کے سامنے سے گزرتے ہوئے بہت سوں کے دل تیز ہو جاتے ہیں اور بہت سوں کے دل مدھم پڑ جاتے ہیں۔ غیر متعلقہ افراد دروازے پر ہی روک دیے گئے۔ یہ خصوصی حکم چھلیا یا رگھو ہی نے دیا ہوگا، ورنہ ریت کے خلاف تھا۔ مجھے عین چوکی کے سامنے اتارا گیا۔ مجھے ٹھٹکتا دیکھ کے چھلیا اچھلتا ہوا آگے آیا اور ہاتھ جوڑ کے بولا: ”ابھی تیرے آگے کسی کا مجال تھا سوامی جی! پر ابھی اِدھر جمانے کا استاد آنے کا اے۔“

چھلیا کے اس جملے نے مجھے برف کر دیا۔ میں نے بے تابی سے مڑ کے اُس کا گریبان پکڑنا چاہا، مگر اِس سے پہلے بھادوں کی گھٹاؤں کی طرح گرجتا اور شیر کی طرح دھاڑتا ہوا وہ مجھ پر آ پڑا تھا۔ وہ کوئی اور نہیں بٹھل تھا۔ ایسی ویران آنکھیں کہ موت بھی دہل جائے، ایسا اجاڑ چہرہ کہ شہرِ خموشاں آہ و بکا کرے۔ ایسی وارفتگی کہ بجلیاں کوندنا بھول جائیں۔ مجھ پر تو گویا شادیِ مرگ کا لرزہ طاری ہو گیا تھا۔ کیسی ناامیدی کے وقت چلا آیا تھا، ہمیشہ کی طرح۔ اُس نے پوری قوت سے میرا منہ تھپڑایا کہ طمانچے کے زور سے خود جھوم گیا۔

”بڑا ظالم ہے رے!“ بٹھل نے جھومتے ہوئے اُلٹا ہاتھ چھوڑ دیا۔ گال اندر سے پھٹ گیا تھا۔ پھر تو جنون طاری ہو گیا۔ تھپڑ، لاتیں، گھونسے، جو اُس کے جی آیا وہ اُس نے چلایا۔ چھلیا، رگھو اور دیگر گھیرا ڈالے کھڑے تھے۔ سب کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ زورا اور جمرو بھی جگہ سے آگے نکل آئے تھے۔ اُن کی آنکھوں سے موسلا دھار بارش برس رہی تھی۔ اسے دیکھ کے میرا کلیجا ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ میں لڑکھڑا کے گر پڑا۔ بٹھل نے گریبان سے پکڑ کے اٹھایا۔ وہ تن کے کھڑا تھا۔ بھلا دیمک زدہ پیڑ بھی اکڑتے ہیں۔ ٹپکاتی آنکھوں سے اُس نے مجھے گھورا اور بولا، ”تیرے مرنے کے نہیں تھے رے... موتی کو دلنے کو زندہ ہیں۔“

اُس کی آنکھیں اتنی سفاک نہیں تھیں، جتنا وہ خود تھا۔ گوشوں میں نمی کے قفل پڑے صاف دکھ رہے تھے۔ پھر اُس نے جھپٹ کے مجھے بھینچ لیا۔ سارے بند ٹوٹ گئے۔ سبھی کچھ بہہ گیا۔ میری ہچکیاں بندھ گئیں۔ زورا اور جمرو بھی دائیں بائیں سے آ کے چمٹ گئے۔ پھر تو یوں لگا جیسے اڈّے کے در و دیوار بھی سسکیاں بھر رہے ہوں، پھر بٹھل دیوانہ وار قہقہے لگانے لگا۔ اُس نے مجھے ہاتھوں میں بھر کے دیوانہ وار چومنا شروع کر دیا۔ ہاتھ تھما تھما کے گلوں پر چٹکیاں بھرنے لگا، پھر یکایک سبھی مسکرانے لگے۔ برسات میں نکھری نکھری، کھلی کھلی، پکی اور چمکیلی دھوپ نکل آئی تھی۔

”یہ کیا بھوت بن گیا ہے رے۔ چھلیا! اوچھل چھل چھلیا۔“ بٹھل نے انگلی سے میری ٹھوڑی اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”حکم بول استاد!“ چھلیا صدقے واری ہو کے بولا۔

”تیرے پاس کال پڑ گیا ہے کیا؟ نکھٹو ہی لا بٹھائے ہیں یا تمھیں دکھائی پڑتا ہے!“

”ابھی اِدھر رگھو کا کانٹا اے استاد۔“

”آنکھوں میں بٹن ٹنکے ہیں تو بولو۔ لاڈلا آیا ہے رے چھلیا، اپنا لاڈلا راجا۔“ بٹھل کے منہ سے پیاسی اور ترسی ہوئی آواز نکلی تھی۔

”ابھی ایسا کیسا ہونے کا ہے استاد۔ ابھی ایک دم کوزا لٹھا لفافے میں بند رکھنے کا ہے۔ ابھی سوامی جی کو اسناد پھارگ کرنے کا اے تو چھلیا کا سیوا شروع ہونے کا ہے استاد۔“ چھلیا کے اشارے پر ایک نے کونے میں دھرے

خاکی لفافوں میں سے ایک اٹھا کے بڑھا دیا۔ چھلیا نے وہ
جھپٹ کے مجھے پیش کر دیا۔

میں غسل کر کے اور چھلیا کا دیا ہوا بوسکی کا کُرتا پاجامہ
پہن کے باہر آیا تو بٹھل چوکی پر جما بیٹھا حقہ گڑگڑا رہا تھا۔
زورا، چھلیا اور جمرو اُس کے ساتھ جُڑے بیٹھے تھے۔ اِس
کے علاوہ اڈے پر صرف چیدہ چیدہ افراد ہی موجود تھے۔ دروازہ
سختی سے بند تھا۔ شور مچاتے بیش تر افراد کو باہر دھکیل دیا گیا
تھا۔ چھلیا کے اِس فعل کی وجہ سمجھ آتی تھی۔ اُس نے بٹھل
زورا اور جمرو کو یہاں چھپا رکھا تھا۔ یقیناً اڈے میں انتہائی
بھروسے ہی کے آدمی موجود تھے۔ مجھے دیکھ کے زورا اور
جمرو ایک بار پھر بے تابی سے میری طرف اٹھ آئے اور بغل
گیر ہو گئے۔ بٹھل میری موجودگی سے لاتعلق بیٹھا چھلیا
سے گفتگو کر رہا تھا۔ اُس کے شکستہ حال چہرے پر زندگی کی
کچھ رمق پھریریاں لیتی صاف دکھ رہی تھی۔ دھیارا اور لنگو
بل بل کے بٹھل کے پاؤں گھوٹ رہے تھے۔

"تیرے پیچھے استاد تو گیا تھا لاڈلے... اب کیا ٹھٹھے
اُڑا رہا ہے۔" جمرو نے میرا پیٹ گدگداتے ہوئے کہا۔ وہ
خود بھی کھِلا جا رہا تھا۔

"ماں قسم لاڈلے! اکھا زندگی میں کسی کا ایسا کمتائی نہیں
پڑا۔ ابھی کل تک میرے کا خبر تھا۔ ابھی سالا ایک دم چاند کا
موافق تم ہمارے سامنے چمک رہا ہے۔ ایک دم سپنا ہے۔
لاڈلے ایک دم سپنا۔" زورا نے باقاعدہ آنکھیں پٹپٹا اپنی
انگلی دانتوں چبائی۔

تُو نے کل کا تماشا نہیں دیکھا لاڈلے؟" جمرو نے میرا
شوق اُبھارتے ہوئے کہا۔ بٹھل نے تو میری طرف نہ
دیکھنے کی گویا قسم کھائی تھی۔ سدا کی طرح بے پروائی کی چادر
اوڑھے بیٹھا تھا۔

"کیسا تماشا؟"

"چھلیا سے کل ہی پہلی میل ملاقات ہوئی تھی۔ چھلیا
نے استاد کو بھی تمھارے بارے میں بتایا کہ تم زندہ ہو تو یقین
کر لاڈلے استاد کو میں نے اپنی آنکھوں سے ناچتے ٹھمکے
لگاتے دیکھا۔ چھلیا کو بچوں کی طرح ہاتھوں پر اٹھا کے استاد
نے بڑی دیر تک پھرکنی دیا۔ ابھی صبح تک بیٹھے بیٹھے ہنس رہا
تھا۔" جمرو نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ "ابھی تیری
جان پہچان سے مکر رہا ہے۔"

میں مسکرا کے چپ ہو رہا، کیوں کہ مجھ سے زیادہ اُس کا
واقفِ حال کوئی اور نہ تھا۔ میں انھی کے بیچ جا بیٹھا۔ چھلیا
بٹھل کو میری چاقو زنی کے کرشمے بڑھا چڑھا کے بتا رہا تھا۔
بٹھل کلے بھر بھر کے دھواں کشید کرنے میں مگن دکھائی دیتا
تھا۔ تاہم وہ "ہوں ہاں" باقاعدگی سے کر رہا تھا۔ اب تک
مایا نظر نہیں آئی تھی۔ اطلاع کے بہ موجب اُسے ان کے
ساتھ ہونا تھا۔ میں نے اس سے متعلق استفسار غیر مناسب
سمجھا۔ میرے اندر خوب کھد بد مچی ہوئی تھی۔ میری طرح
ہی زورا اور جمرو بھی کچھ جاننے کے لیے بے چین تھے، مگر یہ
سب تنہائی کی دست یابی ہی پر منحصر تھا۔ میں نے اپنی گذشتنی
میں سے مولوی شفیق اور کورا کا تذکرہ حذف کر لیا تھا۔ سینے
سے باہر اچھلتے دل کو میں نے ہزار رسیوں میں جکڑ لیا تھا اور
یہ کوئی کارِ آساں نہیں تھا۔ انھیں بمبئی پہنچا کے چھپ
چھپاتے نکالا جا سکتا تھا۔ ایس پی کے بقول ریاست کی حدود
سے چڑیا کا بچہ بھی ان کی نظروں میں آئے بغیر نہیں نکل سکتا
تھا۔ مجھے کامل یقین تھا کہ اجیت جیسا بدماغ پولیس افسر
جاں فشانی سے بٹھل کی تلاش میں مصروف ہوگا۔ رگھو بوری
والا اور چھلیا کا حسنِ انتظام ستائش آفریں تھا، ورنہ کون سی
پولیس تھی جو اڈے پاڑوں کے شب و روز کے ایک ایک پل کی
جان کاری نہ رکھتی ہو! میری نگرانی پر مامور سادہ لباس والے
باہر یقینی طور پر موجود تھے۔ ان کے لیے بیدا چنبھے کی بات ہی
ہوگی کہ جلوس کے لیے اڈے کے دروازے بند کر دیے گئے
تھے، ورنہ اس وقت وہ بھی کسی گوشے میں دبکے کھڑے
ہوتے۔ ایک منچلا دوڑا ہوا آیا اور رگھو کے کان سے چپک
گیا۔ اُس کی بات سن کے رگھو نے بٹھل اور ہمیں اندر چلن
کے کھانے کی دعوت دی، جہاں دستر خوان چن دیا گیا تھا۔
بٹھل کے اشارے پر ایک شوخے نے حقہ اٹھا لیا۔ اندر ایک
کشادہ کمرے میں چاندنی بچھی تھی۔ اُس پر پیلے زرد ململ کا
دستر خوان۔ رگھو بوری والا نے شاید پورا دلواڑا یہاں لا کے
رکھ دیا تھا۔ نہ جانے کیا کیا الم غلم بھرا پڑا تھا۔ کھانے کے بعد
ٹھرے کی بوتلیں کھل گئیں۔ میرے احتراز پر خوب قہقہے
اڑے۔ بٹھل نے رسمِ محفل نبھائی تھی۔ اُس کے ہاتھ کا ایک
پوا چسکیوں پر چسکیوں کے باوجود کم نہ ہوتا تھا۔ باقی سب کا

ہاتھ بھی کچا کچا تھا، سوائے رگھو بوری والا کے۔ وہ بوتل پر بوتل پانی کی طرح چڑھا رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں چڑھتا نشہ کسی اور ہی ساخت کا تھا۔ جلا جلا اور بجھا بجھا۔

میں باہر آ گیا۔ مجھے یقین تھا کہ جمرو یا زورا میں سے کوئی ایک میرے پیچھے ضرور آئے گا۔ وہ دونوں ہی چلے آئے۔ بٹھل تو ایسے بیٹھ گیا تھا جیسے اب ساری زندگی یہیں رہے گا۔ بات بے بات کے ٹھٹوں سے صحن میں بھی مفر نہ تھا۔ میں نے زورا اور جمرو کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا، اور دائیں طرف سیڑھیاں چڑھ گیا۔ چھت پر کسی قسم کی تعمیر نہیں تھی، بس دو ہاتھ کی چار دیواری کر کے چھوڑ دی گئی تھی۔ اطراف کے مکانات زیادہ بلند تھے۔ دُور تک کہیں قندیلیں، کہیں قمقمے ٹمٹما رہے تھے۔ چھت کے وسط میں کھڑے ہو کے بھی گلیارا صاف نظر آتا تھا۔ ہوا ٹھنڈی چل رہی تھی، میں پاؤں پسار کے بیٹھ گیا۔ نیچے کے شور و غل سے چھت دھمکتی محسوس ہو رہی تھی۔ میں جمرو اور زورا سے تفصیل سننے کے لیے بے چین تھا۔ اُدھر بھی کچھ کم بے تابی نہ تھی، وہ لپکے چلے آئے تھے۔ ’’قسم سے، چاند چھت پر اتر آیا ہے۔‘‘ جمرو ناچتا ہُوا میری طرف آیا۔ وہ خوشی سے تھرک رہا تھا۔

زورا نے اُسے دھکیلتے ہوئے ہانک لگائی ’’ابھی چندرا وندرا کے بول پرانا ہو گئے ہیں۔ اپنا راجا ایک دم ہیرو ہے۔‘‘ زورا نے چھلانگ لگائی اور مجھ سے لپٹ کے لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ اوپر سے جمرو بھی آ پڑا۔ پھر تو بہت دیر تک دھما چوکڑی مچی۔ وہ مجھے گدگداتے رہے۔ آنکھیں مل مل کے دیکھتے رہے۔ حلق پھاڑ پھاڑ کے ٹھٹول کرتے رہے۔ آس پاس کئی دریچے وا ہو گئے تھے۔ چھتوں سے جھانکے پڑنے لگے، لیکن یہاں تو مدہوشی کا عالم تھا۔ آخر کافی دیر بعد جب پیوٹے پانی سے بھر گئے، زورا میری پیشانی چوم کے بولا، ’’تو اپن کے لیے مر گیا تھا لاڈلے۔ سالا سپنا لگتا ہے۔‘‘

’’تجھے جیتا دیکھ کے ابھی بھی بھروسا نہیں پڑتا۔‘‘ جمرو کی آواز گلوگیر ہو گئی۔

میری حالت بھی عجیب ہو رہی تھی۔ سینہ پھٹا جا رہا تھا۔ میں نے لپک کے جمرو کو کھینچ لیا۔ ’’جمرو بھائی! چھلیا نے مجھے آپ کے...‘‘ میری آواز رُندھ گئی۔ میں جملہ پورا نہ کر سکا۔

’’چھلیا بولا تھا، اُسے غلطی لگی تھی۔ وہ جمرو نہیں تھا لاڈلے۔‘‘ جمرو نے مجھے اَور زور سے بھینچا۔ اُس کی آواز بھرا رہی تھی۔

’’جمرو بھائی! آپ کو دیکھنا نظروں کا دھوکا لگتا ہے۔ میری وجہ سے آپ لوگ مصیبت میں مبتلا ہیں۔‘‘

’’لاڈلے! جی کرتا ہے تیری زبان گدی سے کھینچ لوں...‘‘ جمرو نے ایک جھٹکے سے الگ ہوتے ہوئے کہا۔ ’’ابھی سالہ بالشیا ترازو کر دیتا۔ ایسا نہ بولتا۔ ہم تیرے کچھ نہیں لگتے؟‘‘ وہ یک دم غصّے سے لال بھبوکا ہو گیا۔ میں کیا جواب دیتا۔ کیا اشک شوئی کرتا، میری بات بھلا اُنھیں کیسے سمجھ آتی۔ یہ بھی ٹھیک ہی کہتے تھے۔ میں خاموشی سے اُنھیں دیکھا کیا۔

’’اپن تیری وجہ سے مشکل میں نہیں ہے راجا۔ اپنا زندگی تیرے سے زیادہ کوئی نہیں مانگا اور تُو ایسا بولتا ہے؟‘‘ زورا نے بھنچی ہوئی آواز میں کہا۔ پھر اُس نے چشم زدن میں ڈولتے ہوئے چاقو نکالا اور بائیں بازو پہ ایک لکیر کھینچ دی۔ اس سے پہلے کہ میں اُسے روکتا، وہ چاقو بائیں ہاتھ کی طرف لوٹا چکا تھا، اور دائیں ہاتھ پر بھی لکیر کھینچ چکی تھی۔ دریچوں سے ابھرتی ہوئی نسوانی سسکیاں واضح طور پر سنائی دی تھیں۔

’’ابھی دوبارہ ایسا بولا تو کھرونچا دل پر پڑے گا راجا! طعنہ سننے کو زندہ نہیں رہے گا اپن۔‘‘ زورا کے دونوں بازو سرخ ہو گئے تھے اور انگلیوں سے خون ٹپا ٹپ چھت پر گرنے لگا۔ چاقو وہ پہلے ہی گرا چکا تھا۔

پھر نہ جانے مجھے کیا ہُوا۔ میں نے مچل کے زورا کا گریبان پکڑ لیا۔ ’’زورا بھائی! کیا سمجھتے ہو آپ لوگ مجھے! میں انسان نہیں ہوں؟ میرے سینے میں دل نہیں ہے، پتھر ہے؟ آپ کے ایسا کرنے سے میں بہت خوش ہو گیا ہوں؟ میری چھاتی فخر سے پھول گئی ہے کہ ایسے ایسے میرے جاں نثار ہیں! یہی سمجھتے ہیں نا آپ؟ آپ لوگ مجھے تکلیف میں نہیں دیکھ سکتے، کیوں کہ آپ مجھے اپنا سمجھتے ہیں، مجھے بے پناہ چاہتے ہیں، میرے پسینے پر اپنا لہو نچھاور کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں، اس لیے کہ آپ کے سینے میں ایک دل ہے۔ کبھی یہ بھی سوچ کے دیکھیں کہ میں بھی آپ سے محبت رکھتا ہوں۔ آپ کی تکلیف پر تڑپ سکتا ہوں۔ زورا بھائی! میں بھی اتنا ہی انسان ہوں جتنے آپ ہیں، جتنے جمرو بھائی

ہیں۔ جتنا بٹھل ہے۔‘‘ میں نے سسکتے ہوئے زورا کا گریبان بری طرح جھنجھوڑ ڈالا تھا۔

’’راجا!‘‘ زورا کے ہونٹ بس لرز رہے تھے۔

جمرو نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا۔ اُس کی کپکپاہٹ میرے وجود میں اترنے لگی۔ کبھی کبھی سامنے کا دکھائی نہیں پڑتا۔ ہم تینوں ایک بار پھر ایک دوسرے میں پیوست ہو گئے۔ گویا غم بھی مدغم ہو گئے۔

’’ہائے دیّا! کھون!‘‘ کسی دریچے سے ایک کھنکناتی ہوئی نوخیز آواز آئی۔

چاندنی کے اجالے میں سب اڑوس پڑوس چھت کے منظر کو آنکھیں پھاڑے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ کھڑکیوں کی آڑ سے، طاقچوں میں آنکھ لگائے، منڈیروں کے پیچھے دبکے ہوئے۔ مجال ہے کہ بہ غور دیکھے پر بھی کوئی نظر آ جائے۔ معاً سیڑھیاں قدموں کی دھمک سے گونجنے لگیں۔ میں نے گھبرا کے دیکھا تو سب سے پہلے بٹھل چھت پر قدم رکھتا نظر آیا۔ اُس کے پیچھے چھلیا، رگھو اور بہت سارے لوگ۔ میں سمجھ گیا تھا کہ یہ تاکا جھانکی کرنے والوں ہی کی کارستانی تھی۔ مرچ مسالے کے ساتھ اڈّے کے دروازے تک چھت کا احوال پہنچنا ہی تھا۔ ممکن تھا کہ خبر میں ایک آدھ قتل بھی شامل ہو گیا ہو۔ زورا کے بازو سے کافی خون بہہ گیا تھا۔ جمرو اور میری قمیص بھی سرخ دھبّوں سے پٹ گئی تھی۔ بٹھل کے لیے یہاں کی کارگزاری سمجھنا چنداں دشوار نہ تھا۔ اُس نے تو پہلی نظر میں منظر پی لیا ہوگا۔ وہ بھنبھناتا ہُوا آیا۔ ’’ادھری تو نَٹکی کا دھندا کر لو۔ بہت چلے گا رے۔ ایک توشہ دو براتی۔‘‘ بٹھل نے اِرد گرد سے جھانکتے ہوؤں کو یقیناً تاڑ لیا تھا۔

مجھے یوں محسوس ہُوا جیسے کسی نے غسل کرتے ہوئے پردہ کھینچ لیا ہو۔ پورا اڈّا چھت پر اُمڈ آیا تھا۔

’’ابھی سب کھیر ہے نا سوامی جی!‘‘ چھلیا نے حیران پریشان ہوتے ہوئے کہا۔ ہم تینوں کے لباس خون آلود تھے۔ یہ اندازہ کرنا ممکن نہیں تھا کہ صرف زورا ہی زخمی ہے۔

’’ہاں، سب خیریت ہے چھلیا! زورا نے میرے ملنے پر قسم اٹھائی تھی، وہ پوری کی ہے۔‘‘ میں نے بٹھل سے نظریں کھسکاتے ہوئے بات بنائی۔ وہ کھا جانے والی نظروں سے مجھے گھور رہا تھا۔

’’اس کی ماں کا یار ملا دکھتا ہے حرامی! ٹھکانے سے پہنچ گئی تیری قسمیا۔ باہر پھولوں کے ہار لیے بیٹھے ہیں نہ وہ حرام کے جنے!‘‘ بٹھل نے پھرتے ہوئے زورا کے کندھے پر ہاتھ مارا۔

میں نے تو چھلیا اور رگھو کے لیے بات بنائی تھی، ورنہ وہ اسے ہمارا باہمی جھگڑا گردانتے، لیکن بھرے میں بٹھل بھی آ گیا تھا۔

’’تُو بھی کندھے چڑھ جا۔ ادھری دم ہے دو چار کا اور بوجھا اٹھانے کا...‘‘ بٹھل نے زورا کے بازو سے خون کا تیز رساؤ محسوس کر لیا تھا۔ ’’اور تو نے مارنے کی قسم اٹھائی ہے۔ سُور نے آج ہی پیٹ میں کچھ ٹھونسا تھا۔ کلیجے کو کچھ تو بنانے دیتا رے۔‘‘ بٹھل نے بیک وقت مجھے اور زورا کو مخاطب کیا تھا۔

میرے حرکت میں آنے سے پہلے جمرو زورا کی قمیص کھینچ کر اتار چکا تھا۔

’’چھلیا تیرے کھونٹے سے نہیں بندھے؟‘‘ بٹھل اب چھلیا کی اور پلٹ پڑا تھا۔ وہ غصّے سے باؤلا ہو رہا تھا۔ چھلیا گڑبڑا گیا۔ بٹھل کا اشارہ وہ کچھ تاخیر سے سمجھا۔ رگھو فوراً چلّا کے بولا، ’’کھڑے دوں تمھاری میّا ناچ رہی ہے کیا۔ جاؤ اپنے ٹھکانے سے لگو... اوئے، اُدھر مرنے کا ہے۔‘‘

’’استاد! اُچّو بکسا لینے جانے کا ہے۔‘‘ جاتے ہوؤں میں

’’تم اپنے آپ کو مجھ سے بہتر سمجھتے ہو، ہے نا؟‘‘

سے کسی نے جواب دیا۔

رگھو کے چلانے پر سب ہڑبڑا کے نیچے اتر گئے۔ اُس لمحے ایک پستہ قد چھوٹی سی صندوقچی لیے دوڑتا چلا آیا۔ اُس کا جسم ٹھوس اور گٹھا ہُوا تھا۔ اُس کی ناک چپٹی اور رنگت توے کی طرح سیاہ تھی، جب کہ سر پر زرد رنگ کا پھندنے والا رومال لپٹا ہُوا تھا۔ اڈوں میں جراحت کے لیے کوئی ایک آدھا ضرور مخصوص ہوتا ہے۔ بعض اوقات یہ جراح زخم سینے کے ہنر میں بھی طاق ہوتے ہیں۔ زخم کے معاملے میں آخری حد تک ڈاکٹر کے پاس یا اسپتال جانے سے گریز کیا جاتا ہے۔ زورا نے کمالِ صفائی سے چاقو چلایا تھا۔ زخم کی دھار کندھے کے قریب سے سیدھی کلائی تک چلی آئی تھی۔ اُس نے دانستہ زخم گہرا لگانے سے گریز کیا تھا۔ بھٹل بھن بھن کرتا واپس چلا گیا تھا۔ جاتے جاتے چھلیا سے کہہ گیا تھا کہ ان کے بستر الگ الگ جگہ لگواتے ہیں، ورنہ یہ سونے کے نہیں۔ لجو اپنے فن میں طاق تھا۔ زخم کا معائنہ کرتے ہی بولا ”ابھی چاقو کس نے چلایا ہے؟ اس کو چومنے کا ہے۔“

استاد! ابھی تم پٹی کر دو بس!“ جمرو بولا۔

”ایسا برابر لکیر پھٹا رکھ کے کھینچنے کا ہے... نہ کم نہ جیادہ، نہ اندر نہ باہر...“ لجو کی آنکھوں میں ستائش تھی۔ ”ماں قسم! اپُن پنچارا پھیرنے کا ہے۔“

اُسے کام کی شُد بُد خوب لگتی تھی۔ صندوقچی میں رکھی شیشیاں اور ڈبیاں سب انگریزی تھیں۔ میں حیران ہو رہا تھا۔ لجو نے قاعدے کے مطابق جراثیم کش پانی سے جب زخم صاف کیا تو میں چپ نہ رہ سکا۔ ”یہ کیا ہے؟“

”ابھی سپھائی کرنے کا ہے۔ استاد اپن کو کیڑے آج تک دکھائی نہیں دینے کا ہے۔ پر ڈاکٹر نے بولا کہ زخم کھلنے کا ساتھ ہی چھوٹا چھوٹا کیڑا اس میں بھرنے کا ہے۔ ابھی سب کیڑا مر گیا۔“ لجو نے اٹک اٹک کے وضاحت کی۔ ڈاکٹر کے تذکرے سے معاملہ سمجھ آ گیا تھا۔ لجو کے ہاتھ زبان کے برعکس خاصے تیز اور مہارت سے چل رہے تھے۔ اُس نے لال دوائی کا پھویا بھر بھر کے زخم پر رکھا۔ پٹی باندھنے کے مرحلے پر زورا نے پس و پیش سے کام لیا، مگر میرے اور جمرو کے اصرار پر اُس نے پٹی لپٹوا لی۔ لال دوائی کے لگاتے ہی خون کا رساؤ مکمل رک چکا تھا۔ میں نے لجو کو کچھ دینے کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالے تو جیب میں پھوٹی کوڑی نہ تھی۔ میرا ہاتھ وہیں اٹک گیا۔ لجو اور جمرو نے بہ یک وقت معاملہ فہمی کا مظاہرہ کیا۔ جمرو نے پیسوں کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالا اور لجو نے لجاجت سے آواز نکالی۔ ”اپنا ٹھکانا رگھو استاد کے ساتھ ہی ہے۔ ایسے بڑھیا جخم کی سیوا کا نجرانہ ابھی اپنی طرف بنتا ہے۔ شرمندہ نہ کرنے کا ہے استاد!“

مجھے ندامت محسوس ہوئی۔ بھلا یہاں کے نرالے طور طریقے مجھ سے بہتر کون جان سکتا تھا۔ جمرو کا ہاتھ بھی جیب سے خالی ہی لوٹا، مگر اس دوران چھلیا پلٹ آیا۔ اُس نے لجو کی کمر پر لات جماری۔ ”کنجری کی اولاد! حرام کھور! ادھر دہاڑی لگانے کا ہے۔“

”ارے نہیں نہیں چھلیا استاد! ہم ہی اِسے کچھ دینے کی کوشش کر رہے تھے اور یہ نہ لینے کے لیے ہماری منت سماجت کر رہا تھا۔“ میں نے مداخلت ضروری سمجھی تھی۔

چھلیا نے ناقابلِ یقین انداز سے میری طرف دیکھا، پھر جیسے بادلِ ناخواستہ میرا بیان درست مان لیا۔ ”سوامی جی! ابھی استاد بڑی گرمی کھانے کا ہے۔ آپ لوگوں کو بستر پر پہنچانے کا ہے۔“

ہم چھلیا کے ساتھ اتر آئے۔ بھٹل کسی خاص وجہ سے ہی ہمیں سونے پر مجبور کر رہا تھا۔ شاید اُس کا صبح دم یہاں سے کوچ کا ارادہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ میں زورا اور جمرو سے پوری داستان سننے کے لیے اتاولا ہو رہا ہوں گا۔ اِس خیال کاری میں رات آنکھوں میں کٹ جاتی تو کوئی بڑی بات نہیں تھی۔

”من موہنا ہے۔“

”ہا! چھیل چھبیلا۔“

”وہ جا رہا ہے۔“

”ہائے۔“

پڑوس کے بائیں چوبارے کی نسوانی سرگوشیاں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ ہم نیچے اتر آئے۔ پیچھے مترنم اور شوخ ساز دھیرے سے مسکرائے تھے۔ بھٹل سامنے غصے میں بھرا پھونکیں مار رہا تھا۔ حقے کی گڑگڑ ضرورت سے زیادہ تیز تھی۔ اُسے دیکھ کر خود بہ خود میرا مسکرانے کو جی چاہا۔ اُس نے بھی میری شکل پڑھ لی تھی، مگر اَن جان بن گیا اور مُنہ دوسری

طرف پھیر لیا۔ چھلیا نے مجھے رگھو کے حوالے کیا اور خود دائی طرف زورا اور جمرو کو لے کر بڑھ گیا۔ دالان سے کمروں کی طرف جاتے ہوئے میں نے بھٹل کی آواز سنی۔ وہ زورا کو پکار رہا تھا۔ بھٹل میں اب دم خم کہاں رہا تھا۔ بس ایک تصویر تھی، شکستہ حالی اور ویرانی کی۔

رگھو نشے میں سنسنایا ہُوا اچھل رہا تھا۔ وہ زینے کے نیچے سے نکل کے ایک تنگ راہداری میں گھسا۔ وہ چھریرے اور تراشیدہ جسم کا مالک تھا۔ کسی لڑکی طرف سے اُسے مسترد کرنے کی ایک ہی وجہ ہوسکتی تھی کہ وہ اڈے پاڑے کا آدمی تھا۔ اُس سے اب تک براہِ راست میری کوئی خاص بات نہیں ہوئی تھی۔ میں خاموشی سے اُس کے پیچھے چلتا رہا۔ اڈے کی عمارت خاصی وسیع و عریض تھی۔ ایک دروازے پر رُک کر اُس نے جیب سے چابی نکالی! اور میری طرف مڑے بغیر بولا ”بابر بھائی! ابھی آپ میرے کمرے میں رہو۔ اُدھر ستھرائی نہیں ہوگی۔“ اُس نے تالا کنڈی سے نکال کے دروازہ کھول دیا۔ وہ میرے لیے راستہ چھوڑ کے ایک طرف ہٹ گیا۔ کمرا دیکھ کے حیرت سے میری آنکھیں پھیلتی گئیں۔ وہ اڈے کا کمرا نہیں تھا، بلکہ اُس کا تعلق تو کسی راجا کے محل سے تھا۔ دیواریں سرخ مخملیں پردوں سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ ان پر اطلسی کام کے بیل بوٹے کڑھے تھے۔ فرش پر قالین ایسا کہ پاؤں دھنستے تھے۔ چھت کے انتہائی وسط میں ایک پنکھا ساکت تھا۔ چارپائی پر کم خواب کا گدا اور گلابی مخملیں غلاف چڑھا تکیہ تھا۔ دیواروں کے ساتھ بانس کی کھپچیوں سے بنے نازک موڑھے جن کی گولائیوں پر شیشے کی گیندیں جھول رہی تھیں۔ رگھو نے ایک ڈوری کھینچی جو دروازے کے ساتھ ہی نیچے تک چلی آئی تھی۔ پنکھا ٹھمک ٹھمک کے چل پڑا۔ اڈے پاڑے میں بجلی کا پنکھا میں نے پہلی مرتبہ ہی دیکھا تھا۔ رگھو ڈوری کھینچتے ہی سیدھا افقی دیوار کی جانب گیا۔ وہ سنگھاسن ہی تھا، جس پر ایک لجائی ہوئی حسینہ کی قدِ آدم مورتی رقص کر رہی تھی۔ رگھو نے اُسے جھک کے پرنام کیا۔ وہ بلاشبہ لکشمی تھی۔ وہی نین نقش، وہی قد کاٹھ، وہی اٹکھیلیاں کرتی زلفیں۔ وہی شربتی رنگت، وہی بدن کے دل نشین نشیب و فراز۔ لکشمی کو سامنے بٹھائے بنا وہ مورتی تراشنا ناممکن تھا۔ رگھو بہت دیر تک ہاتھ جوڑے سر جھکائے کھڑا رہا۔ میں ایک موڑھے پر بیٹھ گیا۔ چندن کی دھیمی دھیمی خوش بُو نے ماحول رومان پرور بنا رکھا تھا۔ میں نے ناقدانہ نظروں سے کئی بار جائزہ لیا، مگر کوئی عطردان یا خوش بُو کا ماخذ دکھائی نہیں دیا۔ رگھو آچاریوں کی طرح ہاتھ جوڑے کوئی پاٹھ پڑھتا رہا۔ کمرے کے تمام خدوخال مجھے ازبر ہو چلے تھے اور اب بے زاری سی ہونے لگی تھی۔ رگھو مجھے کمرے میں لا کے بھول گیا تھا، لیکن نہ جانے کیوں مجھے اُس کا استغنا مصنوعی معلوم نہیں ہُوا۔ وہ آپے میں نہیں تھا۔ وہ دن بھر اڈے پر مصروف رہا، لیکن وہ وہاں تھا ہی نہیں۔ مجھے لکشمی یاد آئی۔ واقعی وہ حسن و جمال میں یگانہ تھی۔ کسی بھی فرزانے کو دیوانہ کرنے کے کمال سے متصف۔

بہت دیر بعد رگھو کی پرارتھنا ختم ہوئی۔ وہ پلٹتے ہی بولا۔ اُس کا لہجہ صاف تھا۔ ”بابر بھائی! لکشمی دیوی کے بعد آپ پہلے آدمی اس پوتر استھان میں داخل ہوئے ہو۔“ رگھو کی آواز سوز سے بوجھل تھی۔ وہ بہت بڑی بات کہہ گیا تھا۔ ایسا فراخ دل بے حد تعلیم یافتہ ہندو ہی ہوسکتا تھا۔ وہ خاموش نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

”رات ہی گزارنی ہے۔ کسی اَور کمرے میں گزار لوں گا، صفائی ستھرائی کا تمھیں اندازہ ہونا چاہیے۔“ میری زبان من بھر کی ہو رہی تھی۔ خجالت سے جسم گرا جاتا تھا۔

”نہیں نہیں، ایسی بات نہیں ہے بابر بھائی! میں اپنی چاہت سے آپ کو یہاں لے کر آیا ہوں۔“ وہ بے چین ہو کے میری راہ میں کھڑا ہو گیا۔

”لیکن مجھے اچھا نہیں لگا۔“ میں نے نظریں کچھ اَور جھکاتے ہوئے کہا۔ اُس کی اس کمرے سے وابستگی، دھرم کے وچار، مورتی کا حجاب، اس کے آتشیں جذبات، سبھی کچھ تو مانع تھا میرے یہاں آنے میں مگر وہ پھر بھی لایا تھا۔ نہ جانے کیوں۔

”بابر بھائی! جب آپ پہلی مرتبہ دکھائی پڑے تھے، تبھی یہاں بڑی ہلچل مچی تھی...“ رگھو نے دل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ”بابر بھائی! بہت اپنے اپنے لگتے ہو! معلوم نہیں کیوں لگتے ہو، پر سچ مانیں کچھ ہے جو مجھے آپ کی طرف دھکا دیتا ہے۔ استاد نے بول دیا، ورنہ میں خود موقع ڈھونڈ رہا تھا کہ

آپ سے کہوں، آپ کچھ وقت مجھے دیں۔"

"میرے لیے حیرت کی بات ہے، مگر یہ بتاؤ کہ تم پریشان کیوں لگتے ہو؟"

"ابھی آپ اِدھر بیٹھیں، پھر سوال کریں۔" رگھو نے مجھے ہاتھ سے کھینچ کے چارپائی پر بٹھا دیا۔ خود چشم زدن میں نیچے بیٹھ گیا۔

"ارے نہیں نہیں۔ ادھر، اوپر بیٹھو۔ شرم سار نہ کرو۔" میں جس طرح بیٹھا تھا، اسی طرح کھڑا ہو گیا۔

"بابر بھائی! آپ استاد ہیں۔ بڑے کلاکار ہیں۔ چھلیا استاد تو آپ کو دیوتاؤں کے سنگھاسن پر بتاتا ہے۔"

رگھو نے میرے پیر چھونے کی کوشش کی۔ مجھے اِس منصب داری سے چڑ ہونے لگی تھی۔ کبھی تو ایسی عزت اور کبھی یہ حال کہ بول و براز کے ساتھ کال کوٹھڑیوں میں عزلت نشینی۔ میں نے رگھو کی ایک نہ چلنے دی۔ اُس کے ساتھ قالین پر بیٹھ گیا۔

"یہ اچھی بات نہیں ہے۔" رگھو شاکی ہو کے بولا۔

"چھوڑو اچھی یا بری بات کو۔ یہ سب کیا ہے، یہ کمرا، اڈّا اور تم؟"

"بابر بھائی! یہ اڈّا میرا بدن ہے۔ یہ کمرا میرا دل... اور اپنے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔" رگھو نے دھیرے سے مسکرا کے کہا۔ میں اُس کے اِس فلسفیانہ طرزِ استدلال پر حیران ہی رہ گیا۔ وہ تو ہر لمحے مجھے چونکا رہا تھا۔

"تمھاری تعلیم کتنی ہے؟"

"جونا گڑھ سے بی اے پاس کیا تھا۔"

"اوہ! پھر یہاں، یہ سب؟"

"یہ لمبی داستان ہے بابر بھائی! رات بہت چھوٹی، پھر کبھی۔" رگھو کی آنکھوں میں دیے جلتے بجھنے لگے تھے۔

"یہ مورتی لکشمی دیوی کی نہیں لگتی!" میں نے دانستہ اُس کی دُکھتی رگ پر ہاتھ رکھا۔

"ستیا ماں کی قسم! یہ لکشمی ہی ہے۔ لکشمی دیوی!" رگھو یک دم طیش میں آ گیا۔

"کسی سچے سنگ تراش کا کمال ہے۔"

"میں نے تراشی ہے!" رگھو نے جواب دے کر مجھے اچھلنے پر مجبور کر دیا۔

میں بے اختیار ہو کے اٹھ کھڑا ہوا۔ ایک غیر مرئی قوت مجھے سحر زدہ کیسے مورتی کے قریب لے گیا۔ انگ انگ شاہکار خالق کی گواہی دے رہا تھا۔ میرے دل میں کہیں یہ خواہش مچلی کہ کاش لکشمی ایک بار خود کو مجسم دیکھ لے۔ سبھی کچھ ہار جائے گی۔

"کتنا عرصہ لگا؟" میں نے رگھو سے پوچھا۔ میں واپس آ بیٹھا تھا۔

"چھ مہینے تو لگے ہی تھے۔" رگھو کے چہرے پر کچھ بشاشت نمودار ہو رہی تھی۔

"تم اعلا پائے کے سنگ تراش ہو۔ کیسے اور کس سے سیکھا؟"

"چھتیل بابو سے۔ ہائی اسکول میں استاد تھے۔ اب بھی ہیں۔ ہمارے پڑوس میں رہتے تھے، وہ وہیں رہتے ہیں۔ پر ہمارا گھر وہاں نہیں ہے۔" رگھو کی آواز جیسے منجدھار میں ڈوبنے لگی تھی۔

میں نے خاموشی سے اُس کی طرف دیکھنا ہی مناسب سمجھا۔ وہ کچھ دیر سوچتا رہا، پھر کسی خود کار آلے کی طرح بولتا چلا گیا کہ میری ماں کا احمد آباد میں بڑا نام تھا۔ جتنا بڑا نام ہندستان میں کسی پیشوا کا ہو سکتا تھا، اس سے بڑا نام میری ماں کا احمد آباد میں تھا۔ شوبھا بائی۔ وہ ساتویں دن گھنگرو باندھتی تھی۔ تب سب چوبارے بند ہو جاتے۔ بمبئی کے بہت بڑے صنعت کار مدن لال تک شوبھا بائی کے گھنگروؤں کی جھنکار پہنچی تو وہ احمد آباد دوڑا چلا آیا، اور جب شوبھا بائی کے اعضا کی شاعری دیکھی تو سبھی کچھ ہار بیٹھا۔ اُدھیڑ عمر کالے کلوٹے مدن لعل نے مُنہ مانگی بولی دے کر شوبھائی بائی کو چھڑوا لیا۔ اُس کا دلواڑا شہر میں آنا جانا رہتا تھا، کیوں کہ اُس کی ایک مِل وہاں بھی تھی۔ شوبھا بائی کو دلواڑا میں مکان لے دیا۔ اپنے قابلِ اعتماد نوکروں کا جوڑا شوبھا بائی کی خدمت اور نگرانی کے لیے وہاں چھوڑ دیا۔ شوبھا بائی کو اگرچہ مدن لعل پسند نہیں تھا، لیکن اُسے چار دیواری کی زندگی بھلی لگی۔ جب اُس کا پاؤں بھاری ہُوا تو اُس نے مدن لعل کو نہیں بتایا۔ آخر کب تک! مدن لال کو معلوم ہوا اُس نے سر پیٹ لیا، مگر بہت دیر ہو چکی تھی۔ شوبھا بیٹا پا کر ساری دنیا سے بیگانی ہو گئی۔ اُدھر مدن لعل بھی بیٹے کو دیکھ کے پسیج گیا۔ کنڈلی بنوائی۔ جیون لعل نام تجویز ہُوا۔ جیون لعل بہت بھاگوان ثابت ہُوا۔ مدن لعل کا کاروبار اَور پھیل گیا۔ آمدن دُگنی ہو گئی۔ اُدھر مدن لعل کا دل بھی جیون لعل میں اٹکا رہتا۔ جیون لعل کی تعلیم کی خاطر شوبھا جونا گڑھ اٹھ آئی۔ سوامی اسکول میں داخلہ کروایا۔ جیون لعل نے جب دسویں پاس کی تو ایک اندوہ ناک خبر اُس کے پیچھے آئی۔ مدن لعل رات اچھا بھلا سویا تھا، مگر صبح اپنے بستر پر مردہ پایا گیا۔ مدن لعل کے مرنے کی اطلاع شوبھا کے پاس قریب مہینے بعد آئی تھی۔ وہ بولائی ہوئی بمبئی پہنچی۔ مدن لعل کے خاندان نے اُسے دھکے دے کر نکال دیا۔ اُس کے بیٹے اپنے باپ کی کسی دوسری بیوی سے واقف نہ تھے۔ جیون لعل کا نام سُن کے تو وہ جتھے سے اُکھڑ گئے۔ شوبھا نے کچہری کر لی، مگر ان جھمیلوں سے واقف نہ تھی۔ وکیلوں کو پیسے وہ دیتی، مگر وکیل دم مدن لعل کے بیٹوں کا بھرتے۔ آخر تھک ہار کے جونا گڑھ جا بیٹھی۔ سال بھر جمع پونجی سے گزر بسر ہوتی رہی... مگر کب تک! جیون لعل کے تربیتی اخراجات نوابوں سے کم نہ تھے۔ شوبھا چند دن ہی غربت کے گزار سکی۔ وہ بیٹے پر اُٹھنے والے اخراجات میں کسی طور کمی کرنے پر آمادہ نہ ہوئی۔ ابھی آتش جوان تھا۔ اُس نے راتیں رنگین شروع کر دیں۔ امرا شرفا پچھلے پہر خاموشی سے آتے اور خاموشی سے چلے جاتے۔ مدن لعل سے کچھ بھی چھپا نہ رہا تھا۔ وہ چودھویں پاس کر کے اب گھر میں پتھروں کی تراش سے وقت گزاری کرتا۔ اُس نے کلکٹری کے لیے درخواست دے دی تھی۔ جیون لعل ماں کے لچھن جانتا تو تھا، مگر سب کچھ واضح نہ تھا۔ وہ اسے بتاتی تھی کہ اُس کے باپ کا دیا سونا توڑ توڑ کے گاڑی چلا رہی ہے، لیکن ایک دن ہونی ہو کے رہ گئی۔ اُس نے ماں کو سیٹھ گردھاری چند کے ساتھ بستر پر پڑے دیکھ لیا تھا۔ شوبھا کو زخم کاری پڑا تھا۔ وہ وہیں مر گئی، البتہ گردھاری کو اسپتال والوں نے بچا لیا۔ جیون لعل بھاگ کے دلواڑا چلا آیا۔ یہاں اُسے چھلیا مل گیا۔ چھلیا نے اُسے پورے دو سال اڈّے پر چھپائے رکھا۔ آخر پولیس بھی اُسے بھول بھال گئی۔ پرچہ داخلِ دفتر کر دیا گیا۔ ان دو سالوں میں چھلیا نے اپنا سارا فن اُس کی ہتھیلی پر رکھ دیا تھا۔ اِدھر جیون لعل پیدائشی فن کار تھا۔ استاد کو پیچھے چھوڑ گیا۔ چھلیا اُسے اولاد کی طرح رکھتا تھا، پھر ایک دن چھلیا اپنا چاقو چوکی پر رکھ کے کھڑا ہو گیا۔ اُس کی برہمی کے باوجود جیون لعل نے چھلیا کا چاقو اٹھا لیا۔ دو ایک شوخ طنطنا کے اٹھے تھے کہ کل کا چھوکرا ہے، لیکن جیون لعل نے اس تیزی سے اُنھیں بٹھایا کہ اُس کا نام ہی رگھو پڑ گیا، جب کہ شہر کی ایک مشہور شخصیت سیٹھ رگھو پوری والا سے رگھو کی عرفیت کیا ملی، لوگوں نے اُسے بھی رگھو پوری والا کہنا شروع کر دیا، حالاں کہ پوری والا خاندان سے اُس کا دُور دُور تک کوئی رشتہ نہیں تھا۔ چھلیا احمد آباد چلا گیا۔ وہاں سے بمبئی، پھر وہاں سے ماتا ورو۔ آخر گر کے مضافات میں گوشہ نشین ہو گیا۔ رگھو کا نام اُس وقت دور تک سنا گیا جب اُس نے دلواڑے کے تمام بالا خانے بند کروا دیے۔ شرفا میں کھلبلی مچ گئی۔ آخر چھلیا نے معاملہ نبٹایا۔ اُس کی مداخلت پر رگھو چپ کر گیا۔ اُس کی زندگی سیدھی سادی ڈگر پر چلنے لگی، پھر ایک دن سیٹھ راج پٹیل نے اپنی لڑکی کا معاملہ اُس کے سپرد کیا۔ لکشمی فیکٹری کے معمولی ملازم قاسم میمن پر فریفتہ ہو گئی تھی۔ رگھو نے قاسم میمن کو دھمکایا تو اُس نے رقم کا تقاضا کر دیا۔ اس قضیے کے دوران رگھو کئی مرتبہ لکشمی سے بالمشافہ مل چکا تھا۔ اس چھیل چھبیلی حسینہ کی کج ادائیاں اُسے گھائل کر رہی تھیں۔ رگھو بھی بات بے بات سیٹھ راج پٹیل کی کوٹھی کے چکر لگانے لگا۔ اُس نے لکشمی کو متنفر کرنے کے لیے بتایا کہ قاسم میمن دام مانگ رہا ہے تو لکشمی نے اِٹھلا کے کہا کہ وہ بھی دل بستگی کو کھیل تماشا کر رہی تھی۔ اِٹھلانے کو تو وہ اِٹھلا گئی تھی، مگر رگھو کا قرار لوٹ لے گئی۔ رگھو نے براہ راست راج پٹیل سے لکشمی کا ہاتھ مانگ لیا، مگر راج پٹیل نے یہ کہہ کر جھٹک دیا کہ اس سے اچھا تو قاسم پٹیل تھا۔ راج

پٹیل کو اپنی مل کا گھمنڈ تھا۔ رگھو نے بھی مل لگانے کی ٹھان لی۔ چھلیا کے علاوہ کوئی نہیں مانتا تھا کہ رگھو ایک تعلیم یافتہ نوجوان ہے۔ اس کے لیے اُسے کثیر سرمایہ درکار تھا۔ اُس نے پہلی مرتبہ اپنے باپ کی جائیداد میں سے حصہ مانگنے کی سوچی۔ وہ سیدھا جمبئی پہنچ گیا۔ اُس کی ماں ایک اَن پڑھ اور کم زور عورت ہونے کے ناتے ڈرڈ یک کے بیٹھ گئی تھی۔ رگھو نے کاغذ ٹٹولے تو بے شمار ثبوت اُس کے ہاتھ لگ گئے۔ تعلیم، طاقت اور سچ کی سہ آتشہ قوت نے اُس کے سوتیلے بیٹوں کو سر جھکانے پر مجبور کر دیا۔ اُس کے حصے میں چھتیس لاکھ کی خطیر رقم آئی۔ دینے کو رقم تو اُسے دے دی گئی تھی، مگر وہ سانپ کی طرح پھنکار رہے تھے۔ رگھو کا کام دھندا بھی اُن سے چھپا نہیں رہا تھا۔ وہ اصل سے کہیں کم حصہ لے گیا تھا۔ وہ بازی پلٹ سکتا تھا۔ ادھر رگھو نے دلواڑے میں مل کی بنا ڈال دی تھی۔ فیکٹری بہت تیزی سے تکمیل کے مراحل میں تھی کہ ڈکیتی کے دو مختلف مقدمات میں سورت اور ممبئی کی پولیس اُس کے وارنٹ لے کر پہنچ گئی۔ دلواڑے میں مشہور ہوگیا کہ رگھو ڈاکا مار کے فیکٹری بنا رہا ہے۔ رگھو کے سوتیلے بھائیوں نے پولیس کی ملی بھگت سے یہ ڈراما رچایا تھا۔ سورت کی ڈکیتی کے ساتھ ایک قتل بھی تھا۔ پھانسی نہ سہی، عمر قید ضرور ہوتی، مگر رگھو نے اپنے وکیل کے ساتھ مل کے جھوٹے مقدمے کے پرخچے اُڑا دیے۔ خوش قسمتی اُس کے ساتھ تھی۔ واردات کے اصل مجرم کلکتہ میں گرفتار ہوگئے۔ اُنھوں نے سورت کی ڈکیتی اور قتل بھی قبول لیا اور یوں رگھو صاف بچ آیا۔ ادھر دلواڑا میں سب تیا پانچ ہو رہا تھا۔ لکشمی کی سگائی تھی۔ رگھو اب زندگی سے بے زار ہو چکا تھا۔ اُس نے لکشمی کے متوقع پتی وشنو پٹیل کو علی الاعلان قتل کرنے کی بات کہہ دی۔ وشنو پٹیل پیچھے ہٹ گیا۔ حالات واقعات اُسے جس قدر لکشمی سے دُور کرتے رہے، اسی قدر لکشمی اُس کے نزدیک ہوتی رہی۔ اُس کی مانگ شدید محبت اور پھر جنون میں ڈھل گئی، پھر ایک دن لکشمی نے بھرے بازار میں رگھو پر تھوک دیا اور چیخ چیخ کے کہا کہ وہ بھنگی چمار سے شادی کرے گی، مگر رگھو سے نہیں۔ ایسا کبھی ہوا تو زہر کھا مرے گی۔ تب سے رگھو پاش پاش ہوگیا تھا۔ تیل کی فیکٹری ادھوری اور اجاڑ پڑی تھی، لاکھوں رُپے بینک میں پڑے گل سڑ رہے تھے، لیکن رگھو کو اب کسی چیز کی ضرورت نہیں تھی۔ اڈّے سے بھی بس وہ راہ و رسم نبھا رہا تھا۔

رگھو نے اپنی بات مکمل کی تو میں نے کہا، ”تو لکشمی جس سے بیاہ کرے گی تم اسے مار دو گے؟“

”ہاں۔“ رگھو نے یک دم بھڑکتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے، اس پر قائم رہنا۔“ میں نے مختصر جواب دیا۔

میرا ذہن کہیں اُلجھا ہوا تھا، پھر میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی اُس سے پوچھ لیا۔ ”تم کسی شاکر بھائی کو جانتے ہو؟“

”ہاں اچھی طرح۔ اُس کا سارا کام اِدھر ہی ہوتا ہے۔ آپ کیوں پوچھتے ہو!“

”بس یونہی۔ گذشتہ دنوں اُس کا کوئی کام کیا تھا؟“

”ہاں۔ اُس کے مہمان تھے ایک مولوی صاحب۔ دوسرے اُن کی لڑکی کو تلاش کرتا تھا، وہ گم گئے تھے۔“

میں نے دھڑکتے دل سے پوچھا، ”تو پھر؟“

”اِدھر تو اُن کا پتا نہیں چلا، پھر شاکر بھائی...“

میری دھڑکن بے قابو ہوگئی۔ ”شاکر بھائی؟“

”شاکر بھائی کو ممبئی میں اُن کا اتا پتا ملا ہے۔“

رگھو میری طرف بہ غور دیکھ رہا تھا، اور میرا دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا۔ معاً دوڑتے قدموں کی آواز آئی۔ کسی نے دروازہ بے طرح پیٹنا شروع کر دیا۔

”استاد! پولیس اڈّے پر گھس آئی ہے۔ پکّا گھیرا ہے۔ بولتے ہیں وارنٹ ہے، تلاشی لینی ہے۔“

پولیس کی آمد میرے لیے غیر متوقع نہیں تھی۔ بجھل انھیں مطلوب تھا۔ مطلوب بھی ایسا کہ جس کے مول پر پوری ریاست چڑھی ہو۔ اڈّے والوں کی مقدور بھر احتیاط چور دروازے بند نہیں کرسکتی۔ اڈّے والے ہزار ہاتھ پاؤں رکھتے ہیں۔ پولیس والے ہزاروں آنکھیں رکھتے ہیں۔ رگھو کے اڈّے پر بجھل کو اس رسائی سے دیکھ کے مجھے عجیب گمان ہُوا تھا۔ جسے میں نے اگلے ہی لمحے جھٹک دیا تھا۔ جو خیال مجھے آسکتا ہے وہ بجھل کو مجھ سے کہیں پہلے آ گیا ہوگا۔ اس کے پاؤں کی زنجیر پولیس نہیں کوئی اَور ہی چیز تھی۔ کوئی 'ب' ایسا بھی رقم ہو جاتا ہے کہ 'الف' پر مقدم ٹھیرتا ہے۔ بجھل کا 'ب' بھی 'الف' پر ہمیشہ مقدم ہی ٹھیرا تھا۔ عجب نہیں تھا کہ پولیس کی آمد شاکر بھائی کے تذکرے سے میرا ارتکاز منتشر نہیں کرسکی۔ میں نے تسلسل میں کہا، اس طرح ڈوبتے ابھرتے بے قابو دل سے۔ ''میں ابھی اور اسی وقت شاکر بھائی سے ملنا چاہتا ہوں۔''

رگھو مجھ سے اس سوال کی توقع نہیں کررہا تھا۔ کچھ پولیس کی اُفتاد نے اُسے بوکھلا دیا تھا۔ اُس نے لہجے میں ترش اور طنز کی آمیزش دانستہ نہیں سموئی تھی۔ ''کمال کرتے ہو بابر بھائی! ابھی استاد پولس کے ہتھے چڑھ گیا تو واپسی نہیں ہے۔ شاکر بھائی کو گولی مارو۔'' رگھو نے طوفان کی طرح چڑھ کے دروازے کھول دیا۔ آنے والا ابھی سیلاب بلا کی طرح دروازہ پیٹ رہا تھا۔ دروازہ کیا کھلا بند ٹوٹ گئے اور وہ منہ زور اپنی ہی لہر میں اندر گھستا چلا آیا۔ ''چھلیا استاد، بجھل استاد، جورا استاد اور جمرو استاد کو لے کے باؤلی سے نکلنے کا ہے۔ رگھو کو بولنے کا ہے بابر استاد پولس بھگتا لے گا۔ تو رپھڑا نہیں کرنے کا۔ شانت رہنے کا ہے۔'' تنکے کی طرح دبلے منحنی اور ایستادہ کارندے نے پھولے ہوئے سانسوں سے جلدی جلدی اپنا مدعا اُگلا۔ ''استاد چریا ہو گیا... سالا رگھو نتانی نہیں ہے۔ پولس کی ماں کا۔ چوکی پر آگئے ہیں یا دروازے پر کھڑے ہیں۔'' رگھو چھلیا کا پیغام سُن کے طیش میں آ گیا۔

مجھے یہ سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی کہ یہ پیغام چھلیا کا نہیں، بجھل کا تھا۔ میں پولیس سے نمٹنے کی صلاحیتوں سے مالا مال نہیں تھا۔ بجھل نے سیدھے سادے الفاظ میں مجھے تنبیہ کی تھی کہ معاملہ خوش اسلوبی سیف نمٹانا ہے۔ کسی طور پر بات بڑھنی نہیں چاہیے۔ بجھل جلد از جلد یہاں سے نکلنا چاہتا تھا۔ اور میرے سر میں شاکر بھائی کا سودا سمایا ہُوا تھا۔ راہ داری سے افرا تفری کی سرگوشیاں یہاں تک آرہی تھیں۔ پولیس کے لیے ماحول یقیناً سازگار بنایا جارہا تھا۔ رگھو نے مجھے کمرے میں ٹھیرنے کا کہا اور خود باہر جانے لگا۔ میں اس سے پہلے قدم اٹھا چکا تھا۔ نتیجتاً دونوں گڈمڈ ا گئے۔

''بابر بھائی آپ یہیں ٹھیرو۔ مجھے کتے سدھانے آتے ہیں۔'' رگھو نے ناگواری سے کہا۔ ہر چند کہ اُس نے اپنے تاثرات چھپانے کی کوشش کی تھی۔

لیکن میں نے اُس کی سنی نہیں اور باہر نکل آیا۔ پولیس معمول کی کارروائی پر نہیں آئی تھی۔ معاملہ دگرگوں تھا۔ رگھو بھی جھلّایا ہُوا میرے پیچھے لپک آیا۔ صحن کے پورے حصے میں ایک دالان چھتا ہُوا تھا۔ اُس کے نیچے چوکی تھی۔ چھپت، کمروں اور نہ جانے کس کس کونے کھدرے سے نکل کے اڈّے کے مکین وہاں جمع ہورہے تھے۔ سب کے سر تے سیدھے تھے۔ کندھے شریفوں کی طرح ڈھلکے ہوئے تھے۔ ان کی آنکھوں سے اضطراب جھلک رہا تھا۔ سب کے سب بیرونی چوکھٹ کی طرف رُخ کیے ہوئے دست بستہ کھڑے تھے۔ جیسے پولیس بھی جانتی تھی کہ یہ شرفا کا ٹھکانا ہے ویسے ہی وہ بھی شرفا ہی تھے۔ دروازہ بے طرح سے پیٹا جا رہا تھا۔ دروازہ کیا تھا شیشم کے بڑے بڑے جناور بلم تھے۔ جنھیں توڑنا پولیس کے لیے سر دست ممکن نہ تھا۔ ہمارے صحن میں پہنچتے ہی سب کی حکم طلب نظریں رگھو کی طرف اُٹھ گئیں۔ رگھو نے میری طرف ایک نظر اٹھا مجھے ان سب کا مرکز بنا دیا۔ میرے پاس سوچنے کی فرصت نہیں تھی۔ میں کسی ہچکچاہٹ اور تردّد کے بغیر چوکی پر جا کے بیٹھ گیا۔ ایسی سسکاری اُبھری، گویا سب نے ایک ہی منہ سے سانس بھرا ہو۔ اس طرح اور اس وقت چوکی پر بیٹھنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔

''رگھو دروازہ کھلواؤ!'' میں نے سکون سے کہا۔

''او چڑی مار سنگل گرا دے۔'' رگھو نے دروازے کے پاس کھڑے دو تین میں سے ایک کو کہا۔

دروازہ کھلتے ہی پولیس گرتی پڑتی اندر کی اور چڑھ دوڑی۔ پہلے ہلّے میں پندرہ کے قریب سپاہی اندر گھس آئے، ان میں کوئی افسر شامل نہیں تھا۔ پولیس والے اپنی جھونک میں لاٹھیاں سونتے سیدھے چوکی ہی کی طرف آئے۔ گویا شدید ردِ عمل کی توقع تھی۔ اڈّے میں اس وقت کم و بیش بارہ سے پندرہ کارندے موجود تھے۔ اور وہ بھی سب کے سب صحن میں۔ عموماً پولیس اڈّوں میں اس طریق داخل نہیں ہوتی۔ پولیس والے دو مقامات ہی سے متعلق کاربند ضوابط ہُوا کرتے ہیں۔ اول تھانا دوم اڈّا۔ کام یاب پولیس افراد اور اڈّے کے درمیان خوب چھنتی ہے، مگر ادب آداب کے ساتھ ہر لحاظ مراتب ''وہ اپنی ماں کو تجبر خانے چھوڑ گئے تھے۔'' رگھو دانت پیستے ہوئے زیرِ لب بڑبڑایا۔ وہ چوکی کے پہلو میں کھڑا تھا۔ میں نے تنبیہ کے طور پر ترچھی نظر کی تو اُس نے سختی سے ہونٹ بھینچ لیے۔ میرا ذہن بہت تیزی سے حالات کا تجزیہ کرنے میں مصروف تھا۔ پولیس بجھل کی برآمدگی کے لیے اڈّے پر چڑھ دوڑی تھی۔ لامحالہ وہ پکّی مخبری کے ساتھ آئے تھے، آسانی سے ٹلنے والے نہیں تھے۔ رگھو کی بڑ ہی بھی بجا تھی۔ اڈّے کا بھرم ہی تو سب کچھ ہُوا کرتا ہے۔ بھرم نہ رہا تو پھر کیا رہا۔ تحفظ، رُعب اور طاقت ہی تو اڈّے کی علامت ہے۔ یہ علامت نہ رہے تو اڈّا کہاں رہا کرتا ہے۔ پولیس آتی ہے اڈّوں سے لوگوں کو گرفتار بھی کرکے لے جاتی ہے، مگر سج اور سبھاؤ سے۔ داخل ہونے سے پہلے اجازت طلب کی جاتی ہے۔ شرافت سے آئے اور شرافت سے چلے۔ ایسے نہیں کہ تھم بلم لے کے چڑھ دوڑے چاچا کے چبوترے پر۔ اب کئی دن تک رگھو کے گزرے پیچھے لوگ کن سوئیاں کریں گے۔ معنی خیز مسکراہٹیں رگھو کے پیچھے دوڑائی جائیں گی، مگر مجال ہے کہ اس کے مڑنے پر سوائے سناٹے اور جھکی ہوئی گردنوں کے کچھ باقی ہو۔ بہ ہر حال، اس موسم تک رگھو کا بھرم رخصت ہو گیا تھا۔ پولیس کا بات چیت کا قطعاً کوئی ارادہ نظر نہیں آرہا تھا۔ سپاہیوں نے اندھا دھند لاٹھیاں چلانی شروع کر دی تھیں۔ پھر تو جیسے چوکی کے گرد پروانے جمع ہو گئے۔

لاٹھیوں سے جل جل کے گرنے والے۔ ان کے پیچھے مزید دس پندرہ سپاہی اور اندر گھس آئے۔ وہ سیدھے کمروں کی طرف دوڑ گئے۔ اُن کی بھاگ دوڑ سے بٹھل کی شدید طلب عیاں تھی۔ رگھو چٹان کی طرح منہ بھینچے ساکت وجامد کھڑا تھا۔ اور میں بھی مضبوطی سے جما بیٹھا تھا۔ چوکی کے گرد شیدائیوں نے دو گھیرے ڈال رکھے تھے۔

پہلا گھیرا پانچ افراد کا تھا، جب کہ اُس کے اوپر دس جنے جڑے کھڑے، سپاہی وحشیانہ انداز میں لاٹھیاں گھما رہے تھے، مگر ادھر نہ کوئی آہ تھی نہ کراہ اور نہ کوئی شگاف۔ پولیس کا طرزِ عمل ناقابلِ سمجھ تھا۔ انھیں ایسا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ مجھے اب اُٹھ جانا چاہیے تھا۔ کسی بے ضبطے نے اگر چاقو کھول لیا تو بات سنبھالنی مشکل ہو جائے گی۔ رگھو نے خود پر مکمل لاتعلقی ظاہر کر رکھی تھی۔ میرا ذہن خالی خالی سا ہو گیا تھا۔ میں سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ آخر میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ادھر انسپکٹر اجیت اڈّے کے دروازے پر نمودار ہوا۔ باروٹیہ کے قاتل پکڑنے کے لیے وہ خاصی دل جمی سے کام کر رہا تھا۔ انسپکٹر اجیت کی نظریں مجھی پر پیوستہ تھیں۔ شاید اُسے گلامی سے زیادہ بٹھل مطلوب تھا۔

''رُک جاؤ! رک جاؤ۔ یہ کیا کر رہے ہو!'' اجیت سپاہیوں کی گھم گتھی دیکھ کے چلایا۔ کچھ اس طرح جیسے کہہ رہا ہو اس سلسلے کو اور تیز کرو۔

حسبِ توقع لاٹھیوں کی گردش کچھ اور تیز ہو گئی۔ بہت سوں کی چمڑی لاٹھیاں اتار لائی تھیں، بازوؤں کی ہڈیاں بھی کچھ ضرور ٹوٹی ہوں گی۔ یہ دیکھ کے اڈّے کے در و دیوار بھی حیران ہوں گے کہ کسی تختۂ مشق نے آہ تک نہیں کی۔ آخر کفر ٹوٹا خدا خدا کرکے گالیاں اور لاٹھیاں دونوں تھم ہی گئیں تاوقتیکہ انسپکٹر مجھے دیکھ کر دو تین مرتبہ چلا یا نہیں۔

''ابھی تھکنے کا نہیں اے صاب۔ جور دکھانے کا ہے۔ ادھر جور دکھانے کا ہے۔'' ایک لمبے تڑنگے کھردرے سے کارندے نے بپھر کے کہا۔ میں جب اڈّے میں آیا تھا وہ اس وقت بھی پیش پیش تھا۔ اسے چھلیا نے کاٹو کے نام سے دو ایک مرتبہ بلایا تھا۔

اجیت نے اُسے کینہ توز نظروں سے گھورا اور کہا۔ ''اُسے گاڑی میں بٹھاؤ، اس کی سیوا کمرے میں ہوگی۔ حوالدار شرما!''

''جی سرکار!'' چمکتی ہوئی وردی میں ملبوس ایک نوجوان پولیس والے نے مستعدی سے جواب دیا۔

''یہاں سے بٹھل اور اس کے ساتھی کی ہر حال میں برآمدگی چاہیے۔ یہ سوچ کے تلاشی لینا کہ تم چیونٹیوں کو ڈھونڈ رہے ہو۔ وہ دیوار کی اینٹوں اور پتھروں سے پیچھے سے بھی برآمد ہو سکتی ہیں۔'' اجیت نے میری طرف دو قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔ میری آنکھوں سے انگارے نکلتے ہوئے اسے یقیناً نظر آ رہے ہوں۔ میں ابھی تک اپنی جگہ پر ساکت بیٹھا تھا۔ اجیت کے حکم کی تعمیل میں دو سپاہیوں نے کاٹو پر ہاتھ ڈالا۔

''ان سے کہو کہ کاٹو سے دُور ہو جائیں۔'' دفعتاً میں نے بھڑکتے ہوئے کہا۔ میں چوکی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

''پولیس کے کام میں جو رکاوٹ ڈالے گا، وہ تھانے جائے گا۔'' اجیت نے کہا۔

''پولیس کی آمد کا سبب جان سکتا ہوں میں انسپکٹر اجیت صاحب!'' میں نے زہر خند لہجے میں کہا۔

''مسٹر بابر آپ کو اس وقت یہیں میں ہونا چاہیے تھا۔ آپ ابھی تک یہیں ہیں۔''

''میں وضاحت کر چکا ہوں اور میں اپنے ساتھیوں کے بنا یہاں سے نہیں جاؤں گا۔''

''وضاحت تو آپ کو پولیس نے بھی کر دی ہے کہ آپ کے ساتھی اجازت کے بنا یہاں سے نہیں جا سکتے۔''

''میرے ساتھی مجھے مل جاتے تو میں اب تک یہاں نہ ہوتا۔''

''ٹھیک ہے، کچھ دیر میں پتا چل جائے گا۔ ہمیں پکا بھید ملا ہے۔ باروٹیہ کا قاتل یہاں آپ کے استقبال کے لیے موجود تھا۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں بابر صاحب؟'' انسپکٹر اجیت نے جس انداز میں باروٹیہ کا قاتل کہا تھا یوں لگتا تھا جیسے اس نے کہا ہو کہ میرے ''باپ کا قاتل''۔ باروٹیہ سے اس کی وابستگی شدید تھی۔ اس سے قبل بھی کئی مرتبہ وہ اپنے طرزِ عمل سے اس کا اظہار کر چکا تھا۔

نوجوان حوالدار اندر سے آ کے اجیت کے کان میں کھسر پھسر کرنے لگا۔

''میں بتا چکا ہوں وہ مجھے مل جاتے تو میں تمھیں یہاں نہ ملتا۔'' میں نے لہجے میں ذرا نرمی پیدا کی۔

سپاہی لاٹھیاں جھٹک کے ایک طرف ہو گئے تھے۔ مضروب اور ضارب دونوں ایک دوسرے کو پیغام رساں نظروں میں تول رہے تھے کہ کبھی تو اکیلے ملو گے۔ میرا خیال تھا کہ انسپکٹر اجیت کا اڈّے پر دھاوا اپنے افسروں سے بالا ہی بالا کوئی کام ہے۔ وہ خاصا خود اعتماد قسم کا پولیس افسر دکھتا تھا۔ اس نے حکومت برطانیہ کے دو اہم نمائندے خاموشی سے راہِ عدم پہنچا دیے تھے۔ وہ یہاں کچھ بھی کر سکتا تھا۔ وہ انگریزوں سے انتہائی نفرت کرنے والوں میں سے دکھتا تھا۔ شاید یہی نفرت اسے باروٹیہ سے بہت قریب کرتی تھی۔ مجھے علم نہیں تھا بٹھل کس طرف سے نکلا ہے اور کہاں گیا۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ آئندہ اس سے کہاں ملاقات ہوگی۔ میں تو اس پر گزری بھی نہ جان سکا تھا۔ موقع ہی نہیں ملا۔ وہ بھی اپنے مزاج کا آدمی ہے، مرضی سے بتائے تو بتا دے، ورنہ مجال ہے جو کوئی بات بانٹ لے۔ میں نے باروٹیہ کے قتل سے متعلق جو کچھ سنا دوسروں سے سنا۔ اور اس میں سے نصف معلومات ناقص ثابت ہوئی اور نصف مبہم گڈمڈ تھی۔ میری تمام معلومات ظنی بر اندازہ ہی تھی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ میرے پیچھے بٹھل، زورا اور جمرو پر کیا بیتی۔ زورا اور جمرو سے ضرور مکمل احوال مل جاتا مگر شومیِ قسمت وہاں محبت پروان ہی نہ چڑھ سکی۔ میں دل میں دعا مانگ رہا تھا کہ خدایا، چھلیا بٹھل کو لے کر جس راستے سے نکلا ہے وہ راستہ اس مرخ نظر پولیس والے کو دریافت نہ ہو، ورنہ آج کچھ بھی ممکن تھا۔ اس شخص سے کچھ بعید نہیں تھی۔ اس نے جس طرح لاٹھی چلوائی تھی اس سے اُس کے انتہائی جارحانہ عزائم مترشح تھے، ورنہ اسے یہاں ایسے طور کی چنداں ضرورت نہیں تھی۔

''مجھے تمھارے ساتھیوں کا پتا چاہیے۔ ابھی اور اسی وقت۔'' انسپکٹر اجیت نے حوالدار کی کھسر پھسر سن کے چھچھناتے ہوئے کہا۔ حوالدار نے اُسے سرخ جھنڈی دکھا دی تھی۔

''انسپکٹر صاحب تم اپنا وقت ضائع کر رہے ہو۔'' میں نے اطمینان کی سانس بھرتے ہوئے کہا۔

''ایک ایک کی کھال کھنچوا کے گوبر بھروا دوں گا۔ کہاں چھپایا ہے ان حرامیوں کو۔'' انسپکٹر اجیت نے روئے سخن اڈّے کے دوسرے لونڈوں کی طرف کر لیا۔ وہ سب تو منہ میں گھنگنیاں ڈال کے کھڑے تھے۔ ''رگھو تو بول۔ چھلیا کدھر ہے... میری اطلاع کے مطابق وہ کچھ دیر پہلے اِدھر ہی تھا۔''

''استاد بابر بھائی کو چھوڑ کے چلا گیا تھا۔ کدھر گیا پتا نہیں ہے۔'' رگھو نے اکھڑے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ اُس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ اُس کا بس نہیں چل رہا۔ انسپکٹر اجیت کو پل کے پل میں بھنبوڑ دے۔

''میں یہاں سے انھیں برآمد کیے بغیر نہیں جاؤں گا۔ اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا اس عمارت کی۔'' طیش میں اجیت کے حواس اس کا ساتھ چھوڑ رہے تھے۔ جو میرے لیے خوش آئند بات تھی۔

''رگھو تجھے شرم آنی چاہیے۔ دھرتی کے غداروں کو چھپا رہا ہے۔ انھیں کدھر چھپایا ہے وہ ادھر ہی ہیں۔ تجھے جیل پہنچنا نصیب نہیں ہوگا۔ بتا کدھر ہیں۔'' اجیت غصّے سے کانپتا ہوا رگھو کے قریب آ کے بولا۔

''جو کرنا ہے کر لے۔ بول دیا وہ ادھر نہیں ہے۔'' رگھو نے اپنی ٹھوڑی پر سے اُس کی چھڑی ہٹائی۔

''مسٹر بابر! تم میرے لیے انتہائی ناپسندیدہ شخصیت بن چکے ہو۔ تمھاری قسمت اچھی ہے جو بچ رہے ہو۔''

''پسند ناپسند ہر کسی کی اپنی صواب دید پر ہے۔'' میں نے مختصر جواب دیا۔ مجھے معلوم تھا وہ مجھے یہاں سے تھانے نہیں لے جا سکتا۔ تحمل اور معتدل مزاج ہی سے وہ ٹل سکتا تھا۔

''میری صواب دید پر اور بہت کچھ ہے۔'' اجیت نے زہریلے لہجے میں کہا۔

''میں نے کہا ہے کہ ہر آدمی اپنی صواب دید پر بااختیار ہوتا ہے۔''

''بھلائی اسی میں ہے کہ بتا دو بٹھل کہاں ہے۔''

''ایسی بات ہے تو سنو! مجھے علم ہوتا میں تب بھی نہ بتاتا۔'' میں نے آخرکار حتمی لہجہ اختیار کر لیا۔

''جانتے تو تم ہو۔ یہاں پر تم نے اور اُس نے دھما چوکڑی مچائی ہے۔ پل پل کی خبر ہے۔''

''پل پل کی خبر ہے تو مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہو۔ اسی سے پوچھو جو تمھیں پل پل کی اطلاعات فراہم کر رہا ہے۔''

بس وہ ایک ساعت تھی، جس کا دورانیہ کم مائیگی کی بدولت ماپا نہیں جا سکتا تھا۔ اجیت کی نگاہیں ایک کارندے سے ٹکرائی تھیں۔ پھر دونوں کی نظریں ایسے جدا ہوئیں جیسے کبھی ملی ہی نہیں، مگر وہ میری نظر میں آ گیا تھا، وہ مخبر تھا۔ چھوٹے قد، مگر گٹھے ہوئے جسم کا مالک مخبر۔ اُس آنکھیں چندھیائی ہوئی تھیں۔ چہرے کی رنگت توے کی طرح سیاہ تھی۔ مخبر اس موقعے پر انسپکٹر اجیت کو کسی بھی قسم کی معلومات نہیں فراہم کر سکتا تھا۔ ایک ہی راستہ تھا، مخبر کو گرفتار کر کے باہر لے جایا جاتا اس کے بعد ہی راز و نیاز ممکن تھا۔ وہی ہوا جس کا مجھے خدشہ تھا۔ اجیت نے رگھو

سمیت دو چار کو تھانے لے جانے کا حکم دے دیا۔ یقیناً ان دو چار میں اہم ترین آدمی چھیے ہی تھا۔

"یہاں سے کوئی نہیں جائے گا۔ اجازت نامہ ہے گرفتاری اور تلاشی کا؟" میری کنپٹیاں سلگنے لگی تھیں۔ صورتِ حال اس سے کہیں زیادہ گھمبیر تھی جتنی نظر آتی تھی۔ بٹھل کو دیکھنے کے بعد وہ بات بعد میں کرتا گولی پہلے چلاتا۔ اس کی جذباتی کیفیت کچھ اسی طرح کی نظر آ رہی تھی۔

"یہ ہے نا میرے پاس!" اُس نے طمنچہ نکال لیا۔ دیگر سپاہیوں نے اُس کی دیکھا دیکھی لٹکائی ہوئی بندوقیں فوراً تان لیں۔

"تو پھر چلاؤ گولی۔ یہاں سے کوئی نہیں جائے گا۔" میں نے خواہ مخواہ مسکراتے ہوئے کہا۔ رگھو مٹھیاں بھینچ رہا تھا۔

"یہاں وائسرائے یا اس کا کوئی گماشتہ نہیں آئے گا۔" اجیت نے طمنچہ سیدھا میری طرف تان لیا۔ اُس کی آنکھیں شعلے اگل رہی تھیں۔

"انگریزوں سے تعلق کی گالی مجھے بار بار مت دو! اس سے بہتر ہے گولی چلا دو!" میری سوچنے سمجھنے کی صلاحیت چھینتے ہوئے اعصاب سلب کرتے جا رہے تھے۔

"جذباتی داؤ پیچ مت آزماؤ بابر صاحب! وائسرے کا رُقعہ تمھاری جیب میں ہوگا۔"

آخر مجھے طیش آ گیا۔ بقول بٹھل کے شکست کی پہلی علامت غصہ اور جھنجھلاہٹ ہے۔ مجھے بہت آسان لگ رہا تھا کہ وہ ایک گولی چلائے جو سیدھی پیوست خاطر ہو۔ "تم کسی کراتی اور آزادی کے بھگت ہو، تم نے اپنے آپ کو از خود قید کر رکھا ہے۔ تم نے ایک دانا اور تعلیم یافتہ شخص پر ایک عقل سے عاری اور متشدد شخص مسلط کر رکھا ہے۔ تمھارے نزدیک مجھے انگریزی آتی ہے، اس لیے میں انگریزوں کا گماشتہ ہوں۔ تم کیا ہو؟ کیا تمھیں انگریزی نہیں آتی۔ کیا تم انگریزی تعلیم کے بل بوتے پر یہ وردی زیبِ تن نہیں کیے ہوئے۔ کیا اس بنا پر تم انگریزوں کے گماشتے نہیں کہلا سکتے؟ تمھیں پہلی مرتبہ دو انگریزوں ہی کے ساتھ دیکھا تھا۔ کیا میں تمھیں صرف اس بنا پر انگریزوں کا گماشتہ مان لیتا کہ تم دو ذی وقار انگریز افسروں کے ہمراہ آئے تھے۔ انسپکٹر اجیت حالات کا تجزیہ کرنے کے لیے انسان کو عقل کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ باروٹیہ، میں اور تم میں فرق ہونا چاہیے تھا۔" میں اپنی روانی میں بولتا چلا گیا۔ اجیت خاموشی سے طمنچہ تانے بس مجھے دیکھا کیا۔

"بولتے جاؤ۔ میں ہمیشہ سچ کے لیے لڑنا پسند کرتا ہوں۔" اُس کی آواز میں ٹھیراؤ تھا۔

"اجیت صاحب! سامنے کی بات ہے۔ باروٹیہ کیا تھا؟ باروٹیہ کیا ہے؟ ہم بالکل نہیں جانتے۔ وہ جہاز کہاں سے آ رہا تھا اور کہاں جا رہا تھا۔ اس میں سوار ہونے سے قبل ہم بالکل نہیں جانتے تھے۔ بالکل اس طرح جس طرح تم نہیں جانتے کہ تم کتنی بدگمانی میں مبتلا ہو۔"

"بابر صاحب! میں کیا ہوں اور کیا نہیں ہوں، یہ مجھ پر رہنے دیں۔ اپنی بات پوری کریں۔"

"میرا قصور صرف اتنا ہے کہ میں بھی بالکل اسی طرح تھوڑا بہت لکھ پڑھ لیتا ہوں، جس طرح تم انگریزی جانتے ہو، ورنہ میرے ساتھی اپنا نام لکھنے کی سدھ بدھ بھی نہیں رکھتے۔ ہم جہاز میں بمبئی جانے کے لیے کراچی سے سوار ہوئے تھے۔ ایک انگریز محقق کو ایسے ہندوستانی کی تلاش تھی جو انگریزی جانتا ہو۔ ہماری اُس سے عرشے پر ملاقات ہوئی۔ وہ میری باتوں سے بے حد متاثر ہوا اور ہمیں جہاز کے ریستوراں میں لے گیا، جو جانے ممنوعہ تھی ہندوستانیوں کے لیے۔ تمھیں جہاز میں کسی نے یہ بھی بتایا ہوگا کہ ہمیں ریستوراں سے محض ہندوستانی ہونے کی وجہ سے نکالا گیا۔ انگریز محقق ہی نے میری ملاقات مایا سے کروائی تھی۔ ہمیں ریستوراں سے باہر کرنے والا متعصب کپتان مایا کا شوہر تھا۔ وہاں ہماری مایا کے شوہر سے جھڑپ ہوئی، جو خالصتاً نسلی تعصب کی بنیاد پر تھی۔ اسی دوران باروٹیہ جہاز پر چڑھ آیا۔ ہمیں فی الفور انگریزوں کا گماشتہ تصور کر لیا گیا۔ ہمیں بوریوں میں بھر دیا گیا۔ اس کے بعد ہماری ہر کوشش خود کو باروٹیہ کے چنگل سے آزاد کروانے کی تھی، نہ کہ انگریزوں کے دفاع میں کیا جانے والا کوئی اقدام۔ میں وہاں سے بھاگا، اس لیے کہ اپنی جان بچانا میرا حق تھا۔ میرے ساتھ ایک انگریز قید تھا۔ اُس کی حیثیت محض ایک شریکِ دردکی سی تھی۔ اس کی جگہ کوئی ہندوستانی، فرانسیسی، انگریز خواہ کوئی بھی ہوتا میری ہمدردی حاصل کرتا، لیکن لیونارڈ کو اپنے ساتھ فرار کروانے کی بنیادی وجہ کچھ اور بھی تھی۔ وہ یہ کہ میں وہاں سے نکلنے میں لیونارڈ ہی کی بدولت کامیاب ہو سکا تھا۔ تنہا آدمی کے لیے ایسا ناممکن تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ بٹھل کے ہاتھوں، باروٹیہ ہلاک ہُوا بھی ہے یا نہیں، تاہم دو اور دو چار کی طرح یہ واضح بات ہے کہ بٹھل نے اگر کوئی ایسا قدم اٹھایا ہوگا تو محض اپنے دفاع کے لیے اور اسے ایسا کرنے کا حق حاصل ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں بنتا کہ ہمارا تعلق انگریزوں سے ہے۔"

"تم کراچی کس لیے گئے تھے؟"

"ہمارا تعلق زمیں دار گھرانے سے ہے۔ گاؤں گاؤں، قصبے قصبے اور شہر در شہر ہم گھومتے پھرتے ہیں۔ بس شوقیہ!"

"بھوا مہاجن کا معاملہ کیا ہے؟ وہ اپنی ساری دولت تمھارے حوالے کیوں کر گیا ہے۔" انسپکٹر اجیت کا لب و لہجہ معقولیت کی شاہراہ پر لوٹ آیا تھا، لیکن طمنچے کی نال ذرا بھی ترچھی نہ ہوئی تھی۔

"مجھے تمھارے ذریعے ہی معلوم ہُوا کہ بھوا مہاجن باروٹیہ کی مالی معاونت کرتا تھا۔ ورنہ میں بھوا کا اس حادثے سے قبل محض چند ساعتوں کا شناسا ہوں۔"

"نہیں بابر صاحب! تمھاری پہلی گفتگو دلیل کی حامل تھی، جب کہ کراچی اور بھوا والا معاملہ تم آگے پیچھے کر رہے ہو۔ تمھاری حیثیت مشکوک ہے۔" وہ پھر تھے سے اکھڑنے لگا۔

"تم گولی چلا سکتے ہو، مگر یہاں سے کوئی آدمی نہیں لے جا سکتے۔" اس سے مغز مارنا بے سود تھا۔ بھوا کے تذکرے نے میرے اضمحلال کو دو آتشہ کر دیا تھا۔

"میں باروٹیہ کے قاتل کو کسی صورت نہیں چھوڑ سکتا۔ میں اُسے بھیانک انجام سے دوچار کر کے رہوں گا۔ دیکھو، رگھو بات یہیں ختم ہو سکتی ہے۔ تم جانتے ہی ہو کہ تھانے کی سیر سے بہت سے فرفر بول پڑتے ہیں گے۔" اُس نے اچانک رگھو کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"ابھی بابر بھائی نے بول دیا ہے گولی چلاؤ! ادھر سے کوئی نہیں جانے کا۔" رگھو نے سرد اور ٹھیرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ اور ایک جھٹکے سے چاقو کھول لیا۔ رگھو کی دیکھا دیکھی کھٹا کھٹ بج گئی۔ سبھی کے چاقو ہاتھوں میں چمکنے لگے۔ اڈّے یاڑوں سے وابستگی کی قدامت اپنی جگہ، مگر ایسی صورتِ حال سے پالا کبھی نہ پڑا تھا۔ ایک طرف وہ ضدی پولیس والا تھا جو دماغ استعمال کرنے کی سوچ بھی نہیں رہا تھا اور دوسری طرف میں تھا جس کا سب کچھ داؤ پر لگا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ چھیے بٹھل کے یہاں سے کوچ کے بارے میں کس حد تک جانتا تھا، تاہم میں یہ فیصلہ کر چکا تھا۔ چھیے کسی طور یہاں سے نہیں جائے گا۔ چاقو اور گولی اگر چلتے ہیں تو صورتِ حال اس سے زیادہ گھمبیر ہو جاتی، لیکن اس کے سوا کوئی دوسری راہ بھی سامنے نہ تھی۔

"ٹھیک ہے انسپکٹر اجیت! رگھو تمھارے ساتھ جانے کے لیے تیار ہے، مگر اور کوئی نہیں جائے گا۔" میں نے ایک نیا پانسہ پھینکا۔ رگھو کے چہرے پر ناگواری صاف مترشح ہوئی تھی۔

"نہیں رگھو نہیں، دو چار آدمی اور جائیں گے!" اجیت نے سوچتے ہوئے کہا۔ مجھے محسوس ہُوا کہ وہ شاید میرے مقصد تک پہنچ رہا ہے۔

"ٹھیک ہے، چار نہیں تم پانچ آدمی لے جاؤ۔ کالو، باٹلے، اور تم اور تم اور تم۔" میں نے فوراً اس کا یہ تقاضا پورا کر دیا اور پانچ کی بجائے چھ آدمیوں کو اُس کے ہمراہ جانے کا اشارہ بھی دے دیا۔

"نہیں، آدمی میں اپنی مرضی سے لے کر جاؤں گا۔"

انسپکٹر اجیت کی آنکھوں میں اُلجھن تیر گئی۔ اور چھیمے سے متعلق میرا شک پختہ ہوگیا۔ چھیمے جس قدر اخفا میں رہتا اِتنا ہی ہمارے لیے سود مند تھا۔ مجھے خدشہ تھا کہ کہیں رگھو اس معاملے کی تہہ تک نہ پہنچ جائے اور ضبط نہ ہاتھ سے گنوا دے۔ چھیمے کی نظروں میں چوری پھیلتی جارہی تھی۔ یا شاید مجھے ایسا محسوس ہورہا تھا۔

''ٹھیک ہے پھر یہاں سے کوئی نہیں جائے گا۔'' میں نے بھی زِچ ہوکر کہا۔

رگھو اور سب کی شکلوں پر تناؤ سکڑا اور پھیل رہا تھا کہ اس اثنا میں باہر ہلکا سا غلغلہ بلند ہُوا اور دوڑتے قدم اندر کی طرف آئے۔ وہ چند اہلکار ہی تھے، سادہ لباس والے بھی اور باوردی بھی۔ ان کی باچھیں کھلی جارہی تھیں۔ انھیں دیکھتے ہی میرا دل بے طرح سے دھڑکا۔ وسوسوں پر وسوسے اٹھنے لگے۔ اور وہی ہُوا جس کا مجھے خدشہ اُنھیں دیکھتے ہی ہُوا تھا۔ وہ بٹھل، چھیایا، جمرو اور زورا، دھیارا اور لنگو کی گرفتاری کی خبر لائے تھے۔ اُنھوں نے آتے ہی واشگاف انداز میں بتایا کہ اڈّے سے ملحقہ مکان سے مطلوبہ افراد کو گرفتار کرلیا گیا ہے۔ ملزمان اڈّے میں موجود خفیہ راستے سے وہاں پہنچے تھے۔ اجیت یہ اطلاع سن کر کھل اٹھا تھا۔ میں خود ہی سوچ رہا تھا کہ انھیں اڈّے پر لایا جائے، حالاں کہ یہ احمقانہ سوچ تھی۔ اجیت باہر جانے کے لیے گھوما تو میں کسی خودکار آلے کی طرح حرکت میں آ گیا۔ وہ مجھ سے تین قدم کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ میں نے تُلی چھلانگ لگائی۔ درمیانی فاصلے پر میرا پنجہ مجھے دوبارہ اچھالنے کے لیے زمین پر لگا۔ اور اسی لمحے میں اجیت کے اُوپر تھا، مگر میں اُسے لے کر نیچے نہیں گرا۔ میں نے اپنی جھونک میں اُس کے دائیں کندھے پر اشارتاً ضرب لگائی۔ وہ زور میں آ کے گھوما۔ اُس کی پشت میری جانب ہوگئی۔ اسی اثنا میں مَیں چاقو نکال چکا تھا۔ یہ وقوعہ پلک جھپکتے سا ہی تھا۔ اجیت کی گردن میرے بازو کے شکنجے میں تھی اور میرے چاقو کا تیز دھار پھل اس کے نرخرے سے لگا ہُوا تھا۔ ایسے اقدام کی توقع وہاں کوئی خواب میں بھی نہیں کرسکتا تھا۔ سپاہی بندوقیں تاننے کے تانے ہی رہ گئے۔ میں اجیت کو لے کر دیوار سے لگ گیا۔ میں نہیں جانتا تھا میرے اس قدم سے کیا نتائج برآمد ہوں گے، لیکن مجھے اِتنا اندازہ ضرور تھا کہ اجیت بٹھل سے 'خون کا بدلہ خون' سے کم پر سلوک نہیں کرے گا۔ مجھے بچاؤ کا دُھندلا سا راستہ یہیں نظر آیا تھا۔ اجیت نے جوابی طور پر کوئی حرکت نہیں کی۔ پھل اُس کے نرخرے میں تقریباً گڑا ہُوا ہی تھا۔

''اس سے تم کوئی فائدہ حاصل نہیں کرسکتے۔'' اجیت نے بھنچے بھنچے لہجے میں کہا۔

''سپاہیوں سے کہو بندوقیں گرادیں۔'' میں نے چاقو کا دباؤ بڑھایا۔ سپاہی چند لمحوں کے لیے سٹپٹا گئے تھے۔ اڈّے پاڑے کا کوئی شیدا اُن کے افسر کو پولیس کی بھاری جمعیت کے بیچوں بیچ یرغمال بنا سکتا تھا۔ یہ تو اُنھوں نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔ جب تک وہ معاملے تک پہنچے اجیت میرے شکنجے میں کسا جاچکا تھا، تاہم غیر ارادی طور پر سب کی سب بندوقوں کا رُخ میری طرف ہوگیا تھا۔ اِس قدر قریب سے میری کنپٹی کا نشانہ باندھنا خاص مہارت کا متقاضی نہیں تھا۔ بہت آسانی سے ایک گولی مجھے ٹھنڈا کرسکتی تھی۔ جس پر مجھے اجیت کا نرخرہ کاٹنے کی مہلت قطعاً نہیں ملتی۔ اور میں آنے والی گولی کے لیے بالکل تیار تھا۔ سپاہیوں کی بندوقیں بدستور میری طرف اُٹھی ہوئی تھیں۔ انھیں اب تک سنگینیں سرنگوں کرنے کا نہیں کہا گیا تھا۔ اجیت سمجھ رہا تھا اٹھی ہوئی بندوقیں بازی اس کے حق میں کیے ہوتے تھیں۔ پلڑا اُس کا بھاری تھا، تاہم وہ زبان سے اپنے ماتحتوں کو گولی چلانے کا حکم نہیں دے سکتا تھا۔ زبان کے ساتھ ساتھ میرا چاقو بھی چل سکتا تھا۔ رگھو بھی ہکّا بکّا کھڑا تھا۔ میں نے اُسے آنکھوں ہی آنکھوں میں کسی قسم کی حرکت نہ کرنے کی تنبیہہ کردی تھی۔ شکر ہے کہ اُس نے اشارہ سمجھ لیا تھا۔ اجیت کی زبان نے حرکت نہ کی۔ میں نے دھار کھال میں اتار دی بس آلو کے چھلکے کی بقدر۔ اجیت نے سسکاری بھری۔ نوجوان حوالدار سے رہا نہ گیا اُس نے بندوق زمین پر رکھ دی۔ پھر گویا جھڑی لگ گئی۔ آن کی آن میں سب بندوقیں زمین پر آرہیں۔ کالو لپک کے بندوق اٹھانے کے لیے بڑھا۔

''کالو ٹھیر جاؤ! اڈّے کا کوئی آدمی اس لفڑے میں نہیں اُلجھے گا۔'' میں نے اجیت کو لے کر باہر کھسکتے ہوئے کہا۔ مجھے کم از کم دروازے تک جانا تھا۔

''ابھی چوڑی پہنانے کا ہے استاد! قسم! اکھا جندگی میں کالو نے ایسا مائی کا لال نہیں دیکھا۔ ابھی استاد تیرے کو چومنے کا ہے۔ کلیجا کاٹنے کا ہے استاد۔'' کالو نے پھڑکتے ہوئے کہا۔ اُس کی آنکھیں پانی چھوڑ رہی تھیں۔

''بابر بھائی۔ ابھی زندگی بیکار ہے۔ جو کچھ ہے آپ کے قدموں میں ہے۔'' رگھو بھی بول پڑا۔ اُس کی آواز بھی ڈبڈبا رہی تھی۔ اُس نے آگے بڑھ کر ایک بندوق اٹھالی۔ اُس کی دیکھا دیکھی پورا اڈّا بندوق بردار بن گیا۔

میں یہ نہیں چاہتا تھا۔ وہ شاید انجام سے واقف نہیں تھے۔ جو ہونا ہو وہ ہوکر ہی رہتا ہے، انسان کی سب تدبیریں بے کار ہی جاتی ہیں۔ رگھو نے سب سپاہیوں کو ایک قطار میں کھڑا کروادیا تھا، تاہم میں نے اجیت کو اپنی گرفت سے آزاد نہیں کیا تھا۔

''بٹھل کو اندر بلواؤ۔'' میں نے آئندہ کے بارے میں سوچتے ہوئے کہا۔ ہمیں یہاں سے نکلنا تھا۔

''بابر صاحب! اِس کے اچھے نتائج برآمد نہیں ہوں گے۔'' اجیت نے کسمساتے ہوئے کہا۔

''نتائج پہلے بھی اچھے نہیں تھے۔ انھیں بلواؤ فوراً۔'' میں نے درشتی سے کہا۔

''انسپکٹر اجیت نے اس نوجوان حوالدار کو اشارہ کیا اور وہ دوڑتا ہُوا باہر نکل گیا۔ اس موقع پر تنبیہ بے سود تھی۔

''اب بھی وقت ہے بابر صاحب! یہ بات یہیں پر دفنائی جاسکتی ہے۔ پولیس بھول جائے گی کہ اڈّے کے آدمیوں نے پولیس کو یرغمال بنایا تھا۔ یہ بات چھوٹی نہیں ہے، مگر میں اسے ختم کرسکتا ہوں۔'' اجیت نے جھنجھناتے ہوئے کہا۔ چاقو اس کی گردن پر باریک لکیر بنا چکا تھا۔ میں نے اُسے جواب دینا مناسب نہیں سمجھا۔

''باہر پولیس کا کڑا پہرا ہے۔ یہاں سے نکل نہیں سکو گے۔'' میں نے خاموشی ہی بہتر سمجھی۔ میں تو واقعی نہیں جانتا تھا۔ یہاں سے کیسے نکلا جاسکتا ہے۔ کچھ دیر خاموشی میں گزری۔ سب ہونقوں کی طرح گھڑیاں گن رہے تھے۔ تھوڑی دیر گزری کہ وہ آ گئے۔ ان کے ساتھ صرف وہی نوجوان حوالدار تھا۔ اس نے اندر کی کارگزاری سنادی ہوگی اور باہر والوں کو بتادیا ہوگا کہ ان کا باہر رہنا ہی مناسب ہے۔ بٹھل ان میں سب سے آگے تھا۔ چھلیا، جمرو، زورا، لنگو دھیارا سب آگے پیچھے آرہے تھے۔ سب کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پڑی ہوئی تھیں۔ حوالدار کے ہاتھ میں ایک زنجیر تھی، جس میں ان سب کی زنجیریں پروئی ہوئی تھیں۔ بٹھل کو دیکھ کے گویا میرے سر سے فولاد کا پہاڑ سرک گیا تھا۔ جیسے ہی وہ صحن میں داخل ہوئے میں نے اجیت کی گردن چھوڑ دی۔ وہ گردن مسلتا ہُوا سامنے کو ہو رہا۔ بٹھل ایک گرگِ باراں دیدہ تھا۔ لمحوں میں اُس نے صورتِ حال بھانپ لی ہوگی۔ یکا یک اُس کی پیشانی پر گہری سلوٹیں اور تردّد نمایاں ہوگیا۔ ''یہ کیا ہے لاڈلے؟'' وہ حلقۂ زنجیر کو کھینچتے ہوئے میری طرف آیا۔ اس کے ساتھ بقیہ پانچوں بھی کھنچے چلے آئے۔ بٹھل برہم ہورہا تھا۔ اُسے غصہ تھا۔

''انسپکٹر صاحب یہ ہتھکڑیاں کھلواؤ۔'' رگھو نے اب بندوق اجیت کی گردن سے لگادی تھی۔

بٹھل مجھے گھورتا ہُوا شدید غصّے میں پلٹا۔ وہ ایسے زور اور غصّے میں تھا کہ زنجیریں بری طرح جھنجھنا گئیں۔ دھکّے میں چھلیا اور زورا تو تقریباً گر ہی گئے تھے۔ بٹھل نے ہاتھ مار کے رگھو سے بندوق چھین لی اور اسی زور میں گھومتے ہوئے دیوار پر دے ماری۔ وہ پھر میری طرف پلٹا۔ میری سانس خشک ہونے لگی۔ میں نے کچھ غلط نہیں کیا تھا۔ وہ اجیت کو پولیس سمجھ رہا تھا۔ اجیت پولیس نہیں تھا اُس کا جانی دشمن تھا۔

''ادھری باغ میں چھوڑ آیا تھا.. ٹھکانے کا تول پورا نہیں ہے رے، کچھ نہیں ہے۔'' بٹھل تپتی ہوئی آواز میں بولا۔ اُس کے منہ سے تپش کی لپٹیں اٹھ رہی تھیں۔ ''رشتے داری رکھنی تھی تو پوری کرتا... یار بنا کے چھوڑ دیے۔ ادھری کھونٹے سے بھیا کھڑے ہیں نہ باجے لے کے۔ لاڈلے بھیا کا استقبال پولیس کرے گی۔'' بٹھل چنگھاڑ رہا تھا۔ صحن میں سناٹا گونج رہا تھا۔ اجیت آنکھیں پھاڑے بٹھل کو دیکھ رہا تھا۔ اُس نے بٹھل کو پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔

''چھوڑ دو رے یہ بھمیاں۔ اُنھی کو بھائیں گی جن کی ہیں... پتا نہیں ڈالا ان حرام کے جنوں کو چھلیا بھیاں!'' بٹھل آپے سے باہر ہورہا تھا۔ حوالدار نے زنجیر کا کنڈا چھوڑ دیا تھا، ارادی یا غیر ارادی طور پر کچھ کہا نہیں جاسکتا تھا۔ رگھو کے اشارے پر بندوقیں واپس پھینک دی گئی تھیں۔ باقی سب پیچھے کو سمٹ گئے تھے۔ رگھو اپنی جگہ پر ساکت نظروں سے زیرپا خاک کرید رہا تھا۔ بہت سارے استادوں کے درمیان وہ ٹکو بن رہا تھا۔ یہ اضطراب اس کے چہرے پر متواتر نمایاں تھا اور مسلسل بڑھ رہا تھا۔ چھلیا نے کچھ نہیں کہا، وہ خاموش کھڑا دیکھ رہا تھا۔ شاید ایسی پیچیدہ صورتِ حال سے اُس کا واسطہ پہلی مرتبہ ہی پڑا ہوگا۔ کبھی یوں گمان پڑتا تھا کہ وہ اپنی سدھ بدھ کھو بیٹھا ہے۔ اجیت حیرت سے آنکھیں پٹپٹائے بٹھل کو دیکھ رہا تھا۔ مجھے

اُس کی حیرت سمجھ میں آ رہی تھی۔ عام صورتِ حال میں یہ حیرت ہی نہیں تھی کوئی بھی شاطر اسی طرح اپنے لیے فضا ہموار کرتا ہے۔ بٹھل نے صحیح ہی تو کہا تھا۔ ہم اس طرح کیا کر سکتے زیادہ سے زیادہ اس گلی محلے ہی سے باہر نکل پاتے۔ پھر دھر لیے جاتے یا مارے جاتے، لیکن اب کوئی مناسب راہ بن سکتی تھی۔ اس پینترے کو معمولی سوجھ بوجھ والا مقابل بہ آسانی سمجھ سکتا تھا۔ اس میں حیرانی کی بات نہیں تھی، لیکن اجیت کا معاملہ کچھ مختلف تھا۔ وہ بٹھل کے لیے جو کچھ سوچ چکا تھا۔ اس تناظر میں اس منظر حیران کو دیکھ رہا تھا۔ لاشعوری طور پر وہ اس شخص کو سچ پا دیکھ رہا تھا۔ جو اپنے سامان قتل کے بہم نہ ہونے پر جھگڑا کر رہا تھا۔ یہ میرا قیاس تھا، ممکن ہے کچھ اور وجہ ہو۔ اجیت آنکھیں پھاڑے بٹھل کو تک رہا تھا۔ معاً اسے ہوش آ گیا۔ اُس نے چلا کر کہا۔ ''بندوقیں اٹھانے کے لیے بھی اجازت چاہیے۔ شرما۔''

سپاہی بھی خاموش تماشائی بنے کھڑے تھے۔ معاً صحن میں دونوں طرف بھنبھناہٹ شروع ہو گئی۔ اجیت کی آواز سن کر جیسے سپاہی چونک پڑے اور کھٹا کھٹ سب نے بندوقیں اٹھا کر کندھوں پر تان لیں۔

''ابھی صاحب آپ بولو! ادھری بہت سا نمٹنا پورا نہیں ہے۔ حساب چکتا کرنے کا تھا، مگر اپنے لڑکے نے کچھ بچتا نہیں چھوڑا جو ہم بولتے۔ ابھی آپ بولو صاحب!'' بٹھل نے درمیان میں کھڑے ہو کے کہا۔ عجیب ہی منظر بنا تھا۔ ایک طرف قطار میں پولیس کی جمعیت کھڑی تھی۔ دوسری طرف ہڑبڑاتے سینوں کے ساتھ اڈّے کے آدمی چپ سادھے کھڑے تھے۔ ان سے کچھ آگے رگھو چبھتی نظروں سے چاروں اور گھور رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی چھلیا کھڑا تھا۔ چھلیا کی نظریں ایسی بھاری ہو رہی تھیں جیسے منوں وزنی پتھروں سے لپیٹ دی گئی ہیں۔ وہ کچھ کر ہی نہ بیٹھتا۔ وسط میں بٹھل کھڑا تھا۔ اس کے پیچھے کنگر دار چھجے کے پاس زورا، جمرو، لنگو اور دھیارا۔ مجھ سے آگے انسپکٹر اجیت کھڑا تھا جو بٹھل کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''بٹھل صاحب! آپ کو تھانے جانا ہوگا۔ باقی سے مجھے کوئی تعرض نہیں۔ یہاں جو کچھ ہُوا میں اسے فراموش کر کے جا رہا ہوں۔'' اجیت نے دھیمے اور ٹھیرے ہوئے لہجے میں کہا۔ وہ شاتت ہو چکا تھا۔ اس کے تاثرات یک سر تبدیل ہو چکے تھے۔ میں وجہ سمجھنے سے قاصر تھا۔ بات کچھ سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

''بٹھل تنہا نہیں جائے گا۔'' مجھے معلوم تھا کہ میرے جملے سے بٹھل تلملا جائے گا، مگر کیا کیا جائے۔

''بٹھل اپنی ماں کے ساتھ جائے گا۔ بول اور بول رے... کلیجے میں کچھ بچا نہیں ہے رے۔'' حسبِ توقع بٹھل تھک کے پڑا۔

''بابر صاحب! آپ بھی ان کے ساتھ جا سکتے ہیں۔ آپ کے علاوہ جو آنا چاہے وہ تھانے آ سکتا ہے، مگر اپنی سواری پر۔'' اجیت کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ حیرت انگیز طور پر اُس نے بابر کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''بٹھل صاحب چلیں! حوالدار ان کی ہتھکڑی کی ضرورت نہیں، کھول دو۔''

حوالدار نے لرزتے ہوئی انگلیوں سے ہتھکڑی میں کھڑ پیچی گھمائی اور کھٹاک کر کے ہتھکڑی کھل گئی۔ بٹھل میری طرف دیکھے بنا انسپکٹر اجیت کے پیچھے بڑھ گیا۔ حوالدار نے زورا، جمرو، چھلیا، دھیارا اور لنگو کی ہتھکڑیاں بھی کھول دیں۔ رگھو وہیں سر پکڑ کے بیٹھ گیا۔ چھلیا اب بھی ویسے ہی کھڑا تھا، اسے اپنی سدھ بدھ نہیں تھی۔ اڈّے کے آدمی بکھرے چلے گئے تھے۔ میں بھی فوراً بٹھل کے پیچھے لپک گیا۔ گو اُس نے جان لیا تھا کہ میں اُس کے عقب میں آ رہا ہوں، مگر انجان بنا ہُوا تھا۔ اڈّے کے دروازے کے بالکل سامنے پولیس کی جیپ کھڑی تھی۔ گلی کے دونوں سروں پر لوگوں کے ٹھٹھ کھڑے تھے۔ چھتوں سے جھانکنے والوں کی کوئی کمی نہ تھی، تاہم اڈّے کے سامنے کوئی نہیں تھا۔ وہاں پولیس کا سخت پہرا تھا۔ اجیت جیپ میں آگے جا کے بیٹھ گیا۔ بٹھل پچھلی طرف چڑھ گیا۔ میں بھی دوسری طرف سے لپک کے بٹھل کے ہمراہ بیٹھ گیا۔ زورا اور جمرو بھی دوڑتے ہوئے آئے تھے۔ بٹھل نے انھیں ہاتھ کے اشارے سے روک دیا، تاہم اُس نے مجھ سے کوئی تعرض نہیں کیا، وہ میری موجودی ہی سے انکاری تھا۔ یہ بھی خواہ مخواہ ہی جھنجھناتا رہتا ہے۔ اسے صحیح صورتِ حال کا علم نہیں تھا۔ میں نے درست قدم اٹھایا۔ سوائے اس کے کوئی اور چارہ جو نہ تھا۔ نہ جانے بٹھل کو دیکھ کے اجیت پر کیا جادو ہُوا کہ وہ یک دم رام ہو گیا۔ اور پولیس پر حملے، پولیس کو یرغمال بنانے جیسے سنگین مقدمات سے بہ آسانی دست بردار ہو گیا۔ جیپ کا انجن جیسے ہی غرغرایا گلی محلے کے لوگ سمٹتے ہوئے محسوس ہوئے۔ جیپ جب گلی سے موڑ کاٹ

کے باہر نکل رہی تھی تو چھلیا اور رگھو بھی اڈّے سے باہر نکلتے نظر آئے تھے۔ لوگ بھاگ گھروں میں دبک گئے تھے، جب کہ بچے آخری دم تک جیپ کے پیچھے دوڑیں لگاتے ہوئے آئے تھے۔ بچپن خوب ہوتا ہے، ہر چیز کھلونا لگتی ہے۔ اس کی وجہ کسی نے درست ہی بتائی ہے کہ بچپن خود ہی کھلونا ہوتا ہے۔

راستے بھر کسی نے کوئی کلام نہیں کیا۔ حالاں کہ یہ رات کا کوئی پہر تھا، مگر لوگوں کی چہل پہل دن سے بڑھ کے تھی۔ خبر بڑی ہی تھی۔ رگھو استاد کے اڈّے کو پولیس نے گھیرے میں لے لیا ہے۔ کون ہوگا جو یہ سن کر متجسس نہ ہُوا ہو۔ اب تک اس واقعے کی ہزار داستانیں بن چکی ہوں گی۔ اور لوگ بڑھ چڑھ کے اپنی اختراع کو راہِ حق ثابت کرنے کے لیے بحث و مباحثے سے لطف کشید کر رہے ہوں گے۔ اڈّے باڑے کے نام سے جہاں لوگ خوف زدہ ہوتے ہیں وہیں اس کے تذکرے میں بے پناہ طلسم بھی محسوس کرتے ہیں۔ اڈّے کو چھو کر گزر جانے والی ہوا بھی قصۂ پارینہ بن جاتی ہے۔

تھانے تک کا سفر خاموشی سے گزرا۔ بٹھل گہری سوچ میں مستغرق تھا۔ یہ وہی عمارت تھی جہاں سے آج دن میں میں رہائی پا کر نکلا تھا۔ عمارت کی کھڑکیوں سے ملگجی روشنی باہر آ رہی تھی۔ دروازے پر تعینات سنتری کھڑا اُونگھ رہا تھا۔ یہاں اِرد گرد سناٹا تھا۔ کہیں کہیں کتّوں کے رونے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میرے اندر پھر سے شاکر علی تک پہنچنے کی ہوک جاگ رہی تھی۔ سنتری کو سوتا دیکھ کے ڈرائیور نے جیپ کی رفتار کم زیادہ کرنے والے قدمچے پر پاؤں کچھ زیادہ ہی جوش و خروش سے رکھ دیا۔ انجن تیز آواز سے بول اٹھا۔ سنتری نے سٹپٹا کے خراٹا بھرا اور جیپ کو سلام جڑ دیا۔ اس اثنا میں اجیت جیپ سے اتر کے اندر بڑھ چکا تھا۔ بٹھل اس کے پیچھے اور میں ان دونوں کے پیچھے پیچھے تھا۔ اجیت کے استغنا کا عالم میرے چودہ طبق روشن کیے دے رہا تھا۔ اُس نے پیچھے مڑ کے دیکھنے کی زحمت نہیں کی۔ مختلف راہ داریوں اور عمارتی تقاضوں سے گزر کے ہم اجیت کے کمرے میں پہنچے۔ اجیت اپنی کرسی پر جا کے بیٹھ گیا۔ بٹھل اُس کے سامنے جا کے کھڑا ہو گیا۔ بٹھل کی شکل سے صاف لگ رہا تھا کہ اس کے لیے بھی یہ اچنبھے سے کم نہیں ہے۔

''بیٹھیں آپ! یہاں سامنے والی کرسی پر بیٹھیں!'' اُس نے بٹھل سے اپنے مقابل بیٹھنے کو کہا۔

''نہیں صاحب! ادھری ٹھیک ہے۔ ابھی آپ بولو!''

بٹھل نے ستے ہوئے لہجے میں کہا۔ میں بٹھل کے عقب میں دروازے کے ساتھ ہی کھڑا ہو گیا تھا۔

''بٹھل بھائی آپ بیٹھیں! یہ ماحول دوستانہ ہے۔'' اجیت لپک کے اُٹھ آیا تھا اور بٹھل کے شانوں پر ہاتھ رکھ کے اُسے بیٹھنے کو کہا۔

بٹھل خاموشی سے بیٹھ گیا۔ میں وہیں دروازے کے ساتھ لگی ہوئی بینچ پر بیٹھ گیا۔ اجیت کا رویّہ ناقابلِ فہم تھا۔

''ابھی بھید بھاؤ بولو صاحب! سارا اسی اونچ نیچ میں اندر باہر گزر رہا ہے۔ سیدھ نہیں پڑ رہی صاحب!'' بٹھل نے رسان سے کہا۔ اس کی آنکھوں میں شدید اُلجھن تھی۔ اجیت کے چہرے پر پھیلنے والی مسکراہٹ گہری ہوتی جا رہی تھی۔

''بٹھل بھائی کلکتہ میں ایک علاقہ ہے اشوک نگر... اشوک نگر کے دو علاقے ہیں قاضی پاڑا اور صندل پاڑا...'' اجیت لطف اٹھاتے کے سے انداز میں بٹھل کی طرف دیکھنے لگا۔

بٹھل کی آنکھوں میں اندھیرا تھا۔ وہ خاموشی سے اجیت کو دیکھا کیا۔ اشوک نگر کا علاقہ کلکتہ کے مضافات میں تھا۔ میرا ایک دو بار ہی اُدھر سے گزر ہُوا تھا۔

''بٹھل بھائی! منڈل پاڑا کا شرلی رام آپ کو یاد ہے، جس کی اشوک نگر چوک پر پان بیڑی کی دکان تھی۔''

معاً بٹھل کی آنکھوں کے دیے روشن ہو گئے۔ وہ زیرِ لب کچھ بدبدانے لگا۔ ''ہاں یاد ہے۔''

''میں اسی شرلی رام کا بیٹا ہوں اجیت رام۔'' اجیت نے مختصر جملہ ادا کیا، مگر اس میں بھی اُس کی آواز رندھ گئی۔ وہ ہڑکنے لگا۔ بٹھل حیرت سے آنکھیں پھاڑے اُس کے نقوش پڑھ رہا تھا۔ معاً بٹھل وارفتگی سے اُٹھا۔ پھر تو گویا کمرے کی دیواریں لرز گئیں۔ بٹھل نے کچھ ایسے زور سے اجیت کو کرسی سے کھینچ کے بھینچا تھا کہ مجھے بھی اجیت پر رشک آ گیا۔ میری آنکھوں کے کونے چرمرانے لگے۔ اجیت بچوں کی طرح بٹھل سے چمٹا ہُوا بلک رہا تھا۔ بٹھل

برف کی طرح چپ چاپ پگھل رہا تھا۔ کچھ دیر اُس نے اجیت کو یونہی لپٹائے رکھا۔ اجیت کے باپ شرلی رام سے بٹھل کا کوئی خاص تعلق ہی تھا، تاہم میں شرلی رام سے متعلق نہیں جانتا تھا۔ یہ قصہ بٹھل سے میری ملاقات سے قبل کا لگتا تھا۔ کچھ ہی دیر میں ہم یوں بیٹھے تھے جیسے صدیوں سے ایک دوسرے سے واقف ہوں۔ بٹھل اس کی بلائیں لیتا نہ تھکتا تھا۔ بٹھل اس سے اس کے بارے میں پوچھتا رہا۔ وہ بٹھل سے سوالات کرتا۔ میں بھی بیچ بیچ میں گاہے گاہے ان کی گفتگو میں شریک ہوجاتا۔ گھنٹوں گزر گئے پتا ہی نہ چلا۔ ان کی گفتگو کا لب لباب یہ تھا کہ شرلی رام شیام بازار کا نامی گرامی دادا تھا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب بٹھل ابھی استادوں کی بجا آوری میں مشغول تھا اور کلکتے میں دھیرے دھیرے اپنا نام بنا رہا تھا۔ شرلی کے ایک آدمی سے بٹھل کا تنازعہ ہوگیا۔ بٹھل نے اس کی ران کھول دی۔ بٹھل کا نام اس سے قبل کئی مرتبہ شرلی رام تک پہنچ چکا تھا۔ شرلی اس نورسیدہ شعلے سے ملاقات کا خواہش مند تھا، تاہم پہل کرنا خلافِ شان سمجھتا تھا۔ بٹھل نے اب اس کے آدمی کو لٹا دیا تھا۔ بٹھل سے جواب طلبی اب چوکی کا استحقاق بن گئی تھی۔ بٹھل تھا کہ چھلاوے کی طرح غائب تھا۔ شرلی رام کے آدمی بٹھل کو ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔ ایک دن بٹھل خود شرلی رام کے پاس پہنچ گیا۔ بٹھل نے چاقو کھول لیا۔ شرلی رام کی شاقی کا زمانہ معترف تھا اور بٹھل گلی کا لونڈا تھا۔ شرلی رام کو چھوکرے کے تیور شاہانہ لگے تھے۔ وہ میدان میں اتر آیا۔ شیام بازار کے اڈّے والوں کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں، جب کلکتہ کے نامی گرامی استاد کو بٹھل نے اپنے داؤ کی زد سے دانستہ رعایت دی تھی۔ ایک مرتبہ تو شرلی رام فاش خطا کھا گیا تھا اور اپنے جھونک میں آگے گزر گیا تھا۔ اس کی پشت بٹھل کی طرف تھی اور بٹھل کے پاس مہلت ہی مہلت تھی۔ بٹھل نے کمالِ بے نیازی سے چاقو فضا میں اچھال کے دوسرے ہاتھ میں دبوچ لیا تھا۔ چھوکرے کے ہاتھ برق کی طرح لپکتے تھے۔ جب شرلی رام پلٹا تو بٹھل نے اپنا چاقو اُس کے قدموں میں پھینک دیا۔ بٹھل کے انداز ہی نہیں اطوار بھی شاہانہ تھے۔ بٹھل پلٹ کے جانے لگا تو شرلی رام ایک نعرۂ مستانہ مار کے اُس سے لپٹ گیا۔ اس جوان نے اُسے پچھاڑا کیا تھا، بس جیت لیا تھا۔ شرلی رام اُسی وقت چوکی چھوڑنے پر مصر تھا، مگر بٹھل نے اُسے جتا دیا کہ اُس کا ایسا کوئی ارادہ نہ تھا۔ وہ استاد شرلی رام کی دل سے قدر کرتا تھا۔ استاد کا نیاز مند ہی رہنا چاہتا ہے۔ بٹھل کا مقصد بس یہ باور کرانا تھا کہ استاد کے آدمی کی غلطی تھی۔ ادھر استاد بٹھل کو نظروں سے دُور کرنے پر آمادہ ہی نہ تھا۔ ایسے شاہ کار قدرت کم کم ہی بناتی ہے۔ یوں بٹھل اور استاد شرلی رام کی واقفیت ہوئی۔ بہت تھوڑے ہی عرصے میں دونوں کے تعلقات گہری انسیت میں تبدیل ہوگئے۔ مجرے سا تجھے ہونے لگے۔ اس دوران بٹھل کے علاقے بڑھتے چلے گئے۔ اس کی قلم رو علی پور سے لے کر سامن گھاٹ تک پھیل چکی تھی۔ اِردگرد کا پورا علاقہ بٹھل کے نام سے لرزنے لگا۔ بٹھل کا شرلی رام سے میل ملن ذرا کم ہوگیا۔ ایک دن بٹھل کو اطلاع ملی شرلی رام قاضی پاڑے کی ایک ودوا اُستانی کو دل دے بیٹھا ہے۔ چوکی چھوڑ کے دن رات قاضی پاڑے کے پھیرے لگاتا رہتا ہے۔ قصہ کچھ یوں تھا، ایک دن شرلی حسبِ معمول اڈّے کے باہر چارپائی لگا کے بیٹھا ہی تھا کہ سرخ وسپید رنگت، گداز بدن اس پر سپید ساڑھی میں ملبوس ایک جوان خاتون طنطناتی ہوئی وہاں وارد ہوئی۔ وہ غصے سے بھری ہوئی تھی۔ وہ سیدھی شرلی کے پاس پہنچی اور باوقار انداز میں اُسے لتاڑنا شروع کردیا۔ کلکتہ میں سرخ وسپید رنگت شاذ و نادر ہی نظر آتی تھی۔ وہ حسن و جمال کا باوقار پیکر بنی تھی، مگر اس کی اصل خوب صورتی جو شرلی کو بھائی تھی وہ اس کا طنطنہ تھا۔ غصے میں لال بھبوکا چہرہ، پیشانی پر خطاطی کا شاہ کار باریک سلوٹیں۔ بھرے بھرے بدن پر کسی ہوئی ساڑھی۔ اُس نے بھری گلی میں شرلی رام کو ننگِ خاندان جیسے القابات سے نوازنا شروع کر رکھا تھا۔ وہ شیام بازار اپنے رشتے دار کے ہاں آئی تھی۔ ایک اچکا اُس کا بٹوا لے اڑا تھا۔ وہ پوچھتے پچھاتے یہاں تک پہنچی تھی۔ بٹوے میں نقدی، گہنے اور کچھ اہم کاغذات تھے۔ اُس نے سرِعام شرلی رام کو دھمکی دی کہ اگر اس کا بٹوا واپس نہ لوٹایا گیا تو یہیں آتما ہتیا کرلے گی۔ اڈّے والوں کے نتھنے پھٹنے لگے تھے، مگر شرلی رام اسے دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ شرلی رام کے کہنے پر پوچھ تاچھ شروع ہوگئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ خاتون اپنا نام پتا بتائے بغیر وہاں سے اپنا بٹوا لے کر جا رہی تھی، مگر اس کے ساتھ بٹوے کے علاوہ ایک قیمتی چیز شرلی رام کا دل بھی تھا جو اس کے قدموں سے لپٹا ہوا ساتھ ساتھ چلا جا رہا تھا۔ شرلی رام نے اُس کے پیچھے ایک آدمی دوڑا دیا۔ جو رات گئے واپس آیا۔ وہ اس خاتون کا نام پتا نکال لایا تھا۔ وہ قاضی پاڑے میں رہتی تھی، ایک جولاہے کی بیٹی تھی۔ منڈل پاڑے کے سرکاری اسکول میں پڑھاتی تھی۔ دو برس قبل اس کا بیاہ منڈل پاڑے کے رہائشی سریش کرور سے ہوا تھا جو صرف چھ مہینے بعد ہی چل بسا تھا۔ استانی کا نام روپا کرور تھا اور وہ قاضی پاڑے میں اپنے باپ کے ساتھ رہائش پذیر تھی۔ بہت سے اس سے بیاہ رچانے کے آرزومند تھے، مگر روپا کرور پکی دھرم داسی تھی۔ وہ اگلے جنم میں بھی سریش کرور کے ساتھ ہی جیون بتانے پر یقین رکھتی تھی۔ شرلی رام نے یہ کتھا سنی تو سلگتے ہوئے دل کو بجھانا چاہا، مگر دل تھا ہی نہیں۔ دہکتا آتش فشانی خلا تھا۔ شرلی رام نے وہاں کے پھیرے لگانے شروع کردیے۔ روپا کرور نے اُسے بری طرح جھڑک دیا۔ وہ دوسرے بیاہ کا تصور بھی نہیں کرسکتی تھی اور وہ بھی ایک لچے لفنگے بدمعاش سے۔ ادھر شرلی رام کی آگ بھڑکتی چلی گئی۔ وہ دیوانہ ہو کے قاضی پاڑے اور منڈل پاڑے کے درمیان گھومنے لگا۔ اڈّے کے آدمی اس کے آگے پیچھے رہتے تھے، اس بنا پر اس سے کوئی تعرض نہیں کرتا تھا۔ اُس نے اپنے کارندوں کو ہاتھ جوڑ جوڑ کے کہا وہ اس کے پیچھے نہ آیا کریں۔ اپنا کوئی اور استاد ڈھونڈ لیں۔ شرلی رام میں کوئی بات تو تھی، بٹھل نے یونہی اُس کے سامنے چاقو نہیں پھینک دیا تھا۔ اڈّے والے اُس کے پیچھے دیوانے ہو رہے اور وہ روپا کرور کا دوانہ ہو رہا تھا۔ آخر ایک دن روپا کرور کا دل پسیج گیا۔ وہ بھی جہاں دیدہ خاتون تھی۔ اس نے شرلی سے کہا کہ اگر وہ شرافت کا کوئی کاروبار کر دکھائے تو وہ اس کے بارے میں سوچ سکتی ہے۔ کاروبار سے مراد یہ ہے کہ اس میں اڈّے پاڑے کی کمائی کا ایک دھیلا بھی نہیں ہونا چاہیے۔ خواہ وہ چھابڑی ہی کیوں نہ لگالے۔ شرلی کی دیوانگی کا روپا کرور نے غلط اندازہ لگایا تھا۔ شرلی رام کے ہاتھ میں ماں کا دیا ہوا کڑا تھا۔ وہ اُس نے اونے پونے بیچا اور روپا کرور کے اسکول کے سامنے پان بیڑی کی دکان کھول لی۔ یہی وہ دورانیہ تھا جب بٹھل کو اس معاملے کی بھنک پڑی تھی۔ وہ دوڑا دوڑا منڈل پاڑے پہنچا۔ استاد شرلی رام کو گلوریاں بناتے دیکھ کر بٹھل آب دیدہ ہوگیا۔ کہاں وہ ذی شان، ذی وقار رعب دار استاد شرلی رام جس کے نام کی گونج سے پورا کلکتہ دھمکتا تھا اور کہاں یہ تانبے کی کٹوریوں میں شاخیں تھمانے والا شرلی پان بیڑی والا۔

بٹھل نے استاد شرلی رام کی صورت دیکھ کر ہی تمام محبتیں اپنے سینے میں دفن کرلی تھیں۔ استاد کے پاس کچھ دیر بیٹھ کے واپس آگیا تھا۔ البتہ جب استاد نے بنارسی پان بنا اُس کے کلّے میں مشاقی سے ٹھونسا تو بٹھل سے رہا نہ گیا۔ بلک بلک کے رو پڑا۔ روپا کرور نے استاد سے بیاہ کرلیا اور وہ بیں منڈل پاڑے میں شرلی کے ساتھ کرائے کے مکان میں اُٹھ آئی۔ بٹھل گاہے گاہے چکر لگایا کرتا تھا۔ استاد کے بیٹا پیدا ہوا تو بٹھل مٹھائی کے ٹوکروں سے لدا پھدا وہاں پہنچا تھا۔ روپا کرور نے وہ سارے ٹوکرے گلی میں پھنکوا دیے تھے۔ بٹھل استاد کو دیکھ کر چپکا ہو رہا۔ بٹھل بھی آتا جاتا رہا اور یوں کئی سال بیت گئے۔ شرلی رام اپنی دنیا میں مگن ہوگیا تھا۔ بٹھل کو شرلی رام کی یہ ادائے دل ستانی خوب بھائی تھی۔ استاد سے اس کا دل لگ گیا۔ استاد کا بیٹا اجیت بٹھل کو چاچا کہہ کر بلاتا تو بٹھل کو بھلا لگتا تھا۔ روپا کرور کو بٹھل اور اڈّے کے دوسرے افراد کا استاد کی مزاج پرسی کو آنا سخت ناپسند تھا۔ ایک دن صبح استاد کی دکان جب نہیں کھلی تو لوگوں کو پتا چلا کہ شرلی رام پان بیڑی والا اپنی بیوی اور بیٹے کے ساتھ دکان مکان چھوڑ کے نامعلوم منزل کی طرف نکل گیا ہے۔ اس کے بعد بٹھل کو شرلی رام کا پتا نہیں چلا کہ اسے زمین کھا گئی یا آسمان نکل گیا۔ اجیت نے بتایا کہ ولواڑا ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ اس کے قریب ہی ایک شہر ہے اُناؤ، وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ وہیں مقیم ہے۔ اس کی ماں حال ہی میں پنشن پر آگئی۔ یہ عشق بھی کیا کیا کام کروا دیتا ہے۔ شرلی رام نے گزارے لائق لکھنا پڑھنا سیکھ لیا تھا اور ڈاکیے کی سرکاری نوکری کر رہا تھا۔ اجیت کا کہنا تھا کہ پوچھتے ہی وہ انھیں گھر لے چلے گا۔ جیپ میں گھنٹے بھر کا سفر بھی نہیں ہے۔ اس کا باپ بٹھل کو دیکھ کر باغ باغ ہوجائے گا، تاہم بٹھل نے جواب میں ہنکارا ہی بھرا تھا۔ باروٹیہ کا قصہ چلا تو بٹھل نے بتایا کہ باروٹیہ کو انھوں نے زندہ سلامت واپس کیا تھا، تاہم اجیت نے اس بات کی تصدیق کی کہ باروٹیہ ہلاک ہوچکا ہے۔ اجیت نہ صرف بہ حیثیت پولیس آفیسر باروٹیہ کے بارے میں اچھی رائے رکھتا ہے، بلکہ اجیت کی اخلاقی ہم دردیاں باروٹیہ کے ساتھ ہیں۔ اجیت کا کہنا تھا کہ بدیشی لوگوں سے دھرتی کو آزاد کروانے کی جنگ میں وہ باروٹیہ کے ساتھ ہے۔ اجیت نے اعتراف کیا کہ وہ بٹھل کو بالا ہی بالا ہلاک کرنے کا منصوبہ بنا چکا تھا۔ گڑگاؤں کے

مطالبے والی کہانی اجیت کی اپنی ہی گھڑی ہوئی تھی۔ پولیس اور گلاؤٹی کے درمیان رابطہ اجیت ہی تھا۔ اجیت نے اپنے افسران کو باور کروایا تھا کہ بٹھل کی گرفتاری ازحد ضروری ہے، جب کہ بابر کی رہائی کے لیے براہِ راست دلی سے دباؤ ڈالا گیا تھا۔ اس حوالے سے مزید گفتگو کرنے میں اجیت نے ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کیا۔ ہم نے بھی کریدنا مناسب نہ سمجھی۔ اُس کی جانب سے ہم دلواڑا میں آزادانہ نقل و حرکت کے اور یہاں سے جانے کے لیے آزاد تھے، تاہم ہمیں دلواڑا میں گلاؤٹی کے لوگوں سے محتاط رہنا ہوگا۔

باتوں میں خبر بھی نہ ہوئی اور صبح ہوگئی۔ اجیت بجھا جا رہا تھا۔ گفتگو کے دوران اُس نے نہ جانے کیا کیا الم غلم منگوا لیا تھا۔ جو ہم دھیرے دھیرے ٹونگتے رہے تھے۔ اجالا ابھی پھیلا نہیں تھا کہ اجیت اُٹھ کھڑا ہُوا۔

''بٹھل چاچا، اب باقی باتیں پتا جی کے ساتھ کریں گے۔ یقین جانیں وہ باغ و بہار ہو جائیں گے۔''

''نہیں رے۔ پھر بھی آئیں گے تو اِدھر بھی جھانکا ماریں گے۔ ابھی جانے دے۔'' بٹھل نے اجیت سے نظریں پھیرتے ہوئے کہا۔

''نہیں چاچا یہ کیسے ممکن ہے۔'' اجیت اُچھل پڑا۔ اس کے پاؤں میں پھلجھڑیاں اُلجھ گئیں۔

''ممکن وہ بھی نہیں تھا جو شرلی استاد نے ٹھونک دیا رے۔'' بٹھل نے دھیرے سے کہا اور باہر نکلنے کے لیے مڑ گیا۔ اجیت دوڑ کے سامنے آ گیا۔ ''پتا جی کو پتا چلے گا تو وہ مجھے گھر میں گھسنے نہیں دیں گے۔'' اجیت مچل مچل رہا تھا۔

بٹھل نے شگفتگی سے راستہ بنایا اور پیچھے مڑے بنا کہا۔

''ہمیں تیری ماں نہیں گھسنے نہیں دے گی رے۔'' بٹھل کے لہجے کا کرب تھا کہ میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ وہ عجیب دیوانگی سے اپنا سر جھر جھراتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ اجیت کو سکتہ ہو گیا تھا۔ اُس کی زبان کسی نے نوچ لی تھی۔ مجھ سے ٹھیرا نہ گیا کہ اجیت کی دل جوئی کرتا۔ میں بھی بٹھل کے پیچھے آ گیا۔ منشی کے کمرے میں چھلیا، رگھو، جمرو اور زورا بیٹھے تھے۔ ان کی شکلوں پر رت جگے کا نوشتہ سجا تھا۔ چھلیا لپک کے اُٹھا اور بٹھل سے لپٹ گیا۔ بٹھل اسے لے کے خاموشی سے باہر نکل گیا۔ وہ بے جان مٹی کے پتلے کی طرح چل رہا تھا۔ بٹھل کے شانے کتنے ڈھلک گئے تھے۔ میں اس سے کہنا چاہتا تھا۔ شاید میرے ہی ادعا میں کوئی نقص تھا۔ میں اس سے کہہ نہیں پاتا تھا۔ سائلوں کی طرح یوں گلی کوچوں میں اس کی خواری مجھ پر بھی گراں بار ہے۔ ایک حد تک ہی آدمی آدمی کے ساتھ چل سکتا ہے۔ ایک حد تک ہی کسی کو دوسرے کے بوجھ میں شریک ہونا چاہیے۔ میں غلط ہی کیا سوچ رہا تھا۔ میں نے دیکھا تھا زریں کے پاس پہنچ کے بٹھل کے چہرے پر کیسا سکون چھا جاتا ہے۔ زریں تو واقعی کوئی شجرِ سایہ دار ہے۔ وہاں جا کے بٹھل زریں کے اشاروں کا منتظر رہتا تھا۔ آدمی کو جہاں تعمیلِ حکم میں آسودگی ملے، بٹھل کے لیے زریں کی حویلی بھی ایسی ہی جگہ تھی۔ وہاں جا کے وہ کوئی دوسرا آدمی ہوتا۔ اس درخت میں ایک نئی کونپل پھوٹ جاتی۔ اُس نے اڈا ترک کر دیا تھا۔ جہاں ایک عرصے سے اُس کی حکومت قائم تھی۔ ایک نظرِ غلط پر پروانے فدا ہو جاتے تھے۔ اس نے اڈے کے ان ساتھیوں سے کنارہ کر لیا تھا جو غلاموں کی مانند اُس کی جنبشِ ابرو کے اسیر تھے۔ اپنے ساتھ مجھے اُس کی ہمہ وقت بے آرامی کا احساس رہتا تھا۔ مجھے بھی تو اُس کا خیال کرنا تھا، اُس کی خاطر داری میری لیے بھی مطلوب خاطر تھی۔ میں بہی کچھ اُس سے کہنا چاہتا تھا، مگر لفظ کہیں کھو گئے تھے۔ شاید مجھے اس کی دل برداشتگی اور ناراضی کا خدشہ تھا۔ مجھ پر تو خود یہ واضح نہیں تھا کہ میری منشا کیا ہے؟ میں چاہتا کیا ہوں؟ میری امید میں اب پہلے سا اضطراب نہیں رہا تھا۔ وہ یقین اب بہت سوں میں تقسیم ہو گیا تھا، مگر ایسا بھی نہیں تھا۔ یہ مولوی صاحب ہی تھے جو مجھ سے دامن کشا رہنا چاہتے ہیں تو میں کیا کر سکتا ہوں۔ جہاں جہاں ہم اُن کے قریب ہُوا چاہتے ہیں وہ ہم سے دُور چلے جاتے ہیں۔ وہ کسی ایک جگہ کے ہو کر بھی نہیں رہتے۔ نہ جانے اُن کے ساتھ کیا مسئلہ درپیش ہے جو ہر وقت اڑے اڑے پھرتے ہیں۔ ہاں، ان میں ان کا بھی کیا قصور۔ اُن کے تو ہوائے بہار ہم رکاب تھی۔ جس کی خوش بو بھلا چمن سے چھپائے کہاں چھپتی ہے۔ یہ بھی نہیں تھا کہ ہم ناکام رہے ہوں۔ کئی جگہ بس آگے پیچھے کی بات ہوگئی۔ ہم اُن کے گھروں تک پہنچ گئے تھے جہاں اُن کا قیام رہا تھا۔ مراد آباد، نگریا سادات، صدر آباد اور اب یہ دلواڑا۔ انھیں دلواڑا جیسے الگ تھلگ مقام پر آنے کی بھلا کیا ضرورت تھی۔ یہاں بھی نہیں تھا۔ پھر یہاں بھی بس نہیں کی کہیں اور نکل گئے۔ اب بمبئی کی خبر ہے۔ وہاں بھی کہاں ہوں گے، وہاں کی کھوج بھی نکل ہی جائے گی، وہ وہاں سے آگے نکل جائیں۔ بس وہ آگے آگے دوڑتے رہیں گے اور ہم ان کے پیچھے پیچھے۔ بٹھل کو میں کیسے بتاتا کہ اس کے ساتھ رہتے ہوئے بھی میں کیسا تنہا رہتا ہوں۔ کیسی آگ میرے اندر بھڑکتی ہے۔ کیسے کیسے انگارے مجھے دہکاتے رہتے ہیں۔ میرے سینے میں مسلسل ہوک سی اٹھتی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ دیواروں سے سر پھوڑ لوں۔ اپنا منہ نوچ لوں۔ کسی ویرانے میں گھر کر لوں۔ کوئی میری پرسش نہ کیا کرے۔ کوئی زخموں پر مرہم نہ رکھا کرے۔ میں کب چاہتا ہوں کہ کوئی میری آگ میں جلے۔ میں کوئی پاگل نہیں ہوں۔ میرے حواس میرے ساتھ ہیں جو میرے ساتھ دیا جائے۔ نہ پنگوڑے میں کھیلتا کوئی بچہ ہوں جسے ہر وقت نگہداشت کی ضرورت ہو۔ میں مخبوط الحواس تو نہیں ہوں۔ مجھے اپنے اچھے برے کی خوب تمیز ہے۔ کالا پیلا رنگ پہچان لیتا ہوں۔ صحیح دیکھتا ہوں۔ صحیح سنتا ہوں، لیکن میں کیا کروں سب کچھ میری استعداد میں بھی تو نہیں ہے۔ میں خود کو بہت روکتا ہوں، خوب ٹوکتا ہوں، خود کو سمجھاتا ہوں۔ میری استطاعت بس اس قدر ہے۔ آدمی بہت محدود ہے، بس ایک دائرے میں سننے اور سمجھانے کی توفیق رکھتا ہے۔ یہ دنیا آدمی سے بہت بڑی ہے۔ ایک دنیا میں پر کیا مستزاد یہاں تو ہر چیز آدمی سے بڑی ہے۔ یہاں کی بڑائی کا کوئی شمار نہیں، کوئی حد و حساب نہیں۔ بے شمار اس کی سمتیں ہیں۔ بے پناہ اس کے فاصلے۔ کون ہے جو ان فاصلوں اور سمتوں کو عبور کر سکتا ہے۔ جنبش تو بقدرِ استطاعت ہی کی جا سکتی ہے۔ جیل سے آنے کے بعد میں نے کوئی لمحہ نہیں گنوایا۔ میں تو بھاگتا ہی رہا، میں جو نظر آتا ہوں وہ بھلا کہاں ہوں۔ ایک آدمی کا اندرون کسی کو کیا نظر آ سکتا ہے۔ بٹھل کو جو نظر آتا ہے وہ اتنا نہیں جتنا میں خود سے نبرد آزما ہوں۔ میں اُس سے کہنا چاہتا تھا کہ بے شک زریں کا خیال میرے لیے لطف و راحت کا باعث بنتا ہے، لیکن جانے کیوں جب وہ سامنے آتی ہے تو کہیں سے کورا بھی چپکے سے اس کے پہلو میں آ کے کھڑی ہو جاتی ہے۔ پھر میری آنکھیں کہاں میری رہتی ہیں۔ انھیں کوئی انگاروں کے دام خرید لیتا ہے۔ میرا سینہ گھٹنے لگتا ہے۔ بٹھل سے میں کیا کہوں، فیض آباد میں زریں کی حویلی ہو یا بمبئی میں ابا جان کا عالی شان مکان، میں اُس کے ساتھ ہلکورے لیتی کشتی میں سوار ہوں اور وہ دل نشین نہایت بلیغ، شائستہ اور اثر آفریں پیرائے میں گفتگو کر رہی۔ وہ جولین ہو جس کی معیت میں زریں جیسی ٹھنڈک اور جذب و کیف ہے، میں کسی سرتاپا عنایت لطف و کرم شخصیت کے سامنے ہوں یا کسی حقیر نظر اور خوش نما نظر کے سامنے میرا دل بہت جلد گھبرانے لگتا ہے۔ میں تو مسلسل اُس کی آوازیں سنتا ہوں۔ جیسے وہ مجھے پکار رہی ہو۔ میری طرح سے وہ آزردہ ہو۔ کوچہ گردی کے اس کاروگر میں ایک طمانیت تو ہے۔ ایک امید پوشیدہ تو ہے کہ ایک نہ ایک دن میں اُس کے پاس پہنچ سکتا ہوں، لیکن یہ بٹھل آخر کب تک اپنی جان جلائے گا۔ جیسے میں جل رہا ہوں، کیا یہ بھی جل رہا ہے؟ اِسے کسی چیز کی جلن ہے۔ اسے اب کیسا ٹھکانا کرنا ہوگا۔ مجھے خبر ہی نہ ہوئی کہ کب ہم منزلیں مارتے ہوئے اڈّے پر پہنچ چکے ہیں۔ گلی محلے کے معززین اڈّے کے دروازے پر ہاتھ جوڑے کھڑے تھے۔ بٹھل پژمردگی سے بے حال ہُوا جاتا تھا۔

لوگ اچھل اچھل کے مبارک بادیں دے رہے تھے۔ اچھا بھلا ہجوم امڈ آیا تھا۔ اڈّے کے اثر و رسوخ کی دھاک سب کے دلوں میں بیٹھ گئی تھی۔ پولیس کا اتنا بڑا چھاپا اور وہ بھی ناکام۔ لوگ خوش تھے، لوگ تب بھی خوش تھے جب ہمیں لے جایا جا رہا تھا۔ لوگ اب مسرت آگیں جذبات کا اظہار کر رہے تھے۔ لوگوں کا کام ہی خوش ہونا ہے۔ کسی کا غم ہو یا دکھ یہ اس میں سے مسرت کشید کرنا جانتے ہیں۔ ہمیں دروازے پر ہی روک لیا گیا تھا۔ کچھ منچلے ہار لے آئے تھے۔ کوئی پل تھا کہ میں برافروختہ ہو جاتا۔ بٹھل کو تنہائی درکار تھی اور کچھ مجھے بھی۔ روپا کرور کے تذکرے پر اسے چرکا خوب لگا تھا۔ گھر کی قدر و قیمت تو بے گھر ہی جانتے ہیں۔ جب اُس نے کہا تھا کہ تیری ماں ہمیں گھر میں نہیں گھسنے دے گی تو کم مائیگی کا احساس کیسے چھلکتے ہوئے زردی کی طرح چھلکا تھا۔ زبان سے کہا حقیر نہیں ہوتا۔ بادشاہ سے فقیر ملنے سے انکار کر دے تو بادشاہ دو کوڑی کا نہیں رہتا۔ خواہ وہ فقیر کے ٹکڑے چیل کوؤں کو کھلا دے، بادشاہ کم مائیگی کا احساس مٹا نہیں سکتا۔ بٹھل کو اس احساس نے توڑ دیا تھا۔ کیسی زردی سمٹ آئی تھی اس کے نقوش میں، بانس کا سلگتا ہوا جنگل نظر آتا تھا۔

ہم بہ مشکل اندر پہنچے۔ بٹھل کے لیے دالان میں چارپائی کھینچ دی گئی۔ چھلیا نے اندر پہنچتے ہی چیخ و پکار شروع کر دی تھی۔ رگھو بہ دستور بجھا بجھا اور پژمردہ تھا۔ بٹھل چارپائی پر بس گر ہی گیا۔ دھیارا دوڑا دوڑا گیا اور حقہ سلگا لایا تھا۔ تازہ خمیر کی وہ مہک جس کا بٹھل شیدائی تھا خوب اٹھ رہی تھی۔ دھیارے نے منقش نَے بٹھل کی طرف بڑھائی، مگر اُس نے بے دلی سے دھیارا کا ہاتھ جھٹک دیا۔ بٹھل کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ تنہائی کا کوئی رفیق تو اُسے رکھنا تھا اس وقت حقہ پی لینا چاہیے تھا، مگر وہ کسی اور ہی دنیا میں پہنچا ہوا تھا۔ شاید اپنا گھر دیکھ رہا تھا۔ زریں کا گھر۔ جو اُس کے بازوؤں میں شیر خواروں کی طرح تھی۔ مجھ سے اور دیکھا نہ گیا۔ میں اندر کی طرف بڑھا تو رگھو میرے پیچھے آ گیا۔ وہ مجھے اپنے کمرے میں لے آیا۔ میں اندر جا کے ایک طرف پڑ گیا۔ اُس نے بھی مجھ سے معترض نہیں کیا۔ درد مشترک ہو تو زبان عذر لنگ کی سی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ کبھی کچھ خود بہ خود بنا کہے، بنا سنے ہو جاتا ہے۔ سن بھی لیا جاتا ہے، سنا بھی لیا جاتا ہے۔ رگھو مجھے کمرے میں چھوڑ کے خاموشی سے باہر نکل گیا۔ اور اس کے باہر نکلتے ہی دروازہ کھول کے چھن سے وہ در آئی۔ وہ صد فیصد کوراہی تھی۔ میں اپنی سدھ بدھ کھو بیٹھا تھا۔

دن ڈھلے تک میں بے خبر پڑا رہا۔ دھیارا نے مجھے آ کے اٹھایا۔ بٹھل نے بلوایا تھا۔ دھیارا نے بتایا کہ میں بخار میں پھنک رہا تھا۔ میں نے اُسے منع کیا کہ بخار کا تذکرہ باہر کسی سے نہ کرے۔ میں اُس کے ساتھ باہر نکل آیا۔ صحن کا رنگ روپ ہی بدلا ہوا تھا۔ گلاب کی خوش بو چار سو پھیلی ہوئی تھی۔ صحن میں سفید چاندنی بچھی تھی۔ دیوار کے ایک طرف عنابی گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے تو دوسری دیواروں پر سنہری پنیوں کی بل کھائی ہوئی جھالریں جھول رہی تھیں۔ قندیلوں سے روشنی فیاضی سے پھوٹ رہی تھی۔ اِدھر سے اُدھر، اُدھر سے اِدھر کارندے دوڑے دوڑے پھر رہے تھے۔ درمیانی تکیے پر ٹیک لگائے بٹھل راجا بنا بیٹھا تھا۔ یہ وہ صبح والا بٹھل نہیں تھا۔ پژمردہ ویران کھنڈر۔ بٹھل نے کورے لٹھے کا سفید کرتا پاجاما زیب تن کر رکھا تھا۔ خوب نکھرا اور اُجلا اُجلا لگ رہا تھا۔ نوابین کے سے وقار سے سنہری نَے بار بار منہ سے لگاتا چھوڑتا بھلا لگ رہا تھا۔ اس کے برابر میں چھلیا تھا۔ سرخ بھڑکیلے کرتے اور سفید پاجامے میں ملبوس۔ اس کے دائیں رگھو بیٹھا تھا کھویا کھویا سا۔ بائیں طرف ایک تکیہ خالی تھا۔ غالباً مجھے وہاں بیٹھنا تھا۔ سامنے ہی جمرو، زورا، لنگو بیٹھے تھے۔ دھیارا بٹھل کے پاؤں داب رہا تھا۔ بٹھل عالم استغنا میں یوں بیٹھا تھا جیسے دھیارا اس کے پاؤں دبا ہی نہیں رہا۔ کسی بھگوان کے پوتر قدموں کو دھو رہا ہے۔ ان کے سامنے میووں سے بھرے تشت رکھے تھے۔ بادام، پستے، الائچیاں، سونف، بتاشے، ایک تھال میں چاندی کے ورق میں لپٹی گلوریاں پڑی تھیں۔ ان سے آگے ساز اور کلاونت شوخ زرد رنگ کے کرتوں پاجاموں اور سیاہ رنگ کی واسکٹ میں ملبوس بے چین و مضطرب بیٹھے تھے۔ سارنگی نواز سوت سے زخمہ صاف کر رہا تھا۔ یہیں تیرگی میں ایک چاند بھی چمک رہا تھا۔ تکلف میں کاڑھے گئے گھونگھٹ سے جھلکتا سفید چہرہ۔ تیکھی اور کجلائی آنکھیں، ابیض پیشانی، اس پر چھیڑ چھاڑ کرتی ایک آوارہ لٹ، خط کشیدہ مژگان کے درمیان ایک ننھی سی بندیا۔ مؤدبانہ خم سے جھکی ہوئی گردن، وہ بڑے رچاؤ سے بیٹھی تھی۔ نہ جانے کس نے بالا خانوں میں یہ اُڑا دی تھی کہ غزال سہما ہوا زیادہ حسین لگتا ہے۔ وہ بھی سہمی سہمی سی لجائی بیٹھی تھی۔ چھلیا نے بازار گرم کر رکھا تھا۔ جسے دیکھ کر سب کے چہرے کھل پڑے۔

"ادھر بھی سوامی جی ادھر آنے کا ہے۔" میں زورا کے پاس بیٹھنے لگا تو چھلیا نے آواز لگائی۔ وہ خوب ترنگ میں تھا۔ میں بٹھل کے برابر جا کے بیٹھ گیا۔ میرے بیٹھتے ہی چھلیا نے پاس بیٹھے ایک بڑے میاں کو اشارہ کیا تو اُنھوں نے بانسری اٹھائی کہ بانسری گنگنانے لگی۔ نہ جانے وہ کون سی دھن تھی جو بڑے میاں نے بانسری سے چھیڑی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں تماشا بین بے حال ہونے لگے۔ ایک سانس گرتا تو وہ دوسرا اٹھا دیتے، دوسرے پر تیسرا۔ بٹھل بھی سر دھننے لگا۔ چھلیا تو گھٹنوں کے بل کھڑا ہو کر جھوم رہا تھا۔ بڑے میاں کی آنکھوں سے پانی رسنے لگا تو اُنھوں نے دھیرے دھیرے بانسری کو زمین پر اتارنا شروع کر دیا۔ پھر تو جیسے سب کچھ طے تھا۔ ڈھولچی نے تھاپ دی اور وہ شرمیلی ادا سے بل کھاتی ہوئی اٹھی۔ اُدھر ڈھولچی نے ہاتھ روکے اِدھر اُس کے پیروں میں گھنگھرو چھنا چھن، چھن چھن، چھنا چھن چھن کرنے لگے۔ رقص کر رہی تھی کہ شاعری۔ اُس کے اعضا کی حرکت میں بے باکی اور شرماہٹ کا عجیب توازن تھا۔ اُس نے مقامی زبان میں نغمہ چھیڑا۔ سچ کہا ہے کسی نے کہ موسیقی کی کوئی زبان نہیں ہوتی۔ یہ ہر زبان کی زبان ہے۔ اسے سب سمجھتے ہیں۔ یہ سب کو ہنساتی ہے، یہ سب کو رلاتی ہے۔ کچھ دیر قبل بانسری نواز بڑے میاں کا طوطی بول رہا تھا اور گمان تھا کہ اس سے خوب بھی بلا کیا ہوگا۔ اب لگتا تھا کہ بڑے میاں نے وقت ہی گنوایا۔ وہ مغنیہ ایسی تھی کہ سنا کیجے، رقاصہ ایسی کہ بس دیکھا کیجے۔ ڈھولچی کی تھاپ سے تو گویا اُس کے قدموں کی ڈور بندھی تھی، مجال ہے کہ تھاپ سے ایک جھنکار کم یا زیادہ ہو جائے۔ وہاں تو ہنگامہ بپا ہو گیا۔ سب سے پہلے جھومتا ہوا چھلیا اٹھا۔ پھر تو سبھی مچلنے لگے۔ زورا تڑپ تڑپ جا رہا تھا۔ نوٹوں کی گڈیوں پر گڈیاں کھلنے لگیں۔ خدام سے زر پیا سمیٹا نہیں جا رہا تھا۔ آخر چھلیا نے ہاتھ پکڑ کے بٹھل کو بھی گھسیٹ لیا۔ بٹھل نے بھی ٹھمکے لگانے شروع کر دیے۔ رات گئے تک ہنگامہ چلتا رہا۔ رقاصہ انّا سے بلوائی گئی تھی۔ وہ جس تانگے میں آئے تھے واپسی کے لیے بھی اسی کو پابند کر لیا گیا تھا۔ اب اس تانگے والے کو جلدی تھی، ورنہ یہ مجرا صبح تک ہی چلتا۔

میں صبح تک جاگتا ہی رہا۔ میں نے رگھو سے شاکر بھائی کا پتا سرسری طور پر پوچھ لیا۔ یہ ایک چھوٹا سا قصبہ نما شہر ہی تھا، بلکہ یہ قصبہ ہی تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ شاکر بھائی کو تلاش کرنے کے لیے یہاں کسی سے پتا پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اڈّے میں سب سوئے پڑے تھے۔ دوپہر سے پہلے کسی کے جاگنے کا امکان نہیں تھا۔ میں خاموشی سے باہر نکل آیا۔ بس ایک جگہ مجھے پوچھنا پڑا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد میں شاکر بھائی کے دروازے پر کھڑا تھا۔ گلیارے کا سب سے نمایاں مکان یہی تھا۔ بیرونی دیوار سرخ بیل سے ڈھکی ہوئی تھی۔ دروازے پر ایک ڈشکرا کھڑا مونچھوں کو تاؤ دے رہا تھا۔ اُس نے سرتاپا میرا بہ غور جائزہ لیا اور حقارت سے منہ بگاڑ کے بولا۔

"اے کیا رے، تیرے کو دِکھنے کا نئیں اے کیا۔"

اُس نے نہ جانے مجھے کیا سمجھ لیا تھا۔ یا ہو سکتا ہے شاکر بھائی خود کو لوگوں کی دسترس سے دُور رکھتا ہو۔ میں نے اُسی کے لہجے میں جواب دیا۔

"شاکر بھائی نے پتا نہیں ڈالا لگتا۔ اسے جا کے بول راجا استاد آیا ہے۔"

"اے چھٹنے کا ہے ادھر سے۔ چل نکل سالا... راجا استاد...!" اُس نے دیدوں کے ساتھ ساتھ ہاتھ بھی نچاتے ہوئے کہا۔ "ساکر بھائی اور نئیں اے بھاوا۔"

"شاکر بھائی کے بھلے کی بات ہے اسے بولو بمبئی سے راجا استاد آیا ہے۔" میں نے اپنا غصہ دباتے ہوئے کہا۔ وہ بھی کوئی افلاطون ہی تھا۔

"اور چونا لگانے کا نئیں ساکر بھائی نئیں اے... ابھی نکلنے کا ہے اِدر سے۔"

"تو پھر کدھر ہے شاکر بھائی۔" میں نے تیور ذرا تیکھے کر لیے۔ وہ ایک دم ہتھے سے اُکھڑ گیا۔ ہاتھی کی طرح قد آور تھا۔ اُس نے اچانک میرے سینے پر دو ہتڑ جمایا۔ مجھے اس قدر جلدی اُس سے یہ توقع نہیں تھی۔ میں لڑکھڑا کے پیچھے الٹ پڑا۔

"تیرے باوا کا نوکر نئیں اے..... ساکر بائی کدر ہے... بڑا آیا سالا... ابھی نکل ادر سے۔" مجھے دھکا دے کے اُس نے اطمینان سے ہاتھ جھاڑا اور کرسی پر جا کے بیٹھ گیا۔

کوئی خاص وجہ لگتی تھی۔ دروازے پر آئے ہوئے ہر آدمی سے ایسا سلوک نہیں کیا جاتا۔ ممکن ہے شاکر بھائی کی طرف سے ہنگامی حکم دیا گیا ہو۔ اُسے میرے بارے میں کوئی سن گن کہاں سے مل سکتی تھی۔ معاً مجھے خیال آیا۔ بھوا نے اپنی جائیداد میرے نام کر دی تھی، اس علاقے میں کوئی چھوٹی موٹی بات نہ تھی۔ سبھی کو خبر ہو جاتی اور یہ بھی ممکن ہے کہ بھوا نے دم آخر کوئی پیغام شاکر بھائی کے لیے بھی چھوڑا

ہو۔ بہ ہرحال، اس ڈشکرے کے رویے سے گمان یہی پڑتا تھا کہ شاکر بھائی نے ہر عام کے لیے دروازہ بند کر رکھا ہے۔

میں نے نہایت اطمینان سے اٹھ کر کرتا جھاڑا اور ایک مرتبہ پھر دروازے کی طرف قدم اٹھا دیا۔ وہ ٹپٹپا کے اٹھ کھڑا ہوا۔

"اوئے اوئے... ابھی تین سال بجنور میں کاٹنے کا ہے۔" اُس نے چاقو کھول لیا۔ "تُو اندر کائیں پڑتا... میرے کا جانتے کا نئیں اے... اسے دکھائے گا نئیں چلانے کا ہے... جان بچا... نکلنے کا ہے۔" اُس نے چاقو کو مشاقی سے دونوں ہاتھوں میں تولا، استاد والا لگتا تھا۔ میں نے اُس کی جھبکیوں کو یک سر نظر انداز کر دیا اور بے نیازی سے قدم اٹھا دیے۔ اُس کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں۔ بڑی مستعدی سے اُس نے ایک قدم بڑھا کے چاقو کو میرے چہرے کے ساتھ ساتھ گھمایا۔ اتنے قریب سے کہ چاقو بس مجھے چھو نہیں اور وہ دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ یہ ایک قسم کی تنبیہ تھی اور اپنی ماہرانہ قوت کا خوب صورت اظہار تھا۔ اس کے خیال میں اس حرکت پر مجھے سرپٹ دوڑ جانا چاہیے تھا۔ میں نے قدم آگے کی طرف اٹھایا تو اُسے معاملے کی سنگینی کا احساس ہوا۔

"اے بول کون ہے تُو... ساکر بائی سے کیا کام پڑنے کا ہے۔"

"کام تیرے کو بولنے کا نہیں ہے تُو شاکر بھائی کو جا کے بول بمبئی سے راجا استاد آیا ہے۔ تیرا کام جو ہے تُو وہ کر۔" میں نے اگلا قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔ مجھے بُھل کے بیدار ہونے سے قبل اڈے پر پہنچنا تھا۔ بہت ممکن تھا کہ ہم آج ہی بمبئی کے لیے روانہ ہو جاتے۔

"تیری تُو سالے... ابھی ڈاکٹر سے ملنے کا ہے۔" اُس نے چابک دستی سے چاقو دائیں ہاتھ میں تولا اور میرے دائیں پہلو میں گھونپنے کے لیے آگے بڑھایا۔ اگر میں اُس کی مہارت کا اندازہ نہ کر چکا ہوتا تو چاقو میری ایک آدھ انتڑی باہر نکال لاتا۔ اُس نے دائیں طرف کا جھانسا دے کر بجلی کی سی تیزی سے چاقو بائیں ہاتھ میں تھاما اور نشانے پر گھونپ دیا۔ وہ بھی مقابل کو کسی درجے میں رکھ رہا تھا، ورنہ ایسا پُر پیچ داؤ نہ آزماتا۔ بُھل کی تربیت کا بنیادی جز وہی یہ تھا کہ بدن کا ہر جز و نظر کے تابع ہونا چاہیے۔ حرکتِ نظر کے اشارے پر حرکت کرنے لگ جائے تو شاگرد استاد ہو جاتا ہے۔ اُس نے جیسے ہی بائیں ہاتھ میں ترازو تولا، میرا جسم خود بہ خود ہی بل کھا گیا۔ اب اُس کے پاس دوسرے موقع کی گنجائش نہیں تھی۔ میرا دایاں ہاتھ اُس گھماؤ کے زور میں اُس کی کلائی پر پڑا۔ اگلے ہی لمحے اُس کا چاقو میرے ہاتھ میں تھا۔ وہ اپنی جھونک میں آگے نکل رہا تھا، لیکن اُس کا ہاتھ میری گرفت میں تھا۔ جوابی جھٹکے سے اُس کے کندھے کا جوڑ ضرور ہل گیا ہوگا۔ وہ گھومتا ہوا واپس میری طرف آ گیا، مگر اب میں اپنی جگہ پر نہیں تھا، نتیجتاً منہ کے بل زمین پر گر پڑا۔ کندھے پر ہاتھ رکھتا ہوا وہ تیزی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ بکھری ہوئی نظروں سے مجھے گھورنے لگا۔ میں نے چاقو بند کر کے واپس اُس کی طرف اچھال دیا۔

"ابھی چلانا سیکھ... جا کے شاکر بھائی کو میرا بول۔" میں نے اُس کی کیفیت سے دانستہ اغماز برتتے ہوئے کہا۔

وہ ہوش و حواس سے بیگانہ بس مجھے گھورا کیا۔ کبھی اپنے ہاتھ کو تو کبھی چاقو کو دیکھتا۔ پھر اُس نے اپنی کلائی پر پوری شدت سے دانت گاڑ دیے۔ اُس کے لیے یہ انہونی تھی۔ معاً اُسے کچھ ہو گیا۔ اُس نے دیوانوں کی طرح سر دائیں بائیں جھٹکا، چاقو وہیں پھینکا اور سیدھا میرے پیروں میں پڑ گیا۔

"مائی باپ میرے کو ماپھی دینے کا ہے۔ ابھی تیرے سے سیکھنے کا ہے استاد۔ تُو مل گیا استاد! تُو مل گیا۔" وہ پیروں سے لپٹ کے ہڑکنے لگا۔

میں نے بہ مشکل اُسے اٹھایا۔ "استاد بولتے ہو تو مجھے جلدی بتاؤ۔ شاکر بھائی سے ملنا ہے جلدی۔"

"مائی باپ ابھی تیرے کو اپن جانے دینے کا ہے۔ ایسا استاد جندگی میں نئیں ملا...... ماں قسم جندگی میں نئیں ملا۔" وہ دونوں کان ہاتھوں سے پکڑنے لگا۔ "اپنا نام سرپھ ہے۔"

"دیکھو، مجھے بہت جلدی ہے، یہ باتیں میں تم سے بعد میں کر لوں گا۔ مجھے شاکر بھائی سے بہت ضروری ملنا ہے۔"

"استاد ابھی ساکر بھائی نے سختی سے منع بولا ہوا ہے۔ پر اپن تیرے کو بتانے کا ہے۔ ساکر بھائی تین دن پہلے ہڑا ہڑی میں ادھر سے بمبئی گیا۔ ابھی اور سب کو اے ای بتا ہے کہ وہ دلواڑا میں ہونے کا ہے۔"

شریف نے فوراً اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے رازدارانہ لہجے میں کہا۔

"بمبئی میں وہ کدھر گیا ہے۔" میں نے سنسناتے ہوئے اُس سے پوچھا۔ میں وہیں کھڑا کھڑا بمبئی پہنچ چکا تھا۔

"ابھی اپن کو اُس کے ٹھکانے کا تو نئیں پتا پر ادر لکشمی مل کا مالک دوست ہونے کا ہے۔ بمبئی میں اس کا بنگلہ ہے۔ بس ادری رہنے کا ہے۔"

"بنگلے کا پتا ہے تمھیں۔"

"ابھی اے لکشمی مل والے کو پتا ہونے کا ہے۔"

شریف مجھ سے غلط بیانی نہیں کر سکتا تھا۔ اُس کی بات مکمل ہونے سے قبل میں وہاں سے مڑ آیا۔ شریف دُور تک میرے پیچھے آیا۔ گڑگڑاتا رہا، منتیں کرتا رہا کہ مجھے ساتھ رکھ لیا جائے۔ میں نے اُس سے دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے بہ مشکل جان چھڑائی۔ میں کس کس کو اپنے ساتھ لیتا جاؤں گا۔ یہاں تو جو ساتھ ہوتا ہے وہ مارا جاتا ہے۔ بٹھل اٹھ گیا ہوگا۔ مجھے وہاں نہ پا کر اُس نے سر پکڑ لیا ہوگا، لیکن میرے میرے کہاں رہے تھے۔ خود بہ خود ہی لکشمی مل کی طرف قدم اٹھ رہے تھے۔ ایک راہ گیر نے تفصیلی پتا سمجھا دیا۔ وہ جگہ لکشمی مل آبادی سے قدرے ہٹ کر تھی، وہاں تک تانگے جاتے تھے۔ دن کی چہل پہل خوب جم چکی تھی۔ لوگ باگ سائیکلوں پر اور پیدل اوزار اپنے کندھوں سے ٹانگے رواں دواں دکھائی دیتے تھے۔ ولواڑا کا اکلوتا بازار سڑک کے دونوں اطراف بنائی گئی چوبی دکانوں پر مشتمل تھا۔ چھابڑیوں اور ٹھیلے والوں کی وجہ سے بازار تنگ لگ نظر آتا تھا۔ وہیں اس ہجوم کے بیچ تانگے بھی کھڑے تھے۔ نہ جانے وہ یہاں کیسے آئے تھے اور نہ جانے وہ یہاں سے نکلیں گے کیسے۔ میں ایک تانگے کے پچھلے حصے میں بیٹھ گیا اور کوچ وان سے کہا کہ لکشمی مل چلو۔ وہ آنکھیں چڑھا کے بولا۔

"بابو صاحب دو آنے سے ایک پائی کم لینے کا نئیں اے۔ تانگا بھرنے کا ہے تو چلنے کا ہے۔"

میں نے خاموشی سے ایک رُپیا نکال کے اُسے دیا تو وہ حیرت سے پھٹنے لگا۔ "ابھی چار آنے ٹوٹا نئیں اے صاحب۔"

"رُپیا سارا رکھ لو، مگر جلدی چلو۔"

اس کے بعد وہ بھیڑ تو وہاں تھی ہی نہیں۔ وہ تیر کی طرح بیچ سے تانگا نکالتا چلا گیا۔ میں لکشمی کے بارے میں سوچنے لگا۔ ممکن ہے وہ مل میں آئی ہوئی ہو اور اُس سے ملاقات ہو جائے۔ لکشمی کو سمجھایا جا سکتا تھا، رگھو سے بہتر اُسے کیا ملتا، لیکن مجھے ان جھمیلوں میں الجھ کر پھر کوئی نئی مصیبت مول نہیں لینی تھی۔ ہو سکتا ہے شاکر بھائی سیٹھ کو تفصیل بتا کر گیا ہو۔ ہو سکتا ہے سیٹھ بمبئی میں اپنے بنگلے کے وجود ہی سے انکار کر دے۔ ایسا سوچنا ہی بیکار تھا۔ کسے خبر تھی کہ وہاں معاملہ کس طرح نبٹنا تھا۔ اب تک ہوتا تو یہی آیا ہے کہ سیدھی سی بات بھی الجھ جاتی ہے۔ بہتر یہی تھا کہ میں پہلے لکشمی سے مل لوں اور اسی کے ذریعے اس کے باپ سے بات کروں، لیکن نہ جانے کیوں مجھے ایسا کرنا مناسب نہیں لگا۔ کچھ غلط تھا۔ پہلے لکشمی کے باپ سے ملنا مناسب ہوگا۔

"ساب آپ ناراج نئیں ہونے کا ہے... ابھی میرا تانگا بھاڑے کا ہے۔ بیاج کا قرجا ہے۔ سام کو روٹی پانی کے پیسے نئیں بچتے ساب۔" کوچ وان نے گھوڑے کو چابک رسید کرتے ہوئے کہا۔ تانگا بازار سے نکل کے کھلی جگہ پر آ گیا تھا۔

"قرضہ کیوں لیا تھا۔"

"قرجے سے اپنا تانگا بنانے کا تھا۔ گھوڑے کو جہر دے دیا، پتا نئیں کس نے۔ گھوڑا ایسیں تو نئیں چلنے کا تھا۔ بیاج میں تانگا بیچنے کا تھا۔ بس ابھی سام کو آنے دو آنے بچوں کے لیے لے جانے کا ہے ساب... سواری لوگ پیسا نئیں دینے کا ہے ساب... ابھی دو آنے مانگے تو ایک آنا ملنے کا ہے۔" کوچ وان دکھیارے لہجے میں بولا۔ اُس نے کھینچ کھینچ کے گھوڑے کو چابک رسید کیے۔

"اس غریب کو کیوں مارتے ہو! بیاج کا قرضا کتنا ہے۔"

میں نے اس سے پوچھا۔ میری پشت بہ دستور اُس کی طرف تھی۔

"ابھی پورے تین سو ہونے کا ہے ساب... اپنا جھونپڑی بکنے کا ہے اب۔"

"اس تانگے کی کتنی قیمت ہے جو تم چلا رہے ہو۔"

"ساب یہ پورے ساڑھے پانچ سو کا ہے۔ بھگوان کرپا کرنے کا ہے ساب... آپ کا ہے چنتا کرنے کا ہے۔"

"نہیں، میں ویسے ہی پوچھ رہا تھا... لکشمی ہل کتنی دُور ہے۔"

"یہ آ گیا ساب... آپ بھی اچھا پوچھنے کا ہے۔ ہل تو آ گیا ساب۔"

میں نے مڑ کے دیکھا ہل واقعی آ گئی تھی۔ چمنیوں سے گاڑھے سیاہ رنگ کا دھواں نکل رہا تھا۔ کوچ وان نے تانگا عین ہل کے دروازے پر روکا۔ میں نے اُسے وہیں ٹھیرنے کا کہا۔ معاً مجھے کچھ خیال آیا۔ بٹھل نے کچھ پیسے میری جیب میں ٹھونسے تھے۔ جانے اُس کے پاس کہاں سے آئے۔ شاید چھلیا سے لیے ہوں، مگر وہ کافی رُپے تھے۔ سو سو کے کئی نوٹ تھے۔ میں نے جیب سے نکال کے دیکھے تو دو ہزار سے زیادہ کی رقم لگتی تھی۔ کیا خبر اندر سے واپس کس حال میں آنا ہو، میں نے ایک ہزار رُپے گن کے کوچ وان کو دیے۔

"یہ رکھ لو! قرضہ بھی لوٹا دینا، تانگا اپنا خرید لینا۔"

کوچ وان کھڑا کھڑا لرزنے لگا۔ اُس کی آنکھیں جھر جھر بہنے لگیں۔ وہ زیر لب کچھ بدبدا رہا تھا۔ میں نے رُپے اسے تھمائے اور ہل کی طرف چل دیا۔ بے رنگ زنگ آلود فولادی دروازہ بند پڑا تھا۔ بغل میں ایک چھوٹی سی طاقچی کھلی تھی، سڑک کی مٹی بھی تیل میں چپڑی ہوئی سیاہ ہو رہی تھی۔ فضا میں مرداری بساند رچی ہوئی تھی۔ میں طاقچی کے قریب گیا تو اندر سے ایک پیر مرد نے جھانکا۔ اُس نے قلم کان میں اُڑس رکھا تھا۔ وہ منشی وغیرہ لگتا تھا۔

"ہاں بھائی صاحب فرمائیں۔" اُس نے شستہ لہجے میں دریافت کیا۔

"سیٹھ سے ملنا ہے۔" میں نے وضع دارانہ مسکراہٹ اپنے چہرے پر سجاتے ہوئے کہا۔

"کیا کہا؟ کس سے ملنا ہے؟" اُس نے مصنوعی حیرانی سے پوچھا۔

"سیٹھ سے ملنا ہے۔" میں نے اُسی کے لہجے کی نقل اتارتے ہوئے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"دلّی سے آئے لگتے ہو... اماں سٹھیا گئے ہو بھیے۔ یہاں چار دن پہلے نام کھاتے میں چڑھوانا پڑتا ہے۔"

"بڑے میاں، میں دلی سے نہیں آیا۔ مجھے آج اور ابھی ملنا ہے۔"

"بڑے میاں ہو ویں گے تمھارے باوا حضور۔ سیٹھ ایرے غیرے نتھو خیرے نہیں ہیں۔ نام چڑھوا جاؤ، چار دن بعد آ جانا۔" بڑے میاں یک دم بھتے سے اُکھڑ گئے۔

بٹھل کہتا تھا کہ جیت کا پہلا دروازہ اسی وقت کھل جاتا ہے جب مقابل کی کوئی کم زوری تمھارے ہاتھ لگ جائے۔ جسمانی کم زوری سے کہیں زیادہ سود مند نفسیاتی کم زوری ہوتی ہے۔ کم زوری دریافت ہوتے اسے مقابل پر آزمانے کے طریقے پر غور شروع کر دینا چاہیے۔ بڑے بڑے سورما صرف زبان سے چت ہو جاتے ہیں۔

"حضور، آپ دلّی کے لگتے نہیں۔ ہم نے سنا تھا کہ اِدھر بڑے میاں عزت اور احترام کے القابات میں سے ایک ہے۔ بڑے میاں نوابوں کو بھی بولتے ہیں۔ آپ غلط سمجھے ہیں ہماری بات۔ آپ اور ہم برابر ہی کے دِکھتے ہیں۔"

میری بات سن کے بڑے میاں کی آنکھیں مسکرائیں، مگر انھوں نے اپنے لہجے میں تیکھٹ برقرار رکھی، بولے۔

"بھیے، سیٹھ صاحب کے آنے کا وقت ہو رہا ہے۔ باہر بازو دیکھتے رہو۔ مان جاویں تو مل لیو۔ باقی اپّن کی طاقت میں کچھ ہے نہیں۔" یہ کہہ کے بڑے میاں نے چھپاک سے طاقچی بند کر دی۔ اپنے تئیں اُنھوں نے بڑی فراخ دلی کا ثبوت دیا تھا کہ سیٹھ صاحب کی آمد کا بتا دیا۔ کوئی اور چارہ کار بھی نہ تھا۔ میں وہیں ایک طرف کو کھڑا رہا۔ سر اندر سے جی متلا رہا تھا۔ کوچ وان نے مجھے یوں کھڑا دیکھا تو گرتا پڑتا بھاگا آیا۔ اُس پر ابھی تک لرزہ طاری تھا۔ اُس سے چلا بھی نہیں جا رہا تھا۔ اُس نے قریب آتے ہی بڑے سبھاؤ سے اپنے کندھے کا رومال کھولا اور میرے سر پر سایہ کرنے لگا۔

"ساب، آپ اور کھڑا ہونے کا نہیں ہے۔ تانگے میں بیٹھنے کا ہے۔ ساب دھوپ ہے۔" کوچ وان بچھا جا رہا تھا۔ مجھے کوفت ہونے لگی، مجھے اسے ابھی رُپے نہیں دینے چاہیے تھے۔ رخصت کرتے وقت دیتا تو بہتر تھا۔ میں اُس کے بے حد اصرار پر تانگے میں آ کے بیٹھ رہا۔ گھنٹے دو گھنٹے، کئی گھنٹے گزر گئے۔ دوپہر ڈھلنے کو آ رہی تھی، مگر سیٹھ کی کار نہیں آئی۔ میں کئی مرتبہ طاقچی میں بڑے میاں کے پاس بھی گیا۔ انھوں نے بڑے پیار اور خلوص سے کہا کہ اس سے زیادہ انھیں بھی کچھ نہیں معلوم۔ البتہ وہ یہ بات پوری دیانت داری سے بتا رہے تھے کہ سیٹھ اس وقت کارخانے میں نہیں ہے۔ آخر بٹھل جھلا رہا ہوگا۔ مجھے کسی نہ کسی کو بتا کے آنا تھا۔

نے سیٹھ کی کوٹھی پر جانے کا فیصلہ کر لیا۔ میں لکشمی کا سامنا کرنے سے احتراز کر رہا تھا، مگر اب کوئی اور چارہ کار بھی نہ تھا۔ اسے کم سے کم اپنے باپ کے بمبئی کے بنگلے کا ضرور علم ہوگا۔ کوچ وان کو سیٹھ کی کوٹھی کا علم تھا، میرے اشارے کی دیر تھی اُس نے تانگا ہوا کر دیا۔ یہ دیکھ کے میری حیرت کا کوئی ٹھکانا نہیں رہا کہ شاکر بھائی کے عین برابر میں سیٹھ کی کوٹھی تھی... شاکر بھائی کے مکان پر شریف اس وقت نظر نہیں آ رہا تھا۔ سیٹھ کی کوٹھی تھی... کیا عالی شان محل تھا۔ پوری عمارت پر سنگ ابیض برتا گیا تھا۔ چوبی دروازے پر چوب داری کا خوب کام کیا گیا تھا۔ جس پر روپیلا روغن خوب بھلا لگ رہا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر دستک دی۔ ایک بندوق بردار سکھ باہر آیا۔ وہ چوکی داروں کی انگریزی وردی میں ملبوس تھا۔ میں نے اُس سے بلا جھجک کہا کہ مجھے لکشمی دیوی نے بلوایا ہے۔ اُن سے کہنا بابر زمان آیا ہے۔" اُس نے بہ غور میرا جائزہ لیا اور مجھے وہیں کھڑا رہنے کی تاکید کر کے چلا گیا۔ وہیں کھڑا رہنے کی تاکید وہ یوں کر گیا تھا جیسے میں نے ایک قدم بھی بڑھایا تو اندر ہی سے ایک گولی داغ دے گا۔ میں ابھی اس کی ہدایات پر سختی سے عمل کرنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ سوئی ہوئی کوٹھی جاگ اٹھی۔ گمان پڑتا تھا کہ دیواروں کے پیچھے ہڑبونگ مچی ہے۔ بہتیرے لوگ اِدھر اُدھر دوڑ رہے ہیں۔ پھر دھم سے وہ روپیلا پھاٹک کھلا۔ لکشمی ننگے پیروں بنا آنچل کے دوڑی چلی آ رہی تھی۔ اُس کا سینہ دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ وہ زخمی نظروں مجھے دیکھے گئی۔ وہ سادگی میں بھی بے پناہ حسین لگ رہی تھی۔ اُس کی پھیلی ہوئی آنکھوں میں زخموں کے ساتھ ساتھ بے اختیاری بھی جھلک رہی تھی۔ اس کے اطوار بتا رہے تھے کہ وہ مجھ سے لپٹنے کے لیے آئی تھی، مگر لجا گئی۔

"موہن جی، وشواس نہیں پڑ رہا۔ بھگوان سے دن رات پراتھنا کی تھی آپ کو بلانے کی۔"

میں نے کہنا چاہا کہ میں تمھاری وجہ سے نہیں آیا۔ تمھارے پتا سے ملنے آیا ہوں، ایک کام ہے ان سے، مگر میں کچھ کہہ نہ سکا۔

"میں نے کہا تھا دلوا آؤں گا تو تم سے ضرور ملوں گا۔" نہ جانے کیوں میں نے وہی کہا جو وہ سننا چاہتی تھی۔

"میں نے پتا جی سے آپ کا ذکر کیا تھا۔ وہ آپ کی چنتا میں بیٹھے ہیں۔ بستی بھی ایک مورکھ کو دوڑایا تھا جو دل جلانے والی آ گیا کہیں پہلے آیا تھا۔ آپ ٹھیک تو

موہن جی۔ بھوا جی کی ہتیا۔" معاً اُسے بہت کچھ یاد آ گیا۔ اُس تک ساری خبریں پہنچ چکی تھیں۔ وہ اُچک کے محتاط نظروں سے میرے عقب میں دیکھنے لگی۔ پھر بولی۔

"آپ جلدی سے اندر آ جائیں، چنتا کی کوئی بات نہیں، سب خیر ہو جائے گا۔ پولیس اس دروازے کا پالن نہیں کر سکتی۔"

"تم غلط سمجھ رہی ہو۔ نہ ہی میں مفرور ہوں اور نہ ہی پناہ..."

اُس نے مچل کے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "دوشی نہ کرو موہن جی، داسی ہوں آپ کی۔ آپ آئے نہیں ہیں، میں نے بھگوان سے کہہ کر بلوایا ہے۔" وہ وہیں پر مجھ سے بے اختیار لپٹ گئی۔ میں گھبرا گیا اور آہستہ سے علاحدہ کیا۔ لکشمی نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے اندر کھینچ لیا۔

"مویا! مویا!" وہ چلانے لگی۔ وہ گھر کی منہ چڑھی دِکھتی تھی۔ وہ بلا کسی خوف و خطر اور بلا کسی حیل و حجت کے میرا ہاتھ پکڑ کے اندر کو دوڑی جا رہی تھی اور میں چل نہیں رہا تھا گویا پھسل رہا تھا۔ بیرونی دیوار اور عمارت کے درمیان باغیچہ تھا جس کے پودے رنگ بارنگ کے پھولوں اور بھانت بھانت کی خوش بوؤں سے اٹے پڑے تھے۔ مہک کی لپٹیں پوری کوٹھی کا احاطہ کیے ہوئے تھیں۔ کوٹھی ولایتی طرز پر بنی ہوئی تھی۔ مہمان خانے میں پہنچ کے اندازہ ہوا کہ تزئین و آرائش بھی ولایتی طرز پر کی گئی ہے۔ نرم نرم گدوں والی مخملیں کرسیاں تھیں، جنھیں انگریز سوفا کہتے تھے۔ برقی قندیلیں ہر محراب پر تھیں اور ایک بیضوی قمقمہ عین وسط میں لٹک رہا تھا۔ نہ جانے کہاں کہاں سے یہ بجلی حاصل کر رہے تھے۔ بمبئی میں بھی مہاشا کی بجلی تک رسائی نہیں تھی۔ مہمان خانے کی پشتی دیوار پر ایک قدِ آدم تصویر ٹنگی ہوئی تھی۔ یہ یقیناً سیٹھ ہی تھا۔ اتنے میں سرخ ساڑھی میں ملبوس ایک باوقار خاتون بوکھلائے قدموں سے اندر داخل ہوئیں۔ لکشمی انھی کا پرتو تھی۔

"مویا، یہ موہن جی ہیں ہم نے جن کا بتایا تھا۔ رگھو کا سروناش کرنے آئے ہیں۔" لکشمی نے میرا ہاتھ نہیں چھوڑا... ان کا ماحول خاصا آزاد لگتا تھا۔

"موہن جی، یہ مویا ہیں ہماری ماتا جی۔"

میں نے انھیں ہاتھ جوڑ کے نمسکار کیا۔ جواباً انھوں

''لکشمی آپ کا بہت جکر کرتی ہے۔ رگھو پاپی نے ہمارا جیون ناس کر رکھا ہے۔ لکشمی کا وچار ہے کہ رگھو کا سروناس آپ ہی کر سکتے ہو۔''

''یہ لکشمی کی ذاتی رائی ہے۔ مجھ میں ایسا کوئی گن نہیں ہے۔'' میں انھیں کیا بتاتا کہ میں رگھو کے اڈّے ہی پر رہائش پذیر ہوں۔

''مویا! پتا جی کدھر ہیں، موہن جی کو پتا جی سے ملوانا ہے۔''

''بابر جمان نام ہے تمھارا...'' لکشمی نے بتایا تھا۔ لکشمی کی ماں نے بڑی محبت سے کہا۔ انھوں نے لکشمی کے سوال کو سنا اَن سنا کر دیا تھا۔

''جی بابر زمان!'' مجھے وہاں گھٹن ہونے لگی۔ مجھے بٹھل کی فکر کھا رہی تھی۔ وہ سو سو گالیاں بک رہا ہوگا۔

''موہن جی آپ مویا جی سے باتیں کریں، ہم پتا جی کو بلا کے لاتے ہیں۔'' لکشمی نے اب جا کے میرا ہاتھ چھوڑا تھا۔ وہ جانے لگی تو اُس کی مویا جی نے اُسے منع کرتے ہوئے کہا۔ ''تمھارے پتا جی آج سویرے بمبئی گئے ہیں۔ اُدھر سے مستری لینے گئے ہیں۔''

لکشمی کی ماں کا یہ جملہ سن کے میرے تو گویا قدموں سے کسی نے زمین کھینچ لی۔ بمبئی میں ایسا کیا تھا کہ سب وہاں دوڑے جا رہے تھے۔ ممکن ہے مولوی صاحب کی مالا میں سیٹھ بھی دل چسپی لے رہا ہو، لیکن مجھے شاکر بھائی اور سیٹھ کا بہت گہرا یارانہ لگتا تھا۔ دونوں کے مکان بھی پہلو بہ پہلو تھے۔

''مجھے تانگے والا بتا رہا تھا کہ بمبئی میں تمھارے پتا کا اپنا بنگلا ہے۔ بمبئی میں میرا گھر بھی ہے۔''

''ہائے رام تانگے والے کو کیسے پتا چل گیا۔ لکسمی کو بھی نہیں پتا۔ اُس کے پتا جی نے مجھے بھی چند دن پہلے اِتنا بتایا تھا کہ اُنھوں نے بمبئی میں مکان لیا ہے۔ ابھی کسی کو بولنا منع ہے۔ بالکوں کو بھی نہیں۔ ہائے رام تانگے والے کو بھی... لکسمی تانگے والے کو بلوا جرا پوچھوں... او راجا... تانگے والا باہر کھڑا ہو تو بلا لاؤ اسے۔'' لکشمی کی مویا یک دم بوکھلا گئی اور اُس سے زیادہ میں بوکھلا گیا۔ میں نے رواروی میں ایسے ہی جھوٹ بولا تھا اور وہ تانگے والے کو بلوا رہی تھی۔ کوچ وان یقیناً باہر ہی کھڑا ہوگا۔ وہ میرے بغیر کہاں ٹلنے والا تھا۔ راجا نامی ملازم بھی چلا آیا۔ اُس نے بتایا کہ تانگے والا مجھے چھوڑتے ہی چلا گیا تھا۔ وہ باہر نہیں ہے۔ مویا جی میرے پیچھے پڑ گئیں کہ اتنی راز کی بات تانگے والے کو کیسے پتا چل گئی۔ ان کی باتوں سے مجھے اِتنا پتا چل گیا تھا کہ بمبئی میں سیٹھ کے بنگلے کا ان میں سے کسی کو علم نہیں ہے۔ سیٹھ عن قریب بمبئی میں ایک بڑی مل لگانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اب میرا یہاں رُکنا بے کار تھا۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔

''مجھے اجازت دیجیے۔ میرے کچھ دوست راہ تک رہے ہوں گے۔''

''ہائے ہائے... دیا کرو موہن جی... ایسے کیسے چلے جاؤ گے۔'' لکشمی مچل کے اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ بے یقینی سے مجھے دیکھنے لگی۔ غضب کا سحر تھا اُس کی آنکھوں میں۔

''مجھے ابھی جانا ہے لکشمی۔ میں دوبارہ آؤں گا۔'' تمھارے پتا جی سے کچھ ضروری کام بھی ہے۔''

''بتایا ہوتا۔ مجھے بتاؤ کیا کام ہے۔ سمجھو موہن جی کام ہو گیا، مگر جانے نہیں دوں گی۔'' وہ سامنے آ کے کھڑی ہو گئی اور گھورنے لگی۔

اُس کی بلا خیز آنکھوں میں کچھ تھا۔ مجھے از خود ہی خیال آیا۔ ''میں اپنے دوستوں کو بتا کے واپس آ جاؤں گا۔''

''نہیں موہن جی، میں جانے نہیں دوں گی۔'' وہ اپنی مرضی پر اڑ گئی۔

''تو پھر ساتھ چلو... میں ساتھ ہی واپس آ جاؤں گا۔'' میرے دل میں خواہش اٹھی کہ وہ انکار نہ کرے۔

''راجا ڈرائیور سے کہو موٹر نکالے... چلیں موہن جی۔''

وہ جھٹ تیار ہو گئی۔ اُس نے ماں سے اجازت لینے کا تکلف بھی روا نہیں رکھا۔ جو کھڑی اُسے تذبذب سے دیکھ رہی تھی۔ پھر شانے اچکا کے اندر چلی گئی۔ اُس نے لکشمی سے کسی قسم کا استفسار نہیں کیا۔ مجھے اُن کی معاشرت کا بہ خوبی اندازہ ہو رہا تھا۔ لکشمی پھر میرا ہاتھ پکڑ کے باہر کو آ گئی۔ مہمان خانے کے دروازے سے ڈرائیور نے موٹر لگا دی تھی۔ سفید رنگ کی چمچماتی موٹر اور سفید چمچماتی وردی میں ملبوس ڈرائیور خوب بھلے لگ رہے تھے۔ مؤدب ڈرائیور نے آگے بڑھ کے پچھلا دروازہ کھولا۔ میرے ایما پر لکشمی سوار ہو گئی۔ ڈرائیور بھاگتا ہوا گیا، اُس نے جھٹ دوسری طرف کا دروازہ کھول دیا۔ مجھے خواہ مخواہ ہنسی آ گئی اور میں مسکراتا ہوا موٹر میں بیٹھ گیا۔ ڈرائیور تیزی سے موٹر کوٹھی سے نکال لے گیا۔ تانگے والا بہ دستور باہر جما کھڑا تھا۔ راجا نے کام چوری دکھائی تھی یا پھر اس وقت کچھ دیر کے لیے کوچ وان اِدھر اُدھر سرک گیا ہوگا۔ کوچ وان نے مجھے موٹر میں بیٹھا دیکھ لیا تھا اور ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا۔ اس سے آگے کا منظر میں نہیں دیکھ سکا۔ ڈرائیور موٹر تیزی سے بڑھا لے گیا تھا۔ یہ چھوٹا سا قصبہ تھا، میں نے رگھو کے اڈّے کا پتا بتا دیا۔ ڈرائیور نے جھٹکے سے موٹر روک دی۔ وہ سٹپٹا گیا تھا۔

''صاحب آپ نے واقعی اُدھر جانا ہے...؟ مالکن اُدھر رگھو دادا کا اڈّا ہے۔'' ڈرائیور نے عقبی شیشے میں دیکھتے ہوئے کہا۔ اُس کے ماتھے سے پسینہ پھوٹ پڑا تھا۔

''جدھر موہن جی بول رہے ہیں اُدھر ہی چلو۔'' بس میرے کسی جواب سے پیش تر لکشمی نے بڑے اطمینان سے کہا۔ اس کے انداز میں کوئی تلاطم نہیں تھا، کوئی ہیجان، کوئی طوفان کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ ایسے بیٹھی تھی جیسے اُسے توقع ہو کہ میں اُسے وہیں لے جاؤں گا۔

چند منٹوں میں موٹر رگھو کے اڈّے کی گلی میں داخل ہو گئی۔ ڈرائیور کے ہاتھ لرز رہے تھے۔ دھیارا اور کالو گلی کی نکڑ پر کھڑے تھے۔ دھیارا نے مجھے دیکھ لیا تھا اور شور مچا دیا۔ دوڑتا ہوا موٹر کے پیچھے آنے لگا۔ پھر تو گلیارے ہی نے انگڑائی لی اور جاگ پڑا۔ موٹر جب رگھو کے دروازے سے لگی تو دیکھتے ہوئے چہرے کے ساتھ سب سے پہلے بٹھل آیا پھر چھلیا اور پھر رگھو!

ڈرائیور نے دروازہ کھولا تو لکشمی شانِ بے نیازی سے نیچے اتری۔ میں خود ہی دوسری طرف کا دروازہ کھول کے اتر آیا تھا۔ رگھو پتھر کا ہو گیا تھا۔ لگتا تھا کہ وہاں بیش تر لوگ لکشمی کو پہچانتے تھے۔ میرے آنے سے جو تھر تھل مچی تھی وہ یک دم تھم گئی تھی۔ رگھو کی آنکھیں پھٹتے پھٹتے باہر نکلنے کو آ رہی تھیں، مگر اس کے جسم میں ذرا بھی حرکت نہ ہوئی تھی۔ چھلیا نے دو قدم پیچھے ہٹ کے رگھو کے کان میں سرگوشی کی، مگر رگھو کچھ کہاں سن رہا تھا۔ وہ تو بس دیکھ رہا تھا۔ لکشمی نے یہاں آنے سے متعلق پہلی مرتبہ زبان کھولی۔

''موہن جی، یہاں کیوں لے آئے ہو۔''

''رگھو کا سروناش کرنے۔ آؤ میرے ساتھ، ڈرو نہیں۔'' میں نے ڈپٹ کے کہا اور تیز آواز میں کہا، تاکہ سب سُن لیں۔

''آپ کے ساتھ تو سوامی جی میں نرکھ میں بھی چلی جاؤں گی، چلیے۔'' اُس نے بھی تیز ہی آواز میں جواب دیا۔ وہ رگھو کو ڈھونڈ رہی تھی۔

میں نے از خود اُس کا ہاتھ پکڑا اور اندر لے چلا۔ بٹھل مجھے کیپٹو تو نظر وا [illegible] پڑ رہا تھا۔

''موہن جی ادھری نرکھ ہی میں آ رہے ہیں۔'' بٹھل نے بھنبھناتے ہوئے کہا۔ غصے میں اُس کا چہرہ ستا ہوا تھا، مجھے ڈر لگنے لگا۔

''تم راستے سے ہٹ جاؤ، اِس لفڑے سے تمھارا کوئی واسطہ نہیں استاد۔'' میں نے بٹھل کو مخصوص انداز میں آنکھ سے اشارہ کیا۔

''تیرے راستے کی متا... ذرا خوش نہیں دیکھ سکتا رے... بول کے چلا جاتا۔'' بٹھل یک دم مدھم پڑ گیا۔

''سوامی جی، استاد سویرے سے پریشان بیٹھے کا ہے۔ ابھی سارا دلواڑا ڈھونڈنے کا تھا۔ تانگے والا بھی غائب سوامی جی غائب۔'' چھلیا دھیرے سے بولا۔

''کدھری گیا تھا۔'' بٹھل نے سوچتی نظروں سے لکشمی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہ بعد میں بتاؤں گا...'' پھر میں نے ذرا تیز آواز میں کہا۔ ''ابھی رگھو دادا سے دو دو ہاتھ کرنے کا ہے۔'' بٹھل کھلکھلا کے ہنس پڑا اور راستہ چھوڑ دیا۔ سب دائیں بائیں سمٹ گئے، مگر رگھو وہاں تھا ہی نہیں۔ وہ کہیں پہنچا ہوا تھا۔ میں نے چاقو کھول لیا اور لکشمی کا ہاتھ پکڑ کے اڈّے میں داخل ہو گیا۔ بٹھل مسکرا رہا تھا، باقی سبھی ایک دوسرے کو حیران و پریشان نظروں سے گھور رہے تھے۔ میں لکشمی کا ہاتھ پکڑ کے سیدھا رگھو کے کمرے کی طرف چلا گیا۔ ایک بھیڑ ہمارے ہمرکاب تھی۔ اب لکشمی بھی کچھ کچھ گھبرانے لگی تھی۔ رگھو کے کمرے تک پہنچنے میں مجھے شدید کوفت کا سامنا کرنا پڑا۔ دروازہ مقفل تھا۔ میں نے پیچھے مڑ کے دیکھا تو [illegible] بھیڑ میں سب سے آگے تھا۔ ان کی

سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ کہیں میرا دماغ تو نہیں چل گیا ہے۔ چاقو کھول کے شہر کے امیر کبیر شخص کی بیٹی کو میں یہاں کھینچتا ہوا کیوں لایا ہوں۔ میں نے دھیارا سے رگھو کے کمرے کی تالی لانے کا کہا تو کاٹو تے جواب دیا۔

"استاد کے کمرے میں کوئی اور نہیں جاتا، تالی وہ کسی کو نہیں دیتا۔"

"استاد کو میرا نام بولو اور تالی مانگ لاؤ۔" میرے منہ سے الفاظ نکلتے ہی دھیارا دوڑتا چلا گیا۔

اتنے بہت سارے لوگ اور وہ بھی اڈے پاڑے کے آدمی۔ "دولکشمی گھبرانے لگی ہو، تم لوگ یہاں کیوں کھڑے ہو، جاؤ اپنا کام کرو۔" میں نے درشتی سے کہا تو ایک ایک کر کے سب دائیں بائیں ہو گئے، مگر اپنی نظریں وہیں چھوڑ گئے تھے۔

دھیارا تالی لے آیا تھا۔ لکشمی سن چکی تھی کہ دھیارا اس کمرے میں کسی کو داخل نہیں ہونے دیتا۔ مجھے خود سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کرنے جا رہا ہوں۔ میں جو کچھ کر رہا تھا از خود مجھ سے سرزد ہو رہا تھا۔ میں نے تالی سے دروازہ کھولا اور لکشمی کو ہاتھ کے اشارے سے اندر داخل ہونے کا کہا۔ وہ ذرا جھجکی، مگر اندر داخل ہو گئی۔ سامنے ہی لکشمی دیوی کی مورتی تھی۔ وہ اس شاہکار کو دیکھ کے مبہوت ہو گئی اور کچھ دیر دیکھتی رہی۔ میں نے دھیرے سے کہا۔ "مورتی کیسی ہے؟"

"سندر ہے موہن جی، کیا میں اتنی سندر ہوں۔" اس نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔

"تم سندر ہو، مگر اس مورتی کی سندرتا اسے بنانے والے ہاتھ ہیں۔"

"میں نے سنا تھا کہ مورتی بنانے والے کے لیے مہینوں مورت گر کے سامنے بیٹھنے کی تپسیا کرنی ہوتی ہے۔ یہ کیسی مورتی بنالی۔"

"مجھے نہیں معلوم کیسے بنائی ہے، مگر اتنا معلوم ہے کہ اسے رگھو کے ہاتھوں نے بنایا ہے۔ آؤ میرے ساتھ آج رگھو سے دو دو ہاتھ ہو جائیں۔" مجھ پر جنون سوار ہو گیا تھا۔ لکشمی کی سمجھ میں کچھ نہ آ رہا تھا اور میرے ذہن میں بھی سب کچھ واضح تھا۔ میں لکشمی کو لے کے چوکی پر چلا آیا۔ دالان میں سب جمع تھے۔ ایک طرف چارپائی پر بھٹل پڑا تھا۔ دھیارا اس کے پاؤں داب رہا تھا۔ میں نے با آواز بلند کہا۔

"ریت کے مطابق اڈے کا راج بل سے ہے۔ یہاں پر وہی بیٹھے گا جو دم رکھتا ہوگا۔" میری آواز سن کے کچھ ہڑبڑا کے کچھ ٹھٹکا کر مجھے دیکھنے لگے۔ رگھو ایک کونے میں گھٹنوں میں سر دیے بیٹھا تھا۔ اس طرح بیٹھنے سے کسی کو تشویش لاحق نہیں تھی، جس کا مطلب یہی تھا کہ رگھو کا یہ طور ان کے لیے نیا نہیں تھا۔ میری بات سن کے بھٹل کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ چھلیا کے چہرے پر تردّد آیا تھا، مگر وہ بھٹل کو دیکھ کے شانت ہو گیا تھا۔ بھٹل نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کر دیا تھا۔

"جیسا کہ آپ لوگ جانتے ہیں کہ لکشمی دیوی اور رگھو دادا کے درمیان کیا تنازع چل رہا ہے۔ لکشمی دیوی میرے پاس فریاد لے کر آئی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ رگھو دادا نے دھمکی لگائی ہے جو لکشمی سے شادی کرے گا رگھو اسے مار دے گا۔ لکشمی نے مجھے مجبور کیا ہے کہ میں اس سے شادی کر لوں اور میں نے ہامی بھر لی ہے۔" میں نے رگھو کی طرف دیکھتے ہوئے ذرا توقف کیا۔ رگھو نے ایک جھٹکے سے گھٹنوں میں دیا ہوا سر اٹھایا اور مجھے خشمگیں نظروں سے گھورا۔ میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ "میں رگھو سے معاملہ صاف کرنے آیا ہوں۔" میں نے اندازے سے چاقو فضا میں اچھالا اور اندازے ہی سے لپک کے پکڑ لیا۔ اس دوران میری نظر ایک پل کے لیے بھی رگھو سے نہیں ہٹی تھی۔ میں نے رگھو سے دیانت داری سے لڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ محبت کرنے والوں سے کیا بعید۔ میرے ذہن میں اب تک یہی تھا کہ رگھو سے دانستہ شکست کھاؤں، لیکن جب رگھو چاقو کھول کر دیوانگی سے اٹھا تو میرے اندر ایک شخص رشک و حسد میں تلملا اٹھا۔ میں نے تہیہ کر لیا کہ رگھو کو زیادہ دیر تک کھڑا رہنے نہیں دوں گا۔

"بازی گر" سب رنگ کا سب سے مقبول سلسلہ

انگوٹھی، حوصلوں، آنسوؤں اور آہوں کی داستان

پانچویں درویش کا بیان

ایک سرفراز سینہ فگار نوجوان کا سفرنامۂ زندگی

باقی واقعات آئندہ